عزت ہیں۔

ہمایوں متفرق مضامین کا ایک مجموعہ ہے، رنگ رنگ کی علمی و ادبی دلچسپیوں کا ایک ذخیرہ ہے۔ جی چاہتا ہے کہ اس ذخیرے کے بعض جواہر پاروں کا آج ذکر کیا جائے۔ مگر دقت یہ ہے کہ گنجائش کم ہے اور تحائف بہت پس چند مضامین کا نام گنوایا جاتا ہے اِس امر کا اعتراف کرتے ہوئے کہ جن کا یہاں ذکر نہیں کیا گیا۔ اُن میں سے بعض کا درجہ مذکورہ ذیل میں سے بعض سے کچھ کم نہیں۔ سب سے پہلے ہمارے کرمفرما فلک پیما ہیں جنہوں نے برضائے خود اپنے اوپر اپنا ہی یہ حکمِ امتناعی اب تک جاری کئے رکھا ہے کہ وہ ہمایوں کے سوا کہیں اور نہ لکھیں گے۔ اُن کے مضامین میں کس کا ذکر ہو کس کا نہ ہو لیکن میں کیا ہوں۔ میرا زینہ۔ بے صبروں کا دوزخ۔ ابلیس اور عورت۔ معترضہ جملے۔ سنہ ۵۹۲۶ء۔ قاضی دیگ بر۔ نئی تاریکی۔ آنکھ کا جادو۔ پچیس اور تیس۔ دقتیں۔ اور دقتیں۔ میاں جموں اللہ میاں۔ بڑی کتابیں اور چھوٹے آدمی۔ مشینوں کی موت۔ بے اختیار یاد آتے ہیں۔

پھر اور مختلف انواع کے مزاحیہ اور لطیف مضامین کا خاصا ذخیرہ ہے جن میں مشتے نمونہ از خروارے یہ ہیں۔ دل دینا۔ زبیدہ۔ ٹھیکری کا نصیب۔ دماغ کے جھوٹ۔ زندگی کی تین راہیں۔ قبر کا بھید۔ خانہ جنگی۔ بمبئی کا ایک پھیرا۔ انجمنِ زندہ دلانِ ہند۔ صاحب بہادر۔ دوستوں کی قسمیں۔ بہرا۔ غریبوں کی سیل۔ مرد ایک عورت کی نظر سے۔ چھان۔ گولّی موتی اردو۔

تاریخی مضامین میں سے چند یہ ہیں۔ انقلابِ فرانس۔ آفرینشِ عالم۔ مصر کے آثارِ قدیمہ۔ گلبدن بیگم۔ تاریخ ہند کے چند زریں عہد۔ حریت اور اسلام۔ دنیا کی تاریخ ایک صفحے میں۔ نپولین مصر و شام میں۔

سیرت و سوانحعمری میں سے چند یہ ہیں۔ ہمایوں۔ غازی مصطفیٰ کمال پاشا۔ لارڈ نارتھ کلف۔ ٹیپو سلطان۔ فخرِ کائنات صلعم۔ مسز سروجنی نائیڈو۔ ٹالسٹائے۔ مادام کیوری۔ سر اسحٰق نیوٹن۔ نواب خان خاناں۔ شبلی۔ کونٹ ہرمان کیزرلنگ۔

علمی مضامین میں یہ خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں۔ سائنس اور جنگ۔ علم الجراثیم۔ گیلیلیو۔ سُروں کے رنگ۔ رنگوں کے ذریعے سے سیرت کا مطالعہ۔ تاریخِ مصوریٔ ہند۔ موجودہ فنِ مصوری۔ مصوری۔ تین خاموش۔ نیا سیارہ۔ حیوانِ عاقل۔ فلسفۂ یاس۔

اخلاقی و تمدنی مضامین کی طرف ہمایوں کی خاص توجہ ہے۔ چند عنوانات یہ ہیں۔ عورت اور مختلف مذاہب۔ حقیر شے کی قوت۔ زن و شوہر کے تعلقات۔ شکستہ دلی۔ خوش کیونکر رہئے۔ قوتِ فیصلہ۔ نیک ارادے۔ عورت اور مرد کا مسئلہ پردہ۔ ہندِ قدیم اور صنفِ نازک۔ مقصدِ زندگی۔ جدید ترکی۔ جرمنی میں تحریکِ صحرانوردی۔

تنقید میں علاوہ "اردو نمبر" کے چند یہ مضامین ہیں۔ (سنہ ۲۲ء میں) ادبیات اردو اور ذوقِ عامہ (سنہ ۲۳ء میں) شاعری و نفسیات

(۱۹۲۴ء میں) تاریخ امثال (۱۹۲۵ء میں) پھول بن (۱۹۲۶ء میں) ہندی بھاشا کا جدید ادب - اصلاح زبان اردو (۱۹۲۷ء میں) اسلام کی شاعری (۱۹۲۸ء میں) سودا کی ہجویہ نظمیں - ہندی رزمیات پر ایک محدخانہ نظر - سرمایہ مشترک - (۱۹۲۹ء میں) طنز شاعری (۱۹۳۰ء میں) بھوا بھوتی - اردو شاعری (۱۹۳۱ء میں) شاعری میں عشقیہ مضامین کی اہمیت - اقبال ایک پیغمبر کی حیثیت سے -

افسانوں کا انتخاب مشکل ہے لیکن قارئین کو شاید یہ نہ بھولے ہونگے ۱۹۲۲ء میں افسانہائے عشق - وزیر عدالت - ذکریا کی عروسی - ۱۹۲۳ء میں گمنام خطوط - بنارسی ساڑھی ۱۹۲۴ء میں حسین جعلساز - گناہ کی یاد - مجھے کوئی منائے - ۱۹۲۵ء میں جادو - سہیل - ۱۹۲۶ء میں شہزادی کا کفن - ایڈیٹر کی شہرت - بڑوالا چودھری - نیرنگ فطرت - بھنور کی دلہن - ایثار - ۱۹۲۷ء میں لکسر کا مندر - تکمیل جنوں - میرے بچے میرے آقا - قربانی - موت کا راگ ۱۹۲۸ء میں تکمیل محبت - ہمارا پہلا مقدمہ - لیلی - زندگی - ۱۹۲۹ء میں خزاں کی ایک رات - پھول - ایک بالاتر ہستی کے مصائب - نیند کا غلبہ - عبرت - ۱۹۳۰ء میں ایک خط اور ایک پارہ - ناکام فاتح - رقاصہ - زرکار اچکن - چہیتا بھائی - ۱۹۳۱ء میں - بہرا شہزادہ - طفلانہ مگر فطری - الشذری - سفر کا مقصد -

ڈراموں میں رفع دفع - کچھ جھوٹ کچھ سچ - چپ کی داد - آنکھ کا جادو - پہلی پیشی وغیرہ قابل ذکر ہیں -

جیسا کہ بیان کیا جا چکا ہے ہمایوں ایک گلدستۂ ادب ہے - اس میں مختلف نوع کے مختصر مضامین پائے جاتے ہیں لیکن ہمایوں نرا "چوں چوں کا مربہ" نہیں بلکہ اس میں متعدد بار مبسوط محققانہ مضامین پیش کئے گئے ہیں - علاوہ بعض خاص نمبروں کے جن میں دسمبر ۱۹۲۲ء کا پرچہ ترکی انقلاب کے مفصل حالات پر مشتمل تھا اور مارچ ۱۹۲۳ء کا پرچہ اس موضوع کے لئے وقف تھا کہ اردو ہندوستان کی ملکی زبان کیونکر بن سکتی ہے (اسی موخرالذکر نمبر میں مولانا وحیدالدین سلیم کا وہ معرکۃ الآرا انعامی مضمون ہندوستان کی عام زبان درج تھا جو ساری اردو دنیا سے خراج تحسین وصول کر چکا ہے) ان کے علاوہ دیگر موضوعات پر بسیط مستند مضامین ہمایوں میں شائع ہو چکے ہیں - مثلاً سیاسیات میں مبادئ سیاسیات (۱۰۶ صفحات) فلسفے میں اخلاقیات اجتماعیہ (۱۷ صفحات) تاریخ میں دنیا کی تاریخ پر ایک نظر (۲۹ صفحات) اسلام کا اثر مغربی تہذیب پر (۷۴ صفحات) اور تاریخ ہند کے چند زریں عہد (۲۸ صفحات) سوانح عمری میں دوشیزۂ فرانس (۱۲۷ صفحات) مذہب میں دنیا کی مذہبی و معاشرتی تاریخ (۶۰ صفحات) اور اسوۂ حسنہ (۱۴ صفحات) تنقید میں علاوہ اردو نمبر (۱۷ صفحات) کے مضامین کے شبلی بحیثیت مصنف (۵۴ صفحات) غزل گوئی پر ریزہ خیالی کا الزام (۱۴ صفحات) فن قصہ نویسی (۱۴ صفحات) سندر سنگھ اور من سکھی کا قصہ (۲۴ صفحات) اور جدید تحریکات کے متعلق سائنس و مذہب کا ملاپ (۱۶ صفحات) دنیا کا نیا تمدن (۲۶ صفحات) تعلیم و تربیت کے نئے طریقے (۳۶ صفحات) وغیرہ وغیرہ + علاوہ بریں "لطیف ادب" "جدید خیال" اور ادب کے بعض اور شعبوں کے متعلق

متفرق مضامین گاہے گاہے شائع ہوتے رہے جن میں سے بہترین مضامین کے ذکر کی بھی یہاں گنجائش نہیں۔

نظم کے ضمن میں ظاہر ہے کہ غزلیات کے لئے ایک مستقل مضمون درکار ہے کہ اُن کے منتخبات کا ذکر ہو سکے۔ بہترین غزلیہ کلام میں وحشت۔ آزاد انصاری۔ احسن۔ اصغر۔ اثر صہبائی۔ اکبر اور حامد اپنی کثرتِ تعداد کے باعث نمایاں ہیں۔

متفرق نظموں میں (۱۹۲۲ء میں) "ہمایوں"۔ خاموشی۔ سفرِ عدم کی اطلاع۔ آصف الدولہ کا مقبرہ۔ وطن کا راگ (۱۹۲۳ء میں) مشرق کا پیغامِ اخوت مغرب کے نام۔ زلیست (۱۹۲۴ء میں) سائل۔ مسافر کا گیت (۱۹۲۵ء میں) خضر کا کام کردں۔ کرشن جی کی بانسری۔ زورقِ ماہتاب (۱۹۲۶ء میں) محبت کی اولین سرگزشت۔ انسان۔ نامعلوم سرزمین کو۔ کنارِ چمن۔ پھول اور ستارہ (۱۹۲۷ء میں) وفا۔ محبت کا دوسرا دور۔ سمندر کی موج۔ ترانۂ روح (۱۹۲۸ء میں) تمنائے محبت۔ جھیل۔ بچپن کی سہانی صبح۔ جنگل کی شہزادی۔ چاند سے جھڑپ (۱۹۲۹ء میں) کیفِ موسیقی۔ حسن نیم شبی۔ پیپل کے پتے۔ برسات (۱۹۳۰ء میں) پھولوں کے دن۔ مکالمۂ نفس۔ ہم۔ پریم ناچ۔ بچھڑی ہوئی جوانی۔ آواز۔ پھول۔ کیوڑا۔ معبد کا دروازہ۔ مشیت۔ (۱۹۳۱ء میں) گھٹا۔ نظارۂ قدرت۔ ستارے۔ بروگ۔ ہنسی۔ نعرۂ مردانہ۔ افسردہ دلی یہ مقبول ہو چکی ہیں +

ہر چند محض مقدار و تعداد خوبی کا ثبوت نہیں تاہم قارئین ہمایوں کی دلچسپی کے لئے یہاں بیان کیا جاتا ہے کہ ہمایوں نے گذشتہ دس سال میں جو لٹریچر پیش کیا اُس کا مجموعی حجم ۸۵۱، ۸ صفحات ہے +

آئندہ کے لئے ہمارا ارادہ ہے کہ ہمایوں بدستور اپنی روش پر قائم رہے لیکن اس قیام و استحکام میں سکون کے ساتھ تحریک بھی پائی جائے۔ سکون و حرکت کا توازن ہمارا نصب العین ہو۔ نہ ہم محض قدامت سے وابستہ ہوں نہ محض جدت کے لئے بےقرار۔ ہر ایک کو خوش کرنا ہمارے پیشِ نظر نہ ہو لیکن ہم ہر مذہب اور ہر ملت ہر زمانے اور ہر حالت سے سبق آموزی و خوشہ چینی کرنے کو ہمہ تن تیار ہوں کہ صحیح انسانی تمدن فقط مختلف بلکہ متضاد عناصر کی ترکیب و تنظیم ہی سے پیدا ہو سکتا ہے اور کچھ پائداری بھی نصیب ہو سکتی ہے تو اک ایسے ہی تمدن کو!

اِس حقیقت کے احساس نے کہ آج ہمایوں نے اپنی عمر کے دس سال پورے کئے ہیں ہمایوں کے پُرانے ایڈیٹر کے دل میں پھر ادبی ولولہ انگیزی کی اک نئی لہر پیدا کر دی ہے اور اس نئی سرگرمی میں اس وقت خوش قسمتی سے اک ایسے "نیم پرانے" جائنٹ ایڈیٹر کی قابلیت شریکِ حال ہے جس کی نئی مساعی سے ہمایوں کی بہت سی امیدیں وابستہ ہیں +

ہاں یہ ساری خوشیاں اور تسلیاں، یہ گذرے ہوئے پر تسکین، یہ آنے والے کے لئے تحریک، یہ ولولے یہ سرگرمیاں، یہ جوش و خروش، یہ سارے کے سارے دعوے، یہ تمام کے تمام ارادے اُسی حالت میں کچھ مفید و کارآمد نتیجے پر پہنچیں گے جب ادارۂ ہمایوں کی کوششوں کے ساتھ ناظرینِ ہمایوں ہمدردانہ عملی اعانت بھی شامل ہو!

بشیر احمد

جہاں نما

جنگ عظیم کے بعد گذشتہ تیرہ سالوں میں کوئی سال ایسی عالمگیر مشکلات اور ایسی خوفناک ممکنات سے معمور نہیں رہا جیسا کہ ۱۹۳۱ء
۱۹۱۴ء کے جنگ عظیم کو "جنگ عالمگیر" پکارا گیا ہے لیکن حقیقت یہ ہے کہ وہ جنگ اس قدر عالمگیر نہ تھی جیسی موجودہ معاشی سرد
بازاری جس نے ۱۹۳۱ء میں دنیا بھر میں ایک خطرناک صورت اختیار کر لی۔ یہ بات کہ متمدن دنیا کے ایک خطے کے حالات و واقعات
کا باقی حصص پر کم و بیش اور جلد یا بدیر لازماً اثر پڑتا ہے اس قدر سیاسیات میں ظاہر نہیں ہوئی جتنی معاشیات میں۔ قومیں جو سیاسی نقطۂ
نظر سے ابھی ایک دوسرے سے بہت کچھ الگ تھلگ نظر آتی ہیں معاشی حیثیت سے ایک دوسرے سے غایت درجہ وابستہ ہیں اور
عموماً ان میں سے کسی ایک کی اچھی یا بُری حالت کا جلد یا بدیر دوسروں پر کچھ نہ کچھ ضرور اثر ہوتا ہے۔ مثلاً یورپ تنگ حال
ہو تو خوشحال امریکہ دیر تک خوش نہیں رہ سکتا یا اگر ہندوستان بیرونی مال کا مقاطعہ کرے تو ہو نہیں سکتا کہ دوسرے ملکوں کے کان پر
جوں بھی نہ رینگے۔ ۱۹۳۱ء میں ایک تو بعض ممالک کی انتہائی معاشی عسرت کے باعث اور دوسرے بعض عالمگیر معاشی اسباب کے
زیر اثر دنیا کے ہر قوم اور ہر ملک کو اپنی اپنی روزمرہ کی زندگی میں پہلی دفعہ بیک وقت ایک معاشی زلزلے سے واسطہ پڑا اور سبھی نے اس دھماکے
کو کچھ اتنا ہی محسوس کیا اور کر رہے ہیں جتنا جنگ عظیم کو۔

۱۹۳۱ء کے بعض واقعات خاص اہمیت رکھتے ہیں۔ جنوری میں وزیر اعظم نے گول میز کانفرنس کے سامنے اپنی وہ مشہور تقریر
کی جس میں ہندوستان کو صوبجاتی و مرکزی ذمہ دار حکومت دینے کا وعدہ کیا۔ اور کانگرس کے قائدین رہا کر دیئے گئے۔ مارچ میں "گاندھی ارون
مفاہمت" ہوئی۔ اپریل میں سپین ایک خاموش انقلاب کے بعد ایک جمہوریہ بن گیا۔ مئی میں مصطفےٰ کمال چوتھی بار جمہوریہ ترکی کا صدر منتخب ہوا۔ جون
میں ہُوور امریکی صدر نے تمام سرکاری بین الاقوامی قرضوں کے ایک سال تک ملتوی رہنے کی تجویز پیش کی۔ جولائی میں جرمن بنکوں نے اپنے
دروازے بند کر لئے۔ اگست میں انگلستان میں مالی حالت بگڑ کر مزدور حکومت کا خاتمہ ہوا اور "قومی" حکومت کی بنا پڑی۔ ستمبر میں دوسری
گول میز کانفرنس شروع ہوئی۔ جاپانیوں نے چینی شہر مکڈن پر قبضہ کر لیا۔ برطانیہ طلائی معیار سے دست بردار ہوا۔ اکتوبر میں کشمیر کے
مسلمانوں نے مہاراجہ کے سامنے اپنے مطالبات پیش کئے اور انگلستان میں قدامت پسندوں نے دارالعوام میں حیرت انگیز
اکثریت حاصل کر لی۔ نومبر میں باوجود اسمبلی کی شدید مخالفت کے وائسرائے نے جدید میزانیہ کا قانون نافذ کر دیا۔ دسمبر میں ادھر وزیر اعظم
نے گول میز کانفرنس میں ہندوستان کو خود اختیاری حکومت دینے کا گول مول وعدہ کیا ادھر وائسرائے نے بنگال آرڈیننس کا اور
بعض کانگرسیوں نے لگان نہ دینے کا اعلان کر دیا۔

ہندوستان اور انگلستان کی باہمی کشمکش، ہندوستان میں فرقہ وارانہ مناقشات، سپین میں انقلاب، جرمنی کی مالی عسرت،

انگلستان کا معاشی انحطاط اور قدامت پسندانہ زور، جاپان کا حملہ چین پر اور اس پر مجلس اقوام کا اختجاج، ساری دنیا میں مالی تباہی کے آثار، یہ ہے ۱۹۳۱ء کا کارنامہ۔ سب سے پہلے یورپ کو دیکھو۔ یہاں پہلی شئے جس کی طرف توجہ خود بخود منعطف ہو جاتی ہے یہ ہے کہ "تمدن" یورپ ایک طرف ہے منقلب روس دوسری طرف۔ یعنی سرمایہ داروں اور کارخانہ داروں کا کسانوں اور مزدوروں سے مقابلہ ہے۔ ایک کی کامرانی دوسرے کی تباہی سمجھی گئی ہے۔ ایک ہی برّاعظم میں دو تمدن کام کر رہے ہیں ایک دوسرے کا جانی دشمن۔ یورپ کے گھر میں پھوٹ پڑ گئی ہے اور گھر کے دو حصّے ہو گئے ہیں۔ اطالیہ اور فرانس کی رقابت بدستور چلی جاتی ہے، فرانس یورپ کی سب سے متمول دولت ہے اور اُس کی فوج سب سے زیادہ طاقتور ہے لیکن ادھر اطالیہ میں ایک مسولینی اپنے آپ کو لاکھوں پر بھاری سمجھے ہوئے ہیں وہ اطالیہ کی پُرانی رومی قوت کے احیا کا دیوتا ہے اور بحرِ روم کو اطالوی جھیل بنا لینا چاہتا ہے۔ یہی سبب ہے کہ ان دونوں ملکوں کے درمیان بحری مقابلے کا بازار گرم ہے۔ جرمنی جو باوجود جنگِ عظیم کی شکست کے گذشتہ سات سال سے حیرت انگیز سرعت کے ساتھ اپنی بگڑی ہوئی حالت کو سنوار رہا تھا اب نئی مصیبتوں میں گرفتار ہے۔ عالمگیر معاشی کساد بازاری نے گذشتہ سال اسے بھی سخت نقصان پہنچایا۔ انگلستان جو مدت سے دنیا کا سب سے بڑا دولت مند سمجھا جاتا رہا اس کی مالی حالت اس قدر نازک اور پیچیدہ ہو رہی ہے کہ دنیا کے ساہوکاروں کو اس ہوشیار بنئے پر اعتماد نہیں رہا اور وہ بڑے تندہی کے ساتھ اپنی حالت کی درستگی میں مصروف ہے۔

لیکن نرے یورپ کو دُنیا کا سب سے اہم مرکز سمجھ لینا غلطی ہے۔ جس طرح اب انگلستان کا یورپ میں وہ رعب نہیں رہا اسی طرح یورپ کا بھی دُنیا میں اب وہ پہلا سا اقتدار باقی نہیں پس رفتارِ زمانہ کا صحیح اندازہ کرنے کے لئے ہمیں نہ صرف یورپ کی سیاسیات بلکہ دوسرے برّاعظموں کے معاملات پر بھی ایک جھلکتی ہوئی نگاہ ڈالنی چاہیئے اور ساتھ ہی اُن اہم ترین تحریکات کو ایک غائر نظر سے دیکھنا چاہیئے جن کے باعث کچھ عرصے سے دنیا اور سے اور ہو رہی ہے۔

جیسا کہ بیان ہو چکا ہے اس وقت جو چیز دنیا کو اپنی طرف متوجہ کر رہی ہے دنیا پر اپنا اثر ڈال رہی ہے وہ موجودہ غیر معمولی کساد بازاری ہے چیزوں کی قیمتیں کم ہو گئی ہیں لورپول میں گیہوں کی قیمت پچھلے تین سو سال میں اتنی کم نہیں ہوئی جتنی آج ہے۔ بے روزگاری کی ہر سو شکایت ہے یورپ بھر میں (جس میں روس شامل نہیں) تقریباً ½ ۱ کروڑ بیکار آدمی ہیں اور اکیلے ممالک متحدہ میں ایک کروڑ ستر لاکھ آدمی ایسے ہیں جن کے کرنے کو کام موجود نہیں۔ ان میں سے اکثر کو گھر بیٹھے بھتہ ملتا ہے۔ باوجود ان آفتوں کے متمدن حکومت کے جنگی اخراجات میں روز افزوں اضافہ ہو رہا ہے اور سب سے صلح پسند ملک ممالکِ متحدہ جس نے جنگ سے قبل تقریباً چھ کروڑ پونڈ سالانہ اس مد پر صرف کئے ۱۹۳۰ء میں اس کا خرچ چودہ کروڑ کی خطیر رقم تک جا پہنچا۔ اس جنگی گرم بازاری کے اسباب تو فقط باہمی بے اعتمادی اور تمدنی دیوانگی ہیں لیکن اس **معاشی سرد بازاری کے اسباب کیا ہیں**۔ اسکے چار بڑے سبب بیان کئے جاتے ہیں اول طلب کی کمی جس کی وجہ بے روزگاری، چین میں خانہ جنگی ہندوستان اور جنوبی امریکی ریاستوں میں سیاسی بے امنی، روس کی نشر و اشاعت قوموں میں غلط قسم کی معاشی علیحدگی کی تحریکیں اور تجارت پیشہ مین کا اجرا امیروں کی تنگ دستی، شرحِ مبادلہ کی تبدیلیاں وغیرہ ہیں۔ دوم رسد

کی زیادتی جس کی وجہ کلوں کی ترقی رقبہ زیر کاشت کی توسیع اور امتناعی محاصل ہیں۔ سوم زر کا تلون جس کی وجہ امریکہ اور فرانس میں دنیا کے ۶۰ فیصدی ذخیرۂ زر کا جمع ہونا اور چاندی کی ارزانی ہے۔ چہارم تاوانِ جنگ کی زیادتی جس سے بعض قوموں کی معیشت تباہ ہو کر دوسری قوموں پر بھی اثر ڈال رہی ہے۔ اس کا علاج یوں تجویز کیا گیا ہے کہ رسد کو طلب کے مطابق کیا جائے۔ چین، ہندوستان اور جنوبی امریکہ میں امن کے قیام کی کوشش کی جائے، ایک بین الاقوامی کانفرنس مدعو کی جائے جو سونے اور چاندی کی باہمی شرح مبادلہ کو مقرر کر دے اور سب سے بڑھ کر یہ کہ متمدن دنیا اپنے معیارِ زندگی یعنی معیارِ عیش و عشرت کو برضا ئے خود کم کر دے۔

سیاسی دنیا میں سب سے بڑی سب سے طاقتور اور سب سے مالدار دولت اس وقت ممالکِ متحدہ امریکہ ہے۔ امریکہ بظاہر یورپی سیاسیات سے علیحدہ رہا ہے لیکن اب روز بروز یہ بات اس پر اور باقی ماندہ دنیا پر صاف ظاہر ہو رہی ہے کہ امریکہ ہر بڑے بین الاقوامی معاملے میں مختلف ملکوں کے داخلی معاملات میں بھی دخل دے رہا ہے۔ فی الحقیقت دخل دینے پر مجبور ہے۔ دُنیا کے سونے کا بیشتر حصہ اس وقت ممالکِ متحدہ اور فرانس میں جمع ہو رہا ہے۔ امریکہ کی بحری قوت سب سے زبردست ہے اس کے ذرائع پیدائش سب سے بہتر ہیں اُس کے کارکن سب سے زیادہ ہوشیار اور چُست و چالاک ہیں، روس ساری سرمایہ دار دنیا کو چیلنج دے رہا ہے کہ تمہارے طریقے تمام غلط اور ظالمانہ ہیں اور میرے طریقے صحیح اور منصفانہ ہیں۔ وہ بیس تیس برس میں ممالکِ متحدہ کا سب سے بڑا مدِ مقابل بننے کا اُمیدوار ہے اور اپنی تمام پیداوار سے اور اپنی سولہ کروڑ آبادی میں تنظیم و صلاحیت پیدا کر کے وہ ایک روز ایک نئی اشتراکی دنیا کے مرکز بن جانے کے خواب دیکھ رہا ہے اور اپنے اس خواب کو حقیقت میں تبدیل کر دینے میں روز و شب ہمہ تن منہمک ہے۔ ہندوستان ایک آزاد یا نیم آزاد دنیا میں غلامی کی بیڑیاں کاٹ دینے کے لئے آزادی کی سب سے بڑی امن پسند لڑائی لڑ رہا ہے اس نے عمل کی دنیا میں اپنے روحانی تخیل سے کام لے کر نئے حربی آلات ایجاد کئے ہیں جن کا وار بجائے جسم کے دل پر پڑتا ہے۔ اس کا کام جس قدر دشوار ہے اسی قدر دلچسپی سے دنیا اس کی جد و جہد کو دیکھ رہی ہے۔ جمہوریت کی تحریک روز بروز زور پکڑ رہی ہے۔ جنگ سے پہلے یورپ میں تین جمہوری حکومتیں تھیں آج پندرہ ہیں۔ ان جمہوری ملکوں کی مجموعی آبادی تقریباً چھتیس کروڑ ہے "شاہی" ملکوں کی صرف سولہ کروڑ۔

ان معاشی و سیاسی تحریکات سے بہت زیادہ اہمیت رکھنے والی وہ عالمگیر معاشری اور دیگر عام تحریکات ہیں جو ایک نئی زندگی کی طرف موجودہ تمدن کی رہنمائی کرتی معلوم ہوتی ہیں۔ فرد قدیم روایات سے کنارہ کش ہو کر اپنی عقل اور آزادی پر اصرار کر رہا ہے۔ وہ محض دوسروں کی عقلمندی سے فائدہ اُٹھانا نہیں چاہتا۔ وہ انفرادی آزادی اور خود اختیاری چاہتا ہے۔ اپنی راہ آپ اختیار کرنے کی آزادی خواہ اس اختیار اور اس آزادی میں وہ راہِ راست سے راہِ کج پر ہی کیوں نہ چل دے۔ نوجوانوں کے دلوں میں عام بغاوت کا ایک جذبہ کام کر رہا ہے بزرگوں کے خلاف بغاوت، مسلّم اخلاق کے خلاف بغاوت، مذہب کے خلاف بغاوت۔ اس سے خود اعتمادی پیدا ہو رہی ہے لیکن ساتھ ہی کج روشی بھی جس کا نتیجہ وہ قلبی ہیجان اور دماغی بے چینی ہے جو ان باغیوں کو دوبارہ ایک جدید روحانی نشان کا طلب گار بنا رہی ہے۔ ادنیٰ طبقوں میں اپنی قدیم مظلوم حالت سے بیزاری اور بے اطمینانی پیدا کرنے والی انقلابی تحریک روز بروز بڑھ رہی ہے۔ روس کی زندہ مثال نے ان مردہ دلوں میں ایک نئی روح پھونک دی ہے۔ اور وہ اپنے

پیدائشی حقوق پر بیش از بیش اصرار کر رہے ہیں۔ جنگِ عظیم کے دوران میں اور اس کے بعد ایک اور نئی طاقت دنیا میں رُونما ہوئی ہے جس کا گو ابھی آغاز ہی ہے مگر قرائن سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ آگے چل کر اس کا فروغ دنیا کو ایک قطعاً نئی دنیا بنا دے گا۔ یہ ہے **صنفِ نازک کی طاقت** اکثر ملکوں میں لاکھوں گھرانوں میں نسوانی حقوق بلکہ مساوی حقوق کا ٹیڑھا مسئلہ درپیش ہے۔ خانگی زندگیوں میں ایک ہل چل مچ گئی ہے جس سے اس قدیم ترین انسانی نظام کے تنزل ہو جانے کا اندیشہ پیدا ہو گیا ہے۔ مغربی دنیا بالخصوص امریکہ میں عورت مرد کی برابر کی شریک بن رہی ہے (امریکی شریف آدمی اکثر اپنی بیوی کی جوتی کے تسمے باندھتا دیکھا جاتا ہے) اور مشرقی دنیا میں بھی اب غلامی کے دور کا عنقریب خاتمہ ہونے والا ہے۔ گو واقعہ یہ ہے کہ اور محکوم جماعتوں کی طرح عورتوں کو بھی بعض ممالک میں ابھی متعدد دشواریوں کا سامنا ہے اور کچھ مدت تک رہے گا۔ **محکوم و مظلوم نسلیں** جا بجا بیدار ہو رہی ہیں یہاں تک کہ انگلستان کے افریقی مقبوضات کی بابت بھی گذشتہ سال کے ایک سرکاری کمیشن کی رپورٹ ہے کہ سیاہ فام قوم غالباً ساٹھ ستر سال میں آزادی کا مطالبہ کرنے لگ جائے گی۔ اس وقت یہ حالت ہے کہ مثلاً جنوبی افریقہ میں چالیس چالیس ہی برس میں یہ لوگ اپنے زمانۂ تاریکی کو پیچھے چھوڑ آئے ہیں گو ان کے سفید حاکم ابھی ان پر طرح طرح کے ستم توڑ رہے ہیں۔ کوئی کالا آدمی سفید آدمی کا موٹر کار نہیں چلا سکتا۔ ریلوے سٹیشنوں پر صرف سفید قلی بوجھ اٹھا کر اجرت لے سکتے ہیں۔ رات کے ۹ بجے کے بعد کالوں کو گھر سے باہر نکلنے کی اجازت نہیں علیٰ ہذا القیاس لیکن سفید بکرے کی ماں کب تک خیر منائے گی کالوں کو ہوش آیا اور تختہ الٹا۔ آثار ابھی سے خراب ہیں۔

۱۹۳۱ء میں مختلف ملکوں میں کیا کیا ہوا، اس وقت ان کی کیا حالت ہے اس کی تفصیلی داستان کی یہاں گنجائش نہیں۔ چند ملاحظات کافی ہونگے۔ **ممالکِ متحدہ** ملک جہاں ایک کروڑ نوّے لاکھ ٹیلیفون اور تقریباً اڑھائی کروڑ موٹر کار (ساری دنیا میں صرف سوا تین کروڑ) ہیں جس کی آبادی دنیا کے تقریباً نصف ٹین اور ریشم کی خریدار ہے جہاں نئے سے نئے خیالات چند ماہ یا شاید چند دنوں ہی میں پرانے ہو جاتے ہیں جو دنیا بھر کا ساہوکار ہے وہاں بھی معاشی سرد بازاری اور بے روزگاری نے اس سال کے میزانیہ میں تقریباً سوا چار ارب روپے کے خسارے کا احتمال پیدا کر دیا ہے جب دنیا کے سب سے مالدار ملک کا یہ حال ہے تو اوروں کا خدا ہی والی ہے۔ دنیا کی عام معاشی عسرت کو دیکھتے ہوئے امریکہ میں اس خیال نے ترقی کی ہے کہ جنگی قرضوں اور تاوانوں کو یک قلم منسوخ کر دیا جائے۔ **روس** میں سولہ کروڑ آدمی اپنے پنج سالہ لائحۂ عمل کو عمل میں لانے میں روز و شب مصروف رہے۔ بہت سی زمینداراضی مشترک ہو کر زیر کاشت آگئیں۔ ان میں نئی وضع کے میکانکی ہل چلے پیداوار بقدر ایک چوتھائی کے بڑھی مختلف ملکوں کی طرف روسی غلے کی برآمد ہوئی۔ کروڑوں آدمی اپنے جوش میں اس نئے اشتراکی کام کی تکمیل میں مصروف ہیں دیکھئے کب تک یہ بار سہہ سکیں۔ ہاں مخالفین بھی معترف ہیں کہ گو تشدد سے کام لیا جاتا ہے لیکن مقررہ لائحۂ عمل ایک حیرت انگیز حد تک کامیاب ہوتا نظر آتا ہے جنگِ عظیم سے پہلے ستر لاکھ بچے مدرسوں میں تعلیم پاتے تھے ۱۹۲۱ء میں ایک کروڑ دس لاکھ تھے ہر بچے کا خرچ حکومت برداشت کرتی ہے یہاں تک کہ وہ کمانے کے لائق ہو جائے۔ اشتراکی روسی بچوں کی جماعت میں اپنے آئندہ کے حامی و اتحادی پیدا کر رہے ہیں۔ وہ اپنے شہریوں کے مفاد کو اشتراکی دولت کے مفاد سے ملا کر ہر فرد بشر کو اس دولت کا ایک آلہ کار بنانا چاہتے ہیں۔ ان کی صحت، تعلیم اور فراغت کی محافظ حکومت ہی ہے۔ ماسکو کے قریب کے پبلک باغ میں ہر روز تقریباً ایک لاکھ سیر کنندگان کا مجمع ہوتا ہے۔ **انگلستان** پر بُرے دن آئے دنیا میں انگریزوں

کا اعتبار کم ہوا۔ اُن کے سکّے کی قیمت گھٹی۔ ہندوستان میں ان کا اقتدار رو بہ تنزل ہوا۔ اب انگریزی قوم پھر متحد ہوکر اپنی سلطنت اور طاقت کو سنبھالنے کے درپے ہے لیکن ایک ترقی کرتی ہوئی دنیا میں وہ پہلے سا تفوق پھر حاصل کر لینا جب انگلستان ہی بہترین صنعت گاہ تھا ناممکن ہی ہے۔ جرمنی جو طوفانِ جنگ کے بعد خوب اُبھرنے لگا تھا اب پھر اس کی کشتی معاشی بھنور میں گھر رہی ہے لیکن یہ ہنچلا ملک سخت دشواریوں میں بھی ہمت نہیں ہارتا۔ اور اس کے سابق دشمن بھی سمجھنے لگے ہیں کہ اگر جرمنی ڈوبا تو ہم بھی ساتھ ہی ڈوب جائیں گے۔ جرمن ہمت کی ایک زندہ مثال تحریکِ صحرا نوردی ہے۔ جرمن مرد اور عورتیں کندھوں پر چھوٹے چھوٹے بقچے لئے گھر سے نکل پڑتے ہیں۔ دور دور دراز مقامات میں میدانوں میں پہاڑوں پر چشموں کے کنارے معمولی جھونپڑیوں میں مسافرانہ زندگی بسر کرتے ہوئے مہینوں کے بعد پھر گھر کو لوٹتے ہیں اور یوں ان سفروں میں تجربہ اور علم حاصل کر کے اپنے نفس میں عزم و شجاعت کے اوصاف پیدا کر لیتے ہیں۔ اطالیہ میں مسولینی کی فاسیت سرمایہ داری کی مخالف نہیں لیکن وہ نوجوانوں کی مکمل تنظیم صحیح تعلیم اور ان کے ربط و ضبط پر ہر لحظہ اپنی نظر رکھتی ہے۔ پوپ اور مسولینی کے درمیان نوجوانوں کی تعلیم کے بارے میں سخت اختلاف واقع ہو رہا ہے۔ ایک کو اپنے اختیار پر اصرار ہے دوسرے کو اپنے اقتدار پر۔ چین ہر چند کمزور ہے ضرورت سے زیادہ بھاری بھرکم ہے خانہ جنگی کا شکار ہے اور جاپان اُس کی اس حالت سے فائدہ اٹھا رہا ہے لیکن ترقی کا خون اس کی رگ و پے میں برابر دوڑ رہا ہے۔ یہ درست ہے کہ سنہ ۱۹۱۹ء سے لے کر آج تک شاید ایک ہفتہ بھی ایسا نہیں گذرا جب ملک کے کسی نہ کسی حصّے میں لڑائی نہ ٹھنی ہوئی ہو۔ اربابِ حکومت میں پھوٹ پڑی رہتی ہے، حکومت کنگال ہے، صرف اک شمالی چین میں پانچ لاکھ فوج برابر رعایا کا خون چوس رہی ہے لیکن اس پر بھی جائے حیرت ہے کہ چین کے نوجوان ترقی کی راہ پر گام زن ہیں۔ سکونت، حفظانِ صحت، شادی ان سب شعبوں میں بالخصوص ساحلی اور دریائی مقامات میں نئے خیالات نے اہم تبدیلیاں پیدا کر دی ہیں۔ اندرون ملک کے ایک خطّے میں جس کا رقبہ فرانس کے مساوی ہے پانچ کروڑ لوگ ایک نوع کی اشتراکی حکومت قائم کئے ہوئے ہیں۔ ترکی میں بدستور وہی پہلا سا عزمِ کمال موجود ہے اگرچہ معاشی مشکلات نے بالفعل ملکی ترقی کو روک رکھا ہے۔ ایران میں رضا شاہ آہستہ آہستہ لیکن بتدریج نقل و حرکت، تحفظِ ملک، تعلیم، اصلاحِ معاشرت، صنعت و حرفت سب میں ملک کو سیدھی راہ پر لئے جا رہا ہے۔ افغانستان بھی کچھ رینگتا معلوم ہوتا ہے۔ ہندوستانِ جنت نشان میں جہنم کا سا ہیجان پیدا ہے۔ مدتوں سے کبھی اس ملک کو ایسے کرب و اضطراب کا سامنا نہیں ہوا جیسا آج ہے۔ گذشتہ سال کے دوران میں پہلے کانگرس اور حکومت میں مفاہمت ہوئی جس سے کانگرس اور بالخصوص مہاتما گاندھی کا اقتدار بڑھا اور آزادی کی امیدیں بندھیں پھر جا بجا ہندو مسلم تنازعات برپا ہوئے۔ انگلستان میں قدامت پسندوں نے عنانِ حکومت سنبھالی اور ہندوستان کے ساتھ سختی کا برتاؤ ہونے لگا۔ ایسا کیوں نہ ہوتا جب گھر والے لڑیں جھگڑیں تو باہر والے کیسے نہ آ دھمکیں۔ ظاہر ہے کہ قومی آزادی حاصل نہ ہو گی جب تک ہندوستان کی بیسیوں قومیں کسی نہ کسی طرح ایک قوم نہ بن جائیں گی۔ آزادی کی ندی "ہزارہا مصائب کی گھاٹیوں میں سے ہو کر بہتی ہے"!

بشیر احمد

اجتماعی زندگی کا نیا دور

ارسطو کا قول ہے کہ "انسان ایک معاشرتی حیوان ہے" مل جل کر رہنے کی عادت جس حد تک انسان میں پائی جاتی ہے اُس حد تک کسی اور حیوان میں نہیں پائی جاتی۔ اُس کا تمدن اُس کا مذہب اُس کا اخلاق سب اُس کی معاشرت کا پھل ہیں۔ اُس کی معاشرت ہی ہے جس کی ضیا پاشی اور آبیاری نے دنیا کے لق و دق میدانوں اور گنجان جنگلوں کو جنت الفردوس کا نمونہ بنا دیا۔ لیکن بحیثیت ایک حیوان کے اُس کی فطرت میں وہ بہیمیت بھی ہے جس کی جہاں سوزی اور تباہ کاری نے اس جنت کو پھونک کر ایک جہنم میں تبدیل کر دیا۔

شہرہ آفاق جرمن فلسفی کانٹ نے خوب کہا ہے کہ انسان اپنے ہم جنسوں سے محبت بھی کرتا ہے اور نفرت بھی۔ انسانی فطرت کے اس میلان و اجتناب کو اُس نے انسان کی "بے میل ملنساری" سے تعبیر کیا ہے۔ جس طرح وہ دنیا دورنگی ہے جس میں انسان رہتا ہے بعینہ اُسی طرح خود انسان کی فطرت بھی دورنگی ہے۔

انسانی نفس کے اس تضاد و تلون سے وہ کشمکش پیدا ہوتی ہے جو زندگی کے رنج و راحت کا سب سے بڑا سبب ہے لیکن یہی کشاکش ہے جو ترقی حیات کی ضامن بھی ہے۔ انسان دوسروں کی بہترین خدمت اُس وقت کرتا ہے جب وہ اپنے صحیح ذاتی مفاد کو مدنظر رکھے اور وہ اپنے صحیح ذاتی مفاد کو اُسی وقت پا سکتا ہے جب وہ دوسروں کی سچی خدمت کرے۔ اُس کی ترقی اور قسمت کا دوسروں کی ترقی اور قسمت سے چولی دامن کا ساتھ ہے۔ لیکن پھر بھی اگر وہ بہترین انسان بننا چاہے تو لازم ہے کہ وہ دیانت داری کے ساتھ اپنی ہی شخصی خصوصیت پر زور دے اور اس کے اظہار کے تمام جائز ذریعے تلاش کرے ورنہ اُس کی حقیقی قوتیں بروئے کار نہ آئیں گی اور اُس کی روح کا جوہر اس مادی دنیا میں اپنی اصلی آب و تاب نہ دکھا سکے گا۔

اس زریں اصول کے صحیح یا غلط استعمال سے وہ اچھے بُرے نتائج پیدا ہوئے ہیں جن سے تاریخ کے صفحات کہیں تاباں ہیں اور کہیں محض سیاہ۔ بربریت کی حالت میں انسان کو ایک نوع کی آزادی حاصل تھی لیکن جوں جوں معاشرت کی تنظیم ہوتی گئی سود و زیان کا خیال بڑھتا گیا اور نیکی بدی کے حدود معین ہوتے گئے اُس کے لئے رکاوٹیں پیدا ہوتی گئیں اور بندشیں بڑھتی گئیں۔ رکاوٹیں اور بندشیں کچھ اُسے بچانے اور سنوارنے اور بڑھانے والی اور کچھ اُسے بگاڑنے اور پچھاڑنے اور تباہ کرنے والی۔ خاندانوں کے سرگروہ، قبیلوں کے سردار، قوموں کے بادشاہ، بغاوتوں کے سرغنے، مذہبوں کے پیشوا، عالم، واعظ، مفکر، رنگ رنگ کے رہنما بعض نوع انسان کو اپنی بے غرضی سے سیدھی راہ پر لائے اور بعض اپنی خود غرضی

سے غلط راہ پر لے گئے۔ نوعِ انسان طبقوں، نسلوں، قوموں، مذہبوں، رنگوں، جنسوں اور خدا جانے کتنی قسموں میں منقسم ہو گئی بلکہ کہنا چاہیے کہ بحیثیت ایک ہستی کے، بحیثیت ایک جسم کے وہ ہزاروں ٹکڑوں میں کٹ کر رہ گئی اور ہر فرد فروعات میں پھنس کر حقیقت سے بظاہر دور جا پڑا۔ محض بظاہر کم از کم یوں ہماری عقل کو معلوم ہوتا ہے کہ یہ استیصال اور یہ انقطاع محض ظاہری تھا۔ ان خطروں نے نوعِ انسان کے جسم میں ایک نئی جان ڈال دی اور اس گرفتاری نے ہر فرد کو اپنی آزادی حاصل کرنے پر ہمہ تن آمادہ کر دیا!

آج مطلعِ عالم کا اور رنگ ہے۔ ایک خشک پیاسی دنیا پر جد و جہد اور نزاع اور انقلاب کے دھواں دھار بادل چھائے ہوئے ہیں۔ کہیں چمک دمک ہے کہیں کڑک، کہیں ہوا کا زور، کہیں بجلیاں گرتی ہیں کہیں طوفان اُمڈے چلے آتے ہیں، کہیں ابھی سناٹا ہے لیکن دُور افق پر کڑکنے والی بجلیاں برابر چمک رہی ہیں، جہاں خاموشی تھی وہاں شورش ہے۔ جہاں مایوسی تھی وہاں ہیجان ہے دنیا کا دل دہل رہا ہے۔ سوئی ہوئی قومیں جاگ رہی ہیں، بھولے بھٹکے لوگ اِدھر اُدھر تکنے لگے ہیں کہ ہم کہاں ہیں اور سب سے زیادہ یہ کہ افراد کو اپنی اپنی قوت اور عظمت اور جدت آفرینی کا احساس ہو رہا ہے! آج تک دنیا میں انسانی جمعیتوں کا شور برپا رہا ہے لیکن آنے والی دنیا میں انسانی فرد کا زور بیش از پیش نمایاں ہو گا بلکہ آج کل بھی ہماری آنکھوں کے سامنے کہیں یہ قوت رونما ہو رہی ہے کہیں ہونے والی ہے اور کہیں بہت جلد ہو جائیگی! ایک نئے تمدن کا مہرِ عالمتاب جلوہ گر ہو گا کچھ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ہلاکت و تغیر کے تاریک بادلوں کے پیچھے جو آج دنیا پر محیط ہیں نکلنے والے آفتاب کی کرنوں کی سنہری رنگت جھلک رہی ہے۔ خدا کرے یہ فریبِ نظر نہ ہو!

گذشتہ ڈیڑھ سو سال میں دنیا نے کیا کچھ نہیں دیکھا؟ اٹھارھویں صدی کا انقلابِ فرانس، انیسویں صدی کی قومی شورشیں، بیسویں صدی کے آغاز کی عالمگیر جنگ اور اُس کے بعد کی نسلی اور جمہوری تحریکیں اور اس سے زیادہ اہم اشتراکی اور بالشوی اور نسوانی بے چینیاں لیکن شاید ان سبھی سے زیادہ حیرت انگیز اکثر افراد کے سینے میں ایک کاوش، اپنی انفرادی آزادی کے لئے ایک کشمکش اور خود شناسی کے لئے ایک زبردست انقلابی جذبہ! جیسا کہ ظاہر ہے فرد بغیر جماعت کی اعانت کے اپنا مدعا یعنی اپنی خودی کی عظمت کو نہیں پا سکتا۔ سوال یہ ہے کہ جماعت کہاں تک اُس کی زندگی میں دخل انداز ہو کہاں تک نہ ہو اور فرد کہاں تک معاشری دائرے میں کام کرے اور کہاں تک آزاد رہے؟

اشتراکی یا اشتمالی مفکرین اس کا یہ علاج بتاتے ہیں کہ موجودہ سیاسی اور معاشی نظام کو یک قلم موقوف کر کے ایک ایسا قومی بلکہ بین الاقوامی ادارہ قائم کیا جائے جس میں فرد کی آزادی بدرجۂ اتم نشو و نما پا سکے۔ اشتراکی اور اشتمالی اور بالشوی اور نراجی دستور العمل گو تہذیبِ حاضرہ پر غایت درجہ اثر انداز ہو رہے ہیں اور ان انقلاب پسندوں کا خاموش اثر ملک ملک میں جا بجا نئے قوانین اور بالخصوص نئے خیالات میں صاف صاف نظر آ رہا ہے لیکن پھر بھی دنیا کا بیشتر حصہ فی الفور "اشتراکی" جامہ پہننے پر آمادہ نظر نہیں آتا۔ البتہ اکثر تعلیم یافتہ لوگ قدیم طرزِ خیال کو چھوڑ کر کوئی نہ کوئی جدید طریقۂ حیات اختیار کرنے کے

نمایاں ضرور ہیں۔

کچھ عرصہ ہوا مسٹر ایل پی جیکس نے جو آکسفورڈ میں مانچسٹر کالج کے پرنسپل ہیں ایک بصیرت افروز کتاب "معاشرت کا فن" شائع کی ہے جس میں انہوں نے بجائے ایک نیا لائحہ عمل پیش کرنے کے انسانی تمدن کی ترقی کا **ایک نیا طریقہ کار** پیش کیا ہے۔ "تعمیری شہریت" کے اس خاکے میں غور کرنے میں بجائے "مکان اندیشی" کے "زمان اندیشی" کے طرزِ فکر کو ترجیح دی گئی ہے یعنی یہ بتایا گیا ہے کہ زندگی ایک تماشا نہیں جو پھیلی ہوئی فضا میں ہماری آنکھوں کے سامنے ہو رہا ہے، بلکہ ایک تجربہ ہے جو زمانے کے اندر جاری ہوا جاری ہے اور جاری رہے گا! زندگی ایک بنی بنائی ہوئی شے نہیں بلکہ ایک ہمیشہ بنتی بدلتی ہوئی حالت ہے لہذا انسانی نفس کے لئے لازم ہے کہ وہ بجائے مقدار کے معیار کی قدر کرنی سیکھے اور بجائے کتنے کے کیسے کی طرف توجہ کرے، بجائے اس کے کہ وہ زیادہ سوچے کہ مجھے کیا کرنا چاہئے وہ زیادہ اس بات پر غور کرے کہ جو کچھ بھی میں کر رہا ہوں اُسے کس طرح کروں؟ مدعا یہ ہے کہ کام اتنے ضروری نہیں ہوتے جتنا اُن کے کرنے کا طریقہ۔ ہم ذیل میں اُن کے بیش بہا خیالات کا خاکہ پیش کرتے ہیں جس سے ظاہر ہو گا کہ تمدن اور اجتماعی زندگی کو اس دور میں اپنی ترقی اور بہتری کے لئے کن ذرائع کے اختیار کرنے کی ضرورت درپیش ہے اور کون سے طریقے ہیں جن پر عمل کرنے سے افراد اور اقوام اور نوعِ انسان اپنے اور ایک دوسرے کے لئے مفید اور موجبِ مسرت ثابت ہو سکتے ہیں۔

تمدن ایک بنی بنائی شے نہیں بلکہ انسان کی طرح قوت کا ایک زندہ مظہر ہے جو اسی وقت تک زندہ رہتا ہے جب تک کہ بدلتا اور نئے سے نیا بنتا ہے۔ اُس میں خطرے ہیں جیسے زندگی میں بھی خطرے ہیں لیکن حیاتِ حاضرہ کی سب سے بڑی خصوصیت خطرہ ہے۔ تمدن ایک خطرناک مہم ہے، خطرناک اور اسی لئے شاندار اور زندگی بخش۔ ہمارا منتہائے نظر ہونا چاہئے اس طرح جان دینا جس طرح اوٹس نے قطبِ جنوبی میں کپتان سکاٹس کے ہمراہ جان دی جب وہ یہ دیکھ کر کہ اُس کے ہمراہیوں کے لئے خوراک بہت کم رہ گئی ہے اور وہ خود اس قدر کم طاقت ہو رہا ہے کہ اُس کی موت یقینی ہے خیمے سے برف و باراں کے طوفان میں اکیلا چل نکلا اور جاں بحق تسلیم ہوا۔ یا اسلامی تاریخ سے ایک مثال لو تو اس طرح جیسے یرموک کے جنگ میں اُن تین مسلمانوں میں سے ہر ایک نے جان دی جو کارزار میں ایک دوسرے کے پاس زخمی پڑے تھے موت کی جاں کنی میں پیاس کی شدت سے بدن کا رواں رواں العطش الغیاث پکار رہا تھا لیکن ایک نے دوسرے اور دوسرے نے تیسرے اور تیسرے نے پھر پہلے کی طرف پانی کا پیالہ لوٹا دیا یہ کہہ کر کہ اُسے اس کی مجھ سے زیادہ ضرورت ہے اور یوں تینوں نے جاں نثاری کی ایک حیرت انگیز مثال دنیا میں قائم کی۔ ہمارا نصب العین ہونا چاہئے ایسے سورماؤں کی طرح مرنا!

میکانی طبیعیات اور "مکان اندیشی" کے دلدادوں نے اپنے نظریوں سے نوعِ انسان کو زندگی کا ایک غلط سبق پڑھادیا ہے۔ وہ اپنے "نقطۂ نظر" اور "منظرِ عام" کا یوں ذکر کرتے ہیں جیسے زندگی اور دنیا کوئی ساکن وجامد چیزیں ہیں۔ زندگی میں ہر شے کی قدر وقیمت اُس کی پائیداری کے ساتھ وابستہ ہے۔ یہ درست ہے کہ بڑی سے بڑی نیکی کی یاد بعض دفعہ گھرے سے گھرے غم میں محفوظ ہو جاتی ہے لیکن اس حالت میں بھی وہ نیکی ضائع نہیں ہو جاتی بلکہ اپنی پائیدار یاد میں برابر قائم رہتی ہے۔

"**زمان اندیشی**" یا "زمان فکری" خیال وفکر کا وہ طریقہ ہے جس میں مفکّر چیزوں کو زمانے کی عینک لگا کر دیکھتا ہے۔ جو چیز زمانے کے اندر دیر تک قائم رہتی ہے وہ اسے سودمند اور عمدہ اور اعلیٰ سمجھتا ہے لیکن جو چیز جلد فنا ہو جاتی ہے وہ اُسے بے سود اور ناقص جانتا ہے۔ اس لئے وہ ایسی چیزیں تلاش کرتا ہے جو پائدار ہوں، ایسے کام کرتا ہے جو دیرپا ہوں۔ اس کے برخلاف تھوڑی دیر رہنے والی چیزیں اور جلد خراب ہو جانے والے کام "مکان اندیشی" یا "مکان فکری" کا نتیجہ ہیں۔ "مکان اندیشی" و "زمان اندیشی" میں کم وکیف کا تقابل ہے۔ مکان اندیشی کم پسندی ہے۔ زمان اندیشی کیف پسندی۔ سادہ زبان میں یوں کہو کہ پہلی صفت "دور اندیشی" ہے دوسری "کوتاہ اندیشی"۔ مکان اندیش ڈھیر پر مرتا ہے زمان اندیش گُن کو تکتا ہے۔ "زمان اندیشی" "معیار" "پایہ" "جوہر" "گُن" اِن کو اپنا منتہا بناتی ہے اُدھر "مکان اندیشی" "مقدار" "جسامت" "ڈھیر" "بہتات" اِن کو اپنا مطمح بناتی ہے۔ "مکان اندیش" معاشری نظامات کی عمارات کھڑی کر دیتا ہے۔ "زمان اندیش" پوچھتا ہے یہ کب تک کھڑی رہیں گی؟ ہمیشہ جوں کی توں رہنے والی چیز کو نوعِ انسان برداشت نہیں کر سکتی۔ ہمارا مصنّف کہتا ہے کہ اگر جنت بھی اسی نوع کی ہوئی تو اُسے کوئی کب تک پسند کئے جائے گا۔ نہیں صحیح جنت وہی ہے جس میں خدا کے نور کا جلوہ ہوگا جو ہر لمحہ نیا ہے!

سچّے آرٹ میں، سچّے فلسفے میں، بچّوں کی فطرت میں جو ابھی غلط تعلیم وتربیت سے کج خیال نہیں ہو چکی ہوتی "زمان اندیشی" کی صفت بدرجۂ اتم پائی جاتی ہے۔ مسٹر جیکس کا بیان ہے کہ "ایک دفعہ میں ایک تصویر خانے میں فرا انجیلیکو کی ایک تصویر جس میں بہشت میں فرشتوں کا منظر نقش کیا گیا ہے دیکھ رہا تھا۔ ایک نو دس برس کا لڑکا میرے ہمراہ تھا جو پہلی بار کسی تصویر خانے کی سیر کو آیا تھا۔ میں تصویر دیکھنے میں محو تھا کہ یکلخت لڑکے نے مجھے میری محویّت سے یہ کہہ کر گویا بیدار کر دیا کہ یہ فرشتے کب تک یوں عبادت کرتے رہیں گے؟ میں نے جواب دیا "بہت دیر تک۔ دیکھو تو وہ کیسے خوش ہیں"۔ اُس نے کہا "لیکن کیا اِن کے گھٹنے تھک نہ جائیں گے؟" میں نے بغیر سوچے سمجھے جواب دیا "خیر اگر تھک بھی جائیں گے تو وہ اُٹھ کر اُس پیچھے والی خوبصورت چراگاہ میں ٹہلنے لگ جائیں گے"۔ لڑکے نے کہا "اور پھر یہ فرشتے کیا کریں گے، چراگاہ میں ٹہلنے کے بعد" میں نے کیسا بُرا جواب دیا کہ "پھر میرے خیال میں وہ یہیں آجائیں گے جہاں اب ہیں اور پھر نماز پڑھنے لگ جائیں گے"۔ اس پر بچہ بے اختیار رونے لگ گیا اور سسکیاں بھر بھر کر کہنے لگا "میں تو فرشتہ نہیں بننا چاہتا"۔ یہ بچہ بھی اور بچّوں کی طرح

"زمان اندیش" واقع ہوا تھا۔ یہی سوال جو اس نے کئے بہتر سے بہتر معاشری منصوبوں کے متعلق کئے جا سکتے ہیں کہ "یہ فرشتے" پھر کیا کریں گے؟ اور کب تک اس حالت میں یونہی قائم رہیں گے؟ بہتر سے بہتر معاشری نظامات ایک دن سے زیادہ زندہ نہیں رہ سکتے جب تک اُن کے واضعین اُن کو ہر روز بہتر و اعلیٰ تر بنانے میں مصروف نہ رہیں کیونکہ یہی ایک طریقہ ہے جس سے کوئی وجود یا کوئی منصوبہ یا کوئی شئے خدا کی کائنات میں زندہ رہ سکتی ہے۔ آج کل کے منصوبہ باز آج کل کے کاریگروں کی طرح ہیں وہ ایسی شئے بناتے ہیں جو چند ایک دن میں مٹی میں مٹی ہو جاتی ہے۔ اُن کے کام میں کارستانی ہوتی ہے۔ کارگذاری یا کاری گری نہیں ہوتی۔ جیسے وہ خود "گن" سے خالی ہوتے ہیں ایسے ہی اُن کا کام بھی بے بنیاد ہوتا ہے۔ آج کل کی سرکاری عمارتوں سے ذرا بلند نظر، فیاض طبع مغلوں کی عمارات کا مقابلہ کر دیکھو تو معلوم ہو جائے گا کہ اُس زمانے کے دیانت دار لوگ کس قدر جوہر آشنا اور ثبات پسند تھے اور آج کل کے عقلمند کس قدر کوتاہ اندیش اور ظاہر پسند ہیں۔ "مکان اندیشی" کا لازم نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ انسان کائنات میں ہر شئے کو مجبور و مقہور سمجھنے لگتا ہے۔ "زمان اندیش" محض چیزوں کو دیکھنے میں مصروف نہیں رہتا وہ اُنہیں سنتا ہے، سونگھتا ہے، چکھتا ہے، تھامتا ہے اور سو سو طرح سے اُن کو آزماتا ہے جب جا کر سمجھتا ہے کہ وہ ایسی ہیں اور ویسی نہیں۔ اُس کا نفس ہمیشہ متحرک رہتا ہے، گویا حرکت کی پشت پر سوار ہو کر ہمیشہ محوِ جولانی ہے۔ منظر اُس کے لئے بدلتے رہتے ہیں۔ نئی سے نئی حالتیں اُس کے لئے رونما ہوتی رہتی ہیں۔ وہ دنیا کی چیزوں اور باتوں کو خوب طرح سمجھ کر تنگ نظری سے اُن کا پابند نہیں رہتا بلکہ اُن کی ازلی آزادی میں روز بروز شریک ہوتا رہتا ہے۔ "مکان اندیش" اپنی بندشوں میں گویا نثر کا دلدادہ ہے۔ "زمان اندیش" نظم کا، بلکہ نظم کی جکڑ بندیاں بھی اُس کے مطلب کی نہیں سو وہ موسیقی کا ہم نوا ہو جاتا ہے اور کائنات اُسے "مجبور" دکھائی نہیں دیتی بلکہ "آزاد" سنائی دیتی ہے۔ اس سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ چیزوں کے "نظارے" اور فلسفے کے "نظریے" سب چیزیں جن سے محض آنکھ کو تعلق ہے ناکافی ہیں۔ ہم زمانے کے اندر زندگی بسر کرتے ہیں۔ بے شک انسانی اجسام مکانیت سے تعلق رکھتے ہیں لیکن ہم "رہتے" مکان و فضا میں ہیں اور "جیتے" ہیں زمانے کے دوران میں۔ ایک کل نظر میں جانچی جا سکتی ہے لیکن انسان اور اُس کی معاشرت یوں دیکھی اور سمجھی نہیں جا سکتی کیونکہ انسان اور انسانی معاشرت اور انسانی تمدن کا وجود اُن کے قائم ہو جانے میں نہیں بلکہ اُن کے متحرک اور زندہ رہنے میں ہے۔

"زمان اندیشی" کی ایک زندہ مثال "مجلس اقوام" ہے۔ یہ مجلس محض بنائے جانے سے ہمیشہ کے لئے بن نہیں گئی اگر اس کے اراکین اپنی باہمی وفاداری کا ثبوت دیں گے اور دیتے رہیں گے اگر وہ محض کارندے نہیں بلکہ مسلسل کارندے بنے رہیں گے اور ہر روز وہ کام کرتے رہیں گے جس کا انہوں نے پہلے روز بیڑا اُٹھایا تھا تو اُن کی بنائی ہوئی مجلس زندہ رہے گی اور قائم ورنہ ہزاروں رات کی رات کے تماشوں کی طرح وہ بھی ایک تماشا ہوگی اور بس۔

اس سے صاف ظاہر ہے کہ معاشری معاملات میں کوئی ادارہ قائم ہو کر زندہ نہیں رہ سکتا جب تک اُس کے کامو

تو ایسے انسان نہ نبھائیں جو صحیح معنی میں اُس ادارہ کے "امین" سمجھے جائیں۔ دیانت اور امانت داری کے بغیر کوئی نظام یا ادارہ، کوئی مذہبی یا دنیوی درس گاہ، کوئی مجلسِ شوریٰ، کوئی بنک یا کمپنی دیر تک قائم نہیں رہ سکتی +

انسانی معاشرہ ایک موضوعہ شے نہیں بلکہ ایک زندہ وجود ہے + ہمارے نظامات اور دستور العمل اُتنے ہی زیادہ زندہ ہوتے ہیں جتنے زیادہ جرأت آمیز ہوں۔ جب ہم معاشرہ میں غم پسندی اور ناامیدی کے خیالات رائج کرتے ہیں تو ہم اس کی قوت اور زندگی پر گویا موت کی بجلیاں گراتے ہیں + "تعمیری شہریت" موجودہ مسائل کو لے کر اس سے عمدگی کے نصب العین کو پیشِ نظر رکھتے ہوئے اس یقین کے ساتھ معاشرت کو بہتر بنانے میں مصروف رہتی ہے کہ دنیا میں اصلی اور پائدار قدور کی کوئی حد نہیں + اور یہ کام آزاد معتمد شہریوں سے سرانجام پاتا ہے نہ کہ مجبور و مقہور مزدوروں سے کسی قسم کا قانون یا دستور ایک کارندے کو کام کرنے پر مجبور کر سکتا ہے لیکن بہترین کام کرنے پر مجبور نہیں کر سکتا کہ بہترین کام صرف آزادی کے اندر ہی انجام دیا جا سکتا ہے + بلکہ معاشری اصلاح بھی معاشرت کو اسی طرح بہتر بنا سکتی ہے کہ بجائے اس کے کہ اُس کے بوسیدہ حصّوں کی مرمت کیا کرے اُسے عام تقویت دے کہ وہ خود بخود زیادہ زندہ اور قوی ہو سکے + بلاشبہ "لکڑی کی ٹانگ" والا ایک بے ٹانگ آدمی سے بہتر ہے لیکن آخر تو اس کی ٹانگ فقط لکڑی کی ہے۔ تہذیبِ حاضرہ کے بہت سے مصلحین اپنی لنگڑی تہذیب کے لئے مختلف لکڑی کی ٹانگیں لئے پھرتے ہیں کہ یوں اس گرتی ہوئی ہستی کو سنبھالیں، ہمارا مصنّف کہتا ہے کہ تمدّن کی بیماریوں اور کمزوریوں کی طرف زیادہ توجہ نہ کرو بلکہ اُس کی عام قوت کو بڑھانے میں اپنی قوتیں صرف کردو پھر دیکھو کہ کیونکر اُس کی علالت ونقاہت صحت میں تبدیل ہو جاتی ہے۔ مسٹر جیکس نے اکثر موجودہ مصنفین پر نکتہ چینی کی ہے کہ اُن کا طرزِ خیال اور اُن کا فلسفہ علمِ تشخیصِ امراض سے مشابہ ہے۔ وہ تمدّن کو علیل الطبع سمجھ بیٹھے ہیں اُن کے الفاظ و اصطلاحات اس کے شاہد ہیں مثلاً مشہور فلسفی برٹرنڈ رسل "تشخیص اور "مرض" کا مشتاق ہے۔ مسٹر آر۔ ایچ ٹانی (Tawney) نے "حریص معاشرہ کی علالت" پر ایک رسالہ لکھا ہے اسی طرح امریکہ میں ایک کتاب شائع ہو کر ہاتھوں ہاتھ بکی ہے جس کا عنوان ہے "یورپ کا مرض" + اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ **تشخیصی طرزِ خیال** کس حد تک موجودہ افکار پر چھا چکا ہے۔ موجودہ تہذیب بلاشبہ علیل ہے لیکن علالت اور نقاہت ہی اس کی زندگی نہیں بلکہ ان پر زیادہ غور و فکر خود علالت و نقاہت کا موجب ہو جاتا ہے اور وہ یوں کہ معاشرہ اپنی کمزوریوں کی کہانی سُن سُن کر مضمحل ہو جاتی ہے، مشتہرین اپنی اپنی مجرّب دواؤں کے اشتہار دیتے ہیں، عوام الناس ان عالی مرتبہ معالجوں کے باہمی مقابلوں اور مناقشوں سے سراسیمہ ہو کر کسی واقعی اچھّے معالج تک رسائی پانے کے ناقابل ہو جاتے ہیں، فصیح و بلیغ مصنفین و مقررین معاشری خرابیوں اور خطروں کو بھیانک بنا بنا کر دکھانے اور نامراد لوگوں کو اور نامراد بنانے ہیں + لیکن لطف یہ ہے کہ باوجود ان علالت افزائیوں اور نقاہت نمائیوں اور غم پسندیوں کی چیخ و پکار کے معاشرہ کسی نہ کسی طرح زندہ بھی رہتی ہے اور برابر اپنا کام بھی کئے جاتی ہے۔ تہذیب کی بُری حالت پر جا بجا لکچر دیئے جا رہے ہیں اور خوف و ہراس کے نعرے بلند کئے جا رہے ہیں لیکن تعجب ہے

کہ تہذیب پھر بھی فنا نہیں ہوتی + آخر اس کی وجہ کیا ہے؟ صرف یہ کہ ضرور کہیں نہ کہیں اس منحنی مریض کے اندر قوت کا کوئی ایسا خزانہ موجود ہے جو جلد ختم ہونے میں نہیں آتا۔ آؤ اسے ڈھونڈیں اور اس کے مناسب استعمال سے اُسے زیادہ تنومند و قوی بننے میں مدد دیں +

جیسا کہ اوپر بیان ہو چکا ہے وہ تمدن جو زندہ رہنا چاہے وہ معاشرت جو متحد رہنا چاہے اُسے ہر روز قوت و اتحاد کو از سرِ نو تازہ کرتے رہنا چاہیئے + اس ضمن میں موجودہ معاشری و تمدنی بحث و تمحیص میں بہت سے ایسے غلط الفاظ استعمال میں آرہے ہیں جن سے غلط بیانی اور غلط اندیشی کی بنیادیں قائم ہوتی ہیں + مثلاً "علم المعاشرت" جس سے بہت سے لوگ سمجھنے لگے ہیں کہ کہیں نہ کہیں علما کی الماریوں میں یا حکما کی کھوپڑیوں کے نیچے ایک خاص علم یا حکمت کا کوئی خزانہ مستور ہے جس کے حصول سے نوعِ انسان کی تمام معاشری خرابیوں کا کما حقہٗ سدِ باب ہو سکتا ہے لیکن کیا ایک تمدن جو بجائے معاشری خدمت کے معاشری "علمیت" کو سراہے کبھی فنا ہونے سے بچ سکتا ہے؟ ایک اور لفظ ہے "سلف گورنمنٹ یا سواراج"۔ اس لفظ میں آج کل ایک جادو سا ہے لیکن اس کی علمی بلند آہنگی بے کار ہو جاتی ہے جب تک اس کی اخلاقی روح زندہ نہ رہے۔ مسٹر جیکس نے گویا گاندھی جی کے لفظوں میں کہا ہے کہ کوئی شہری اپنے ملک کے سواراج یا خود اختیاری حکومت میں کام نہیں دے سکتا جب تک وہ اپنے ضبطِ نفس میں بھی خود اختیاری نہ برتے + جہاں ضبطِ نفس کی یہ خوبی ایک شہری کے اندر پیدا نہیں ہوتی وہاں جمہوریت اکثریتوں کا استبداد ہو کر رہ جاتی ہے +

"لیڈر" اور "لیڈری" کے معنی میں بھی ایک تبدیلی واقع ہو گئی ہے۔ پہلے زمانے کے قائد اور رہنما خود جنگ میں یا تحریکوں میں پیش پیش رہتے تھے اُن کی قیادت عملی قیادت تھی خطرے کے وقتوں میں وہ میدان میں یا کہیں اور اپنے پیروؤں سے دو قدم آگے نظر آتے تھے + آج کل کے لیڈر گویا محض گیدڑ ہیں دور رہی دور سے بھبکیاں دینے والے یا زیادہ سے زیادہ "پلیڈر"، مفتر، سبز باغ دکھانے والے، پھسلانے والے یا ڈرانے والے اور بس +

"مسئلہ" "عقدہ" "دقت" "گتھی" یہ سب الفاظ ہماری کمزوری اور جلد بازی کا مظہر ہیں۔ ہم چاہتے ہیں "مسئلہ" "حل" ہو جائے "عقدہ" کی "کشائش" ہو "دقت" "دور" ہو جائے "گتھی" "سلجھ جائے" یہ ہے ہماری کمزور خواہش جو جلد اپنی حرص کو پورا کرنا چاہتی ہے + اس لیئے ہم "خوشی" کے پیچھے دوڑتے ہیں "خوشی" بدقسمتی سے نوعِ انسان کے بیشتر حصے کا مرجع و منتہا ہو گئی ہے اور پھر لطف یہ ہے کہ جتنا اس نظر فریب اور دلفریب سیماب پا پری کے پیچھے بھاگو اُتنی ہی اور ہماری گرفت سے بعید نظر آنے لگتی ہے "مسئلہ" اور "سوال" فلسفہ اور ریاضی کی اصطلاحیں تھیں اور "حل" طبیعیات کی اور یہ وہیں تک محدود رہتیں تو بہتر تھا لیکن جب سے انہوں نے عام انسانی زندگی کے دائرے میں قدم رکھا ہے انسان کی معاشرت میں ایک ہلچل ڈال دی ہے + مختلف "ازموں" کے موجدوں نے نوعِ انسان کو اس ناگفتہ بہ حالت تک پہنچا دیا ہے۔ دلیر انسان کو اس بات کا صاف لفظوں میں اعتراف کرنا چاہیئے کہ میرے پاس "معاشری مسئلہ" کا

"حل" موجود نہیں جو ہیں اپنے ہم جنسوں کی "خوشی" کے لئے پیش کروں ۔ اُسے صرف یہ چاہئے کہ وہ اُن کی خدمت کے لئے اپنی ہنرمندی، اپنی چابک دستی، اپنا استقلال، اپنی سنجیدگی پیش کرے اور نتیجے کی فکر نہ کرے کہ کیا ہوگا اور کیا نہ ہوگا + جب ہم لوگوں کے آگے اُن کے شاندار مستقبل کی ایک "تصویر" پیش کرتے ہیں تو لازماً وہ "تصویر" لفظوں یا رنگوں میں کھینچنی اور "قائم" کردینی پڑتی ہے لیکن زندگی اگر صحیح زندگی ہے تو وہ یوں قائم نہیں رکھی جاسکتی اُس کا کام ہے ہمیشہ آگے کو چلنا اور بڑھنا اور بڑھے جانا اسی لئے خوبصورت سے خوبصورت تصویر بہتر سے بہتر نقشۂ مستقبل کبھی پورا تسلی بخش نہیں ہوسکتا + ہماری زندگی بھی ایک "نظارہ" نہیں بلکہ ایک جاری عمل ہے ایک "ہوتی ہوئی شے" ہے بلکہ سچ یہ ہے کہ زندگی کے لئے مسرت میں پڑے رہنے سے بہتر ہے کہ وہ مسرت سے شفقت بلکہ مصیبت کی سمت چل دے۔ اس دنیا میں "منزل" و "مقام" کی تلاش لاحاصل ہے ۔ یہ ایک دائمی سفرگاہ ہے جہاں "انجام" کی بجائے ہمیشہ آغاز کی جستجو کرنا انسان کا شاندار کام ہے + سو بہتر ہے کہ ہم "مسئلے" کی بجائے "چیلنج" اور "حل" کی بجائے "تجربہ" کے الفاظ استعمال کریں ہم مشکلوں کو حل کرنے کے درپے نہ رہیں بلکہ اُن سے "تجربہ" کرنے اور "تجربہ کار" بننے کی تمنا رکھیں + جب مشکلات اور مسائل ہمیں درپیش ہوں اور اگر زندگی بلند زندگی ہے تو اس میں سوائے مشکلات اور مسائل کے کوئی واقعہ درپیش نہیں ہوسکتا تو ہر ایسی گھڑی میں ہم ہر مسئلہ کو ایک "چیلنج" سمجھیں جو قدرت نے ہماری فطرت کو دیا ہے + ہم اس چیلنج سے خائف نہ ہوں، پیچھے نہ ہٹیں، کہیں دبک کر نہ بیٹھ رہیں، بھاگ نہ جائیں بلکہ خوشی اور دلیری سے "لبیک" کہہ کر اُس کی پیشوائی کو آگے بڑھیں + قدرت منتظر ہے کہ انسان کی فطرت اس تسخیر کے لئے آگے قدم بڑھا کر اُسے اور اپنے آپ کو بہتر و خوب تر بنائے جائے!

ہم انسان محض تجربہ کرنے والے ہیں اور ہمارے تجربوں میں کچھ ہمارے "حقوق" ہیں اور کچھ "فرائض"، حقوق اور فرائض زندگی کی جنگ کی تلواریں اور ڈھالیں ہیں، جنگ جو گذشتہ یا موجودہ وحشیانہ طریق سے نہ لڑی جائے بلکہ جو صحیح روحانی معنی میں خرابیوں کی تسخیر اور بہتری کے حصول کے لئے ہمیشہ جاری رہے + تمدن ہے روح کا منظم معرکہ! کس کے خلاف؟ اُس خرد مند قوت کے خلاف جو اس مخالفت میں موافقت کی راہیں پیدا کرتی ہے اُس بلند نظر دشمن کے خلاف جو ہمارا سچا اور اصلی دوست ہے + اس معرکے میں انسان انسان کی پشت پناہ ہے ۔ یہ ہے سچی محبت نہ وہ جو خالی خالی جذبات یا ہوا و ہوس میں غرق رہتی ہے + ہماری عام شہری زندگی میں ابھی خدمت کی وہ خواہش، باہمی امداد کی وہ خوشی پیدا نہیں ہوئی جو ایک منظم فوج کی روح رواں ہوتی ہے + وہ دن نوع انسان کے لئے خوش قسمتی کا دن ہوگا جب ہر پیشہ گویا اپنے پیشے کا جھنڈا سنبھالے ہوئے ترقی کے میدان میں بڑھتا ہوا نظر آئے گا۔

خرابیوں کو دور کرنے کا بہترین طریقہ خرابیوں سے دل آزردہ ہونا نہیں بلکہ خوبیوں کو اپنے جی میں بسانا اور اُن سے اپنی زندگی کو فروغ دینا ہے "کم اندیش" آدمی کا طریقہ روک ٹوک ہے دور اندیش کا تحریک دینا۔ شاید کہا جائے کہ یہ محض "امید پسندی" ہے "امید پسندی" ہے تو ہوا کرے آخر ناامیدی نے دنیا میں کیا کچھ کر لیا ہے کہ "امید پسندی" ایک

کہ اُس کی جگہ نہ چھین لینا چاہیے۔ کسی کا قول ہے کہ "امید پسند" وہ ہے جسے ہر مشکل میں اک موقع نظر آئے۔ اس کے بخلاف "یاس پسند" وہ ہے جسے ہر موقع میں اک مشکل نظر آئے + انسان کی فطرت مشکلوں کی تسخیر کے لئے وضع کی گئی ہے اور وہ سچا انسان اسی وقت ہوتا ہے جب وہ مشکلوں سے دست و گریباں ہو + اس ہر دم نئے کام میں پرانے نظامات اُس کے کام آتے ہیں + پرانے انسانی نظامات میں ایک مضمر قوت ہوتی ہے جو انہیں جلد فنا نہیں ہونے دیتی۔ یہ ہے گذری ہوئی صدیوں کی قوت جوان کی پشت پناہ ہے، ماضی کی شاندار روایات۔ حال زندہ ہے مگر زندہ ماضی کے ساتھ۔ نرا پھیلاؤ کچھ حقیقت نہیں رکھتا جب تک وہ اپنے ساتھ کچھ گہرائی بھی نہ رکھتا ہو + اور نری سطح شدہ معاشری اصلاح سے معاشرت کی اصلاح نہیں ہو سکتی۔ معاشرہ کوئی بندرگاہ میں پڑی ہوئی کشتی نہیں وہ زندگی کے سمندر کا ایک تیز رفتار دخانی جہاز ہے جو اپنی شکستہ حالت میں بھی کچھ نہ کچھ چلے ہی جاتا ہے اور جس کی مرمت بھی جو ایک مشکل کام ہے ساتھ ہی ساتھ ہونی لازم ہے + انسانی نظامات کی یہ حیرت انگیز قوت ماضی سے ماخوذ ہے اور اگر غور کریں تو ہم پر ظاہر ہو جائیگا کہ وہ انسانی نظامات و ادارات زیادہ پائدار ہوتے ہیں جو امانت داری پر مبنی ہوں، جن کے چلانے اور کام کرنے والے قابلِ اعتماد امین ہوں اور جو نسلاً بعد نسلٍ ایمان داری اور استقلال کے ساتھ اپنے فرائض کو سرانجام دیتے رہیں +

تمدن کی ترقی کے اسباب کیا ہیں؟ اور وہ کون سے ذرائع ہیں جو ہمیں دورِ حاضر میں اپنی انفرادی و معاشری بہبود کے لئے اختیار کرنے چاہئیں، ماضی کے تجربات اور حال کے مشاہدات سے اب ہم اس نہایت اہم نتیجے پر پہنچ سکتے ہیں کہ انسانی معاشرت کی ترقی اور پائداری کے **تین بڑے عناصر** ہیں + **اول** مہذب انسان کی اپنے کام میں ذاتی مہارت۔ اسے ہم اس کی عقلی قوت کہہ سکتے ہیں + **دوم**۔ بہت سے انسانوں میں امانت داری کا وصف جس کے ہوتے ہوئے وہ افادۂ عام کے لئے قابلِ اعتبار امین بن سکتے ہیں۔ اسے ہم انسان کی اخلاقی قوت کہیں گے + **سوم** بعض خاص ترقی پذیر و ترقی طلب علمی و طبیعی طریقے جن سے متخاصم حقوق میں مصالحانہ طور پر مطابقت پیدا کی جا سکتی ہے۔ یہ ہے انسان کی تنظیمی قوت +

مہارت، امانت داری، تنظیم یہ تینوں جن کا ایک دوسرے سے گہرا تعلق ہے موجودہ تمدن کی قوت و توانائی کے سب سے بڑے اسباب ہیں اور اس کی ترقی کے سب سے بہتر ذرائع بھی یہی ہو سکتے ہیں + ظاہر ہے کہ ان کا ایک دوسرے سے نہایت قریبی تعلق ہے۔ ذاتی مہارت معاشرہ کے لئے کسی کام کی نہیں جب تک اپنے کام کا ماہر عوام کے فائدے کے لئے امین بن کر اُسے کام میں نہ لائے۔ نری امانت بےکار ہے اگر امین ہر طرح کی مہارت سے عاری ہے۔ تنہا علمی تنظیم نہ صرف لاحاصل ہے بلکہ جب تک لائق قابلِ اعتماد رضاکار نہ ملیں یہ ایک نہایت خطرناک حربہ ہے جیسا کہ محاربۂ عظیم سے صاف طور پر ظاہر ہوا۔ غرض انسانی معاشرت کی صحیح ترقی کا سنگِ بنیاد یہ ہے کہ معاشری "امینوں" کو زیادہ سے زیادہ

تعداد میں تیار کرکے انسانی خدمت کے کام میں لگایا جائے۔

اور یہ کچھ مشکل کام بھی نہیں۔ آج کل دنیا بھر میں اور بالخصوص مغرب میں مختلف پیشوں میں اور خاص کر صنعت و حرفت کے اکثر حلقوں میں اس قسم کے معتمدوں اور امینوں کی خاصی تعداد پیدا ہوگئی ہے، ایسے اشخاص جن کے سپرد بڑے بڑے ذمہ داری کے کام ہیں اور جو اس کارکردگی کے لئے نہ کسی کی حمایت میں ہیں نہ اُن کی ہر وقت نگہداشت کی جاتی ہے۔ موجودہ صنعتی تمدن کا اس درجے کے شہری پیدا کرنا اس بات کی نشانی ہے کہ تمدن کے رگ و پے میں ابھی زندگی کا خون دوڑ رہا ہے۔ اس خون کو زیادہ صالح بنانا، اس کے دوران کو تیز تر کرنا یہ کام ہے جو تمدن کے مفکروں اور کارکنوں کو درپیش ہے اور تمدن کی خوش قسمتی ہے کہ آج کل جب اسے چاروں طرف سے طرح طرح کی مشکلات کا سامنا ہے۔ ان مفکروں اور کارکنوں میں ایک خاصی تعداد اپنی ترقی کے ان ذرائع کی طرف عملی طور پر رجوع کر رہی ہے۔

قصہ کوتاہ "عملی شہریت" کا کام ہے ایسا شہری پیدا کرنا جو اس کے کام کا "امین" ہو سکے جو اپنے پیشے کے کام کو یوں نبھائے گویا یہ اک امانت ہے جو اس کے سپرد کی گئی ہے۔ ذرا ایک لمحے کے لئے غور کرو اور ایک ایسے شخص کا خیال کرو جسے تم جانتے ہو، جسے تم اپنا زر و مال دے سکتے ہو یہ یقین کئے ہوئے کہ اس کے ہاتھوں میں وہ اسی طرح محفوظ و مامون ہوگا جیسے تمہارے اپنے ہاتھ میں، جو اس سے کوئی ناجائز فائدہ نہ اٹھائے۔ بس ایسا شخص ہے ایک اعلیٰ درجہ کا شہری، ایک صحیح انسان اور ہماری تعلیم اور ہماری معاشرت اور ہمارے پند و وعظ اور ہماری جملہ مساعی کا یہی نصب العین ہونا چاہئے کہ وہ ایک ایسا شہری اور ایک ایسا انسان پیدا کرے۔ ہر شخص میں کسی نہ کسی نوع کی ذاتی مہارت پیدا کرنا، ہر کام کرنے والے میں امانت داری کا خیال بدرجۂ اتم بڑھانا، قوم و ملت کے ہر فرد کے نفس میں امانت داری کے خصائص محکم کرنا، یہ ہے ہمارا کام اور اس کام کے کرنے میں ہم بجائے ہوائی قلعے تیار کرنے کے ان مفید چیزوں اور اداروں اور اُن مردوں اور عورتوں سے کام لیں جو آج ہماری دنیا میں ہمارے ملک میں، ہماری قوم میں، ایک خاصی تعداد میں ہیں۔ ہم یہ نہ دیکھتے رہیں کہ لوگوں میں کیا کیا برائیاں اور کیا کیا کمیاں ہیں۔ ہم یہ دیکھیں کہ ان میں کون کون سی خوبیاں اور کون کون سی صلاحیتیں ہیں۔ اور کہیں کہ ہاں یہ ہے ایک اچھی شے۔ وہ ہے ایک کارآمد عنصر، آؤ ہم اسے لیں اور ایک بہتر اور مفید تر مرکب تیار کردیں۔ "عملی شہریت کا کام مرمت کرنا نہیں، ساخت کرنا ہے، وہ کمزوریوں کو نہیں دیکھتی، وہ عام قوت کو جانچتی اور ابھارتی اور استعمال میں لاتی ہے اور بالفعل اس بات کے ماننے کو تیار ہے کہ انسانی نسل کے لئے زیادہ سے زیادہ یہی ممکن ہے کہ اوسط درجے کی خوشی کو پا سکے۔ اس کا اصول ہے 'جیسا مسالہ موجود ہے اُسے کام میں لاؤ'!"

تمدن حاضر ایک صنعتی تمدن ہے۔ اب وہ زمانہ نہیں رہا کہ لوگ الگ اور چپ چاپ بیٹھ کر کائنات کے مسائل پر غور کرنا اور اسی فلسفے میں غرق رہنا زندگی کا نصب العین سمجھیں۔ زندگی کے معنی ہیں محنت اور صنعتی تمدن بھی گو ایک محنتی تمدن ہے۔ اس تمدن میں درحقیقت سیاست کو اس قدر اہمیت حاصل نہیں جتنی بظاہر معلوم ہوتی ہے۔ اس کے

اندر صنعت و حرفت کو سیاست سے زیادہ دخل ہے۔ آج کل کے تمدن کو گویا ہر روز اپنی روٹی کمانی پڑتی ہے۔ اِس لئے اِس تمدّن کی قسمت اُس روزمرہ کے کام کے ساتھ وابستہ ہے جو اِس کے کارکن یا دستکار کرتے ہیں۔ اگر وہ کام ردی ہے تو گویا اس تمدّن میں گھن لگا ہوا ہے اور اگر وہ کام عمدہ ہوتا جائیگا تو اس تمدن میں گویا عمدگی کی صورتیں پیدا ہوتی جائینگی یہ بات ظاہر ہے کہ باوجودیکہ دنیا سے حاضرہ کے ملک الگ الگ سیاسی مملکتیں ہیں جن کے معاملات بظاہر سیاسی تدبیروں اور ریشہ دوانیوں پر منحصر ہیں لیکن درحقیقت یہ تمام ملک ایک دوسرے کے ساتھ کم و بیش زبردست معاشی و صنعتی رشتوں سے جکڑے ہوئے ہیں۔ قومی حدود بین الاقوامی ضروریات کے آگے بار ہا مٹ کر رہ جاتی ہیں بہت کم لوگ ہیں جو دیر تک معاشی قوانین سے بے نیاز رہ سکتے ہیں معاشی تغیرات کا ملک ملک پر اثر پڑتا ہے۔ شرح مبادلہ اور قیمت زر سے لے کر مختلف ملکوں کی پیداوار کی اچھی بُری فصلوں تک کا اثر دنیا بھر پر پڑتا ہے۔ معیشت سیاست پر چھا رہی ہے اور اپنا زبردست اثر صاف طور پر پیدا کر رہی ہے۔ ادھر ملکوں پر ایک دوسرے کے معاشی حالات کا اثر پڑتا ہے اور ادھر تمدّن میں ہمہ گیری و یکسانی پیدا ہو رہی ہے۔ یعنی سیاسی طور پر دنیا میں کثرت نمایاں ہے لیکن معاشی اور تمدّنی طور پر وحدت سرایت کئے جاتی ہے۔ قوموں کے معاشی حالات کسی ایک قوم کی حکومت کے بس میں نہیں بلکہ روز بروز یہ صورت ہو رہی ہے کہ ہر حکومت ان حالات کے بس میں آرہی ہے۔

اس صنعت کے لئے جو موجودہ تمدّن کی روحِ رواں ہے ایک اخلاقی ضابطہ کی ضرورت ہے۔ اخلاق کا ایک سیاسی ضابطہ ہے، ایک مذہبی، ایک فوجی اور ایک قانونی ضابطہ بھی ہے لیکن آج کل کے تمدن کو سب سے زیادہ **صنعتی اخلاق کی ضرورت** ہے جس سے اُس کی بنیاد استوار ہو۔ اور اس اخلاق کا دریا اس ایک کوزے میں بند ہے کہ کام جو کیا گیا ہے وہ اچھا ہے یا بُرا۔ "حزب العمال" "صرف" "یکساں مواقع" "حفظانِ صحت" وغیرہ کے نعرے مارنے میں مصروف ہے لیکن سب لاحاصل ہیں جب تک پہلے وہ کام درست و مناسب نہ ہو یا نہ ہو سکے جو دستکار کے سپرد ہے۔ مسٹر جکیس کا بیان ہے کہ ایک دفعہ میں قدیم آلات کے ایک مجموعے کو دیکھ رہا تھا کہ مجھے ایک غایت درجہ خوبصورت اصطرلاب دکھایا گیا جس میں نہایت خوبی اور دیدہ ریزی سے کام کیا گیا تھا۔ یہ نفیس چیز تقریباً ہزار سال ہوئے حسین علی ایک مسلمان دستکار نے ہندوستان میں بنائی تھی۔ پیتل پر مینا کاری کا کام تھا اور اصطرلاب کے کنارے پر نہایت خوبصورت عربی خط میں یہ زریں حروف کندہ تھے۔ "یہ اصطرلاب عمل ہے حسین علی دستکار اور ریاضی دان کا جو خدائے تعالیٰ عل شانہٗ کا بندہ ہے"۔ صنعتی اخلاق کا مکمل بیان اس کتبے میں موجود ہے۔ دستکاری مہارت ہے، ریاضی دانی قابلیت اور خدا کی بندگی وہ خوبی و عمدگی ہے جو اس مہارت کا صحیح مطمحِ نظر ہے۔ بقول مسٹر جکیس جب تک عیسائی دنیا ان اصولوں پر عمل نہ کرے گی اُس کا صنعتی تمدن صحیح راہ پر نہ آسکے گا!

صنعتی تمدّن کی ترقی کے تین ذرائع ہیں سب سے **پہلا ذاتی مہارت** ہے۔ اپنے کام میں مہارت حاصل کرنے کے لئے ایک شہری کو "اب تو آرام سے گذرتی ہے" کا ترانہ چھوڑ کر کلّی طور پر اپنے کام کی طرف متوجہ ہونا چاہئے

اور جب وہ اسے حاصل کرے تو اُسے عمل میں لانے کے لئے لازم ہے کہ وہ اپنے کام کے دوران میں اپنے نفس پر پُورا ضبط رکھے۔ وہ اپنے جسم و روح پر قابو پائے، اُس کے جملہ اعضا و حواس اس کے نفس کے اشارے پر محوِ کار ہوں اور اگر ضرورت پڑے تو وہ رسمی طریقوں سے بے اعتنائی برتنے کے لئے بھی ہمہ تن تیار ہو۔ ہر نفیس کام کے منصوبے میں ہمیشہ جرات اور اُس کی انجام دہی میں ہمیشہ ضبطِ نفس درکار ہوتا ہے۔ یونانی رومی اور اسلامی و ہندی عظیم الشان تعمیرات کا سرانجام دینا صرف قوی النفس اور بلند نظر لوگوں کا کام تھا۔ اگر تم صحیح معنی میں انسان بننا چاہو تو کوئی ایسا پیشہ اختیار کرو جس سے عہدہ برا ہونے کے لئے تمہاری ذاتی مہارت اپنی بہترین و قوی ترین صورت میں رونما ہو جائے۔ نکمّے کاموں کے کرنے میں اپنی شخصیت کو پھسپھسا نہ بن جانے دو کہ کائنات میں انسان کا اصلی کام صرف ایک ہی ہے، کام کرنا ہنرمندی اور مردانگی کے ساتھ۔ مہارت یا ہنرمندی، ہے عملی دانش یا یوں کہئے کہ وہ علم کا اظہار ہے کسی چیز کے ساخت کرنے میں، یا وہ عقل ہے قوتِ ارادی کا لباس پہنے ہوئے۔ عقل و توجیہہ، علم و فضل، خردمندی اور دوربینی سب اپنی اپنی جگہ اچھّی چیزیں ہیں لیکن یہ جان لینا چاہئے کہ جب تک عقل عملی نہ ہو جائے، جب تک علم کارکردگی میں تبدیل نہ ہو جائے، جب تک خردمندی اچھّے اور مفید کاموں کی صورت اختیار نہ کرے اُس وقت تک اس عمل کی دنیا میں کوئی اِن کا احترام نہیں کر سکتا۔ اس سے یہ اہم نتیجہ نکلتا ہے کہ کوئی تعلیمی نظام جس سے ایک طالب علم میں کسی نہ کسی مفید کام کی مہارت پیدا نہیں ہوتی ناقص ہے اور علم جو اسے اُس کے ذریعے سے حاصل ہوتا ہے خواہ وہ سائنس ہو یا ادب، فلسفہ ہو یا دینیات ادھورا ہونے کی وجہ سے نہ صرف بیہود ہے بلکہ غالباً خطرناک۔ سائنس کی بابت جو ایک طبقے میں یہ خیال ہے کہ وہ "کائنات سے انسانی خوشیوں کا عرق نچوڑنے کا ایک آلہ" ہے محض لغو ہے۔ اِس طرزِ فکر نے بعض ایسے بدکردار سائنس دان پیدا کئے ہیں جن کے ذریعے سے قدرت نوعِ انسان کی نیم جہالت پر اپنے ستم توڑتی ہے۔ سائنس نے اوّل اوّل آرٹ کو تباہ کیا تھا لیکن وہ وقت دور نہیں جب آرٹ کے ساتھ مل کر وہ انسان کی ذاتی مہارت کی شکل میں نمودار ہو گی اور یہ ہو گا سائنس اور علم و فن کا اور سائنس اور مذہب کا صحیح ملاپ۔

کلوں کو بُرا بھلا کہنے میں یورپ کے بعض مفکرین بھی گاندھی کے ہم نوا ہیں اور اس میں ذرا بھی شبہ نہیں کہ کل کار بالکل بازمزدور انسانیت کے درجے سے گر کر نری کلیں بن جاتے ہیں۔ کل سے وابستہ انسان اپنی ذاتی مہارت کھو بیٹھتا ہے اور اُس کی روح روز بروز کمزور پڑتی جاتی ہے۔ کام محض زرگری کا ایک وسیلہ بن گیا ہے حالانکہ اگر اخلاقی نقطۂ نظر سے دیکھا جائے تو معاشرت کو انسان کی محنت کا اصلی فائدہ اسی وقت پہنچتا ہے جب اُسے کسی نہ کسی طرح اپنی ذاتی مہارت کے دکھانے کا موقع ملے۔ مزدوروں کی انجمنیں کم سے کم معیارِ اجرت پر زور دیتی ہیں مزدوروں کی نفسی و روحانی ترقی بلکہ اُن کی عام خوشی کے لئے بھی بدرجہا بہتر ہو کہ وہ بجائے اس کے کم سے کم معیارِ مہارت پر زور دیں تاکہ جو کام مزدور کرے اُس میں وہ کچھ دلچسپی لے سکے۔ امدادِ باہمی کی انجمنوں میں اگر علاوہ نفع کی شرکت کے مہارت کی شرکت بھی شامل ہو جائے تو یہ بات کاریگروں کے لئے

بہت زیادہ نفع رساں ہو + موجودہ صنعتی نظام میں انسان کل کا غلام ہے - اُس کی روح تباہ ہو جاتی ہے ، وہ خود کام سے اور زندگی سے بیزار ہو جاتا ہے اور اُس کی یہ بیزاری بیسیوں شکایتوں کی شکل میں ظاہر ہونے لگتی ہے + یورپ میں مہارت صنعتی کارخانوں سے نکل کر بازی گاہوں یعنی کھیلوں میں جاگزیں ہو گئی ہے - یورپ کے کھلاڑیوں میں ذاتی مہارت کے بہترین نمونے دیکھنے میں آتے ہیں - یہاں تک کہ لفظ "sportsman" (کھلاڑی) کے معنی ہو گئے ہیں ایسا شخص جو شکست کھا کر بھی بد دل نہ ہو ، جو قابلِ اعتماد ہو ، جو اپنے دشمن سے بھی بُرا سلوک نہ کرے - اس کے برعکس ہمارے ہاں "کھلاڑی" کے معنی جو ہیں وہ ظاہر ہیں + اسی طرح وہاں آرٹ میں بھی مہارت بدرجۂ اتم پائی جاتی ہے "زیادہ سے زیادہ دستکاروں کی زیادہ سے زیادہ مہارت" تمدن کی ترقی کا بہترین ذریعہ ہے اور موجودہ تمدن کے لئے وہ مبارک دن ہو گا جب اُس کی جنگی اور صنعتی قوتیں مل جل جائیں گی اور دستکار سپاہی سے کہے گا "تجھ سی دلیری میں سیکھوں گا اور جیسی مہارت سے تو اپنے ہتھیار چلاتا ہے ویسی مہارت سے میں اپنے اوزاروں سے کام لوں گا" اور سپاہی دستکار کو جواب میں کہے گا "تیرے میدانوں اور کھیتوں کے کام میں اب میری لڑائی لڑی جائے گی - وہاں اب میری قواعد دانی میری وفاداری اور اپنا کام کرتے کرتے جان دینے کی خواہش اپنے جوہر دکھائے گی - میں اسے کاریگر اپنی وردی اتار کر تیرے کپڑے پہن لوں گا اور تو اور میں اپنے دلوں کی جرات اور ہاتھوں کی مہارت سے اِس طرح نوعِ انسان کی جنگِ زندگی میں تکلیفیں اور مصیبتیں برداشت کریں گے جیسے اب خونی لڑائیوں میں سپاہی مل کر برداشت کرتے ہیں" + پھر جنگی غضب ناکی صنعتی محنت میں جذب ہو جائے گی اور تمدن کے روزمرہ کے کام میں وہ قوت پسینہ ہو کر ٹپکے گی جو اب خون ہو کر میدانِ جنگ میں بہتی ہے اور یہ کام اب سے زیادہ پائدار اور اس لئے نوعِ انسان کے لئے اب سے بہت زیادہ سودمند ہو جائے گا + نپولین کا قول تھا کہ "ہر جنگ میں وقت سب سے اہم عنصر ہے" یہ اُن جنگوں کا ذکر ہے جو اس لئے لڑی جاتی ہیں کہ مملکتوں کا رقبہ وسعت میں بڑھے ، پھر ایسی عظیم الشان جنگ میں وقت یا زمانے کی کتنی قدر و قیمت ہو گی جو ملکوں کی وسعت کے لئے نہیں بلکہ زندگی کے عمق کے لئے لڑی جائے - یہ ہے انسانی روح کی جنگ اُن قدور کے حصول کے لئے جو پائدار ہیں اور غیر فانی ! اسی لئے "زمان اندیشی" کہتی ہے کہ وہ کام کرو جو پائدار ہو اور پائدار کام وہی ہو سکتا ہے جس میں ذاتی مہارت اپنے جوہر دکھائے +

ہر شہری لازماً ایک دستکار ہے - اپنے نقطۂ نظر سے وہ کام کرتا ہے اپنے جسم و روح کے فائدے کے لئے ، معاشری نقطۂ نظر سے وہ کام کرتا ہے دوسروں کے فائدے کے لئے اور یوں ہی دوسرے اُس کے لئے مصروفِ کار ہیں + یہ حالت صرف اُس کی محنت کی نہیں بلکہ اُس کی فرصت کی بھی ہے ، اُس کی فرصت ایک خاص معاشری قیمت رکھتی ہے + فرصت بھی ایک خاص نوع کا کام ہے ، کوئی کھیل یا تفریح جس سے نہایت خوبی اور خوش اسلوبی سے لطف اُٹھایا جائے ، معاشرہ باہم مل کر کام کرنے کے لئے ایک منظم جمعیت ہے جسے اعلیٰ درجے کے کام سے تسکین و مسرت حاصل ہوتی ہے - اس کام کا درجہ اور پایہ ایک تو ہر کام کرنے والے کی مہارت اور جرات پر اور دوسرے ساختہ اشیا اور کام کی عمدگی پر منحصر ہے + اور یہ بات قابلِ غور ہے کہ

کارکن کی فرصت اُس کی تمام محنت پر غایت درجہ اثرانداز ہے۔ اِن دونوں کا ایک دوسرے پر گہرا اثر پڑتا ہے + معاشرہ کا مل جل کر کام کرنا فرصت میں، چھٹیوں کے دنوں میں بند نہیں ہو جاتا بلکہ برابر جاری رہتا ہے + جس طرح محنت میں فرد کی علیحدگی معاشرہ کے لئے مضرہے اسی طرح فرصت میں بھی اس کی علیحدگی کا یہی نتیجہ ہوتا ہے + ایک اخبار میں اشتہار دیا گیا جس کا عنوان تھا "مل جل کر چھٹیاں بسر کرنے کی انجمن" اگر لوگ اپنے کام اور آرام کے اوقات کو مل جل کر بسر کریں تو نہ صرف آرام کے دنوں میں بلکہ کام کے دنوں میں بھی اُن میں معاشرت کی صحیح حس پیدا ہو جائے اور وہ تمام اجتماعی کاموں کو بہتر طور پر سرانجام دے سکیں + کوئی جمہوریت نری توسیع سے ترقی نہیں پاسکتی۔ نری رائے دہندگی سے سیاست کمال کو نہیں پہنچتی بلکہ صرف صحیح محنت کے کاموں سے وہ قدر مشترک وجود میں آسکتی ہے جس کے متعلق رائے اور رائے دہندگی کے کوئی معنی ہو سکتے ہیں + اس قدر مشترک میں محنت اور فرصت دونوں کا عنصر شامل ہے۔ **فرصت کا صحیح استعمال** وہ ہے جس میں محنت کی طرح ذاتی مہارت کا پرتو ہو اور جس کا نتیجہ خوبی نکلے + محنت وہ ہے جو ہر انسان کے سئے اُس کے مخصوص میلانات کا خیال رکھ کر اُس کے لئے منتخب کی جائے، جس سے اُس کی زندگی کی قدر بڑھے جس میں حصہ لے کر وہ سمجھے کہ میری ذات دنیا کے لئے کارآمد ہے۔ اسی طرح فرصت وہ نہیں جس میں انسان صرف "مکھیاں" مارتا پھرے اُسے معلوم نہ ہو میں کیا کروں اور کس طرح یہ وقت گذاروں بلکہ فرصت وہ ہے جس میں انسان کا دل کسی ایسی تفریح میں مصروف ہو جس سے لطف اٹھانے کے لئے بالعموم اس کی عقل صرف ہو + کئی اشتراکی چاہتے ہیں کہ نظام سیاسی کی مدد سے روزانہ محنت کو کم کر کے صرف چار گھنٹے تک محدود کر دیا جائے۔ لیکن سوال یہ ہے کہ باقی بیس گھنٹے وہ کیا کرے گا + جوں جوں تمدن ترقی کرتا جاتا ہے یہ لازم ہوتا جاتا ہے کہ متمدن آدمی کو اپنی فرصت کے اوقات کا صحیح استعمال سکھایا جائے جس سے اس کو کام میں آرام کا اور آرام میں کام کا لطف آئے اور اُس کی زندگی ڈانواڈول نہ رہے + بعضوں کا خیال ہے کہ کم از کم فرصت میں تو آزادی حاصل ہو۔ کم از کم آرام اور تفریح کی گھڑیوں میں تو کسی قسم کی بندش نہ ڈالی جائے لیکن حقیقت یہ ہے کہ محنت اور فرصت میں زندگی کا خون نہ دوڑے تو اُن پر ایک مردنی سی چھا جاتی ہے جو اُن کی مسرت کو کھوڈالتی ہے۔ ایک شراب خانے میں شراب بیچنے والی کا دن بھر گلاس بھر بھر کے دینے کی محنت اتنی بُری ہے جتنی اُس آوارہ گرد کی فرصت جو وہاں پڑا ہوا دن بھر گلاس منہ کو لگائے رکھتا ہے۔ فرصت نصیب احمق ویسا ہی قابلِ رحم ہے جتنا محنت نصیب غلام + متمدن دنیا کی بابت عموماً یہی کہا جاتا ہے کہ وہ عیش وعشرت میں غرق ہے گویا وہاں کے لوگ دن رات اپنے عیش وآرام میں مزے اڑاتے ہیں لیکن یہ درست نہیں۔ متمدن آدمی جس قدر اپنی "خوشیوں" میں ناخوش ہے کسی اور شے میں نہیں + آج کل "نظارہ بازی" کا دور ہے۔ امیر لوگ اپنے کاموں اور اپنی خوشیوں سے اکتائے ہوئے ملک ملک میں "نظاروں" کی ہوس میں مارے مارے پھرتے ہیں دور دراز چیزوں کو دیکھنے کے لئے وہ ریل، موٹر، ہوائی جہاز غرض ہر تیز رو سواری میں تیزی کے ساتھ سرگرم سفر رہتے ہیں، "چیزوں" کے درمیان میں سے، اُن کے پاس سے عموماً اُن سے کچھ دور ہی دور گذر جاتے ہیں، بھاگے دوڑے جاتے ہیں۔ یہ جلد بازی کس لئے ہے؟ "نظارہ بازی" کے لئے۔ یہ سرعت کس لئے ہے؟ مسرت کے لئے، پرانے زمانے میں خصوصاً

اسلامی اور ہندی دنیا میں لوگ کسی مقصد کے لئے سفر کرتے تھے، کوئی کام سیکھنے کسی سے درس لینے، کسی خانقاہ کی زیارت کرنے، وہ کسی مقام کو جاتے تھے وہاں پہنچ کر کچھ کرتے اور یوں ہنر انسان بنتے تھے لیکن آج ایک ایسے سیاح کے مقابل میں دس ہزار ایسے سیر پسند تماشا بین ہیں جن کا سفر و سیاحت محض تیز رفتار گاڑیوں کی سواری میں اور ہوٹلوں کے بل ادا کرنے اور "نظارے" دیکھ لینے میں ہے۔ جہاں سے گئے جلد گئے جہاں پہنچے جلد پہنچے، رات رہے، کھانے کھائے، ایندھن اُن کی خاطر جلائے گئے، سڑکیں اُن کی رگڑ سے گھسیں، محنتی مزدوروں نے ان کی ضروریات پوری کیں، چلئے سیر و سفر ختم ہوا۔ یہ ہے وقت گذارنا نہیں وقت کاٹنا، کسی نہ کسی طرح وقت کی مصیبت کو گلے سے اتارنا + اگر اس طرح وہ محض چیزوں کو دیکھنے کے لئے نہیں بلکہ چیزوں پر غور کرنے کو جاتے، محض دور سے ہمالیہ کو دیکھنے کے لئے نہیں بلکہ کسی چھوٹے سے ٹیلے پر خود چڑھنے کو جاتے، محض ایک اعلیٰ درجے کے جہاز میں دنیا کے گرد گھمائے جانے کو نہیں بلکہ قریب ہی کہیں سمندر کے کنارے یا دریا میں خود تیرنے خود ہاتھ پاؤں مارنے کو جاتے تو وہ زندگی کے میدان میں دو قدم اور آگے بڑھ جاتے، قوت اُن میں سرایت کرتی، اُن کی شخصیت کو جب اپنے اظہار کے ذریعے ملتے تو اُس میں نئی صلاحیتیں پیدا ہوتیں اور زندگی میں نئی خوبیوں کے تجربے سے نئی خوشیاں پیدا ہو سکتیں + سیر و سفر کے لئے تم اُن مقامات میں جاؤ جہاں تمہارے لئے دلچسپ مشاغل موجود ہوں جہاں تم بعض زبردست زندہ شخصیتوں سے، جہاں تم نوع انسان سے دوچار ہو سکو + یہ ہے سیر و سفر، یہ ہے سیاحت کی راحت، یہ ہے فرصت کا صحیح استعمال۔ ایسی فرصت درحقیقت زندہ محنت کی ایک شکل ہے اور ایسی ہی فرصت ہوتی ہے جس سے محنت کے اوقات میں مسرت کی رَو محنتی انسان کی روح و رواں میں دوڑ جاتی ہے + ایک عمل پسند انگریز مفکر کہتا ہے کہ جب میں پارلیمنٹ کا رکن بن جاؤں گا تو میں مزدوروں کی جماعت یا محنت والی جماعت میں شریک نہ ہوں گا بلکہ اپنی ایک الگ "فرصت والی جماعت" بناؤں گا۔ اور اس کی مدد سے پارلیمنٹ میں ایک نیا مسودۂ قانون پیش کروں گا جس کا عنوان ہوگا "عوام کی بہتر تعلیم کا انتظام جس سے وہ اپنی فرصت کے اوقات کا بہتر استعمال کر سکیں"۔ یہ ہوگی "برطانوی آزادیوں کی دوسری سندِ اعظم" جس سے امیر و غریب لوگ وقت کو کاٹنے کی زحمت سے نجات پائیں گے اور جس کی دفعات کے مطابق کوئی نوجوان اپنی درسگاہ کے نصاب کو اُس وقت تک مکمل نہ کر سکے گا، اس وقت تک اُسے کامیابی کی سند نہ دی جائے گی جب تک وہ کسی نہ کسی کام میں کچھ نہ کچھ ذاتی مہارت پیدا نہ کرلے۔ یُوں اُسے اِدھر اپنے کام میں اُدھر اپنی فرصت میں وہ مسرت حاصل ہوگی جو صحیح تعلیم و تربیت کے بغیر ناممکن ہے + اس ضمن میں مفکر مذکور خوب کہتا ہے کہ "بہشت میں لوگ نہ کام کریں گے نہ آرام۔ اُن کا کام آرام دونوں بیک وقت ہونگے"۔

یہاں تک ذاتی مہارت کا ذکر تھا۔ تمدن و ترقی کا دوسرا لازمہ **امانت داری** ہے۔

جیسا کہ بیان کیا گیا ہے تمدن کا مرحلہ روز بروز مشکل ہوتا جاتا ہے اور اسی مشکل میں اُس کی ترقی کے شاندار موقع ہیں، لیکن اس مشکل کا کیسے سامنا کرنا ہے۔ ہر ایک کو الگ الگ، اپنی جگہ پر بھی لیکن بالخصوص سب کو مل جل کر انسانی "امدادِ باہمی"

دورِ حاضر کی سب سے بڑی ضرورت ہے۔ اس لئے نرا علمِ معاشرت بے سود ہے۔ اس کے لئے جرأت کی ضرورت ہے۔ اجتماعی
جرات کی جرات جو باہمی اعانت اور باہمی وفاداری کے ذریعے سے اپنی قوت دکھلائے، جو نہ صرف وسیع ہو بلکہ عمیق، مشترک
خطرات کا مل کر سامنا کرنے کی رضا کاری۔ کیونکہ خطرے اچھی اور بلند زندگی میں ہمیشہ موجود ہوتے ہیں اور موجود رہیں گے اور شکست
بھی ہمیشہ ممکن اور بعض دفعہ اغلب ہوگی۔ لیکن تمدن یہی ہے کہ خوف کا جو انسانی روح کی ایک بیماری ہے، کامل استیصال کر دیا جائے +
خطرے اور ہمت کی جائے اتصال انسانی خوبیوں کا مقام پیدائش ہے + نپولین کی بابت کونٹ وسیگور کا بیان ہے کہ ایک
دفعہ غالباً بورو ڈینو کی جنگ میں، جب وہ کارزار کا نقشہ سامنے رکھے اس کے مطالعہ میں مصروف تھا تو ایک "ایڈی کانگ"
گھوڑا دوڑاتے گھبرایا ہوا یہ خبر لے کر آیا کہ غنیم فرانسیسی فوج کے بیچ میں گھس آیا ہے اور فوج پسپا ہو رہی ہے۔ نپولین نے
سر اٹھایا اور مڑ کر سنبھل کر جواب دیا "دور ہو جاؤ تم ناحق مجھے پریشان کرتے ہو" اسی طرح ہمیں اپنے اپنے کام میں اپنے آپ
کو مضطرب نہ ہونے دینا چاہئے محض اس لئے کہ یاس پسند تاریک بین آکر پیشین گوئیاں کر رہا ہے کہ ملک و ملت غرق ہو رہے
ہیں اور تمدن کی حالت سخت نازک ہے + ایک ترقی پاتے ہوئے تمدن کی حالت ہمیشہ نازک ہوتی ہے اور اس حالت
سے ڈر کر ہمیں سہم نہ جانا چاہئے بلکہ صرف یہ سمجھنا چاہئے کہ یہ ایک چیلنج (دعوتِ مقابلہ) ہے حالات کا ہماری دلیر روح کو +
ہم انسانوں کی ساخت خطرناک ہے اور شاندار۔ ہمارے خطرے کا دن ہمیشہ ہماری خوبیوں کی پیدائش کا دن ہوتا ہے + پس
دقتیں اور مشکلیں زمانے کے اتفاقات نہیں ہیں بلکہ قدرت کے قوانین کے مطابق یہ واقعات پیش آتے رہتے ہیں۔ کامل
سکون اور امن و امان ہو تو انسانی نسل کی قوت کے رشتے ڈھیلے پڑ جاتے ہیں اس لئے قانونِ ارتقا کا اقتضا ہے کہ "بہترین"
کو اپنی بہتری کے حصول و استحکام کے لئے ہمیشہ اپنے سے کمتر سے برسرِ جنگ رہنا پڑے + خوبیاں ترقی پاتی ہیں تو خرابیاں
بھی بڑھتی ہیں۔ انسان آگے بڑھتا ہے تو شیطان بھی کچھ زیادہ پیچھے نہیں رہتا۔ لہذا انسانی قوتوں کا مسلسل کام مسلسل طور پر
شیطانی کارستانیوں کا مقابلہ کرنا ہے اور اگر انسان اپنی انسانیت پر اصرار کرے تو شیطان کی شیطنت بھی اس کی مخالفت چھوڑ
کر اس کی موافقت کا دم بھرنے لگتی ہے۔ پس مسرت سے تمدن کے عناصر میں اتحاد نہیں بلکہ افتراق پیدا ہوتا ہے اور مسرت
کی بہ نسبت مشقت انسانی برادری کے اتحاد کا بہتر ذریعہ ہے۔ مصیبت جب آتی ہے تو وہ بچھڑے ہوؤں کو بھی ملا دیتی ہے +

اس سے ظاہر ہے کہ تمدن کی دقتوں اور مصیبتوں اور خطروں کا سدّباب متحدہ جرات اور متحدہ قوت ہی سے ہو سکتا ہے،
یہ جرات اسی وقت بروئے کار آئے گی جب ہر کارکن اپنے آپ کو اپنے کام میں سب کا "امین" سمجھ لے اور خوبی و خوش
اسلوبی و امانت داری سے کام کرے + ایک "امین" کے معنی صرف یہی نہیں کہ اسے اپنے کام میں اپنی قانونی ذمہ داری کا
خیال رہے بلکہ یہ کہ وہ از خود ایمانداری اور شرافتِ نفسی سے کام لے۔ اسے خود اپنے کام کو دیانت داری سے کرنے میں لطف
ملے اور اسی میں اطمینان حاصل ہو کہ وہ کبھی کوئی ناپسندیدہ بات نہ کرے۔ امانت دار آدمی اپنی امانت داری کے لئے کسی نگہدا
کا محتاج نہیں۔ امانت داری کے لئے دماغ میں عقل کی اتنی ضرورت نہیں جتنی سینے میں دل کی حاجت ہے + ہر سچا انسان

اپنے ہر کام اور اپنی ہر بات میں نوعِ انسان کا امانت دار ہے اور بطور کام کرنے والے اور کام لینے والے کے اُس کے کچھ حقوق و فرائض ہیں جن پر اصرار اور جن کا احساس اُس کی اور دوسروں کی ترقی کے لئے لازم و لابد ہے۔

بطور کارکن کے اُن کا فرضِ اولیٰ یہ ہے کہ وہ اپنے کاروبار کے لئے ایک ایسا پیشہ اختیار کرے جو معاشری طور پر مفید ہو اور پھر وہ اپنے کام کو بوجہ احسن انجام دے۔ بطور آجر یا کام لینے والے کے اس کا فرض ہے کہ اپنے کارندوں کو عمدہ کام کرنے کی ترغیب دے۔ اور اُن کی حوصلہ افزائی کرے۔ حقوق کے ضمن میں بطور کارکن کے ہر شخص کا حق ہے کہ وہ اپنے کاروبار کے لئے ایک ایسا پیشہ منتخب کرے جسے وہ خوش اسلوبی سے نبھا سکے تاکہ وہ اپنی کارکردگی میں سب کے لئے سود مند ثابت ہو۔ بطور کام لینے والے کے اس کا حق ہے کہ جو چیز وہ خریدے وہ عمدہ ہو اور اس میں کسی قسم کا دھوکا نہ ہو۔ اپنے آرام کے حصول کا بھی ایک کو حق ہے لیکن یہ حق نہیں کہ اُس کی مسرت کسی طرح دوسروں کے لئے ذلیل مشقت کا موجب ٹھہرے۔

نتیجہ یہ نکلا کہ انسانی معاشرت کو ایک ایسی جمعیت بنایا جائے جس کے ارکان باہمی امانت داری کے ساتھ روزمرہ کے کام میں باہمی وفاداری قائم رکھیں۔ یہ امر خاص طور پر قابلِ غور اور تسلی بخش ہے کہ ایسی جمعیت کا قیام محض ایک منصوبہ نہیں بلکہ اس زمانے میں بہت سی ایسی قومی اور بین الاقوامی جماعتیں اور انجمنیں موجود ہیں جن میں اصول مذکورہ بالا بڑی حد تک عمل درآمد ہو رہا ہے۔ یہ بالخصوص مغرب کی کاروباری دنیا میں پائی جاتی ہیں اور اُن کی کاروباری دیانت داری شہرۂ آفاق ہے۔ بنک، تجارتی کمپنیاں، امدادِ باہمی کی انجمنیں، انگلستان کی عدالتیں اور پولیس اور محکمۂ طب، مجسٹریٹ، نرسیں اور بالخصوص ملک ملک کے سائنسدان جن کے ذریعے بتدریج بین الاقوامی اتحاد کی خواہش فروغ پائے گی ان میں سے بہت سے ادارے اور افراد امانت داری کے جذبات سے معمور نظر آتے ہیں اور گمان ہوتا ہے کہ عجب نہیں نوعِ انسان کی آئندہ تنظیم سیاسی نہیں بلکہ صنعتی یا علمی یا کوئی اور شکل اختیار کرے اور دنیا کے لوگ باوجود مختلف ملکوں کے باشندے ہونے کے، باوجود مختلف سیاسی شکنجوں میں مقید ہونے کے اپنے درمیان اتحاد و مؤانست کے نئے ذریعے پیدا ہوتے دیکھیں اور بالآخر گویا ایک ہی گھرانے کے رہنے والے ہو جائیں۔

"امانت داری" کے ذکر سے "ذمہ داری" کا خیال پیدا ہوتا ہے۔ عام خیال ہے کہ انسان ذمہ داری کو پسند نہیں کرتا۔ یہ غلط ہے۔ مہذب انسان کبھی پورا خوش نہیں ہو سکتا جب تک وہ کوئی اچھا کام اپنے ذمے نہ لے۔ مشہور بات ہے کہ انسان، بالخصوص متمدن انسان ذمہ داری سے گریز نہیں کرتا بلکہ صرف اپنی ذمہ داری کو وقتاً فوقتاً تبدیل کرنا چاہتا ہے۔ انسان فطرتاً ایک ذمہ دار وجود ہے وہ ایک پیدائشی امین ہے۔ اُس کے فرائض ہیں ضرور ہیں مگر ان سب فرائض کی بنیاد اُس کا اپنے فرائض کو ادا کرنے کا حق ہے۔ یہ حق کہ اپنے فرائض کی انجام دہی میں اس پر اعتبار کیا جائے۔

کسی شے یا کسی شخص کو سمجھنے کے لئے ضروری ہے کہ دیکھا جائے کہ اُس شے سے کیا کچھ بنتا ہے وہ شخص کیا کچھ کرتا ہے۔ جب کسی شے کی تعریف کی جائے تو یہ کہنا مشکل ہے کہ وہ شے کیا ہے جب تک یہ بھی بیان نہ کیا جائے کہ کسی کو اُس شے کے ذریعہ سے کیا کرنا چاہئے۔ مثلاً اگر ہم کہیں کہ انسان ایک دوپایہ جانور ہے تو اس کا مطلب یہ ہوگا کہ اُسے سیدھا ہو کر چلنا چاہئے اور بیٹھے بیٹھے

باپڑپے پڑے زندگی نہ گذارنی چاہئے۔ اگر ہم کہیں کہ سانپ زہریلے ہیں تو مدعا یہ ہوگا کہ ہم لوگوں کو تنبیہ کرتے ہیں کہ اُن سے بچ کر رہیں + اسی طرح تمام سچائیاں اور تمام صداقتیں فی الحقیقت اوامرو نواہی کی شکلیں ہیں۔ صداقت کے معنی ہیں کچھ نہ کچھ کرنے کسی سمت چلنے کی ہدایت نہ کہ جم رہنے کی کوئی کیفیت۔ صداقت ہے ایک فعلیت یا مصروفیت ایک توت نہ کہ اک زا جینا + یہی اصول معاشری زندگی پر بھی حاوی ہے۔ شہری ہونے کے کسی مملکت یا جماعت کے رکن ہونے کے صریح معنی یہی ہیں کہ وہ شہری یا رکن ایک چست ذمہ دار شخص ہے جس کے فرائض ہیں ایک ایسا شخص جسے چاہئے کہ کچھ کرے اور جتنے اُس شہری یا رکن کو زیادہ فوائد یا جتنی زیادہ عزت حاصل ہوگی اتنی ہی اس کی ذمہ داریاں اور بڑھ جائیں گی +

ایک شہری کا سب سے بڑا حق ذمہ داری کا حق ہے اپنے فرائض اپنے ذمے لینے اور اُنہیں انجام دینے کا حق بلکہ ایک متمدن شہری کا تو یہ بھی حق ہے کہ بغیر کچھ اُجرت لئے کوئی کام سرانجام دے + کچھ عرصہ ہوا (۱۹۲۵ء میں) امریکہ میں ایک مشہور شخص ڈاکٹر چارلز سٹائن میٹز کا انتقال ہوا۔ وہ برقیات کا ماہر تھا اور کئی برس تک وہاں کی مشہور الیکٹرک کمپنی کا علمی ماہر رہ چکا تھا۔ کہا جاتا تھا کہ وہ بڑا امیر کبیر ہے اور مختلف شراکتوں میں اُس کے بیش قرار حصے ہیں اور اُس کا مشاہرہ بھی گراں قدر ہے + جب وہ مرگیا اور اُس کی وصیت اخباروں میں چھپی تو لوگ یہ سُن کر ششدر رہ گئے کہ اُس کی جملہ جائداد جو اُس نے ترکے میں چھوڑی تین سو پونڈ کا بیمہ ہے اور ایک ٹوٹی پھوٹی موٹر اور چند اور ناقابلِ ذکر اشیا + پھر معلوم ہوا کہ اس کے حصے صفر تھے اور وہ کچھ مشاہرہ نہ لیتا تھا + برضائے خود اُس نے ان چیزوں کے لینے سے انکار کر دیا تھا۔ اس کا قول تھا "میں اپنا کام کروں گا محض کام کی خاطر، سونے چاندی کو اس سے کچھ واسطہ نہ ہوگا"۔ مسٹر جینکس کہتا ہے کہ "سٹائن میٹز بھی اسی نوع کا آدمی تھا جیسے حسین علی" + کیا ہم اس قوم کی حالت پر اظہارِ تاسف کریں جس میں کبھی ایک حسین علی نہیں لاکھوں حسین علی موجود تھے، خاموشی کے ساتھ، شوق کے ساتھ، دیانت داری اور ایمان داری کے ساتھ، بغیر روپے کی طمع کے بغیر کسی اور لالچ کے کام کرنے والے، محض عزت کے خواہاں اور وہ بھی اکثر چھپے ہی چھپے دل سے کام کرنے والے، زندگی کی تاریکیوں کو اپنے کام اور اپنے ایمان کی روشنی سے چمکا دینے والے سچے انسان! کیا ہم افسوس ہی کریں کہ یہ لوگ کیا تھے اور کیا ہو گئے؟ نہیں تاسف لاحاصل ہے اور یاس خیز، اب بھی عوام میں لاکھوں نہیں تو ہزاروں اشخاص ضرور ایسے ہوں گے جن میں حسین علی بننے کی صلاحیت موجود ہے بشرطیکہ وہ سمجھیں کہ اُن میں یہ صلاحیت ہے اور بشرطیکہ وہ دیانتداری کے ساتھ اپنی اس صلاحیت کو عمل میں لے آئیں +

انسان جسے اپنے فرائض پر حق حاصل ہے اُسے یہ بھی حق ہے کہ معاشرت اُسے روز بروز بہتر و برتر حق منتخب کرنے کا موقع دے۔ بلکہ وہ چاہے تو بجائے آرام دہ کام کے ایسا کام چُنے جس میں اُسے تکلیف ہو کہیں غریبوں کی امداد کرے کہیں دردمندوں سے ہمدردی کرے + کیا آج ہزاروں ایسے افراد موجود نہیں جو خاموشی کے ساتھ ایسے ایسے کام کرتے ہیں؟ عام خیال کے مطابق اگر معاشرت خوشیوں کو سب میں برابر تقسیم کر دے تو سب انسان مطمئن ہو جائیں۔ لیکن یہ درست نہیں + خوشیوں کا برابر بانٹنا اور پھر یہ یقین ہو سکنا کہ وہ برابر بٹ چکی ہیں ناممکن ہے۔ زیادہ تر اس لئے کہ ہم میں سے ہر فرد جب تک اپنی

خوشی میں تھوڑی سی اپنی شخصیت نہ ملالے اُس وقت تک کبھی پورا خوش نہیں ہو سکتا + اور خوشی کے مرکب میں شخصیت کا جزو محض ایک دلچسپ اور مفید کام کی مدد ہی سے مل سکتا ہے کسی دوسرے کی دی ہوئی خوشی سے انسان کبھی زیادہ دیر تک خوش نہیں رہ سکتا +

مذکورہ بالا باتوں سے یہ نہ سمجھنا چاہئے کہ انسان کے حقوق و فرائض محض ایک قومی جمعیت کے حقوق و فرائض ہیں + وہ محض ایک گاؤں کا یا شہر کا باشندہ نہیں + ایک تو وہ اپنے ملک کا باشندہ ہے، یہاں اس کے حقوق و فرائض سیاسی ہیں۔ دوسرے وہ دنیا کا ایک باشندہ ہے یہاں اُس کے حقوق و فرائض صنعتی ہیں تیسرے وہ کائنات کا باشندہ ہے یہاں اُس کے حقوق و فرائض آفاقی ہیں + بحیثیت ایک رائے دہندہ کے وہ اپنے ملک سے متعلق ہے، بحیثیت ایک کارکن کے وہ نوعِ انسان سے رشتہ رکھتا ہے اور بحیثیت ایک انسان کے وہ ساری کائنات سے وابستہ ہے + ان میں سے ہر حلقے میں اُس کے حقوق و فرائض ہیں ہر ایک میں جداگانہ اور پھر سب میں سلسلے جلے + ان میں ہر حالت کا دوسری حالت پر اثر ہوتا ہے اور ان کے باہمی اثرات سے حقوق و فرائض کا ایک بظاہر نہایت الجھا ہوا سلسلہ پیدا ہوتا ہے جو دراصل اندرونی طور پر ایک متحدہ حقیقت رکھتا ہے اور جس کی قدر و قیمت کا صحیح اندازہ نہیں ہو سکتا کیونکہ وہ وسیع ہے کائنات کی وسعت کی طرح اور عمیق کائنات کی مدت کی مانند + اپنی روزمرہ کی دنیاوی زندگی میں ہم کو کبھی نہ بھولنا چاہئے کہ ہماری چھوٹی سی دنیا پر کائنات کے آئین و قوانین حاوی ہیں اور قدرت کی طاقتیں انسان کی مصروفیتوں کو ہمدردی اور انصاف کی نظر سے دیکھ رہی ہیں اور اس زندگی میں ہمارا بھی فرض ہے کہ ہم ان کی اس ہمدردی سے مطمئن اور اُن کے اِن آئین و قوانین کے بخوشی پابند رہیں!

ذاتی مہارت اور امانت داری کو فروغ دینے کے ساتھ "تعمیری شہریت" کا تیسرا مقصد معاشری تعلقات کو بہتر و خوب تر بنانے میں **علمی طریقۂ تنظیم** کا اجرا و استعمال ہے جس سے معاشرت کی خرابیاں خوبیوں میں تبدیل کی جا سکتی ہیں + پروفیسر جوزیا روئس نے جو امریکہ کی ہارورڈ یونیورسٹی کا ایک قابل کارکن تھا ۱۹۱۴ء میں ایک کتاب "جنگ اور بیمہ" شائع کی جس میں اُس نے نوعِ انسان کی ترقی کے لئے ایک نئی اور حیرت انگیز تجویز پیش کی + وہ مدت سے اپنے ایک منصوبے "محبوب ملت" کی تکمیل میں مصروف رہا تھا اُسے خیال تھا کہ ملت ایک آزاد آدمی کی وفاداری کا صحیح منتہا ہو سکتی ہے + اُس نے دیکھا کہ مذہب اور سائنس کا ملاپ جس پر اک عرصے سے بہت کچھ قابلیت اور جوش صرف ہو رہا ہے محض دونوں کے اصولوں کے اک نظری یا خیالی تطابق سے وجود میں نہیں آسکتا بلکہ اُس کے لئے ایک کے بلند روحانی خیالوں کا دوسرے کے صحیح کاروباری طریقوں سے امتزاج ضروری ہے + اس غرض سے اُس نے کاروباری دنیا میں نگاہ دوڑائی کہ کہیں کوئی ایسا موجودہ ادارہ ہو جس میں یہ امتزاج عملی جامہ پہنے ہوئے نظر آئے + اکثر لوگوں کو سُن کر تعجب ہوگا کہ اس قسم کا ادارہ نہ اسے کسی سیاسی نہ کسی مذہبی نظام میں ملا بلکہ اُس مشہور کاروباری شراکت باہمی میں جسے بیمہ کمپنی کہتے ہیں + بیمہ کمپنی میں اُسے اپنی "محبوب ملت" کا ایک جیتا جاگتا گو نامکمل نمونہ نظر پڑا ۔ ایک ایسا ادارہ جس میں وہی افادۂ عام کا اصول اور وہی وفاداری اور علمی طریقۂ تنظیم کی شکل دکھائی دی

جو وہ اپنی "محبوب ملت" میں مجسم دیکھنا چاہتا تھا۔ اُس زمانے میں جب پہلے پہل بیمہ کمپنیاں قائم کی گئیں تو اُن کے قابل نکتہ چینیوں اور اَور لوگوں کا بھی عام طور پر خیال تھا کہ نوعِ انسان کی نامعتبری اور کم دیانتی اس قسم کے نظام کو نہ چلنے دے گی۔ کہا جاتا تھا کہ اس سے دنیا میں قتل اور خودکشی بڑھے گی، گھر جلائے جائیں گے، جہاز خود ڈبو دیئے جائیں گے یعنی لوگ اپنی چیزوں کا بیمہ کر کے آپ انہیں برباد کر دیں گے اور یوں بیمے سے فائدہ اُٹھائیں گے۔ لیکن نتائج نے ان عقلمند پیشین گوؤں کو جھوٹا ثابت کر دیا۔ اور یہ ظاہر کر دیا کہ انہوں نے انسان کی امانت داری کے جذبے اور علمی تنظیم کی قوت کا صحیح اندازہ نہ کیا تھا۔ آج دنیا میں ہر قسم کی چیزوں کا بیمہ ہو سکتا ہے، تجارت کا ناقابلِ وصول قرضے کے خلاف، ہماری تعطیلات کا بُرے موسم کے خلاف، ہم اپنی جان کا بیمہ کر سکتے ہیں، اپنے گھوڑے کی جان کا بیمہ کر سکتے ہیں علیٰ ہذا القیاس۔ باہمی بیمہ اخلاقی اور علمی اصولوں کے امتزاج کی ایک عملی صورت ہے۔ متمدن انسان کی امانت داری اس میں بہترین شکل میں ظاہر ہوتی ہے۔ پروفیسر روس نے دلیلاً یہ کہا کہ جس طرح افراد کے جان و مال کا بیمہ ہو سکتا ہے کیا وجہ ہے کہ اسی طرح قوموں کے جان و مال کا بھی بیمہ نہ ہو سکے۔ سرقہ، تشدد، زلزلہ، قحط، متعدی امراض، شہروں کی آتش زدگی اور اَور ایسے ہی خطرے بلکہ باہمی لڑائیاں بھی، کیا وجہ ہے کہ قومیں ان کے خلاف بیمہ نہ کر سکیں۔ منصوبہ یہ تھا کہ ایک عظیم الشان بین الاقوامی شراکت یا فنڈ بنایا جائے جس کا انتظام بین الاقوامی امینوں کے ہاتھ میں ہو اور اس شراکت کو انہیں علمی اور کاروباری اصولوں پر چلایا جائے جن پر آج کل بیمہ کمپنیاں چلائی جاتی ہیں۔ بین الاقوامی شراکت ایک معتدبہ بین الاقوامی جائداد کی مالک ہو۔ اُس کی حصہ دار مختلف قومیں ہوں۔ اور اس کی ملکیت تک ملک میں اس طرح بٹی ہوئی ہو کہ اس پر حملہ کرنا اور اس کا غصب کرنا آسان نہ ہو۔ قوموں کے جان و مال کا یہ شراکت بیمہ کرے۔ مثلاً ملکوں کے قومی جہازوں کا اس طریقے سے بیمہ کیا جائے اور اسی طرح اور چیزوں کا بھی۔ انجمنِ اقوام کے تجربے سے ظاہر ہے کہ سیاسی تنظیم معاشی یا معاشرتی تنظیم سے زیادہ مشکل شے ہے لیکن یہ ضروری نہیں کہ بین الاقوامی تنظیم سیاسی شکل میں ہو کیونکہ ایسی تنظیم کے لئے صرف نیک نیت منصف مزاج امینوں کی حاجت ہے جن کے پیشِ نظر کسی ایک قوم کی بہبود نہ ہو بلکہ ساری نوعِ انسان کی ترقی۔

سیاست ہمیشہ صنعت و حرفت کو اپنی جکڑ بندیوں میں مقید کرنے پر تلی رہتی ہے جس سے اُدھر سیاست کو اِدھر صنعت کو ہمیشہ مختلف خطروں کا کھٹکا لگا رہتا ہے۔ کاروباری معاملات کے انتظام کا تقاضا ہے کہ اُن کے متعلق جو فیصلے کئے جائیں وہ مضبوط ہوں اور جلد سے جلد کئے جائیں۔ سیاسی بحث مباحثہ کی طرح ان معاملات کی گتھیوں کو بھی اگر جلد سلجھایا نہ جائے تو اس سے کاروبار میں عموماً سخت خسارے کا احتمال ہوتا ہے۔ اسی لئے مالیات کے معاملے میں حکومتوں کو اکثر بہت جلد فیصلے کرنے پڑتے ہیں۔ منظم جمہوری حکومتوں میں ماہرینِ مالیات کی ایک جماعت ہوتی ہے جن سے ارکانِ حکومت ہمیشہ مشورہ کرتے ہیں اور ایسی باتوں میں عموماً انہیں کے مشورے پر عمل ہوتا ہے۔ کچھ عجب نہیں کہ جوں جوں تعلیم کا معیار بلند تر ہوتا جائے سیاسی ادارات بھی امانت داری کے اصولوں پر قائم ہونے لگیں اور بجائے بار بار منتخب ہونے والے سیاست دانوں کے

حکومت کی باگ ڈور پشت ازمپشت ایسے ایسوں کے ہاتھوں میں آجاتی جو عمر بھر کے لئے یا ایک لمبے عرصے کے لئے حکومت کے کارکن مقرر کئے جائیں۔ قومی اور بین الاقوامی نظامات میں آئندہ غالباً یہی طرز عمل برتا جائے گا۔ جمہوریت کے محاسن ایک مدت سے متمدن دنیا کے دل پر نقش تھے۔ اب کچھ عرصے سے اُس کے نقائص بھی تجربے کی روشنی میں ظاہر ہو رہے ہیں۔ نیابت نے سیاست کے دائرے میں اپنی قابلیت بھی دکھائی ہے اور اپنی جہالت بھی۔ اجتماعی زندگی کے نئے دور میں نری جمہوریت کام نہ دے گی بلکہ ذاتی مہارت اور امانت داری اور علمی تنظیم کے ہاتھوں تعمیری شہریت کی زبردست بنیاد قائم ہوگی!

ل ب

فاروقِ اعظم

ایک دفعہ احنف بن قیس رؤسائے عرب کے ساتھ حضرت عمرؓ کے ملنے کو گئے۔ دیکھا تو دامن چڑھائے اِدھر اُدھر دوڑتے پھرتے ہیں۔ احنف کو دیکھ کر کہا "آؤ تم بھی میرا ساتھ دو، بیت المال کا ایک اونٹ بھاگ گیا ہے۔ تم جانتے ہو ایک اونٹ میں کتنے غریبوں کا حق شامل ہے۔" ایک شخص نے کہا "امیرالمومنین! آپ کیوں تکلیف اٹھاتے ہیں، کسی غلام کو حکم دیجئے وہ ڈھونڈ لائے گا۔" فرمایا اَیُّ عَبْدٍ اَعْبَدُ مِنِّیْ "(مجھ سے بڑھ کر کون غلام ہو سکتا ہے؟)

ایک دفعہ بیمار پڑے، لوگوں نے علاج میں شہد تجویز کیا۔ بیت المال میں شہد موجود تھا لیکن بلا اجازت نہیں لے سکتے تھے۔ مسجدِ نبوی میں جا کر لوگوں سے کہا کہ "اگر آپ اجازت دیں تو بیت المال سے تھوڑا سا شہد لے لوں۔" اس کارروائی سے طلبِ اجازت کے سوا یہ ظاہر کرنا تھا کہ خزانۂ عامرہ پر خلیفۂ وقت کو اتنا اختیار بھی نہیں۔"

جفائے روزگار

یہ نظم "عثمان ساگر" کے کنارے جو حیدرآباد کا ایک رومان آفریں تالاب ہے لکھی گئی

کل منہ اندھیرے صبح کو تالاب کے قریب
یاد آرہا تھا دل کو غم کا کل حبیب

مس ہو رہی تھی قلب و جگر سے خنک نسیم
بوجھل سی تھی ترائی کی بھیگی ہوئی شمیم

جھونکے تھے اضطراب کا پہلو لئے ہوئے
مرطوب و نرم دوب کی خوشبو لئے ہوئے

تھی مدّ و جزرِ آب کے اندر چھڑی ہوئی
ٹھنڈی ہوا کے تند تھپیڑوں کی راگنی

افسانہ کہہ رہا تھا شبِ تارِ ہجر کا
نظروں سے اُس طرف کا کنارہ چھپا ہوا

میداں ہرے بھرے سبد گل فروش تھے
جنگل کے طائرانِ خوش الحاں خموش تھے

دُھندلی بلندیوں پہ گھٹاؤں کا تھا دھواں
گردوں سے آرہی تھیں دبے پاؤں بوندیاں

چھایا ہوا تھا صبح کے ماتھے پہ رنگِ شام
اتنے میں اک کسان نے جھک کر کیا سلام

جاگے ہوئے لطیف خیالات سو گئے
اُٹھی نگاہ، رونگٹے سب جھن سے ہو گئے

اللہ رے عدلِ عالم و انصافِ روزگار | ناکارہ کے قدم پہ جھکے شاہِ کارو بار
بیچارگی کے ساتھ مخیّر جھکائے سر | مغرور بھیک مانگنے والوں کو دیکھ کر
قوّت کا اور ضعف کے در پر سرِ نیاز | صحت اُٹھائے حیف ہے بیماریوں کے ناز
پودوں کے ڈر سے صاحبِ گلشن ہو بیقرار | غنچوں سے اور لرزہ براندام ہو بہار
اوچھی زمیں کے پاؤں پہ چرخِ بریں جھکے | بھُوکے کے آستاں پہ غذا کی جبیں جھکے
ناطاقتی ہو کشورِ طاقت میں شہریار | فاقے کو اور رزق بنائے سپاہدار
در کھٹکھٹائے دستِ کریم اور فقیر کا | فولاد اور مان لے لوہا حریر کا
عقلِ سیاہ کار کو سجدے کرے جنُوں | خاشاکِ بزدلی پہ ہو تلوار سرنگوں
مردانِ کوہ و دشت و دلیرانِ گرم خُو | عاجز ہوں دخترانِ تمدّن کے روبرو

بارِ خدا! "یقین" ہو قربان "بدگمان" پر
لعنت ہو اس زمین پہ تُف آسمان پر

جوش

دمنتی

لیڈی موہن	
مس دمنتی موہن	لیڈی موہن کی بھتیجی۔ ایم اے کلاس کی طالب علم
پروفیسر کرپادیالم	
مسٹر ودیا شنکر ایم اے مسٹر اشنتہ ایم اے	ایم اے کے دوسرے طالب علم
چند طالب علم	ایم اے کلاس کے طالب علم
دو خدمتگار	

زمانۂ حال

پہلا ایکٹ

پہلا سین

دن ہفتہ۔ وقت ۴ بجے بعد دوپہر۔ باغ میں کچھ طالب علم کتابیں سمیٹ کر چلنے سے پہلے باتیں کرتے دکھائی دیتے ہیں۔ چاروں کے چاروں بے تکلفی سے پاؤں پھیلائے گھاس پر سینے کے بل لیٹے ہیں۔

پہلا طالب علم۔ کتاب کے جادو سے خدا بچائے۔ عورت کے کاٹے کا منتر ہے مگر کتاب کا مارا قطعی لاعلاج ہے۔

دوسرا طالب علم۔ بہت خفا ہو، کیا بات ہے؟

پہلا طالب علم۔ خفا نہ ہوں تو کیا ناچوں؟ یہ ظالم کتاب کہہ رہی ہے کہ جوانی خدائی سہرا ہے۔ ایک بڈھے میاں بکتے ہیں "ہائے جوانی ہائے کالج کی بے فکری، ہائے کالج کی شرارتیں"

تیسرا طالب علم۔ بس اس بات سے یہ کتاب ظالم ہو گئی؟

پہلا طالب علم۔ سوتیلی ماں سے بھی بڑھ کر ظالم۔ سوتیلی ماں تو صرف باپ سے پٹواتی ہے یہ کتاب اگر کچھ بھی سچی ہے تو اپنے آپ سے نفرت پیدا کر دیتی ہے۔ بندۂ خدا سوچو تو سہی کہ ہمیں کالج میں چھٹا سال ہے اور قسم لے لو جو کبھی بھول کر بھی جوانی یا بے فکری یا شرارت کو دیکھا ہو۔ گویا ہم زندہ نہیں رہے محض فرمائشی گدھے بنے رہے اگر کالج کی زندگی پُر لطف ہوتی تو ہم کیا پاگل تھے کہ امتحان پاس کرنے کے لئے یوں مرے جاتے۔

دوسرا طالب علم۔ بے فکری تو یقیناً ندارد ہے۔ آج میچ، کل ڈیبیٹ (debate) پرسوں امتحان اور روز روز بعض پروفیسروں کا منہ دیکھنا۔ کالج کیا ہے عذاب ہے۔

پہلا طالب علم۔ میرے خیال میں ہندوستان میں تو اگر انسان پر جوانی آتی ہے تو شاید بڑھاپے ہی میں آتی ہے۔

تیسرا طالب علم۔ شروع ہوگئی تمہاری خیالی بک بک۔ شرارت کو جی چاہتا ہے تو کرو کون منع کرتا ہے؟

پہلا طالب علم۔ تم کیوں نہیں کرتے؟

تیسرا طالب علم۔ میں تو تیار ہوں۔

تینوں (مل کر) تم تیار ہو تو ہم بھی تیار ہیں۔ تجویز بتاؤ۔

تیسرا طالب علم۔ (کچھ سوچ کر کاغذ اور پارکر پن نکال کر) تجویز یہ ہے کہ جو میں کہتا ہوں اور لکھتا جاتا ہوں اس پر دستخط کردو مگر کسی کو خبر نہ کرو اور نہ اس تحریر سے بعد میں انکار کرو۔

تینوں (زور سے) منظور۔ منظور۔ منظور۔

تیسرا طالب علم (بولتا جاتا ہے اور لکھتا جاتا ہے) ڈیر پروفیسر کرپا دیالم۔ یہ گمنام خط نہیں۔ آپ ہمارے دستخط پہچانتے ہیں اور ہم میں سے ایک دستخط کنندہ خود آپ کے ہاتھ میں یہ خط دے گا۔ جو کچھ آپ کو کرنا ہو کل دو بجے سے پہلے کرلیں اگر دیر ہوگئی تو ذمہ داری آپ کی ہوگی۔ جو اطلاع ہمیں آپ کو دینی ہے وہ یہ ہے کہ کل دو بجے کے بعد مس دمتی موہن کی کوٹھی میں ایک نئے ڈرامے کی ریہرسل (rehearsal) کی تجویز ہے۔ یہ ڈراما خود مس دمتی موہن کے متعلق ہے اور ہمیں یقین ہے کہ نقلی ڈراما ہوتے ہوتے ایک اصلی ڈراما ہوجائے گا یعنی بظاہر تو معلوم یہ ہوگا کہ مس دمتی موہن یونہی سٹیج پر مسلمان ہوجاتی ہے اور نکاح کرلیتی ہے مگر گمان یہ ہے کہ وہ نکاح اور تبدیلِ مذہب دونوں شاید اصلی ہوں۔ سٹیج نقلی ہوگی ناٹک اصلی ہوگا۔ آپ نے اسلام کی تعریف میں جو شاندار لیکچر دیا یہ غالباً اس لیکچر کی فصاحت کا کرشمہ ہے۔

آپ کے فرمانبردار

بقلم خود ـــــــ
بقلم خود ـــــــ
بقلم خود ـــــــ
بقلم خود ـــــــ

طالب علم ایم، اے کلاس

مکرر یہ کہ اگر مس دمتی مسلمان ہوگئی تو ہم بھی فوراً اسلام قبول کرلیں گے اور اگر آپ اس کے بعد بھی مسلمان نہ ہوئے تو ہم آپ کو بم کے زور سے مسلمان کریں گے۔ اسے مذاق نہ سمجھئے۔

(چاروں کے چاروں دستخط کر دیتے ہیں)

تینوں طالب علم۔ دستخط تو ہم نے کر دیئے۔ اور ہم اپنے وعدے پر بھی قائم ہیں مگر اس میں شرارت کیا ہوئی؟

تیسرا طالب علم۔ شرارت یہ ہے کہ پروفیسر کرپا دیالم ایسا فول[1] بنے گا کہ پھر کبھی سینیر سٹوڈنٹس (Senior Students) پر دھونس نہ جمائے گا۔ مگر جو تمہیں مجھ پر اعتبار نہیں تو یہ لو خط موجود ہے اسے پھاڑ دو۔

پہلا طالب علم۔ اعتبار تو ہے گر جھوٹ میں اور شرارت میں تو ہزاروں کوس کا فاصلہ ہے تم تو صرف جھوٹ کا قلعہ تیار کر رہے ہو۔

تیسرا طالب علم۔ جناب من! کیا آپ چوبیس گھنٹے کی مہلت دیتے بھی گھبراتے ہیں؟

تینوں۔ نہیں۔ ہرگز نہیں۔ جو تمہارا جی چاہتا ہے تم کرو۔

دُوسرا سین

وقت پانچ بجے شام۔ لیڈی موہن کا گول کمرہ۔ ایک خدمتگار چاندی کی طشتری میں ملاقاتی کارڈ لیڈی موہن کی خدمت میں پیش کرتا ہے

لیڈی موہن۔ سلام دو (خدمتگار دبے پاؤں نکل جاتا ہے اور مسٹر ودیا شنکر (تیسرا طالب علم) داخل ہوتا ہے۔ لیڈی موہن کو جھک کر آداب بجالاتا ہے)

لیڈی موہن۔ آیئے، بیٹھئے۔ کیا آپ دمنتی سے ملنے آئے ہیں۔

ودیا شنکر۔ جی نہیں۔ آپ کی خدمت میں حاضر ہوا ہوں۔ ایک نہایت ضروری معاملہ میں آپ کی مدد کی سخت ضرورت ہے۔

لیڈی موہن (نہایت متانت سے اور اس خوف سے کہ کہیں چندہ نہ مانگتا ہو نہایت خنکی سے) کہئے

ودیا شنکر۔ مختصر عرض یہ ہے کہ میں پروفیسر کرپا دیالم کو ایک خط دینے جارہا ہوں اور آپ کی بہت ہی مہربانی ہوگی اگر اس کی نقل پر آپ تصدیق کردیں کہ آج پانچ بجے شام آپ نے اصلی خط دیکھ لیا ہے۔ (یہ کہہ کر دو خط لیڈی موہن کے سامنے رکھ دیتا ہے۔ لیڈی موہن پڑھتی جاتی ہیں اور اُن کا چہرہ غصّے سے تمتمانے لگتا ہے)

لیڈی موہن (نہایت غصہ سے) آپ کو شرم نہیں آتی کہ میری بھتیجی پر یہ افترا باندھ رہے ہیں اور پھر مجھ سے ہی اس جھوٹ کی تصدیق کراتے ہیں۔

ودیا شنکر۔ لیڈی موہن! خدا کے لئے آپ خفا نہ ہوں۔ یہ ایک خفیف سی دل لگی ہے۔ کالج کی زندگی میں چند دن کے لئے لطف پیدا ہو جائے گا۔ کتابیں پڑھتے پڑھتے دم نکلا جاتا ہے۔ اپنی طبع زاد شرارت کے نتیجہ پر ذرا قہقہے لگالیں گے۔

لیڈی موہن۔ دمنتی کا نام بدنام ہو اور آپ اسے دل لگی سمجھیں میں خیال کرتی تھی کہ آپ اس کے دوست ہیں۔

---

[1] اُلّو بنے گا [2] بڑی جماعتوں کے طلبہ

ودیاشنکر۔ لیڈی موہن! دمنتی نیک و بد شہرت کی قید سے بہت بالاتر ہے
لیڈی موہن۔ پھر اس جھوٹ کا فائدہ؟
ودیاشنکر۔ اس میں نقصان؟
لیڈی موہن۔ سراسر نقصان ہے (یہ کہہ کر دونوں کاغذوں کو لیڈی موہن پھاڑ کر پُرزے پُرزے کر دیتی ہے)
ودیاشنکر (ہنستا ہے اور ہنستے ہوئے کہتا ہے) میری توقع پوری ہوئی اور اسی لئے آپ کی خدمت میں دونوں نقلیں ہی دی تھیں اصلی خط میرے پاس موجود ہے۔ میری والدہ ہمیشہ کہا کرتی ہیں کہ لیڈی موہن کو غصہ بھی جلدی آتا ہے اور پھر مان بھی جلدی جاتی ہیں۔
لیڈی موہن۔ تمہاری والدہ؟
ودیاشنکر۔ سکول کی آپ کی سہیلی پاربتی۔
لیڈی موہن۔ ارے! تم پارو کے بیٹے ہو! (غور سے دیکھ کر) شکل بھی کچھ کچھ ملتی ہے تبھی تم اس قدر شریر اور دلیر ہو۔
ودیاشنکر۔ کیا اس سے ملتی جلتی شرارت آپ نے اور میری والدہ نے اپنی ایک استانی کے ساتھ نہ کی تھی؟
لیڈی موہن (یاد کرتے ہوئے) کیا پارو کو وہ زمانہ اب تک یاد ہے؟
ودیاشنکر۔ اس زمانے کا تو پتہ نہیں آپ کو ہمیشہ یاد کرتی ہیں۔
لیڈی موہن (خندہ پیشانی سے) کیا اچھا وقت تھا۔ کاش کہ پھر ملیں
ودیاشنکر۔ تو فرمائیے کہ اب اس شرارت کی اجازت ہے۔
لیڈی موہن۔ شرارت کے لئے تم مرد ہو کر ایک استری کی مدد کے محتاج ہو۔ دمنتی سچ کہتی تھی کہ پرماتما نے یہ بڑی دیا کی کہ ہندستان میں مرد ہونے کی ذلت سے بچا لیا۔
ودیاشنکر۔ دمنتی کی اصلی دلی رائے کالج کے لڑکوں کے متعلق کیا ہے؟
لیڈی موہن۔ اصلی دلی رائے تو ایشور جانے مگر ایک دن کہہ رہی تھی کہ کالج کے لڑکے سیاسیات کے سانڈوں کے لئے بھس ہیں اُنہیں چبا چبا کر وہ سانڈ موٹے ہو رہے ہیں اور خوب آپس میں ٹکریں لڑتے ہیں۔
ودیاشنکر۔ یہ تو دمنتی نے کوئی نئی بات نہیں کہی۔ ساری دنیا میں شباب بڑھاپے کا شکار ہے۔ نوجوانوں کی امنگوں کو پختہ کار حضرات صدیوں سے یونہی استعمال کرتے چلے آئے ہیں۔ بوڑھوں کا کام ہے دھوکا دینا اور نوجوانوں کا کام ہے دھوکا کھانا۔ اس بیچ میں تو کسی کو گھاٹا نہیں۔ وہ شباب ہی کیا جو انجامِ کار کو سوچے؟
لیڈی موہن۔ آپ اپنا فلسفہ تو رہنے دیجئے۔ مجھ سے وعدہ کیجئے کہ یہ شرارت آپ نہ کریں گے۔
ودیاشنکر۔ تعمیلِ ارشاد میں وعدہ کر لوں مگر میرے دوستوں میں میرا منہ کالا ہو جائے گا۔

لیڈی موہن - تو تمہارا ارادہ کیا ہے؟

ودیا شنکر - آپ بالکل پختہ وعدہ کریں کہ آپ میرا راز فاش نہ کریں گی تو آپ کو بتا دوں -

لیڈی موہن - اچھا وعدہ کیا -

ودیا شنکر - میں یہ خط کر ابھی پروفیسر سے ملوں گا اور اسے یقین دلاؤں گا کہ اس آنے والی مصیبت کا صرف ایک ہی علاج ہے کہ وہ مجھے فوراً اپنے قلم سے لکھ دے کہ اس کے لکچر کا مطلب صحیح نہیں سمجھا گیا - اسلام کی مبالغہ آمیز تعریف محض پولیٹیکل مصلحت تھی - ان سے اجازت لے لوں گا کہ فی الحال یہ مختصر سا خط صرف دمنتی کو دکھلادوں اور باقی اپنا مطلب وہ کل دو بجے خود آکر دمنتی سے بیان کردیں -

لیڈی موہن - اگر تم نے یہ کیا تو پروفیسر فوجداری مقدمہ کرکے تمہیں قید کرا دے گا -

ودیا شنکر - قید ہونے کو تیار ہوں بشرطیکہ آپ خفا نہ ہوں - اب اجازت دیجیے

(چپکے چپکے کچھ باتیں کہتا ہے اور پھر ادب سے سلام کرکے رخصت ہوتا ہے)

تیسرا سین

دن ہفتہ - وقت نو بجے رات - پروفیسر کرپا دیالم کے دفتر کا کمرہ

پروفیسر کرپا دیالم - ودیا شنکر مجھے ہرگز یقین نہیں آتا کہ تمہاری اطلاع درست ہے - تمہارے مشورے کے مطابق تحریر میں نے لکھ دی ہے کیونکہ دمنتی کو اس غلطی سے بچانا اولین فرض ہے مگر کیا تم وعدہ کرتے ہو کہ دمنتی کے سوا اور کسی کو یہ خط نہ دکھاؤ گے

ودیا شنکر - میں حلفی وعدہ کرتا ہوں کہ یہ خط مس موہن کے ہاتھ میں خود دوں گا - یہ تحریر میرے حوالے کرکے آپ نے سارے ہندوستان کی ایک اعلیٰ دماغی خدمت انجام دی ہے -

پروفیسر - ودیا شنکر تم بہت قابل ہو میری ایک نہایت اہم تصنیف اس وقت مطبع میں ہے جس سے قطعی ثابت ہو جائے گا کہ ہندوؤں کے شاندار فلسفے کے مقابلے میں دنیا کے اور سب فلسفے ہیچ ہیں - مجھے صرف ان لوگوں سے اتفاق نہیں جو ہماری مقدس کتابوں کو الہامی کتابوں کے ذلیل زمرے میں شامل کرتے ہیں - میری کتاب پڑھو گے تو تم پر واضح ہو جائے گا کہ اصل پوتر ہندو فلسفے کا مجھ سے بڑھ کر چیمپئن[1] (Champion) آج تک ہندوستان میں پیدا نہیں ہوا

ودیا شنکر - جی ہاں جناب - اس میں کیا شک ہے -

پروفیسر - یہ تم لوگوں نے اپنے خط میں کیا زہر اُگلا کہ تم بھی مسلمان ہو جاؤ گے؟

ودیا شنکر - جناب - ہم تو سب کے سب فری تھنکر[2] (Free Thinker) ہیں اور دمنتی ہم سب کے دل و دماغ کی ملکہ ہے اُس کے

---

[1] علم بردار اور حلیف [2] آزاد خیال

لئے ہم قتل و غارت پر تیار ہیں تبدیلِ مذہب کیا چیز ہے۔

پروفیسر (خوف زدہ ہو کر) کیا تم ٹھیک کہہ رہے ہو؟

ودیا شنکر۔ جناب۔ مجھے غلط کہنے کی کیا ضرورت ہے۔ یہ بھی یقین جانئے کہ اگر ہم مسلمان ہوئے اور آپ نہ ہوئے تو آپ کے لئے بم کا گولہ فوراً تیار کرایا جائے گا۔ لیجئے اب جاتا ہوں "گڈ نائٹ سر"! (Good night Sir)

دوسرا ایکٹ

پہلا سین

(وقت ۱۲ بجے۔ دن اتوار۔ لیڈی موہن کی کوٹھی میں مس دمنتی موہن کا کمرہ)

(دمنتی اپنے کمرے میں چھوٹی سی سٹیج تیار کرنے میں مصروف ہے کچھ کرسیاں سامنے رکھی ہیں۔ چند کرسیاں سٹیج پر ہیں۔ ان کو دمنتی درست کر رہی ہے کہ لیڈی موہن داخل ہوتی ہیں)

لیڈی موہن۔ دمنتی ڈارلنگ[1]! کمرے کا کیا حال کیا ہے؟

دمنتی۔ آنٹی! آج یہاں ری ہرسل (rehearsal) ہوگا اس لئے مختصر سی سٹیج بنا رہی ہوں۔

لیڈی موہن۔ کون سا ڈراما ہے؟

دمنتی۔ آنٹی! ایک دنیا بھر سے نرالا خیال ہے۔

لیڈی موہن۔ وہ کیا؟

دمنتی۔ میرے تین چار ہم جماعت مل کر اپنا اپنا پارٹ خود تصنیف کر رہے ہیں اور اُن کا خیال یہ ہے کہ گو ڈراما میرے متعلق ہو مگر مجھے اُس کا کچھ علم نہ ہو اور میں اس میں قدرتی طور پر خود اپنا پارٹ پلے (play) کروں یعنی وہ نہ کہوں جو کوئی مصنف میری زبان سے کہلوائے بلکہ جو خود بخود حسبِ حال میرے منہ سے بے ساختہ نکلے۔

لیڈی موہن۔ یہ تو بالکل فضول ہے۔ تم جو کچھ بھی کہو گی یا کرو گی اس کا جواب ان لوگوں کے پاس کس طرح پہلے ہی سے موجود ہوگا؟

دمنتی۔ یہی تو نرالا پن ہے۔ ان لوگوں کا دعوے ہے کہ وہ ایسے حالات پیدا کریں گے کہ میرے قول فعل میں اُن کی توقعات سے ذرا بھی فرق نہ ہوگا۔ انہیں شوق ہے تو صرف یہ کہ کیا ایسی صورت میں میرے الفاظ کی بندش اور فقروں کی چستی اسی قسم کی ہوگی جو مشہور ڈراموں میں ہیروئن (heroine) کے کلام میں ہوتی ہے یا میری زبان میں کسی قسم کا ادبی چٹخارہ نہ ہوگا؟

لیڈی موہن (مسکرا کر)۔ پاگلوں کے سر سینگ نہیں ہوتے۔

---

[1] پیاری۔ میری جان۔

دمتی۔اس میں پاگل پن کی کیا بات ہے؟

لیڈی موہن۔ دمتی ڈارلنگ! میں اتنے ڈرامے پڑھ چکی ہوں اور دیکھ چکی ہوں کہ تم ابھی دس سال تک بھی نہ پڑھو گی نہ دیکھو گی۔ ڈرامے اس لئے تھوڑے ہی لکھے جاتے ہیں کہ ڈائیلاگ (dialogue) اسی قسم کا ہو جس قسم کا واقعی زندگی میں ہوتا ہے۔ ڈرامے کا پہلا اصول یہ ہے کہ زندگی کو صیقل کر کے پیش کرو

دمتی۔آنٹی! آپ اپنے خیال کے مطابق ٹھیک فرما رہی ہیں مگر ہم لوگوں کا دعویٰ ہے کہ ہم خالص سونا ہیں۔سونے کو صیقل کی ضرورت نہیں۔

لیڈی موہن۔کیا کہنے تمہارے انکسار کے! اگر کیا مجھے ری ہرسل دیکھنے کی اجازت ہوگی؟

دمتی (ہچکچاہٹ کو روکتے ہوئے) جی ہاں۔شوق سے یعنی اگر آپ کو کوئی ضروری کام نہ ہو۔

لیڈی موہن۔تھینک یو۔(چلنے لگتی ہیں)

دمتی۔آنٹی! اور لوگ تو سب دو بجے آئیں گے مگر مسٹر اشتہ کو میں نے ایک گھنٹہ پہلے بلوایا ہے۔میں چاہتی تھی کہ وہ آپ سے مل لیں۔

لیڈی موہن (بے اعتنائی سے) کون ہے وہ؟

دمتی (غرور سے) میرا دوست ہے، مجھ پر بے انتہا مہربانی کرتا ہے اور گو اسے آپ سے نیاز حاصل نہیں آپ کا بے انتہا ثناخواں ہے

لیڈی موہن (دانائی سے فوراً بدل کر) ہاں دمتی پیاری میں ضرور ملوں گی۔خدا جانے کون کہہ رہا تھا کہ کالج کے سب سے قابل لڑکوں میں ہے

(خدمتگار چاندی کی طشتری میں ملاقاتی کارڈ لے کر آتا ہے اور لیڈی موہن کی خدمت میں پیش کرتا ہے)

لیڈی موہن۔گول کمرے میں بٹھاؤ۔میں ابھی آتی ہوں۔

(خدمتگار چلا جاتا ہے)

دمتی۔کون ہے آنٹی؟

لیڈی موہن۔تمہارے کالج کا پروفیسر مسٹر کرپا دیالم۔اب میں جاتی ہوں۔ضرور تمہارا ری ہرسل دیکھوں گی۔

(دمتی اکیلی کمرے میں رہ جاتی ہے اور پھر کرسیاں درست کرنے لگتی ہے)

(لیڈی موہن کے نکلتے ہی ایک خدمت گار چپکے سے کمرے میں داخل ہوتا ہے اور ایک خط مس دمتی موہن کو دیتا ہے اور چپکا کھڑا رہتا ہے۔)

(مس دمتی فوراً لفافے کو پھاڑ کر پڑھتی ہے اور کچھ خفا ہو کر خط کو کچل کر مٹھی میں لے لیتی ہے اور پھر یک لخت اسے خیال آتا ہے

۱؎ مکالمہ

کہ خدمتگار جو خط لایا تھا وہ کمرے میں موجود ہے خدمتگار کی طرف غور سے دیکھتی ہے)

مس موہن - یہ خط تم لائے ہو؟

خدمتگار - حضور!

مس موہن (بہت غور سے خدمتگار کی طرف دیکھ کر) تمہیں یہاں داخل ہوتے کسی نے دیکھا؟

خدمتگار - حضور نہیں مگر نکلنے پر شاید کوئی دیکھ لے۔

دمنتی - وِدیا شنکر! تم بہت دلیر ہو مگر فوراً چلے جاؤ۔ کیا پروفیسر کرپا دیالم میرا کچھ ذکر کرنے آیا ہے؟

وِدیا شنکر - خیال تو یہی ہے۔ لو جاتا ہوں۔

(چپکے سے کچھ بات کہہ کر دمنتی کے ہاتھ سے خط لے کر نکل جاتا ہے)

(وِدیا شنکر کے نکلنے کے بعد تھوڑی دیر دمنتی ایک کرسی پر سر پکڑے بیٹھی رہتی ہے پھر مستعد ہو کر اٹھ بیٹھتی ہے اور بلند آواز سے گویا اپنے آپ سے یہ کہتی ہے)

اگر دنیا میں پروفیسر نہ ہوتے تو زندگی کس قدر آسان ہوتی۔

دوسرا سین

(لیڈی موہن کی کوٹھی میں لیڈی موہن کا گول کمرہ۔ پروفیسر کرپا دیالم لیڈی موہن کو داخل ہوتے ہوتے دیکھ کر کھڑا ہو جاتا ہے۔)

پروفیسر - گڈ مارننگ لیڈی موہن۔

لیڈی موہن (سلام کا جواب تبسم دیتے ہوئے) آپ تشریف رکھیں (پروفیسر اور لیڈی موہن کرسیوں پر بیٹھ جاتے ہیں)

پروفیسر - لیڈی موہن ساری دنیا آپ کی اور مس موہن کی روشن خیالی کی تعریف کرتی ہے مگر موجودہ حالات میں تو آزادی کی طرف بھی انسان کو سوچ سوچ کر قدم رکھنا چاہیئے؟

لیڈی موہن - میں آپ کا مطلب نہیں سمجھی۔

پروفیسر - میرا مطلب ہے کہ مس موہن کالج میں ہر قسم کے طالب علموں سے ملتی ہیں اور اس بے روک ٹوک میل جول کے ہندو سوشل شعار سے بعض ناگوار تصادم ہونگے۔

لیڈی موہن - کیا دمنتی نے کوئی خاص طور پر قابلِ اعتراض حرکت کی ہے؟

پروفیسر - جی نہیں۔ ہرگز نہیں۔

لیڈی موہن - تو پھر آپ کس بات سے خائف ہیں؟

پروفیسر - مس موہن اپنی حد سے بڑھی ہوئی ذہانت کے جال میں اس قدر پھنس گئی ہیں کہ انہیں مذہب سے چنداں لگاؤ نہیں رہا۔

لیڈی موہن۔ اب میں آپ کا مطلب سمجھی۔ دمتی واقعی مذہب کے معاملے میں سخت منہ پھٹ ہے۔ ایک دن کہہ رہی تھی کہ مذاہب کسی انتہا درجے کے عیش پسند کی ایجاد ہیں کیونکہ مذاہب نے معمولی باتوں کو گناہ قرار دے کر انہیں ضرورت سے ہزار فیصدی زیادہ دلکش بنا دیا ہے۔

پروفیسر۔ جی ہاں۔ مس موہن کی یہ بلاغت ایک سخت آفت ہے۔ ایک دن بحث بحث میں کہہ اٹھیں کہ احتیاط سے تول تول کر خوشی کے نوالے کھانے سے تو زہر کھانا بہتر ہے۔

لیڈی موہن۔ مگر پروفیسر صاحب کیا یہ ذلیل ترین حماقت نہیں کہ ایک طرف تو لڑکیوں کو اعلیٰ تعلیم دیں اور دوسری طرف اُن سے یہ توقع کریں کہ وہ اپنے علم کو آزادی سے استعمال نہ کریں۔

پروفیسر۔ جی ہاں مگر آزادی کی کوئی حد ہونی چاہیئے؟

لیڈی موہن۔ حد کون مقرر کرے؟

پروفیسر۔ سرپرست تو ماں باپ استاد یا گارڈین (سرپرست) ہی کر سکتے ہیں۔

لیڈی موہن۔ میں تو بحث میں دمتی سے ہمیشہ ہار جاتی ہوں اور مجھے ہمیشہ یہی ماننا پڑتا ہے کہ جو وہ کہتی ہے ٹھیک ہے۔ آپ اسے سمجھائیے۔

پروفیسر۔ آپ اجازت دیں تو آج دو بجے اُن سے ملنے کے لئے آجاؤں۔

لیڈی موہن۔ ضرور آیئے مگر خدا کرے آپ سے بھی کوئی ایسا سوال پوچھ بیٹھے جیسے وہ مجھ سے پوچھتی ہے۔

پروفیسر۔ مثلاً

لیڈی موہن۔ ایک دن پوچھنے لگی "بُرے لوگ اپنے پیشے سے اکتا جاتے ہیں۔ کیا نیک لوگ نہیں اکتاتے؟"

پروفیسر۔ واقعی ٹیڑھا سوال ہے۔ میری اپنی ہمشیرہ بعض دفعہ اس قسم کے بیباکانہ سوال کر بیٹھتی ہے مگر میں تو اسے ڈانٹ دیتا ہوں۔

لیڈی موہن۔ مرد اور عورت میں یہی تو فرق ہے۔ مرد غلطی پر بھی ہو تو ڈانٹنے سے نہیں شرماتا۔

پروفیسر۔ آپ بھی دمتی سے کم نہیں۔ لیجئے اب مجھے اجازت دیجئے۔ دو بجے حاضر ہونگا۔

(چلا جاتا ہے)

ڈراپ سین

تیسرا ایکٹ

(لیڈی موہن کا گول کمرہ۔ وہی دن، وقت ایک بجے بعد دوپہر۔ لیڈی موہن اور مس دمتی بیٹھی ہیں۔ خدمتگار چاندی کی طشتری میں ملاقاتی کارڈ لاکر لیڈی موہن کی خدمت میں پیش کرتا ہے)

لیڈی موہن۔ سلام دو۔

دمتی۔ آنٹی! پروفیسر کرپادیالم کیا فرماتے تھے؟

لیڈی موہن۔ کالج کے انتظام کے شاکی تھے۔ کچھ اپنی ہمشیرہ کی بیباکی پر خفا سے تھے۔ کچھ تمہاری تیزی ذہانت کے مداح تھے۔ دو بجے تم سے ملنے کے لئے آئیں گے۔

(خدمت گار مسٹر اشتنہ کو کمرے میں داخل کرتا ہے)

دمتی۔ ہیلو اشٹو

اشتنہ۔ ہیلو ٹام۔

دمتی۔ آنٹی یہ ہیں مسٹر اشتنہ جنہیں میں مذاق سے اشٹو کہتی ہوں۔

(اشتنہ جھک کر آداب بجالاتا ہے)

لیڈی موہن (اُٹھ کر ہاتھ ملاکر) آئیے۔ یہاں میرے پاس بیٹھئے (اشتنہ ادب سے لیڈی موہن کے پاس (Settee) پر بیٹھ جاتا ہے)

دمتی (کرسی سے اُٹھ کر) آنٹی میں ابھی آتی ہوں (کمرے سے چلی جاتی ہے)

لیڈی موہن۔ آپ دوہرا ایم اے کرنے کو ہیں؟

اشتنہ۔ جی ہاں یعنی اگر پاس ہو جاؤں۔

لیڈی موہن۔ کیا دمتی بھی پاس ہو جائے گی

اشتنہ۔ جی ہاں مس موہن ضرور پاس ہونگی۔ بلا کی ذہین ہیں۔

لیڈی موہن آپ نے دمتی کو "ہیلو ٹام" کیوں کہا؟

اشتنہ۔ لیڈی موہن! میں محض ایک طالب علم ہوں۔ میرا شغل صرف کتب بینی ہے یا ضروری قسم کی ورزش۔ میرے پاس وقت نہیں کہ میں اپنے کسی ہم جماعت کے لئے یہ سوچوں کہ وہ لیڈی ہے۔ اس لئے مس موہن کی اجازت سے اُن کا نام ٹام رکھ دیا۔ اس سے زندگی آسان ہوگئی ہے اور اُن سے وہی سلوک روا رکھتا ہوں جو اس نام کے ساتھ مناسب ہو۔

لیڈی موہن (ہنس کر) گویا لڑکیاں کالج میں جاکر لڑکے بن جاتی ہیں۔

اشتنہ۔ قطعی۔

لیڈی موہن۔ لڑکے تو آپس میں گالیاں بھی دیتے ہیں۔

اشتنہ۔ جی ہاں۔ یہی تو آسانی ہے "شٹ اپ مس موہن"[1] (Shut up miss Mohan) کہنا کس قدر ثقیل ہے مگر "شٹ اپ ٹام" (Shut up Tom) کہنا کتنا سلیس ہے اور شٹ اپ (Shut up) پر کیا موقوف ہے۔ ٹام یو آر این ایڈیٹ[2]

---

[1] بکومت مس موہن اور بکومت ٹام۔ [2] ٹام تم گاؤدی ہو۔

(Tom you are a fool) "ٹام یو آر اے فول"[1] ہر وقت ہوتا رہتا ہے اور یہ ٹام (Tom) کے لئے بہترین ٹانک (Tonic) ہے۔ اگر ذرا اردو میں کہہ دیں کہ "دمتی۔ تم اُلو ہو" تو آنسوؤں کی جھڑی لگ جائے۔

لیڈی موہن (مادرانہ شفقت سے) اور تو کوئی وجہ اس تبدیل نام کی نہیں؟

اشتہ (چونکتا ہو کر) اس سوال کی آپ سے توقع نہ تھی مگر اس لئے کہ کسی قسم کی غلط فہمی نہ رہے صاف عرض کئے دیتا ہوں کہ ٹام کے اور میرے مذہب میں دو لفظوں کا استعمال قطعی حرام ہے

لیڈی موہن (بے انتہا دلچسپی سے) کیا دو لفظ؟

اشتہ اول لَو[2] (Love) اور دوسرے پیٹریٹزم[3] (patriotism) ہماری رائے میں یہ دو وہ ذلیل جذبات ہیں جن سے دنیا برباد ہے اور اپنے لئے ہم دونوں نے قطعی فیصلہ کیا ہے کہ ان دو جذبات سے اپنی روح کو آلودہ نہ ہونے دیں گے۔

لیڈی موہن۔ کیا جو ریہرسل آج ہونے والا ہے وہ ان دو جذبات کے خلاف ایک نئے روحانی جذبے کی جنگ ہے۔

اشتہ۔ لیڈی موہن۔ میرا پارٹ تو صرف ایک فلاسفر کا تھا اور توقع یہ تھی کہ ٹام کو جج بنا کر میں بطور ملزم پیش کیا جاؤں گا۔ اور مجھ پر فلاسفر ہونے کی فردِ جرم لگا کر سزا اُس سے تجویز کرائی جائے گی۔ مگر ریہرسل تو آج ملتوی ہو گیا۔

(دمتی داخل ہوتی ہے)

لیڈی موہن۔ دمتی سنتی ہو۔ یہ تو کہہ رہے ہیں کہ ریہرسل ملتوی ہو گیا؟

دمتی (سخت تعجب اور مایوسی سے) ملتوی ہو گیا؟ کیسے ہو گیا؟ کیا ہوا؟

اشتہ۔ لوگوں کو اپنے پارٹ یاد بھی نہیں اور پسند بھی نہیں۔ میں ابھی نوٹس جاری کر کے آیا ہوں کہ ریہرسل کی تاریخ پھر مقرر کی جائے گی۔

لیڈی موہن۔ دمتی! اگر مسٹر اشتہ تمہارے سامنے بطور ملزم پیش ہو اور اس پر فردِ جرم یہ ہو کہ یہ فلاسفر ہے تو تم کیا سزا دو؟

دمتی۔ فلاسفر ہونے کے لئے لازم ہے کہ سر گنجا ہو اور بیوی ترشرو ہو۔ سب سے پہلے تو فردِ جرم کی ترمیم کروں اور یہ جرم عاید کروں کہ یہ شخص نقلی فلاسفر ہے کیونکہ بیوی ندارد اور بال موجود۔ پھر سزا یہ دوں کہ تین توام بچوں کا باپ اسے بنایا جائے کیونکہ فلاسفروں کے تین ہی بچے ہیں۔

لیڈی موہن۔ بچوں کے نام؟

دمتی۔ کیوں؟ کیا؟ اور کیسے؟ (یہ کہہ کر دمتی پھر کمرے سے نکل جاتی ہے۔ چلتے چلتے دروازے میں کھڑے ہو کر کہتی ہے) آنٹی ریہرسل نہیں ہے تو یہ ساڑھی بدل کر ابھی آتی ہوں۔ (چلی جاتی ہے)

لیڈی موہن۔ مسٹر اشتہ! آپ میری موجودگی میں تو مس ڈی کو ٹام نہ کہئے اور سارے اس کے ہم جماعت بے تکلف اسے دمتی پکارتے ہیں

---

[1] ٹام تم گدھے ہو [2] عشق [3] حب وطن

اشتہ تعمیل ارشاد میں عذر نہیں مگر مجھ میں اور دوسروں میں فرق ہے۔ ان کے لئے دمنی صرف ایک ملکہ ہے۔
لیڈی موہن ۔ اور تمہارے لئے؟
اشتہ ۔ میرے لئے؟ (نہایت نرم آواز سے) دمنی! میرے لئے یہ نام نہیں۔ میرے بہترین خوابوں بہترین آرزوؤں کے لئے (کھل سم سم) Open Sesame ہے۔ مشہور شعر میں دمنی کسی شاعر کا نازک خیال ہے۔

(لیڈی موہن اس تعریف سے بے انتہا متاثر ہوتی ہے۔ اشتہ بھی کچھ بے خودی کی حالت میں آنکھیں بند کر کے نہایت دھیمی آواز سے دمنی! دمنی!! دمنی!!! کہتا چلا جاتا ہے گویا یہ وہ راگ ہے جس کے لئے اس کی زندگی وقف ہے۔ دمنی چپکے سے پشت کی طرف سے داخل ہو کر اشتہ کی آنکھوں پر دونوں ہاتھ رکھ دیتی ہے۔ اشتہ فوراً چونکنا ہو کر اُس کے ہاتھ ہٹا دیتا ہے اور کہتا ہے۔

اشتہ ۔ ڈونٹ بی اے فول ٹام[1] (d.ont be a fool Tom) (دمنی پھر کمرے سے بھاگ نکلتی ہے)
لیڈی موہن ۔ تم تو کہتے تھے کہ کوئی (محبت) کا لفظ بھی استعمال کرنا حرام ہے؟
اشتہ (شرما کر، سر جھکا کر) آپ کی اجازت سے حرام حلال ہو سکتا ہے

(لیڈی موہن کچھ کہنے کو تھیں کہ خدمتگار داخل ہوتا ہے)

خدمتگار ۔ حضور! ایک پروفیسر صاحب اور کئی کالج کے صاحب لوگ آنا چاہتے ہیں۔
لیڈی موہن ۔ ضرور بلوالو

(پروفیسر کرپا رام، مسٹر ودیا شنکر اور چھ سات طالب علم کمرے میں داخل ہوتے ہیں۔ طالب علم تو نہایت ادب سے جھک کر سلام کرتے ہیں مگر پروفیسر صاحب بڑھ کر لیڈی موہن سے ہاتھ ملاتے ہیں۔ اشتہ لیڈی موہن کے پاس سے اٹھ کر الگ ایک طرف کو ہو جاتا ہے۔ جتنے لوگ داخل ہوتے ہیں اُن کی نگاہیں گویا چاروں طرف دمنی کی متلاشی ہیں)

لیڈی موہن ۔ آپ سب تشریف رکھیں۔
ودیا شنکر ۔ لیڈی موہن! آج کالج میں عجیب عجیب خبریں مشہور ہو رہی ہیں۔ کوئی کہتا ہے کہ پروفیسر صاحب سکھ ہو گئے ہیں میری نسبت سب کو یقین ہے کہ میں خفیہ طور پر عیسائی ہو چکا ہوں۔ کئی لوگوں نے مجھے گرجا سے نکلتے دیکھا ہے۔ اشتہ کی نسبت مشہور ہے کہ اُس نے جوگی بن کر جنگل کی راہ لی ہے۔ دمنی کی نسبت افواہ ہے کہ کسی مسجد میں قرآن پڑھ رہی ہے۔ پروفیسر صاحب کے لکچر سے آدھے ہندو مسلمان ہو چکے ہیں اور ان کی کتاب سے آدھے مسلمان ہندو ہونے کے آرزومند ہیں۔
پہلا طالب علم ۔ لیڈی موہن! یہ بھی مشہور ہے کہ اسمبلی نے قانون پاس کر دیا ہے کہ ہر شخص دن میں تین دفعہ اپنا مذہب بدلے تاکہ ہندوستان میں قومیت کا رنگ پختہ ہو
لیڈی موہن ۔ تم دونوں کیسی بہکی بہکی باتیں کرتے ہو! پروفیسر صاحب آپ انہیں کیوں نہیں سمجھاتے۔

---
[1] ٹام عقل سے کام لو

پروفیسر کرپا دیالم ۔ آج کل طالب علموں کی طبیعت میں ذرا چلبلا پن ہے اور سائکالوجی (Psychology) کے ماہرین اسے دبائے رکھنا پسند نہیں کرتے ۔ اس لئے جب میں طالب علموں کو کسی وقت بے تکی باتیں کرتے سنتا ہوں تو خوش ہوتا ہوں کیونکہ پھر وہ اپنی سٹڈی زیادہ انہماک سے کرتے ہیں

ودیا شنکر ۔ لیڈی موہن! سائکالوجی اور پولیٹیکل مصلحت دونوں کا تقاضا یہی ہے کہ طالب علموں کے سر نہ ہوا جائے۔

پروفیسر (بات بدلنے کے لئے) مس موہن کہاں ہیں؟

لیڈی موہن ۔ ابھی یہیں تھی ۔ آتی ہی ہوگی ۔ لو آگئی۔

(دمنتی داخل ہوتی ہے ۔ پروفیسر کو "گڈ مارننگ ۔ سر!" کہتی ہے طالب علم "ہلیو دمنتی ہیلو دمنتی" کہہ کر ہاتھ ہوا میں ہلا کر خیر مقدم کرتے ہیں)

پروفیسر ۔ مس موہن! کیا میرا خط آپ کو ملا؟

دمنتی ۔ جی ہاں ۔

(پروفیسر کے بشرے سے ظاہر ہوتا ہے کہ وہ دمنتی سے الگ بات کرنا چاہتا ہے ۔ دمنتی تاڑ جاتی ہے)

دمنتی ۔ جناب! یہ سب میرے کلاس فیلو میرے دوست ہیں اور میری آنٹی تو گویا میری سہیلی ہیں ۔ آپ ان کے سامنے ہی مجھے سمجھا دیجئے۔

پروفیسر ۔ کیا اس گپ کی کچھ بنیاد ہے کہ تم میرے لیکچر سے متاثر ہو کر مسلمان ہونا چاہتی ہو۔

دمنتی ۔ صرف اسی قدر یہ گپ بے بنیاد نہیں کہ ہم سب طالب علموں نے اور بالخصوص میں نے اس لیکچر کا بار بار ذکر کیا اور ہم سب اس نتیجے پر پہنچے کوئی مسلمان بھی شاید اسلام کی خوبیاں اس فصاحت سے بیان نہ کرتا ۔ آپ کی تقریر آپ کی تحریر سے بھی بڑھ کر موثر ہے۔

پروفیسر ۔ تقریر میں مبالغہ لازمی ہے۔

دمنتی ۔ ہم تو آپ کے ایک ایک لفظ کو سچ سمجھے۔

پروفیسر ۔ مجھے یہ سن کر بڑی خوشی ہوئی کہ تم نے میرے لیکچر کو پسند کیا مگر میں اصولاً تبدیل مذہب کے خلاف ہوں۔

دمنتی ۔ میں بھی قطعی خلاف ہوا کرتی تھی مگر اب تو میری رائے بدلتی جاتی ہے ۔ انسان کو چاہئے کہ مختلف مذاہب کو عارضی طور پر آزمائے اور پھر اس مذہب میں رہ جائے جس کے عقیدے اسے خود خوبصورت معلوم ہوں ۔ مذہب کو خوبصورتی کے لئے چننا چاہئے نہ کہ صداقت کے لئے ۔ مذہب میں حسن سب کچھ ہے صداقت کچھ بھی نہیں۔

پروفیسر ۔ کیسی بھولی باتیں کرتی ہو ۔ مذہب لمبے ہیں ۔ زندگی چھوٹی ہے ۔ راہ راست ہر مذہب میں موجود ہے ۔

دمنتی ۔ جی ہاں ۔ بالکل بجا ارشاد ہوا مگر یہ مجھے کیسے علم ہو کہ جس مذہب میں میں پیدا ہوئی اس کا راہ راست میری خاص طبیعت کے لئے خوبصورت بھی ہے ۔ میں دعا کی قائل ہونا چاہتی ہوں مگر اس لئے نہیں کہ دعا ایک اچھی چیز ہے بلکہ محض اس لئے کہ دعا ایک خوبصورت چیز ہے ۔ دعا میں بلا کا زور ہے ۔ اپنی عاجزی کے بھروسے پر انسان تقدیر کے پہاڑ کو اکھاڑ کر پھینک دینے کی آرزو رکھتا ہے۔

پروفیسر۔ یہ لمبی بحث ہے۔ پھر کسی وقت سمجھا دوں گا۔ (لیڈی موہن سے مخاطب ہو کر) اب مجھے اجازت دیجئے (کھڑا ہو جاتا ہے)

لیڈی موہن۔ ذرا تو آپ ٹھہریں۔ ان بچوں کے ساتھ چاء میں شامل ہوں (پروفیسر صاحب بیٹھ جاتے ہیں)

دمنتی۔ پروفیسر صاحب۔ کیا یہ بات سچ ہے کہ لکچر آپ نے کسی پولیٹیکل مصلحت سے دیا تھا؟

پروفیسر (مسٹر ودیا شنکر کو گھورتے ہوئے) ودیا شنکر کو میں نے مفصل سمجھا دیا ہے۔

ایک طالب علم۔ جناب اجو بات ودیا شنکر کو مفصل سمجھائی جائے وہ مسٹر ودیا شنکر سو دفعہ دہرائیں پھر بھی نہیں سمجھتے۔

دوسرا طالب علم۔ جناب! مفصل کوڑمغزی کا دوسرا نام ودیا شنکر ہے۔

تیسرا طالب علم (بناوٹی جوش سے) پروفیسر صاحب! آپ کیوں صاف نہیں کہہ دیتے کہ لیکچر آپ نے ہرگز کسی پولیٹیکل مصلحت سے نہیں دیا۔

پروفیسر۔ اس میں کیا شک ہے۔

بہت سے طالب علم (شور مچا کر) ودیا شنکر کا جھوٹ کھل گیا۔ ودیا شنکر کا جھوٹ کھل گیا۔

ودیا شنکر۔ میرے پاس پروفیسر صاحب کی اپنی تحریر موجود ہے کہ اسلام کی مبالغہ آمیز تعریف محض پولیٹیکل مصلحت تھی (یہ کہہ کر پروفیسر کا خط جو صبح اُس نے دمنتی کو دیا تھا جیب سے نکال کر سب کو دکھلاتا ہے۔ سب طالب علم خط کو دیکھ کر (oh! oh!) اوہو اوہو کا شور مچاتے ہیں پروفیسر شرم کے مارے سر جھکا لیتا ہے)

لیڈی موہن۔ پروفیسر صاحب! آپ بالکل خفا نہ ہوں۔ یہ ان لڑکوں کی دل لگی ہے۔ کیا آپ کو اتنا بھی پتا نہیں کہ آج یکم اپریل ہے۔

پروفیسر۔ لیڈی موہن تھینک یو۔ اگر یہ طالب علم مجھ پر کچھ ہنس لیں تو مجھے بُرا معلوم نہیں ہوتا کیوں نہ ہنسیں؟

ودیا شنکر (پروفیسر کی فراخ حوصلگی اور خوش مزاجی سے متاثر ہو کر) جناب! ہم سب آپ کو یقین دلاتے ہیں کہ یہ تمام مذاق محض اتفاقیہ تھا ہم سب دل سے آپ کے فرمانبردار ہیں۔

سب طالب علم۔ بیشک۔ بیشک۔ تھری چیرز فور پروفیسر (سب لڑکے خوب تالیاں بجاتے ہیں)

سب لڑکے۔ لیڈی موہن آپ اجازت دیں تو ہم پروفیسر صاحب کو اپنے ساتھ لے جائیں اور لورنگ (Lorang) میں چائے پلائیں ضرور اجازت دیجئے

لیڈی موہن۔ اچھا آپ کی خوشی

(سب طالب علم اور پروفیسر لیڈی موہن کو آداب کہہ کر چلے جاتے ہیں۔ لیڈی موہن بھی چلی جاتی ہے۔ صرف اشتہ اور دمنتی رہ جاتے ہیں)

دمنتی۔ اشتو! تم بھی مجھے اب دمتی کہا کرو۔

اشتہ۔ کیوں دمتی؟

دمنتی۔ میں لائق ہونے کے مذہب سے تھک چکی ہوں۔ زندگی ایک اتفاقیہ مذاق ہے۔ اس میں وہی اچھے ہیں جو فول بنائے جانے پر بھی ہنس دیں۔

اشتہ (نہایت پیار بھری میٹھی آواز پیار بھری میٹھی نگاہوں سے) دمتی! دمتی!! دمتی!!!

لیڈی موہن (ایک طرف الگ) ارے تو گرفتار ہو! تم نے فلم سے بھی کچھ نہ سیکھا۔

فلک پیما

لہ الو بنائے جانے پر۔

جلاوطن شہزادی کا خط

شہزادہ میرزا جواں بخت ولیعہد آخری بہادر شاہ، بادشاہ کی بیوی اپنے شوہر اور اپنے ساس سسر دل کے ساتھ قید ہو کر دہلی سے رنگون گئی تھیں۔ وہاں سے انہوں نے اپنی والدہ کے نام دہلی میں جو خط لکھا تھا وہ اگرچہ آج کل محفوظ تو نہیں ہے لیکن جس قدر مفہوم اس خط کا اب مجھے معلوم ہو سکا اُس کو میں نے اپنی زبان میں یہاں لکھ دیا۔ جو دہلی کے واقعاتِ غدر کے سلسلہ میں ایک خاص اور اہم چیز مانا جائیگا۔

حسن نظامی

ازرنگون ملک برہما۔ دہلی کے قیدی بادشاہ کا گھر

اماں حضرت کو آداب!

میں آپ کی بیٹی کالے پانی کے ملک میں ہوں۔ اپنے وطن دِلّی سے ہزاروں کوس دور میکہ سے جدا اور ایسی جدا کہ اب جیتے جی کبھی کسی میکہ والے سے ملنے کی آس نہیں ہے آپ کا خط سائیں سہیل شاہ صاحب لے کر آئے تھے جب وہ حضور (بہادر شاہ) سے باتیں کر رہے تھے میں نے چلمن میں سے دیکھا زار و قطار رو رہے تھے۔ اور حضور کی آنکھوں میں بھی آنسو تھے باتیں کر کے سائیں صاحب ان کے (جواں بخت کے) ساتھ میرے کمرہ میں آئے اور خط دیا۔ خط دیتے ہی رونے لگے ——— مجھے بھی وہ وقت یاد آ گیا جب میری شادی ہوئی اور غالبؔ ذوقؔ کے سہروں کا چرچا ہوا اور میں نے آپکے ذریعہ وہ دونوں سہرے منگائے تو یہی سائیں سہیل شاہ لے کر آئے تھے ——— اس وقت میں ولیعہد ہندوستان کی ملکہ تھی۔ سائیں صاحب سات ڈیوڑھیوں اور پہرہ داروں کو عبور کر کے مجھ تک آتے تھے۔ آج میں ایک جلاوطن قیدی ہوں۔ اور ایک قیدی کی بیوی ہوں۔ قیدی ساس اور قیدی سسرے کی بہو ہوں۔ اب یہاں نہ وہ لال قلعہ ہے نہ پہرہ دار ہیں نہ سات ڈیوڑھیاں ہیں۔ بس لکڑی کا بنا ہوا ایک مکان ہے جو برسات میں ٹپکتا ہے اور جس میں دو چار کمروں کے سوا زیادہ گنجائش نہیں ہے۔ ایک کمرہ میں حضور (بہادر شاہ) اور ملکۂ عالم (زینت محل) کی خواب گاہ ہے۔ دوسرے میں میرا اور ان کا (جواں بخت کا) بستر ہے۔ تیسرے میں نوکر ہیں۔ چوتھے میں کھانے پینے جلنے کا انتظام ہے ——— مجھے یہاں کی ہوا راس نہیں آئی۔ بارش بہت ہوتی ہے۔ مچھر بھی بہت ہیں۔ مکان بھی پرانا اور بوسیدہ ہے۔ اکثر بخار ہو جاتا ہے۔ حضور اور ملکۂ عالم بھی ہمیشہ بیمار رہتے ہیں۔ بس خدا کے فضل سے یہ (جواں بخت) ایک ایسے ہیں جن کو یہاں کی ہوا سے کچھ نقصان نہیں ہوا ——— آپ نے دِلّی کی تباہی کا جو حال لکھا ہے وہ تو ہم جب دِلّی میں تھے اپنی آنکھوں سے دیکھ کر آئے تھے۔ ہاں آکا بھائی (بڑے بھائی) کی پھانسی کا حال اس خط سے معلوم ہوا۔ وہ تو غدر کے دنوں میں بنارس گئے ہوئے تھے۔ ان کو کس خطا پر پھانسی دی؟ یہ بات آپ نے نہ لکھی۔ سائیں صاحب سے میں نے پوچھا تھا کہنے لگے۔ حضرت سید حسن عسکری کو پھانسی دی گئی تو کسی نے کہہ دیا کہ یہ بھی شاہ صاحب کی سازش میں شریک تھے اور شاہِ ایران کو جو خط گیا تھا اُس میں ان کا بھی دخل تھا۔ اور بنارس بھی اسی غرض سے گئے تھے کہ بات چھپانے کا ایک بہانہ ہو جائے ——— میں نے آکا بھائی کا حال سنا کہ اُن کو بڑی بے دردی سے پھانسی دی گئی۔ اور آپ خود پھانسی کے وقت موجود تھیں۔

تو مجھے مارے غم کے غش آنے لگا ——— ہم جب دہلی سے جلا وطن ہو کر چلے ہیں اُس وقت تک تو وہ بنارس سے آئے نہیں تھے۔ اُن کی چھوٹی لڑکی کا بیان کر کر کے رونا سائیں صاحب سے سنا تو کلیجہ منہ کو آنے لگا۔ سعیدہ سلطان کی عمر شاید چار برس کی ہو گی اس کو کیا خبر کہ باپ کہاں چلا گیا۔ اور اس کو کیوں پھانسی دے دی گئی۔ جب میں نے سعیدہ کی یہ بات سنی کہ آکا بھائی کی لاش گھر میں آئی تو اُس نے آپ سے کہا۔ ابا حضرت ہم سے خفا ہو گئے۔ بولتے نہیں۔ آنکھ بند کئے لیٹے ہیں تو میرا کلیجہ ٹکڑے ٹکڑے ہو گیا۔ سعیدہ مجھے بہت یاد آتی ہے اور جب سے آکا بھائی کے مارے جانے کا حال سنا ہے۔ سعیدہ کا خیال روز آتا ہے ہوئی مٹی کی نشانی ہے میں اس کو دیکھتی تو دل کے زخم پر مرہم لگ جاتا۔ مگر میں کہاں؟ سعیدہ کہاں؟ اور میرے ماں باپ کہاں؟ اور میرا دلی شہر کہاں؟ ———

اب تو کوئی امید دلی آ سکنے کی نہیں ہے۔ ہمارے بزرگوں پر بہت سے بُرے وقت آ چکے ہیں حضرت بابر پر ہم سے زیادہ مصیبتیں پڑ چکی ہیں مگر وہ اتنے مایوس نہیں تھے جتنے ہم مایوس ہیں۔ کیونکہ اُن کی ہمت کے سامنے ساری دنیا کے دروازے کھلے ہوئے تھے۔ اُن کی تلوار میں زور تھا۔ وہ جب چاہتے تھے ہزاروں لاکھوں آدمی اُن کی حمایت کے لئے کھڑے ہو جاتے تھے۔ اور اُن کی مصیبت دور ہو جاتی تھی مگر ہماری یہ حالت ہے کہ اس شہر کا ایک آدمی بھی ہمارا ہمدرد نہیں معلوم ہوتا۔ اور دنیا میں ہمدردی جب ہی ہوتی ہے کہ ہمدردی کرنے والے کو کسی سے کچھ امید ہو اور توقع ہو۔ ہم سے کسی کو کیا امید ہو گی۔ اور کیا توقع ہو گی۔ سب جانتے ہیں کہ ہماری حکومت ختم ہو چکی۔ ہمارے اقبال کا چراغ گل ہو چکا۔ ہمارے سب حمایتی مر چکے۔ اب جو ہماری مدد کا ارادہ کرے گا یا ہم سے ہمدردی رکھے گا۔ اُس کو قید ہو گی یا پھانسی اور کوئی انعام و اکرام ہم اُس کو نہ دے سکیں گے۔ حضرت امام حسین کے قاتلوں کو یزید کے دربار سے بہت کم گزارہ ملتا تھا یعنی فی کس ڈیڑھ سیر جو دیئے جاتے تھے۔ اور قاتلوں نے محض ڈیڑھ سیر جو کی خاطر رسول اللہ کے نواسوں کو قتل کر دیا ——— اگر حضرت امام حسین ڈیڑھ سیر جو شاہی فوج کو فی آدمی دے سکتے تو وہ قاتل حضرت امام حسین کے ساتھ ہو جاتے۔ ہمارا حال بھی ایسا ہی ہے۔ کہ آج ہم اپنے ہمدردوں اور حمایتیوں کو ڈیڑھ سیر جو بھی نہیں دے سکتے پھر کوئی ہم سے کیوں ہمدردی کرے۔ اور ہماری حمایت کا خیال اُس کے دل میں کیوں آئے یہ دنیا تو امید اور توقع سے قائم ہے جب ہم کسی کی امید اور توقع پوری نہ کر سکیں تو وہ ہماری مدد کیوں کرے۔

اس ملک کی زبان اور ہے مذہب اور ہے۔ رہنا سہنا کھانا پینا سب ہم سے جنبی ہے۔ وہ جانتے بھی نہیں کہ ہم کون ہیں اور یہاں ہم کیوں قید کیا گیا ہے۔ اماں جی ہماری یہ قید ایسی قید ہے کہ نہ ہم قیدی ہیں نہ آزاد ہیں نہ زندہ ہیں نہ مردہ ہیں۔ اپنے گھر میں اور اپنے شہر میں اور اپنے ملک میں جا نہیں سکتے اس لئے قیدی ہیں اور طوق زنجیر گلے میں اور پاؤں میں نہیں ہے اس لئے آزاد ہیں۔ سب دوستوں قرابت داروں سے جبراً جدا ہیں اس لئے مردہ ہیں۔ بولتے چالتے کھاتے پیتے ہیں اس لئے زندہ ہیں ——— کہاں تک لکھوں سائیں سہیل شاہ کی زبانی سب حالات معلوم ہو جائیں گے ——— سعیدہ سلطان (آکے بڑے مقتول بھائی کی لڑکی) کو گود میں لینا سینہ سے لگانا منہ چومنا اور کہنا کہ پھپھو کا پیار لو۔ ابا حضرت کو یاد نہ کرو۔ ہم کو بھی بھول جاؤ۔ نہ وہ ملیں گے نہ ہم ملیں گے۔ وہ قبر میں ہیں اور ہم بھی قبر میں ہیں۔ اُن کی قبر اپنے وطن میں ہے مگر ہماری قبر پردیس میں ہے۔ جب تک زندہ ہیں قبر میں ہیں اور جب مر جائیں گے تب بھی قبر میں رہیں گے۔

آداب اماں جانی تسلیم۔ خالی گود والی
آپ کی بیٹی

حسن نظامی

کام سندیس

جاگے دنیا والے اور تو نینوں نیند سموئے
چھینے دنیا والے اور تو اپنے آپ کو کھوئے
جاگ جاگ رے سونے والے ایسا کوئی نہ سوئے

اس دنیا کے ڈھنگ نرالے، دکھ بن سکھ نہ ہوئے
کام کرے جو وہ پھل پائے، کاٹے وہ جو بوئے
جاگ جاگ رے سونے والے ایسا کوئی نہ سوئے

ہاتھ ہلے بن کوئی نہ پوچھے سن لے بات ہماری
ہاتھ ہلے تو کام چلے یہ محنت سب کو پیاری
جاگ جاگ رے سونے والے ایسا کوئی نہ سوئے

ڈھیل ڈھال کا سمے نہیں اب چھوڑ یہ آناکانی[۱]
اپنے پیروں آپ کھڑا ہو، اُٹھ جلدی لے گیانی
جاگ جاگ رے سونے والے ایسا کوئی نہ سوئے

"بڑھے چلو" کی آئیں صدائیں، جاگی دنیا ساری
کام کاج کی چلیں ہوائیں، موت ہے اب بے کاری
جاگ جاگ رے سونے والے ایسا کوئی نہ سوئے

قدم بڑھا اب آگے پیارے ہار نہ ٹانک ٹوٹے
تیری اس غفلت اور ڈھیل پہ بھارت بھومی روئے
جاگ جاگ رے سونے والے ایسا کوئی نہ سوئے

سید مقبول حسین احمد پوری

۱؎ آناکانی غفلت

آزاد نگارستان[1] اور دادا جان

مل گئی۔ آخر نگارستان کو کامل آزادی مل ہی گئی۔ اور کیوں نہ ملتی۔ اس ایک آزادی کے لئے یہاں والوں نے کیا کیا نہیں کئے۔ کھیتوں کی کاشتکاری چھوڑ دی۔ نہروں سے پانی لینا چھوڑ دیا۔ ولایتی کپڑے کا خریدنا چھوڑ دیا۔ تجارت میں حصہ لینا چھوڑ دیا۔ بنکوں سے حساب کتاب چھوڑ دیا۔ دوکانوں پر چوکس کی۔ شہروں پر ڈاکے ڈالے۔ ریلوں کے پل اُڑائے۔ اپنوں اور غیروں پر طمنچے چلائے۔ فوجوں کی گولیاں کھائیں۔ پولیس کے ظلم سہے۔ جیلخانوں میں چھاؤنی چھائی۔ پھانسیوں پر جان گنوائی۔ آخر آزادی آئی اور بڑے زور سے آئی۔ حکومت ملی اور پوری حکومت ملی۔ خیر ایک جھگڑا گیا۔ مگر دوسری مصیبت یہ پیش آئی کہ حکومت کریں تو کیونکر کریں اور حکومت کرے تو کون کرے۔ لیڈروں کو دعویٰ تھا کہ یہ سب کچھ کیا دھرا ہمارا ہے۔ نوجوانانِ وطن کو ادعا تھا کہ اگر ہم اپنی جانوں پر نہ کھیلتے تو تمہاری چیخ پکار کوئی نہ سنتا۔ کسانوں کو زعم تھا کہ اگر ہم لگان دینا بند نہ کرتے اور گھر سے بے گھر نہ ہو جاتے تو یہ سارا بنا بنایا کھیل بگڑ جاتا۔ غرض ملک کا ہر شخص سمجھے بیٹھا تھا کہ میں نہ ہوتا تو کچھ نہ ہوتا۔ اور ہر شخص دعویٰ دار تھا کہ اب جو کچھ ملا ہے اس میں سے ہمارا حصّہ بھی سیدھے ہاتھ سے رکھ دو۔

سب سے پہلی مصیبت انتخاب کی پیش آئی۔ انتخاب کے جو حلقے قائم ہوئے تھے ان میں ایک حلقہ ہمارے قصبہ امین آباد کا بھی تھا۔ یہاں آکر ایک وکیل صاحب نے دورے ڈالنے شروع کئے۔ لوگوں کو اپنی کارگزاری جتائی۔ آئندہ امداد کے وعدے کئے۔ یہاں لکچر دیا۔ وہاں لکچر دیا۔ غرض تھوڑے ہی دنوں میں قصبہ میں خاصا اثر پیدا کر لیا۔ ایک دن خدا کا کرنا کیا ہوتا ہے کہ میں اور دادا جان شام کے وقت ٹہلنے نکلے۔ دادا جان کی عمر کوئی ستّر کے لگ بھگ ہوگی۔ مگر اب بھی خوب تگڑے ہیں۔ خوراک تو ماشاء اللہ ایسی ہے کہ کسی جوان کی بھی کیا ہوگی۔ صبح اُٹھتے ہی من بھر کی جوڑی کے سو ہاتھ نکال جاتے ہیں جب کہیں ناشتہ پر بیٹھتے ہیں۔ پرانے زمانہ کی ہڈیاں ہیں۔ مکّا ماریں تو بھینس کو بٹھا دیں۔ اگلے وقتوں کے لوگ ہیں اس لئے خیالات بھی ویسے ہی دقیانوسی ہیں۔ سودیشی مال ہمیشہ سے استعمال کرتے ہیں۔ جب ملک میں بدیشی مال کا بائیکاٹ اور سودیشی کی تحریک شروع ہوئی تو انہوں نے گھر بھر کا سارا بدیشی مال نکال دیا۔ تھے سمجھدار اس لئے جلانے کی بجائے خاصے اچھے داموں میں دوسروں کے ہاتھ فروخت کر دیا۔ کہا کرتے تھے کہ "بیٹا تمہارے لیڈروں سے ہم بہت زیادہ سمجھدار ہیں وہ آج سودیشی بدیشی کا جھگڑا لے کر بیٹھے ہیں۔ ہم جس دن سے پیدا ہوئے اُس دن سے اس بات کو سمجھے ہوئے تھے۔ تم کو لاکھ سمجھایا مگر تمہاری خاک سمجھ میں نہ آیا۔ ولایت کے مال پر جان دیتے تھے ولایت کے فیشن پر جان دیتے تھے۔ اور مجھ سے پوچھو تو ولایت کے مذہب پر بھی جان دیتے تھے۔ یہ دوسری بات ہے کہ لوگوں کی شرم شرمی منہ سے نہ کہتے تھے۔ اب تم ہی بتاؤ کہ جو ہم کہتے تھے وہ ٹھیک تھا یا جو تم کہتے

[1] نگارستان سے مراد چین نہیں ہے بلکہ وہ ملک ہے جہاں انگریز Niggers (کالی پگڑی والے) رہتے ہیں۔

تھے وہ ٹھیک تھا"۔ خیر میری تو کیا مجال تھی کہ ان کے سامنے زبان ہلاتا۔ اچھے بڑے بڑوں کو ان کے سامنے کچھ ہمت نہ ہوتی تھی۔ اور جو خدانخواستہ کہیں کسی نے منطقی دلائل سے ان کو چپ کرنا یا زبان کے زور سے ان کو دبانا چاہا تو سمجھ لو کہ قیامت آگئی۔ زبان تو زبان ان کو لکڑی کے ہاتھ دکھانے میں بھی تامل نہ ہوتا تھا۔ ان کا غصہ سارے امن آباد میں مشہور تھا۔ مگر اس غصے کے باوجود لوگوں کے ساتھ ان کا برتاؤ اور وقت پر سلوک ایسا تھا کہ تمام قصبہ ان پر جان دیتا تھا۔ بھلا ممکن تھا کہ کسی شخص پر برا وقت پڑے اور دادا جان اس کے آڑے نہ آجائیں۔ کسی کے ہاں شادی غمی ہو اور دادا جان اس میں شریک نہ ہوں۔ کسی کا ہاتھ تنگ ہو اور دادا جان اس کی مدد نہ کریں۔ نتیجہ یہ تھا کہ ادھر انہوں نے کسی بات میں "ہاں" کی اور ادھر سارے قصبے والے "اس" ہاں میں ان کے شریک ہوگئے۔ انہوں نے کسی بات میں "نہیں" کی اور ہر شخص کے منہ سے "نہیں" نکلنے لگی۔ غرض سارا قصبہ ان کو "دادا جان" کہتا اور وہ سارے قصبہ والوں کو اپنا عزیز سمجھتے۔ نگارستان کو جو آزادی ملی۔ اس کی جدوجہد میں امن آباد نے بڑا بھاری حصہ لیا تھا اور دادا جان کے مشورے سے لیا تھا لیکن جب آزادی مل گئی تو قصبہ والوں کو تو سب بھول گئے۔ اور باہر کے لوگ آکر قصبہ کا حق چھیننے لگے۔ انتخاب کے لئے قصبہ والے تو گئے جہنم میں۔ باہر کے ایک وکیل صاحب نے آکر اپنے لئے ووٹ جمع کرنے شروع کر دیئے۔

تو خیر میں اور دادا جان شام کے وقت ٹہلنے کو نکلے۔ آبادی کے باہر ندی کے کنارے کیا دیکھتے ہیں کہ ہزاروں آدمی جمع ہیں۔ میلہ سا لگا ہوا ہے۔ سودے والوں نے بھی دوکانیں لگالی ہیں۔ وکیل صاحب کے ساتھ والے لوگوں کی خاطریں کرتے پھرتے ہیں۔ مجمع کے بیچ میں ایک موٹر کھڑی ہے۔ شاید بگڑی ہوئی ہے۔ اور سیٹ پر وکیل صاحب کھڑے اپنے انتخاب کے فوائد بیان کر رہے ہیں۔ دادا جان نے مجھ سے پوچھا "بیٹا یہ کیا تماشا ہو رہا ہے"۔ میں نے کہا "دادا جان یہ وہی وکیل صاحب ہیں جو آج کل ووٹ جمع کرنے یہاں آئے ہیں۔ یہ لوگوں سے کہہ رہے ہیں کہ اگر تم نے میرا انتخاب کیا تو میں تمہارے لئے یہ کروں گا اور یہ کروں گا"۔ دادا جان نے کہا "میں اس کی کیا ضرورت ہے اگر لوگ ان کو اچھا سمجھتے ہیں تو پھر ان کو ادھر ادھر مارے مارے پھرنے کی کیا حاجت ہے۔ خود ہی لوگ ان کو ووٹ دیں گے۔ اور اگر ان کو اچھا نہیں سمجھا جاتا تو یہ ہزار غل مچائیں ان کو ووٹ کون دے گا۔ کیا ہمارے ہاں کے لوگ ایسے بیوقوف ہیں کہ اپنا بھلا برا بھی نہیں سمجھتے"۔ میں نے کہا "دادا جان۔ یہ لوگ ووٹ خریدتے ہیں۔ کسی کو روپے پیسے دے کر۔ کسی کو ذرا دھمکا کر کسی کی خوشامد کر کے۔ کسی کو دھوکا دے کر۔ یہاں کوئی صاف صاف کام تھوڑی ہوتا ہے"۔ میرا یہ کہنا تھا کہ دادا جان تو بھڑک ہی گئے۔ کہنے لگے "ہیں۔ یہ کیا کہا۔ تو گویا یہ وکیل صاحب یہاں بدمعاشی کرنے آئے ہیں۔ ذرا میں بھی تو دیکھوں یہ یہاں سے کیا لے جاتے ہیں۔ مصیبت ہم نے بھری۔ زمینیں ہماری نیلام چڑھیں۔ گھر ہمارے بکے۔ مار پیٹ ہم پر ہوئی۔ اور یہ وکیل صاحب اب حصہ بٹانے آئے ہیں۔ بٹانے کیوں کہو سارے کا سارا ہضم کرنے آئے ہیں۔ چلو جی ذرا ہم بھی چل کر سنیں کہ یہ کیا بک رہے ہیں"۔ جب ہم دونوں مجمع کے قریب پہنچے تو لوگوں نے دادا جان کے گزرنے کو جگہ چھوڑ دی مگر دادا جان وہیں ٹھیر گئے اور کہا "میاں بیٹے دو یہیں سے ان کا لکچر وکچر سن لوں گا۔ کوئی بہرا تھوڑی ہوں کہ پاس جائے بغیر مجھے سنائی نہ دے"۔ غرض ہم دونوں مجمع کے سرے ہی پر ٹھیر گئے۔ اس وقت وکیل صاحب فرما رہے تھے "میرے عزیز بھائیو تم کو اپنے کاموں سے اتنی فرصت کہاں ہے کہ ملک کی پارلیمان میں شرکت کر سکو۔ تم میں اتنی تعلیم کہاں ہے کہ وہاں جا کر خود اپنی بہبود

کے لئے کوئی رائے ظاہر کرسکو۔ تم میں اتنی سکت کہاں ہے کہ دارالسلطنت میں رہ کر وہاں کے اخراجات برداشت کرسکو۔ میں تمہارا خادم ہوں مجھے پر تمہارے حقوق ہیں۔ تمہارا فائدہ ہر وقت میرے پیشِ نظر ہے۔ میں تم کو خوشحال دیکھنا چاہتا ہوں۔ میں تمہاری بھلائی کے لئے اپنی جان دینے کو تیار ہوں۔ میں پارلیمان میں تمہاری نیابت کروں گا۔ میں ثابت کردوں گا کہ تم نے مجھ پر جو بھروسا کیا تھا وہ کچھ بے جا نہ تھا۔ میں تمہارے مقابلہ میں اپنے فائدہ کو ہیچ سمجھوں گا۔ میں ظالموں کے پنجے سے تمہیں نجات دلاؤں گا۔ سچ کی مدد کروں گا اور حقدار کو حق پہنچاؤں گا"

وکیل صاحب یہیں تک پہنچے تھے کہ دادا جان نے "ٹھہر جا تو جھوٹا ہے" کا نعرہ اس زور سے مارا کہ سارا میدان گونج اٹھا۔ ہر شخص اُن کی طرف مڑ مڑ کر دیکھنے لگا۔ یہ بھی بھیڑ کو چیرتے پھاڑتے لوگوں کو دھکیلتے دھکا لتے موٹر تک ہی پہنچ گئے۔ اور کہنے لگے "بھائیو۔ اب میں نے اس شیطان کو پہچان لیا۔ یہ بڑا جھوٹا اور دغا باز شخص ہے۔ تمہیں انندا اور مکندا کا مقدمہ تو یاد ہوگا۔ تم ہی بتاؤ کہ اس میں بیچارے انندا پر ظلم ہوا یا نہیں۔ حق انندا کا تھا یا مکندا کا۔ بدمعاش مکندا ایک لنگوٹی باندھے گاؤں میں آیا۔ انندا کے ہاتھ پاؤں پڑ کر اس کے ساتھ رہنے لگا۔ اور آخر اس غریب کا سارا گھر بار۔ ڈھور ڈنگر۔ زمین مکان سب دبا بیٹھا۔ یہی حضرت اس مقدمے میں مکندا کے وکیل تھے۔ جھوٹی گواہیاں انہوں نے دلوائیں۔ جھوٹی دستاویزیں انہوں نے بنوائیں اور اب یہ بے حیا ہمارے ہی سامنے آکر کہتا ہے کہ میں سچ کا ساتھ دیتا ہوں اور حقدار کو حق پہنچاتا ہوں۔ خدا کے لئے اس بدمعاش کے پھیر میں نہ آجانا۔ یہ بہت سے شریفوں کو ٹھکانے لگا چکا ہے۔ اس کی صورت ذرا اچھی طرح دیکھ لو اور پہچان لو کہ یہ وہی شخص ہے کہ جب مال گذاری نہ دینے پر ہماری زمینیں نیلام ہوئی تھیں تو اس نے ساری زمینیں کوڑیوں کے مول اپنے سالے کے نام سے خریدی تھیں۔ وہ تو کہو کہ پہلی سرکار نے معاملہ رفع دفع کردیا ورنہ ان حضرت نے تم سب کو ٹھکانے لگا ہی دیا تھا۔ اور کیوں جی۔ امن آباد کے لوگ کیا مر گئے ہیں کہ اُن کی بجائے یہ پرمُلے والے کیا نام ہے وہاں جاکر ممبر ہوں۔ چل رے پرس رام تجھ کو ممبر بنائیں گے"۔ پرس رام نے کہا "نا جی۔ دادا۔ مجھ سے یہ کام نہ نبڑے گا"۔ دادا جان نے کہا "او۔ برکت اللہ۔ اے۔ او۔ برکت اللہ۔ ادھر آ۔ تو کیوں ممبر نہیں ہو جاتا"۔ برکت اللہ نے کہا "دادا۔ مجھے لکھنا پڑھنا ہی نہیں آتا میں ممبری کیا کروں گا"۔ دادا جان نے کہا "ارے ممبری کے لئے لکھنے پڑھنے کی کیا ضرورت ہے جو سچی بات ہوئی جاکر کہہ دی۔ سب نے مان لی چلو چھٹی ہوئی۔ ممبری کرنے میں کوئی ہاتھی گھوڑے لگتے ہیں۔ اچھا تم میں کوئی ممبر نہیں بنتا تو چلو ہم ممبر بنتے ہیں۔ جاؤ جی وکیل صاحب۔ یہاں سے چلتے ہو۔ اگر آج سے اس قصبہ میں قدم رکھا تو تمہارے حق میں اچھا نہ ہوگا۔ تم نے اس قصبہ کو بھی کیا نانی جی کا گھر سمجھ لیا ہے کہ بھاگے اور آ پہنچے۔ یہ نہیں معلوم کہ یہاں ہم رہتے ہیں۔ بھائیوں۔ اس بلا کو یہاں سے دفع کرو۔ نکالو۔ نکالو۔ اس کو ابھی یہاں سے نکالو"۔ اس کے بعد کچھ نہ پوچھئے کہ کیا ہوا۔ وکیل صاحب تو ہاتھوں ہاتھ خبر نہیں کہاں سے کہاں پہنچ گئے۔ موٹر بیچاری کی وہ گت بنی کہ بیان نہیں ہوسکتی۔ تھوڑی دیر میں یہ پتہ بھی نہیں چلا کہ یہاں کبھی کوئی موٹر تھی بھی یا نہیں۔ ٹکڑے ٹکڑے اور پرزے پرزے ہوکر یاروں میں بٹ گئی۔ وکیل صاحب نے جھٹ جاکر دیوانی اور فوجداری دو دو نالشیں داغ دیں۔ لیکن ثبوت کہاں سے لاتے کسی میں اتنی ہمت تھی کہ دادا جان کے خلاف ایک حرف بھی زبان سے نکالتا۔ دونوں مقدمے خارج ہوگئے۔ اتنے میں ممبری کے انتخاب کی تاریخ بھی آگئی۔ سب نے دادا جان کو ووٹ دیئے۔ اور مزا یہ ہے کہ سب کے سب انتخاب کنندوں نے بجائے ان کے نام کے ووٹوں میں صرف دادا جان لکھا اور اس طرح پارلیمان

کی ایک نشست آنریبل مسٹر دادا جان ایم پی کے نام سے محفوظ ہو گئی۔

دادا جان کے نام کا اعلان ہونے کے تین چار روز بعد پارلیمان کی کارروائی کا پروگرام۔ دو ٹکٹ اور ریل کے درجۂ اول کا پاس آ گیا۔ اجلاس کے دو ہی دن رہ گئے تھے اس لئے دادا جان نے جھٹ پٹ روانگی کا سامان درست کرنا شروع کر دیا۔ کہیں سے ڈھونڈ ڈھانڈ کر کسی وقت و قتان کا ٹاٹ کا بیگ نکالا۔ موچی کو بلوا کر جہاں جہاں سے چوہوں نے کاٹا تھا اُس کو سلوایا گیا۔ دو جوڑے کپڑے لنگی میں لپیٹ کر اس میں رکھے گئے۔ ناریل کا حقّہ، چلم، تماکو، کوئلے اور دیا سلائی کی ڈبیا اور خدا جانے کیا کیا الا بلا اس میں ٹھونسی گئی۔ پرانی دری دھلوائی گئی۔ صاف چادر اور دو موٹے موٹے تکیے اس میں لپیٹ اور اوپر چھتری اور لٹھ رکھ۔ سب کو بان سے کسا گیا۔ ٹین کے لوٹے میں رسّی باندھ کر اس کو بستر ے میں لٹکایا گیا۔ ڈاڑھی اور بالوں میں لوگوں کے بہت کہنے سننے سے خضاب لگایا۔ چونکہ بچارے بالوں نے اس سے پہلے یہ مصیبت کبھی نہیں اٹھائی تھی۔ اس لئے ہر بال نے اپنی طبیعت کے موافق نیا رنگ اختیار کیا۔ ڈاڑھی سیاہی سے شروع ہوئی۔ آگے چل کر طاؤسی رنگ کی ہوئی۔ پھر اور آگے اودی ہوئی اور آخر ہلکے گلابی رنگ پر ختم ہوئی۔ سر کے بال ذرا اچھے رہے کیونکہ سب کے سب مل ملا کر کشمشی رنگ کی ٹوپی بن گئے۔ چلنے کے دن صبح ہی سے دادا جان کا بناؤ شروع ہوا۔ موٹے گاڑھے کا کوئی تین گز کا منڈاسا باندھا۔ بدن پر گاڑھے کی مرزئی پہنی۔ گاڑھے کی تہمد باندھی۔ پاؤں میں ادھوڑی استر کا نعل دار جوتا پہنا۔ روپیوں کی ہمیانی کمر میں لپیٹی۔ اور پارلیمان کے پورے ممبر ہو گئے۔ منجھولی میں بیٹھ کر گھر سے نکلے۔ قصبہ کے باہر تک ہزاروں آدمی پہنچانے آئے "دادا جی کی جے" کے نعرے لگائے گئے اور اس طرح ہم دادا پوتے اسٹیشن کی طرف روانہ ہوئے دادا جان سر تھے کہ تو بھی ساتھ چل۔ میں کہتا تھا کہ آخر میں جا کر کیا کروں گا۔ آپ کام سے جا رہے ہیں۔ میرے بے کار جانے سے کیا فائدہ۔ غرض اسی حیص بیص میں اسٹیشن آ گیا۔ گاڑی کے آنے میں دیر تھی۔ دادا جان کو گھبراہٹ ہو رہی تھی۔ کبھی ریل کو برا بھلا کہتے۔ کبھی ریل والوں کو۔ کبھی کہتے بھئی ہم سے یہ ریل ویل چلانی ذرا مشکل ہے۔ تم ہی دیکھو نا۔ کہ پہلے کیا ٹھیک وقت پر آتی تھی۔ اور آج آنے کا نام ہی نہیں لیتی" میں نے کہا "دادا جان۔ اب ریل کے وقت بدل گئے ہیں" کہنے لگے "یہی تو میں بھی کہتا ہوں کہ ہم لوگوں سے یہ کام سمٹتا نظر نہیں آتا۔ بھلا تم ہی بتاؤ کہ پہلے وقت میں کیا برائی تھی جو بیٹھے بٹھائے اس کو بدل دیا۔ نہیں بھئی یہ کام کچھ وہی لوگ اچھا چلاتے تھے۔ میں تو کمیٹی میں جاتے ہی کہوں گا کہ اس ریل کو پرانی سرکار کے ہاتھ بیچ ڈالو۔ ان کی دیکھی بھالی چیز ہے وہی اس کے کل پرزوں کو خوب سمجھتے ہیں۔ ہم نئے آدمیوں سے یہ کام نہ سنبھلا ہے نہ سنبھلے گا" میں نے ہزار طرح سمجھایا کہ پہلے بھی ریلوں کے وقت بدلا کرتے تھے۔ مگر وہ کسی طرح نہ سمجھے۔ اور یہی کہتے رہے کہ ریل کو تو میں بکوا کر رہوں گا" خیر۔ خدا خدا کر کے ریل آ ہی گئی۔ میں دادا جان کو درجہ اول کے پاس لے گیا۔ انہوں نے اندر جھانکا اور جھٹ باہر نکل آئے۔ میں نے کہا "اندر جائیے" کہنے لگے "یہ ہمارا درجہ نہیں ہے۔ افسروں کا ہے۔ ہم کو وہیں تیسرے درجہ میں لے چلو" بڑی مشکل سے میں نے اُن کو اندر کیا۔ وہاں پارلیمان کے دو ممبر اور بیٹھے تھے۔ انہوں نے جوان کی ہیئت کذائی دیکھی تو کہا Get out! This is First Class.[1]

[1] نکل جاؤ۔ یہ اول درجہ ہے۔

دادا جان انگریزی تو کیا خاک سمجھتے ہاں اِن لوگوں کے چہرے اور الفاظ کے جھٹکے سے جان گئے کہ مجھے نکل جانے کو کہتے ہیں۔ فوراً باہر آ گئے۔ پھر لاکھ سر مارا کہ اندر جا کر بیٹھئے۔ ان لوگوں سے بھی کہا کہ یہ پارلیمان کے ممبر ہیں لیکن دادا جان کسی طرح راضی نہ ہوئے۔ اور ساتھ ہی میرے پیچھے پڑ گئے کہ ساتھ چل۔ آخر میں نے بھی تھرڈ کلاس کا ٹکٹ لیا اور بیک بینی و دو گوش ان کے ساتھ ریل میں سوار ہو گیا۔ تھرڈ کلاس میں بیٹھ کر دادا جان کی طبیعت کھلی۔ پہلے اپنا تھیلا کھولا۔ ناریل نکالا۔ کوئلے جلائے۔ چلم بھری اور اپنے ہم جنسوں سے مزے مزے کی باتیں کرنے لگے۔ اناج کے بھاؤ پر بحث ہوئی۔ سرکاری مالگذاری کے قصے چھڑے۔ مقدمات کا ذکر ہوا۔ نئی گورنمنٹ کے متعلق رائے زنی ہوئی۔ اپنے کارنامے دہرائے گئے۔ پارلیمان کے لئے تحریکات مرتب ہوئیں۔ غرض رات کے گیارہ بجے تک یہی جھک جھک بک بک ہوتی رہی۔ میں تو کھڑکی میں سر رکھ کر سو گیا۔ معلوم نہیں کہ یہ قصے کب تک چلے اور کب ختم ہوئے۔ ہاں صبح جب میری آنکھ کھلی تو دیکھا کہ دادا جان اسی طرح اپنے یار دوستوں میں بیٹھے چلم کے دم لگا رہے ہیں۔

صبح ۷ بجے گاڑی آزاد نگر کے اسٹیشن پر پہنچی۔ اول تو یہ شہر خود ہی بہت بڑا ہے۔ دوسرے پارلیمان کے اجلاسوں کا زمانہ ہونے کی وجہ سے اس کی چہل پہل اور بڑھ گئی تھی۔ اسٹیشن کی یہ حالت تھی کہ آدمیوں سے کھچا کھچ بھرا ہوا تھا۔ مسافروں کی گڑبڑ۔ قلیوں کی چیخ پکار اور سودے والوں کی آوازوں سے کان پڑی آواز سنائی نہ دیتی تھی۔ میں نے دادا جان سے کہا کہ "اُتریے"۔ انہوں نے کہا "میاں۔ ذرا ٹھیرو۔ بھیڑ کو چھٹ جانے دو۔ ابھی جلدی ہی کیا ہے۔ کوئی ریل بھاگی تھوڑی جاتی ہے۔ اتریں گے۔" میں نے کہا "دادا جان۔ اس اسٹیشن پر تو ہر وقت یہی حالت رہتی ہے۔ بس اب اتر ہی آئیے۔ نہیں تو دو چار منٹ میں پلیٹ فارم سے یہ ریل ہٹ جائے گی۔ دوسری ٹرین آ رہی ہے۔" خیر بڑی مشکل سے ان کو اتارا۔ پہلے انہوں نے اپنا سامان پلیٹ فارم پر ایک جگہ جمایا۔ قلی کو بلایا۔ مگر بھلا قلی تھرڈ کلاس والوں کا سامان اٹھانے کب آتے ہیں۔ ان کو درجۂ اول و دوم کے مسافروں کا سامان لے جانے ہی سے کب فرصت ملتی ہے۔ جب کوئی قلی نہ ملا۔ تو تھیلا میں نے اٹھایا۔ بستر دادا جان نے ہاتھ میں لٹکایا۔ اور ہم بڑی مشکل سے دروازے سے باہر نکلے۔ پارلیمان کے ممبروں کو لینے کے لئے سمنٹی موٹریں آئی تھیں۔ وہ سب جا چکی تھیں۔ میں نے دادا جان سے کہا کہ موٹر کرایہ کی لے لیجئے اور ممبروں کی اقامت گاہ پر چلیئے۔ کہنے لگے "میں موٹر ووٹر کچھ نہیں لیتا اور نہ کسی اقامت گاہ پر جاتا ہوں۔ ابھی ریل میں میرے ایک دوست نے بتایا ہے کہ اسٹیشن کے قریب ہی ایک اچھی سرائے ہے۔ نئی بنی ہے۔ آزاد سرائے نام ہے۔ کھانا بھی اچھا ملتا ہے۔ رہنے کا بندوبست بھی اچھا ہے۔ میں تو وہیں ٹھیروں گا۔" میں نے ہزار سمجھایا کہ پوزیشن کے لحاظ سے اب آپ کا سرائے میں ٹھیرنا مناسب نہیں مگر وہ کیا ماننے والے تھے۔ ہم اسٹیشن سے نکلے ہی تھے کہ دادا جان ایک جگہ بلاوجہ کھڑے ہو کر پولیس کے سپاہی کو گھورنے لگے۔ وہ بیچارا بیچ سڑک میں کھڑا سواریوں کا انتظام کر رہا تھا۔ مجھ سے کہنے لگے "بیٹا دیکھنا یہ بیوقوف سڑک کے بیچ میں کھڑا ہو کر ناچ کیوں رہا ہے۔ اور جو خدانخواستہ کسی گاڑی یا موٹر کی ٹکر لگی تو اس کا کیا حال ہو گا۔" میں نے کہا دادا جان یہ سڑک کا انتظام کر رہا ہے جس طرف کا ہاتھ سیدھا کرتا ہے اُس کے یہ معنی ہیں کہ ٹھیر جاؤ جس طرف کا ہاتھ جھکا دیتا ہے اُس سے یہ مطلب ہے کہ اس طرف سے آگے بڑھو۔" کہنے لگے "اوہو۔ یہ بات ہے۔ ترکیب تو خوب ہے۔

مگر اس بچارے پر ظلم ضرور ہو رہا ہے۔ ہاتھ پھرانے پھراتے شل ہو گئے ہونگے۔ غضب ہے بارہ روپے مہینہ تنخواہ دو اور کام ایسا سخت لو۔ کیا اسی کا نام آزادی ہے اور کیا اس بیوقوف کو آزاد کہا جا سکتا ہے۔ جو چند پیسوں کے لئے سڑک پر کھڑا ہو کر ناچے۔ غرض وہ بزرگوار اسی طرح پٹڑی پر کھڑے منطق بگھارتے رہے۔ میں نے کئی دفعہ چلنے کو بھی کہا لیکن وہ اس سپاہی کی حرکات کا ایسے غور سے مطالعہ کر رہے تھے کہ چلنے کا نام ہی نہ لیتے تھے۔ آخر جب میں نے اُن کو یاد دلایا کہ دس بجے سے پارلیمان کا اجلاس ہے اور آپ کو وہاں جا کر حلف لینا ہے اُس وقت اپنی جگہ سے کھسکے۔ آگے چل کر راستہ کا عبور کرنا مشکل ہو گیا۔ ادھر انہوں نے پٹڑی سے نیچے قدم رکھا اور کوئی موٹر پوں پوں کرتی سامنے یا پیچھے سے آئی۔ اور وہ بھاگ کر پھر پٹڑی پر آ گئے۔ میں نے اُن کو سمجھایا کہ آپ جہاں کھڑے ہیں وہیں کھڑے رہئے موٹر خود بچ کر نکل جائے گی۔ اس کے بعد اور آگے بڑھئے اور اسی طرح ٹھیرتے ٹھیراتے سڑک پار کیجئے۔ بڑی مشکل سے انہوں نے سڑک عبور کرنے کی کوشش کی۔ دو ایک دفعہ تو بیچ سڑک سے بھاگ کر پھر اسی پٹڑی پر آ گئے جہاں سے چلے تھے لیکن آخر کار سڑک پار ہو ہی گئے۔ سڑک کے اُس طرف آزاد سرائے تھی۔ وہاں جا کر دو روپیہ روز پر ایک کوٹھڑی لی۔ کھانے کا حساب ٹھیرایا۔ ہاتھ منہ دھو کر تھوڑا بہت کھانا کھایا اور پارلیمان جانے کو تیار ہو گئے۔ مجھے بھی اپنے ساتھ گھسیٹا۔ میں نے کہا بھی کہ مجھے اندر کوئی نہ جانے دے گا۔ مگر انہوں نے میری ایک نہ مانی۔ اور مجھ کو اُن کے ساتھ جانا ہی پڑا۔ سرائے کے دروازہ ہی پر ایک تانگہ کرایہ پر لیا۔ اور ہم دونوں کوئی گیارہ بجے پارلیمان کے دروازے پر جا پہنچے۔ یہاں سے میں تو تانگہ سے اتر کر ایک طرف چل دیا اور دادا جان نے بسم اللہ کہہ کر سیڑھیاں چڑھ کر عمارت کے عالی شان پھاٹک میں قدم رکھا۔ دروازہ ہی پر افسر نے ٹکٹ مانگا۔ ان کے پاس دو ٹکٹ آئے تھے ایک سبز اور دوسرا سفید۔ معلوم ہوتا ہے کہ سفید ٹکٹ گیلری کا تھا۔ اور سبز ٹکٹ ممبری کا۔ سفید ٹکٹ شاید اس لئے آیا تھا کہ اگر کسی دوست کو لانا چاہو تو لا سکتے ہو۔ انہوں نے سفید ٹکٹ نکال کر افسر کے ہاتھ میں دیا۔ اُس نے دو منزلہ کی جو سیڑھیاں تھیں اُن کی طرف اشارہ کر دیا۔ یہ نعلدار جوتے سے کھٹ کھٹ کرتے سیڑھیوں پر چڑھے۔ کوئی چار پانچ ہی سیڑھیاں چڑھے ہونگے کہ سپاہی نے ہونٹوں پر انگلی رکھ کر خاموشی کا اشارہ کیا۔ انہوں نے ذرا آہستہ آہستہ پاؤں رکھنے شروع کئے۔ مگر اس سے کیا ہوتا تھا۔ سنگ مرمر کی سیڑھیاں تھیں اور نعلدار جوتا۔ لاکھ دبا کر پاؤں رکھتے وہ کھٹ کھٹ کہاں جاتی تھی۔ تھوڑے ہی اوپر گئے ہونگے کہ دوسرے سپاہی نے وہی خاموشی کا اشارہ کیا۔ اب اُن کو سوائے اس کے کچھ نہ سوجھی کہ جوتیاں اتار بغل میں دبائیں اور ننگے پاؤں اوپر چڑھیں۔ چنانچہ اس طرح یہ مشکل آسان ہوئی۔ سیدھی طرف جو دروازہ تھا۔ اُس پر ایک پہرہ دار کھڑا تھا۔ اُس نے بایاں ہاتھ پھیلا کر اشارہ کیا کہ آگے جاؤ۔ یہ سڑک کے انتظام میں پولیس کے سپاہی کی حرکات کا مطالعہ اچھی طرح کر چکے تھے۔ سمجھے کہ اس دروازہ میں جانے کو کہتا ہے۔ جھٹ ڈبکی مار اُس کے ہاتھ کے نیچے سے گزر دروازہ میں داخل ہو گئے۔ شامتِ اعمال سے یہ گیلری عورتوں کی تھی۔ عورتوں نے جو دیکھا کہ ایک دہقان جوتیاں بغل میں دبائے اندر گھسا آ رہا ہے تو غل مچا دیا۔ کسی کو چکر آیا۔ کوئی گھبرا کر کھڑی ہو گئی۔ ایک بیگم صاحب نے بے دم ہو کر دادا جان کے کندھے پر سر رکھ دیا۔ نیچے پارلیمان کا اجلاس ہو رہا تھا۔ اس غل شور سے وہ بھی بند ہو گیا۔ سب لوگ پھر پھر کر عورتوں کی گیلری کی طرف

دیکھنے لگے۔ صدر نشین نے "خاموش خاموش اور آرڈر۔ آرڈر" کے سینکڑوں نعرے مارے مگر کون سنتا تھا۔ آخر نیچے سے دو تین افسروں نے آکر اور دادا جان کو اس گیلری سے نکال کر زبردستی مردوں کی گیلری میں ٹھونس دیا۔ یہ تھوڑی دیر تک تو پریشان حال بیٹھے رہے۔ جب ذرا طبیعت سنبھلی تو اپنی جگہ سے اٹھے۔ اور لوگوں کی کہنیاں کھاتے دھتکاریں سنتے۔ گیلری کے جنگلہ تک پہنچے اور جنگلہ پر دونوں کہنیاں ٹیک جھک کر نیچے کا تماشا دیکھنے لگے۔ لوگوں نے ہٹانا بھی چاہا۔ ٹانگوں میں چٹکیاں بھی لیں۔ مگر یہ کیا ہٹنے والی اسامی تھے۔ تھوڑی دیر کے بعد ایک صاحب سے پوچھا "ارے بھئی یہ نیچے کیا ہو رہا ہے"۔ انہوں نے کہا کہ "پارلیمان کا اجلاس"۔ پھر سوال کیا کہ "نیچے جو لوگ بیٹھے ہیں یہ کون ہیں"۔ انہوں نے جواب دیا کہ "یہ پارلیمان کے ممبر ہیں" اتنا سننا تھا کہ دادا جان نے نعرہ مارا کہ "ٹھیرو ٹھیرو۔ ہم کو بھی نیچے آنے دو۔ یہ ہمارے بغیر کیوں اجلاس کیا جا رہا ہے" اس آواز سے سب لوگوں کی نگاہیں مردانہ گیلری کی طرف خود بخود پھر گئیں۔ کیا دیکھتے ہیں کہ وہی صاحب جو پہلے زنانہ گیلری میں آفت بپا کر چکے تھے۔ اب دوسری گیلری میں کھڑے اجلاس بند کرنے کا حکم دے رہے ہیں۔ لوگوں میں کھسر پھسر شروع ہوئی۔ صدر نشین نے بڑے زور سے "خاموش" کہا۔ دادا جان سمجھے کہ مجھے خاموش کرنے کو کہا جا رہا ہے۔ وہیں سے چیخ کر بولے "آخر ہم کیوں چپ رہیں۔ ایک تو ہمارے بغیر کمیٹی شروع کر دو اور پھر یہ کہو کہ چپ رہو۔ ہم یہاں بولنے آئے ہیں یا چپ رہنے"۔ اتنی دیر میں نیچے سے پھر وہی دونوں افسر اوپر آئے اور ان کو زبردستی گھسیٹ کر نیچے لے گئے۔ نیچے جا کر دادا جان نے باقی کاغذات ان کو دکھائے۔ منتظمین کو جب یہ معلوم ہوا کہ حضرت امن آباد کے ممبر پارلیمان ہیں تو نہایت عزت کے ساتھ ان کو اندر لے گئے۔ صدر نشین صاحب سے تعارف کرایا۔ اس کے بعد اجلاس میں دادا جان نے کیا حصہ لیا اور کیا کیا واقعات پیش آئے۔ وہ دوسری داستان ہے پھر کبھی عرض کروں گا۔

مرزا فرحت اللہ بیگ

بھلائی کرو

جتنی بھی تم سے ہو سکے۔
جس طرح بھی تم سے ہو سکے
جہاں بھی تم سے ہو سکے
جب بھی تم سے ہو سکے
جس کے ساتھ بھی تم سے ہو سکے
ہمیشہ جب تک بھی تم سے ہو سکے!

گلچیں

میڈیا

سینڈسؔل کی مشہور تصاویر میں کولچس کی ساحرہ شہزادی میڈیا کی تصویر سے بڑھ کر مقبول شاید کوئی تصویر نہیں ہوئی۔ یونانی دیومالا کے جس کردار کا انتخاب مصوّر نے کیا ہے اُس کی مثالی تصویر اُس کے مُوقلم کے اِس کارنامے کو دیکھ کر آنکھوں میں پھر جاتی ہے۔

اِس چہرے سے ایک قوی دل، ایک مضبوط قوتِ فیصلہ، ایک ناقابلِ تسخیر آزادیٔ مزاج اور ایک طاقتور سیرت کی جھلک صاف نمایاں ہے۔ اسی مصور کی دوسری تصاویر پینڈورا اور سیفو کے چہروں کے مقابلے میں میڈیا کے چہرے پر جو یقیناً الم انگیز بھی ہے ایک مخصوص مسحور کن ادا نظر آتی ہے۔ اُس کے نازک نتھنوں اور کنجِ لب کے خوبصورت لیکن پُرغرور خم کے گرد پیش ستم آرائی اور بے دردی کی طرف بھی ایک اشارہ سا چکر لگاتا دکھائی دیتا ہے۔ لیکن اس کے باوجود اِس چہرے میں ایک ایسی دلکشی ہے جو ایک دفعہ دیکھنے کے بعد کبھی نہیں بھُول سکتی۔

میڈیا ایٹیس شاہِ کولچس کی بیٹی تھی۔ بچپن ہی میں اُس نے یونانی ضنمیات کی مشہور ساحرہ سرسے سے جو اس کی پھوپھی ہوتی تھی جادو سیکھ لیا تھا۔ جب یونانی شہزادہ جیسن اس کے باپ کے شہر میں گولڈن فلیس حاصل کرنے کے لئے پہنچا تو میڈیا اُسی اپنا دل دے بیٹھی چنانچہ اُس نے شادی کا وعدہ لینے کے بعد گولڈن فلیس کے حصول میں باپ کے خلاف جیسن کو اپنے جادو سے مدد دی اور اُس کے کامیاب ہونے پر وہ اُس کی بیوی بن کر اُس کے ساتھ بھاگ گئی۔

کارنتھ میں وہ کچھ عرصے تک رہے۔ اس کے بعد میڈیا نے جیسن کو اپنی طرف سے دل برداشتہ پایا۔ آخر جیسن نے کریئون شاہِ کارنتھ کی بیٹی سے شادی بھی کر لی

اب میڈیا کی محبت ایک خوفناک انتقام پر اُتر آئی۔ اس نے اپنی رقیب کو زہر میں بسا ہوا ایک لباس ارمغاں دے کر ہلاک کر ڈالا اسی پر بس نہیں اب اس کی فوق العادت خودداری نے بے وفا جیسن کی محبّت کا نام و نشان مٹانے کا تہیہ کیا۔ چنانچہ اس نے اپنے دونوں بیٹے بھی جو جیسن کے بیٹے تھے فنا کر دئے۔

یہ جنونی حرکات دیکھ کر اس کے ہوا خواہوں نے کہا میڈیا تم نے کیا کیا ہے۔ تم نے اپنا سب کچھ کھو دیا۔ آہ اب تمہارے پاس کیا باقی رہا ہے؟ میڈیا نے سراپا خودی بن کر جواب دیا "میں خود" ؎

میں خود جو ہوں نہیں ہمدم اگر کوئی نہ سہی
خود آشنا ہوں، خود آرا ہوں اور خود بیں ہوں

حامد علی خاں

جینیوا کی جھیل پر آفتاب غروب ہونے کو ہے۔ ادھر سوئٹستان کی پہاڑیاں ہیں ادھر سامنے فرانس کے پہاڑ۔ پانی ساکن و مطمئن ہے لیکن نہ اتنا کہ شام کی ہوائیں چلیں اور وہ ذرا بھی مضطرب نہ ہو۔ اس کی ننھی منی جنبشیں کسی حسین ہستی کے نرم و نازک دل کی دھڑکن کا پتہ دے رہی ہیں!

آفتاب اُن خوبصورت شان دار پہاڑوں کے پیچھے چھپ جانے کو ہے۔ رخصت کی گھڑی میں اس کی دریا دلی کا منظر قابل دید ہے۔ سونا پانی پر نچھاور ہو رہا ہے!

جھیل کے کنارے کنارے اِدھر سوئٹستان میں اُدھر فرانس میں ہزاروں لاکھوں سیر کرنے والے فطرت کے جاتری پانی پر پہاڑوں پر سورج پر آسمان پر مسرت کی نگاہیں ڈالتے ہیں اور زندگی کا لطف اٹھاتے ہیں۔ صرف انسانوں کو خوبصورت نظاروں کی ضرورت نہیں نظاروں کو بھی چاہنے والے دلوں کی حاجت ہے!

یورپ کی آزاد قومیں فطرت کے حسن و خوبی کی دلدادہ ہیں۔ مغرب کے رہنے والے گھر میں بیٹھ رہنا نہیں جانتے وہ پہاڑوں اور جھیلوں سمندروں اور ساحلی مقامات میں اپنی فرصت کے اوقات سیر و تفریح میں بسر کرتے ہیں جس سے اُن کی رگ رگ میں زندگی کا خون دوڑ کر زندہ دلی پیدا ہو جاتی ہے اور یہی ان کے تمدن کی رُوح رواں ہے!

جینیوا کی جھیل یورپ کے مرغوب ترین نظاروں میں شامل ہے۔ دو آزاد ملک جمہوریت کے دو وطن اس کے دائیں بائیں پھیلے پڑے ہیں۔ حسن آزادی کی گود میں پرورش پا رہا ہے یا یوں کہئے کہ خوبصورتی دو آزاد دل بہادروں کے پاؤں دھو دھو کر پی رہی ہے۔ جمہوریت کی کیسی کیسی تحریکات آزادی کے لئے کیا کیا مساعی اس جھیل نے پچھلی چند صدیوں میں پہلے اس ساحل پر اور پھر اُس ساحل پر اپنی آنکھوں دیکھی ہیں، سوئٹستان کی آزادی کی لڑائیاں فرانس کے جمہوری انقلابات۔ ایک صدی سے زیادہ مدت گذر چکی ہے کہ انگریزی شاعر بائرن نے اس کے ساحلوں پر حریت کے گیت گائے اور ابھی ایک ماہ بھی نہیں ہوا کہ ہندی رہنما گاندھی نے اس کے کناروں پر ہندوستان کی آزادی کے لئے اپنی زبردست آواز بلند کی!

جھیل کا سوئٹستانی کنارہ کوسوں تک انگور کی بیلوں سے آراستہ ہے یہیں ہے مونترو جہاں بہار کے موسم میں نرگس کا میلہ ہوتا ہے یہیں ہے لوزان جہاں ترکی کی آزادی تسلیم کی گئی اور یہیں ہے جینیوا کا خوشنما شہر جو مجلسِ اقوام کا مقام اور گویا دنیا کی نئی امیدوں کا ماویٰ و ملجا ہے۔

بشیر احمد

راگ اور کھیل

میں کھیت میں سے گذرنے والی راہ پر اکیلی ٹہل رہی تھی اُس وقت جب کہ ڈوبتا ہوا آفتاب ایک کنجوس کی طرح اپنا آخری سونا چھپا رہا تھا۔

دن کی روشنی آہستہ آہستہ تاریکی میں ڈوبتی گئی اور یہ وہ زمین جس کی فصل کٹ چکی تھی خاموش پڑی تھی۔ اچانک ایک لڑکے کی تیز اور تیلی آواز آسمان میں گونجی۔ شام کی خاموشی کو اپنے راگ سے معمور کرتے ہوئے وہ تاریک رستے پر سے گذرا۔

اس کا دیہاتی گھر بنجر زمین کے کنارے پر تھا۔ گنے کے کھیت کے پرے کھجور اور ناریل کے درختوں کے سائے میں چھپا ہوا۔

میں ایک لمحے کے لئے اپنی سنسان راہ پر تاروں بھرے آسمان کے نیچے ٹھہری اور میں نے اپنے سامنے تاریک زمین کو دیکھا کہ وہ اپنی گودی میں بیشمار گھروں کو لئے ہوئے ہے جو ترتیں ہیں پنگوڑوں اور پلنگوں اور ماؤں کے دلوں اور شام کے چراغوں سے اور ایسی نو خیز خوش و خرم ہستیوں سے جن کی خوشی خود نہیں جانتی کہ دنیا کے لئے اس کی قدر و قیمت کیا ہے!

میرے بچے! تم کس قدر خوش ہو مٹی میں بیٹھے ہوئے دن بھر اک ٹوٹی ہوئی ٹہنی سے کھیلتے۔

اس چھوٹی سی ٹوٹی ہوئی ٹہنی سے تمہیں کھیلتے دیکھ کر میں مسکراتی ہوں۔

میں اپنے حساب کتاب میں مصروف ہوں اور گھنٹے بھر سے رقمیں جمع کر رہی ہوں۔

شاید تم میری طرف دیکھتے ہو اور خیال کرتے ہو کہ یہ بھی کیسا احمقانہ کھیل ہے ساری کی ساری صبح کو بے مزہ کر دینے والا۔

میرے بچے! میں چھڑیوں اور مٹی کے گھروندوں سے لطف اٹھانا بھول گئی ہوں۔

میں قیمتی کھلونوں کو ڈھونڈتی ہوں اور سونے اور چاندی کے ٹکڑے جمع کر رہی ہوں۔

تم جو کچھ پاتے ہو اس سے اپنے پیارے کھیل بنا لیتے ہو۔ اور میں اپنا وقت اور اپنی طاقت دونوں ہی ایسی چیزوں پر صرف کرتی ہوں جنہیں میں کبھی پا نہیں سکتی۔

میں اپنی نازک کشتی میں آرزو کے سمندر کو عبور کرنے کے لئے جد و جہد کرتی ہوں اور یہ بھول جاتی ہوں کہ میں بھی ایک کھیل کھیل رہی ہوں!

(ترجمہ)

بشیر احمد بیگم

انگریزی شاعری میں محبّت کا تصوّر

مندرجہ ذیل مضمون انگریزی ادبیات پر لفکاڈیو ہرن کے خطبات میں سے ایک کا ترجمہ ہے۔ لفکاڈیو ہرن ۱۸۵۰ء میں بمقام لفکاڈیا (واقع جزائر یونان) پیدا ہوا اور اسی نسبت سے بعد میں اس نے اپنا مسیحی نام چھوڑ کر "لفکاڈیو" کا نام اختیار کیا۔ اس کا باپ سرجن میجر چارلس ہرن آئرلینڈ کا رہنے والا تھا جس کے خون میں جپسی (یا بہ الفاظ دیگر ہندوستانی) خون کی آمیزش تھی۔ اس کی ماں ایک یونانی نژاد عورت تھی جس کی رگوں میں عربی خون بھی دوڑتا تھا۔ لفکاڈیو ہرن کو اپنے خاندان سے ایک شاعرانہ اور کسی قدر بے قرار طبیعت ترکے میں ملی تھی۔ سن شعور کو پہنچ کر وہ رومن کیتھلک عقاید سے جو اس کا آبائی مذہب تھے برگشتہ ہوگیا۔ اسی زمانے میں فکر معاش کے لئے اسے امریکا جانا پڑا۔ جہاں وہ کئی سال تک اخبار نویسی کے ذریعے سے اپنا پیٹ پالتا رہا۔ ۱۸۹۱ء میں وہ جاپان آیا اور اس نے محسوس کیا کہ یہی وہ سرزمین ہے جہاں اس کی روح سکون پا سکتی ہے اب تک اس کا کوئی مذہب نہ تھا مگر اب اس نے بدھ مت اختیار کیا۔ اس نے جاپانی شہریت کے حقوق حاصل کئے، اپنا نام بدل کر ایک جاپانی نام رکھا اور ایک جاپانی عورت سے شادی کرلی۔ ۱۸۹۶ء میں وہ ٹوکیو یونیورسٹی میں انگریزی ادبیات کا پروفیسر مقرر ہوا اور یہیں اس نے وہ بے نظیر خطبات کہے جن کا مجموعہ اب چار جلدوں میں شائع ہو چکا ہے۔ ۱۹۰۳ء میں اسے خرابی صحت کے باعث ٹوکیو یونیورسٹی سے الگ ہونا پڑا لیکن اب اسے جاپانی موضوعات پر اپنی تصانیف کے اچھوتے پن، زور بیان اور ادبی محاسن کی وجہ سے دنیا بھر میں مقبولیت حاصل ہو چکی تھی۔ ۱۹۰۴ء میں اس کا انتقال ہوگیا۔

یہ خطبات مشرقی طالب علم کے لئے ایک خاص اہمیت رکھتے ہیں اس لئے کہ یہاں انگریزی ادب کے بہترین کارناموں کو ایک مغربی ادیب نے ایشیائی طرز خیال پیش نظر رکھ کر بے مثال وضاحت اور دلآویزی سے سمجھایا ہے۔ لفکاڈیو ہرن کا قاعدہ تھا کہ اپنے جاپانی شاگردوں کے سامنے کسی ادبی موضوع پر یادداشتوں کی مدد کے بغیر آہستہ آہستہ تقریر کرتا تھا اور اس کے طلبہ ان الفاظ کو جو اس کے منہ سے نکلتے تھے قلمبند کرتے چلے جاتے تھے۔ اسی لئے ان تقریروں میں بعض ایسی خوبیاں نظر آتی ہیں جو کسی محنت سے تیار کی ہوئی صنعت گرانہ تحریر میں کبھی نہ ہو سکتی تھیں۔ خود لفکاڈیو ہرن کو خیال تک نہ تھا کہ طلبہ کے لئے اس کے یہ خطبات کبھی دنیا کی نظر کے سامنے بھی آئیں گے لیکن اس کی موت سے کوئی دس سال بعد اس کے دوستوں نے اس کے بعض جاپانی شاگردوں کی یادداشتوں کو دیکھا تو ان پر یہ انکشاف ہوا کہ طالب علموں کے

ان اسباق میں ایک گراں بہا ادبی خزانہ چھپا ہوا ہے۔

اگر لفکاڈیو ہرن کو ان خطبات پر نظر ثانی کا موقع ملتا تو بعض غیر اہم اور فرعی نقائص یقیناً رفع ہوجاتے لیکن دوبے تکلفانہ اظہار خیال جس نے ان تقریروں کو رسمی تنقید کے پھیکے پن سے بلند کرکے۔ بے حد دلکش بنادیا ہے غالباً رخصت ہوجاتا جو کچھ وہ یہاں کہتا ہے انگلستان کے ثقہ نقادوں کے لئے نہیں بلکہ جاپانی طالب علموں کی ایک جماعت کے لئے کہتا ہے نقادوں کے وہ "عالمانہ" تبصرے جو کسی نظم یا افسانے کے مالۂ وما علیہ پر بصیرت افروز نکتہ آفرینی کرتے ہیں اور خود نفسِ مضمون کو نظر انداز کردیتے ہیں یہاں نہیں ملتے۔ پروفیسر جان ارسکن کے الفاظ میں "لفکاڈیو ہرن کو نقادانِ ادب کی صف میں یہ امتیاز حاصل ہے کہ وہ ہمارے اصلی اور خالص ادبی تجربے پر وضاحت سے روشنی ڈالتا ہے۔ یعنی براہ راست ان احساسات پر جو زیرِ تنقید کتاب کے مطالعے سے واقعی ہم پر طاری ہوتے ہیں" اور حقیقت یہ ہے کہ اس اعتبار سے انگریزی ادب کا کوئی نقاد لفکاڈیو ہرن کا حریف نہیں ہوسکتا۔ مشرق اور مغرب کے فلسفے سے اس کی گہری واقفیت ان خطبات میں جابجا نمایاں ہے اور اس لحاظ سے ان کی قدر وقیمت تشریحات ادب کی حیثیت سے بہت بڑھ گئی ہے۔

مجھے اکثر خیال ہوتا ہے کہ جس قدر زیادہ عرصہ تک جاپانی طالب علم کو انگریزی ادب کے مطالعہ کا موقع ملے گا اسی قدر زیادہ وہ اس غیر معمولی تفوق پر متحیر ہوگا جو افسانہ نویسی اور شاعری میں محبت کے جذبہ کو دیا جاتا ہے۔ بلکہ اب تو خود میں بھی اس پر کچھ متحیر ہونے لگا ہوں۔ اس ملک میں آنے سے پہلے یہ بات مجھے بالکل قدرتی معلوم ہوتی تھی کہ محبت ادبیات کا سب سے بڑا موضوع ہو کیونکہ مغربی تمدن کے سوا کسی اور تہذیب و معاشرت سے مجھے مطلق واقفیت نہ تھی۔ لیکن آج مجھے یہ بات حقیقت میں کسی قدر عجیب معلوم ہوتی ہے۔ اگر یہ بات مجھ کو عجیب معلوم ہوتی ہے تو بھلا تم کو کتنی عجیب وغریب معلوم ہوتی ہوگی! بلاشبہ اس مسئلے کا سیدھا سادھا حل یہ ہے کہ یورپ اور امریکا میں شادی انسان کی زندگی کا اہم ترین واقعہ ہے اور ہر چیز کا دارومدار اسی پر ہوتا ہے۔ یہاں مشرق میں حالات بالکل مختلف ہیں۔ لیکن محض اس اختلاف کی سیدھی سادھی تشریح کافی نہیں ہے بلکہ اور بھی بہت سی باتیں محتاجِ تشریح ہیں۔ اس کی کیا وجہ ہے کہ نہ صرف افسانہ نگار بلکہ تمام شعرا بھی عشق کو اپنا موضوعِ اکبر قرار دیتے ہیں؟ مجھے بالکل علم نہ تھا، (کیونکہ میں نے کبھی خیال نہ کیا تھا) کہ انگریزی ادب محبت کے مضمون سے کس قدر لبا ہوا ہے۔ اس حقیقت کا انکشاف مجھ پر اُس وقت ہوا جب میں نے اپنے اسباق میں استعمال کرنے کے لئے نظم و نثر سے منتخبات حاصل کرنے چاہے جس میں میری کوشش قدرۃً یہ تھی کہ ایسے صفحات یا اشعار کا انتخاب کروں جو عشق و محبت سے نہیں بلکہ دوسرے مضامین سے تعلق رکھتے ہوں لیکن بجائے اس کے وہ چیز جس کی مجھے جستجو تھی بہ کثرت دستیاب ہوتی مجھے بمشکل ہی کچھ مل سکا۔ مقالہ (Essay) اور تاریخ کی حدود سے باہر تقریباً تمام بڑے نثار عشقیہ افسانے لکھنے والوں کی حیثیت سے مشہور ہیں۔ اور تقریباً محال ہے کہ اعلیٰ درجہ کی مستند نظم کے چھ بند جو ٹینی سن، روزیٹی، براوننگ، شیلی یا بائرن سے منتخب ہوں اُن میں چومنے، گلے ملنے یا کسی خیالی یا حقیقی معشوق

کی حسرت و آرزو کے متعلق کچھ نہ ہو۔ ورڈزورتھ البتہ کسی حد تک مستثنیٰ قرار دیا جا سکتا ہے اور کولرج سب سے زیادہ ایک ایسی نظم کے لئے مشہور ہے جس میں محبت کو قطعاً کوئی دخل نہیں لیکن مستثنیات کا اس عام اصول پر کوئی اثر نہیں ہو سکتا کہ محبت انگریزی شاعری کی روح ہے۔ اور اسی طرح فرانسیسی، اطالوی، ہسپانی اور جرمن شاعری کا بھی یہی موضوع ہے یہ محرک ہر جگہ موجود ہے +

اسی اصول کا اطلاق انگریزی افسانہ نگاروں پر ہوتا ہے۔ یہاں بھی کچھ مستثنیات نظر آتی ہیں۔ مثلاً رابرٹ لوئی سٹیونسن کے اکثر ناولوں میں عورتوں کو تقریباً کچھ دخل نہیں۔ اس کے ناول زیادہ تر مہمات و خطرات کے افسانے یا حکایتیں ہیں لیکن اس قسم کی مستثنیات بہت کم ہیں۔ آج کل انگلستان میں ہر سال ایک ہزار کے قریب نئے ناول شائع ہوتے ہیں اور یہ سب یا تقریباً سب عشقیہ افسانے ہوتے ہیں۔ ایسا ناول لکھنا جس میں کوئی عورت نہ ہو کچھ زیادہ حوصلہ افزا کام نہیں۔ سو میں سے ننانوے ایسی کتابیں فروخت نہیں ہو سکتیں۔

جو کچھ میں نے اوپر کہا اس سے نتیجہ یہ نکلا کہ دنیا بھر میں جہاں کہیں بھی انگریز ہیں ان کو بحیثیت کتب بینوں کے سب سے زیادہ دلچسپی مضمون زیر بحث سے ہے۔ جب تم ایک پوری قوم کو تمام دوسری چیزوں سے زیادہ کسی ایک خاص چیز میں دلچسپی لیتے ہوئے پاؤ تو اس کا باعث تم یقیناً یہ قرار دے سکتے ہو کہ وہ مسئلہ اوسط درجہ کے انسان کی زندگی میں بے انتہا اہمیت رکھتا ہے۔ اس لئے تمہیں چاہئے کہ ایک ایسے نظام معاشرت کا تصوّر قائم کرنے کی کوشش کرو جس میں کسی دوسرے شخص کی مدد کے بغیر ہر مرد کو اپنی بیوی اور ہر عورت کو اپنا شوہر بطور خود انتخاب کرنا ہوتا ہے، اور نہ صرف انتخاب کرنا بلکہ ممکن ہو تو حاصل کرنا ہوتا ہے۔ مغربی تمدّن کا بڑا اصول یہ ہے کہ یہاں قانونِ مقابلہ اسی طرح جاری و ساری ہے جس طرح زندگی کے دوسرے شعبوں میں اس کا نفاذ ہے۔ بہترین مرد کو (یعنی اس کو جو سب سے زیادہ طاقتور اور سب سے زیادہ زیرک ہو) بہترین عورت ملنے کا امکان غالب ہوتا ہے جہاں بہترین عورت سے مراد سب سے زیادہ حسین و جمیل عورت ہوتی ہے سکڑ و نحیف، بے مایہ اور کریہہ صورت لوگوں کو شادی کرنے کا موقع بہ مشکل ہی میسّر آ سکتا ہے۔ ہزارہا مردوں اور عورتوں کے لئے شادی ناممکن ہوتی ہے۔ اس وقت میں طبقۂ اعلیٰ اور طبقۂ متوسط کا ذکر کر رہا ہوں محنت مشقت کرنے والے: کسان، مزدور، یہ لوگ عموماً نوعمری میں شادی کر لیتے ہیں لیکن کشمکش یہاں بھی بالکل ایسی ہی ہوتی ہے، اتنی ہی سخت اور صرف کسی قدر زیادہ درشت۔ پس یہ کہا جا سکتا ہے کہ ہر شخص کو شادی کرنے کے لئے کسی نہ کسی قسم کی جد و جہد کرنی پڑتی ہے اور ہر قابل قدر عورت کو حاصل کرنے کے لئے ایک طرح کی جنگ یا معرکہ ہوتا ہے نہ صرف انگلستان میں بلکہ یورپ بھر میں مغربی نظام معاشرت کو اس نقطۂ نظر سے دیکھ کر تم بہ آسانی سمجھ سکو گے کہ اہلِ مغرب کے لئے ایسی ادبیات میں جن کا مضمون محبت ہو بہ نسبت دوسری اصنافِ ادب کے کس درجہ زیادہ دلکشی ہے۔

اگرچہ وہ حالات جو میں نے ابھی بیان کئے تمام مغربی ممالک میں تقریباً یکساں ہیں مگر ان ادبیات کا لب لہجہ جنہیں عشق و محبت سے سروکار ہے ان ممالک میں مطلق یکساں نہیں۔ اس میں بہت بڑے بڑے اختلافات ہیں۔ نثر میں بہ مقابلہ نظم یہ اختلافات کہیں

زیادہ گہرے اور کہیں زیادہ اہم ہیں۔ کیونکہ تمام ممالک میں رائے عامہ کسی شخص کو نثر کی بہ نسبت نظم میں زیادہ آزادی دیتی ہے۔ اس مضمون کے اسلوبِ بیان میں یہ اختلافات فی الحقیقت سیرت کے قومی امتیازات پر دلالت کرتے ہیں۔ شمالی اقوام کے عشقیہ افسانوں اور عشقیہ شاعری میں زیادہ متانت اور زیادہ سنجیدگی ہے اور اُن کے مصنفین حدود معینہ سے تجاوز نہیں کرتے۔ بعض مضامین عام طور پر ممنوع ہیں۔ مثلاً انگلستان میں عوام محبت کے متعلق ناول چاہتے ہیں۔ مگر یہ محبت ایک ایسی لڑکی کی محبت ہونی چاہیئے جو کسی کی بیوی بننے والی ہو۔ انگریزی ناولوں میں قاعدہ یہ ہے کہ شادی سے پہلے کی کشمکش اندیشے اور درد یا بالفاظ دیگر وہ جدوجہد بیان کی جائے جو دنیا میں شادی کے حق کے لئے کی جاتی ہے۔ محبت کے کسی دوسرے پہلو کے متعلق کسی شخص کو نہ لکھنا چاہیئے۔ اس میں شک نہیں کہ بہت سے مصنفین نے اس قاعدہ کی خلاف ورزی کی ہے لیکن بااین ہمہ قاعدہ موجود ہے کوئی شخص چاہے تو دو عورتوں کے درمیان مقابلہ دکھا سکتا ہے جن میں سے ایک اچھی ہو اور ایک بُری لیکن اگر کہانی میں بری عورت کی جیت دکھائی جائے تو عوام کو ناگوار ہوتا ہے۔ یہ انگریزی دستور اٹھارویں صدی یعنی رچرڈسن کے وقت سے قائم ہے اور قیاس چاہتا ہے کہ ابھی عرصۂ دراز تک قائم رہے گا۔

فرانسیسی ناولوں کے لکھنے میں اس قاعدہ کی مطلق پابندی نہیں ہوتی۔ فرانس کے ناول زیادہ تر عورتوں کے ان تعلقات کو بیان کرتے ہیں جو شادی کے بعد دنیا سے اور عشاق کے ساتھ پیدا ہوتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ فرانسیسی افسانوں کا معتدبہ حصہ مرد اور عورت کے ناجائز جنسی تعلقات اور بہت سی ایسی باتوں کے متعلق ہوتا ہے جن کو اہلِ انگلستان اپنے افسانوں میں روا نہیں رکھتے۔ اس کا یہ مطلب نہیں کہ انگریز اخلاقی اعتبار سے فرانسیسیوں یا دوسری جنوبی اقوام کے مقابلہ میں کوئی تفوق رکھتے ہیں لیکن اس کا یہ مطلب ضرور ہے کہ تمدنی حالات میں بہت بڑے بڑے فرق ہیں۔ اس قسم کا ایک فرق نہایت اختصار کے ساتھ بیان کیا جا سکتا ہے۔ ایک انگریز لڑکی ایک امریکن لڑکی، یا ناروے ڈنمارک اور سویڈن کی کسی لڑکی کو شادی سے پہلے ہر ممکن حد تک آزادی میسر ہوتی ہے۔ لڑکی سے کہا جاتا ہے "تمہیں چاہیئے کہ خود اپنی حفاظت اور نگرانی کے قابل بنو اور کوئی برا کام نہ کرو۔" شادی کے بعد اس آزادی کا خاتمہ ہو جاتا ہے۔ تمام شمالی ممالک میں شادی کے بعد عورت کے طرزِ عمل کی سختی سے نگرانی کی جاتی ہے لیکن فرانس اور ممالک جنوب میں شادی سے پہلے نوجوان لڑکی کو کوئی آزادی حاصل نہیں ہوتی۔ وہ ہمیشہ اپنے بھائی اپنے باپ اپنی ماں یا کسی تجربہ کار رشتہ دار کی حفاظت میں رہتی ہے جہاں وہ جائے اس کے ساتھ کوئی نہ کوئی ضرور ہوتا ہے۔ دوسرے لوگوں کی موجودگی کے بغیر اسے اپنے منگیتر سے ملنے کی اجازت نہیں ہوتی لیکن شادی کے بعد اس کی آزادی کا دور شروع ہوتا ہے۔ اُس وقت پہلی مرتبہ اس سے کہا جاتا ہے کہ وہ خود اپنی نگہبان ہے۔ اب تم سمجھ گئے ہو گے کہ وہ حالات جو محبت اور شادی کے مسائل کی تحریر میں افسانہ نگاروں کے لئے دلیلِ راہ بنتے ہیں شمالی اور جنوبی یورپ میں بہت مختلف ہیں۔ صرف اسی ایک سبب سے فرانس میں لکھے ہوئے اور انگلستان میں لکھے ہوئے ناولوں کی نوعیت ایک نہیں ہو سکتی۔

لیکن تمہیں یاد رکھنا چاہیئے کہ اس اختلاف کے کئی اور اسباب بھی ہیں جنہیں ہم احساسِ ادبی کے اسباب کہہ سکتے ہیں جنوبی یا

لاطینی اقوام کو شمالی اقوام کے مقابلہ میں تہذیب و تمدن کی منزل تک پہنچے بہت زیادہ عرصہ گزر چکا ہے۔ انہیں پرانی دنیا قدیم یونان اور روما کی دنیا، کی حسیات ورثہ میں ملی ہیں اور ذکور و اناث کے باہمی تعلق کی نسبت ان کا طریق فکر و خیال اب بھی بہت کچھ وہی ہے جو قدیم شاعروں اور داستان نگاروں کا تھا۔ وہ ایسی ایسی باتیں کر دکھاتے ہیں جو انگریزی مصنفین سے ممکن نہیں کیونکہ اُن کی زبان میں نزاکتِ بیان کی استعداد زیادہ ہے۔

ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ لاطینی مصنفین محبت کا ذکر اب بھی بہت بڑی حد تک اسی طرح کرتے ہیں جس طرح مسیحیت کے ظہور سے پہلے کرتے تھے۔ لیکن مسیحیت کے ذکر سے میرا مقصود ایک خاص تاریخی زمانہ کی طرف اشارہ کرنا ہے، ورنہ مسیحیت سے پہلے شمالی اقوام کا نقطۂ نظر بھی محبت کے متعلق بہت کچھ وہی تھا جو ان کے بہترین شعرا کا آج کے دن تک ہے۔ سکنڈنیویا کی قدیم ادبیات سے اس کا ثبوت مل سکتا ہے۔ اُس پرانے بحری قزاق کا جسے "وائیکنگ"[۵] کا نام دیا جاتا ہے محبت کے متعلق بڑی حد تک وہی احساس تھا جو آج ٹینی سن یا میرِڈِتھ کا ہو سکتا ہے۔ اُس کے نزدیک صرف ایک محبت سچی اور حقیقی محبت تھی، وہ محبت جس کا انجام شادی پر ہو، وہ الفت جو شوہر اور بیوی کے دلوں کو ایک کئے دیتی ہو۔ اس کے علاوہ ہر چیز اُس کے نزدیک محض حماقت اور کمزوری تھی۔ مسیحیت اِس مسئلہ کے متعلق اُس کا یہ جذبہ نہ بدل سکی۔ زمانۂ حال میں انگلستان، سوئیڈن، ڈنمارک، ناروے یا جرمنی کا عام انسان محبت کو بعینہٖ اسی گہرے، سنجیدہ، شریفانہ خلوص سے دیکھتا ہے جس سے اس کے مشرک آباؤ اجداد دیکھتے تھے۔ میرے خیال میں ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ مختلف نسلوں کے درمیان تعلقاتِ ذکور و اناث کے بارے میں جذبہ و احساس کے امتیازات حائل ہیں اور یہ امتیازات قلمبند کی ہوئی تاریخ سے بہت زیادہ پرانے ہیں۔ ان کا دخل قوموں کے رگ و ریشہ اور روح میں ہوتا ہے اور نہ مذہب اور نہ تہذیب ان کو کلیتہً متغیر کر سکتی ہے۔

اب تک میں بالتخصیص فرانسیسی اور انگریزی ناولوں کے فرق کا ذکر کر رہا تھا۔ ناول خصوصیت سے قومی زندگی کا عکس یا یوں کہو کہ قصّے کی صورت میں حقیقت کی ہو بہو روئداد ہوتے ہیں لیکن شاعری میں جو ادبیات کی بلند ترین صنف ہے یہ فرق بہت زیادہ واضح اور نمایاں ہے۔ زمانہ حال میں لاطینی اقوام کے شعرا عشق کے مضمون پر اسی آزادی سے خامہ فرسائی کرتے ہوئے نظر آتے ہیں جو شہنشاہ آگسٹس کے عہد کے قدیم لاطینی شعرا کا شعار تھی بخلاف اس کے شمالی النسل شعراء بہ استثنائے چند اس مسئلے پر قلم اٹھاتے وقت بہت ضبط ملحوظ رکھتے ہیں۔ اب حدِّ فاصل کہاں قائم کی جائے؟ کیا لاطینی نسل کا طریقہ درست ہے؟ کیا انگریزوں کا دستور صحیح ہے؟ عشق کے مضامین پر قلم اٹھاتے وقت ہم کس طرح صاف صاف طور پر یہ تمیز کریں کہ یہ چیز اخلاقی اور اچھی ہے، وہ فحش اور بُری ہے؟

لازم ہے کہ عشق کی کوئی تعریف کی جائے۔

---

[۵] یہ آٹھویں سے دسویں صدی تک کے زمانے کی طرف اشارہ ہے۔ اس وقت شمالی اقوام کی مردانگی اور بسالت لیانِ شباب پر تھی اور بالعموم اس کا ظہور سمندروں پر لوٹ مار اور غارت گری کی خطرناک مہموں میں ہوتا تھا۔ اسی زمانے کے بحری جنگجو کو "وائیکنگ" (Viking) کہتے ہیں۔

محبّت سے کیا مراد ہے؟ لاطینی مصنفین کے استعمال کے مطابق اس لفظ سے معانی کا ایک سلسلہ وابستہ ہو گیا ہے جو حشرات یا حیوانات کے شہوانی تعلق سے لے کر مذہبی جذبہ کی اس اعلیٰ ترین شکل تک پھیلا ہوا ہے جسے "محبت الٰہی" کہتے ہیں۔ مجھے یہ کہنے کی چنداں ضرورت نہیں کہ ایسی ڈھیلی ڈھالی تعریف ہمیں کام نہیں دے سکتی۔ انگریزی لفظ سے بہ اتفاق رائے شہوانی جذبہ اور گہری دوستداری دونوں مراد ہوتے ہیں لیکن یہ معنی بھی ہماری ضرورت سے زیادہ وسیع ہیں۔ روزمرہ کی گفتگو میں "سچّی" کی صفت محبت سے پہلے بڑھا کر اس کا مفہوم متعین کرنے کی کوشش کی جاتی ہے۔ جب کوئی انگریز سچّی محبت کا ذکر کرتا ہے تو اس کی مراد بالعموم ایک ایسی چیز سے ہوتی ہے جس میں جذبہ اور خواہش کو مطلق دخل نہ ہو۔ یعنی ایک کامل دوستداری جو شوہر اور بیوی کے درمیان پیدا ہو جاتی ہے اور جسے اُس جذبہ سے جو دونوں کو ایک دوسرے کے قریب کھینچ لایا تھا کوئی سروکار نہیں ہوتا۔ لیکن جب انگریز شاعر محبت کا ذکر کرتا ہے تو اس کی مراد دوستداری سے نہیں بلکہ جذبہ سے ہوتی ہے۔ میں صرف بہت عام اصول بیان کر رہا ہوں۔ تم نے دیکھا یہ مضمون کس قدر پریشان کن ہے اور اس کی تعریف کس قدر مشکل ہے۔ آؤ تھوڑی دیر کے لئے تعریف کے سوال کو چھوڑ کر اس مسئلہ پر فلسفیانہ نقطۂ نظر سے غور کریں۔

بعض نہایت نادان لوگوں نے زمانہ حال ہی میں محبت (یعنی ذکور و اناث کی باہمی محبت) کو مختلف انواع میں تقسیم کرنے کی کوشش کی ہے۔ وہ شاعرانہ محبت اور اسی قبیل کی دوسری چیزوں کا نام لیتے ہیں یہ سب لایعنی مزخرفات ہیں۔ الفتِ جنسی کے مفہوم میں محبت صرف ایک قسم کی ہوتی ہے یعنی وہ فطری کشش جو مرد اور عورت کے درمیان ہو۔ اور اس کشش کی اعلیٰ ترین اور ادنیٰ ترین شکل میں فرق صرف یہ ہے کہ بلند تر فطرت میں روحانی جمالیاتی اور اخلاقیاتی احساسات کی ایک بہت بڑی تعداد اس جذبہ سے وابستہ ہوتی ہے اور پست تر فطرتوں میں یہ احساسات موجود نہیں ہوتے۔ اس لئے ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ اس جذبہ کی بلند ترین صورتوں میں بھی صرف ایک حس غالب ہوتی ہے خواہ وہ کتنی ہی پیچ در پیچ کیوں نہ ہو۔ یہ قبضہ و تسلط کی خواہش ہے قبضہ کے بعد جو کچھ ہوتا ہے اُسے ہم چاہیں تو محبت کا نام دے لیں لیکن بہتر یہ ہے کہ اُسے کامل ہمدردی اور رفاقت کہہ لیا جائے یہ بالکل ہی ایک الگ چیز ہے۔ وہ محبت جو تمام ملکوں میں شاعروں کا موضوع ہے حقیقۃً جذبۂ عشق ہے، وہ دوستداری نہیں جو اس جذبے سے پیدا ہوتی ہے۔

میرے خیال میں تم یہ جانتے ہو گے کہ "جذبہ" کے لئے انگریزی میں جو لفظ (passion) استعمال ہوتا ہے لغوی طور پر اس کا مطلب "تکلیف و درد کی حالت" ہے۔ جب یہ لفظ محبت سے متعلق ہو تو مغربی ذہن کے لئے خاص معنی رکھتا ہے کیونکہ اس کا اشارہ اس کشمکش اور امید و بیم اور حسرت کشی کے زمانہ کی طرف ہوتا ہے جب مراد ابھی حاصل نہ ہوئی ہو۔ اب سوال یہ ہے کہ اس جذبہ کا کس قدر حصہ فنِ ادب کا جائز موضوع ہو سکتا ہے؟

میں سمجھتا ہوں کہ اس مشکل سے عہدہ برآ ہونے کے لئے ہمیں اُن مظاہر ذہنی کی حیرت انگیز نوعیت پر نگاہ ڈالنی چاہیئے جو عشق کے زمانہ میں نمودار ہوتے ہیں۔ اس زمانہ میں انسان ایک عجیب فریب میں مبتلا ہو جاتا ہے، ایک ایسے عجیب و غریب فریب میں کہ بڑے بڑے فلسفیوں کی توجہ ہزارہا سال تک اس پر مبذول ہوتی رہی ہے۔ تمہیں معلوم ہے کہ افلاطون نے ایک مشہور نظریہ میں اس کی توضیح کرنے کی کوشش کی تھی۔ میرا اشارہ اس فریب کی طرف ہے جو کسی شخص کے حواس کو بظاہر بدل دیتا ہے یا یہ کہو کہ ایک خاص زمانہ میں اس

کے حواس کو فی الحقیقت بدل دیتا ہے۔ اس کی آنکھ کے لئے ایک خاص چہرہ یک بیک دنیا کی حسین ترین چیز بن جاتا ہے۔ اس کے کانوں کو ایک خاص آواز کا زیر و بم دنیا بھر کی موسیقی سے زیادہ شیریں معلوم ہوتا ہے۔ عقل کو اس سے کچھ سروکار نہیں اور عقل کو اس افسون پر مطلق قابو نہیں ہوتا۔ قدرت کے حیرت خانۂ اسرار میں سے نکل کر خدا جانے کس طرح یہ عجیب سحر کسی شخص کے حواس کو ناگہاں منور کر دیتا ہے اور پھر جس طرح خاموشی سے آیا تھا اسی طرح غائب ہو جاتا ہے۔ یہ ایک عجیب فوق الفطرت چیز ہے اور کوئی عجیب فوق الفطرت نظریہ ہی اس کی تشریح کر سکتا ہے۔ ہربرٹ سپنسر تک نے اس کے متعلق ایک جدید نظریہ قائم کرنے کی غرض سے اپنا استدلال صرف کیا ہے۔ اس بارے میں مجھے کچھ زیادہ کہنے کی ضرورت نہیں۔ تم کو صرف یہ بتا دینا کافی ہوگا کہ اب عشق کے متعلق ایک طرح سے یہ خیال کیا جاتا ہے کہ اسے موجودہ زندگی سے علاوہ دوسری زندگیوں سے کچھ علاقہ ہے۔ مختصراً یوں سمجھو کہ ایک قسم کی بتدریج ارتقا پاتی ہوئی یاد ہے اُن تعلقات کی جو وجود کی ہزاروں اور لاکھوں گزری ہوئی صورتوں میں قائم تھے۔ یہ نظریات صحیح ہوں یا غلط عشق کی یہی پُراسرار ساعت، یہی فریب کا زمانہ بجا طور پر اعلیٰ درجہ کی شاعری کا موضوع ہے۔ صرف اس لئے کہ یہ انسانی زندگی کا سب سے زیادہ دلکش اور سب سے زیادہ نادر احساس ہے۔ اور کیوں؟

اس لئے کہ اس احساس کی قلیل مدت میں وہ بلند سے بلند، وہ لطیف سے لطیف جذبات جن کی انسانی فطرت استعداد رکھتی ہے بیدار ہو جاتے ہیں۔ اس وقت آدمی کم از کم ایک انسانی ہستی کے لئے ایسا بے غرض ہو جاتا ہے جیسا زندگی کی کسی اور گھڑی میں کبھی نہیں ہوتا۔ نہ صرف بے غرضی بلکہ ایثارِ نفس ایک ایسی خواہش ہے جو اس زمانہ سے مخصوص ہوتی ہے۔ وہ نوجوان جو محبت کرتا ہے صرف اسی پر رضامند نہیں ہوتا کہ جس سے اُسے محبت ہے اپنی ہر چیز اس کی نذر کر دے بلکہ وہ چاہتا ہے کہ تکلیفیں سہے، کڑیاں جھیلے اور اس کی خاطر اپنی جان جوکھوں میں ڈالے۔ اسی لئے ٹینی سن نے اِس وقت کا ذکر کرتے ہوئے نہایت خوبی سے کہا ہے ؎

عشق نے زندگی کا رباب اٹھا لیا اور اس کے تمام تاروں پر زور سے
چوٹ لگائی،
خودی کے تار پر چوٹ لگائی جو لرزتا ہوا، گاتا ہوا نگاہ سے غائب ہو گیا۔

بلاشبہ بے غرضی بجائے خود ایک نہایت شریفانہ احساس ہے قطع نظر اس سے کہ اس کی علت کیا ہو لیکن شدید ہیجان کی صورت میں اعلیٰ درجہ کے اور محسوسات بھی موجود ہوتے ہیں۔ رحم، ملاطفت (وہ ملاطفت جو انسان ایک بچے کے لئے محسوس کرتا ہے) بے یار و مددگار سے الفت، حفاظت کرنے کی آرزو، یہ سب کیفیتیں طاری ہوتی ہیں اور ایک تیسرا احساس جس کا شعور اس وقت کسی اور وقت کے مقابلے میں زیادہ قوت کے ساتھ ہوتا ہے ادائے فرض کا احساس ہے۔ اخلاقی اور معاشرتی ذمہ داریاں اس وقت ایک بالکل نئے انداز میں ذہن پر روشن ہوتی ہیں۔ یقیناً کوئی شخص ان حقائق سے اور ان حقائق کے حسن و زیبائی سے انکار نہیں کر سکتا۔

اخلاقی احساسات سب سے زیادہ گراں قدر ہوتے ہیں۔ لیکن ان کے بعد محض حسن کا شاعرانہ احساس بھی عقلی، بلکہ ثانوی حیثیت سے اخلاقی تجربہ کی بہت بلند شکل ہے۔ حکمت (سائنس) کے رو سے حسن اور نیکی، جسمانی کمال اور اخلاقیاتی کمال میں باہم ایک رشتہ

ہے۔ اس میں شک نہیں کہ یہ رشتہ اطلاقی حیثیت نہیں رکھتا۔ اس دنیا کی کسی چیز میں اطلاقیت نہیں لیکن رشتہ قائم ضرور ہے۔ جو شخص ایک نوع کے حسن کی بلند ترین صورت کا ادراک کرسکتا ہے۔ وہ دوسری نوع کے حسن کو بھی کسی نہ کسی حد تک شعور میں لاسکتا ہے۔ مجھے خوب معلوم ہے کہ ایام محبت کی معراج ایک فریب، ایک دھوکا ہے۔ ہزاروں میں سے نوسو ننانوے صورتوں میں محبوب عورت کا حسن صرف تصور میں موجود ہوتا ہے۔ لیکن کیا اس سے اُن حقائق کی پاکیزگی میں جو اس تصور کے ساتھ وابستہ ہیں کوئی فرق پیدا ہونا ممکن ہے؟ میرے خیال میں تو نہیں۔ حسن کا تصور کرنا درحقیقت اُس کو دیکھنا ہے۔ خارجی طور پر تو شاید یہ صحیح نہ ہو مگر باطنی طور پر بلا شائبۂ شبہ و شک ہم کو حسن نظر آجاتا ہے۔ خواہ تم اس حسن کو صرف اپنے ذہن میں دیکھو، یہ تمہارے ذہن میں ہے تو سہی اور اس کا اخلاقیاتی اثر تمہارے ذہن میں بروئے کار تو ضرور آئے گا جس دوران میں کوئی شخص خواہ فرضی جسمانی حسن ہی کی پرستش کرتا ہوا اُس کو ایک بلند تر قسم کے حسن، دل ودماغ کے حسن، کی ایک چھپی ہوئی جھلک دکھائی دیتی ہے۔ کیا اس دنیا میں کبھی کوئی سچا عاشق ایسا بھی ہوا ہے جو اپنی منظور نظر عورت کو بنی نوع انسان میں نہ صرف سب سے زیادہ خوبصورت بلکہ اخلاقی اعتبار سے بھی بہترین ہستی نہ سمجھتا ہو؟ میرے خیال میں تو ایسا کوئی نہیں ہوا۔

کسی شخص کے اخلاقی وروحانی احساسات جب یوں بیدار ہوتے ہیں تو اس کی تمام لطیف تر انسانی قوتوں کو دفعتہً پیغام عمل دیتے ہیں یعنی اُن تمام ممکناتِ حیات کو جو جد و جہد، شجاعت وبسالت اور ہر طرح کے انتہائی مشقت طلب دماغی یا جسمانی کام غرض ہر ایسی چیز کا مصدر ہیں جو تیزیٔ فکر اور صحتِ عمل کی مقتضی ہو۔ کم از کم اس وقت کے لئے انسان اپنے اندر ایک نئی طاقت محسوس کرنے لگتا ہے۔ کوئی ایسی چیز جو کسی شخص کے قوا کے بہترین استعمال کے لئے زبردست تحریک کرے فائدہ رساں اور بسا اوقات قابلِ احترام ہوتی ہے حقیقت یہ ہے کہ اسی قلیل مدت میں جس کا ذکر میں کر رہا ہوں عورت یا مرد کی سیرت کے بہترین پہلو ہم پر آشکار ہوتے ہیں۔ اس عرصہ میں مذموم صفات اور بدنما پہلو جس حد تک ممکن ہو نظر نہیں آنے پاتے۔

اِن تمام اسباب کے باعث جن کا ذکر کیا گیا ہے اور بہت سے دوسرے اسباب کے باعث جن کا ذکر کیا جاسکتا ہے، محبت کے فریب کا زمانہ ہی درحقیقت وہ زمانہ ہے جسے شاعر اور داستان لکھنے والے قدرۃً جائز طور پر بیان کرسکتے ہیں۔ کیا وہ سلامتی اور معقولیت کے ساتھ اس سے تجاوز کرسکتے ہیں؟ یہ بہت کچھ اس پر منحصر ہے کہ وہ اوپر جاتے ہیں یا نیچے۔ اوپر جانے سے میری مراد اخلاقی مثالیت[1] کی حدود کے اندر رہنا ہے۔ نیچے جانے سے میری مراد محض حیوانی موجودیت[1] کی سطح پر اتر آنا ہے۔ اس موجودیت میں کوئی ایسی چیز نہیں جو اس قابل ہو کہ فنونِ لطیفہ کی کسی صنف کی توجہ کا بہترین حصہ اس پر مبذول ہو۔

فنونِ لطیفہ کا مقصد کیا ہے؟ یہ مقصد کیا یہ نہیں ہے، یا کم از کم کیا یہ مقصد نہیں ہونا چاہئے کہ جو حالات دنیا میں موجود ہیں ان سے کہیں بہتر حالات کا تصور ہم میں پیدا ہو اور اس تصور کے پیدا ہونے سے اُن بہتر حالات کے وجود میں آنے کا راستہ

۱؎ حقائقِ عالم کی وہ تعبیر جس کا معیار محض مادی واقعات کی ظاہری کیفیت نہیں بلکہ انسان کا اعلیٰ ترین تصور یا نصب العین ہو مثالیت کہلاتی ہے۔
اس کے مقابل کے نظریے کا نام موجودیت ہے جو موجودات کما ہی سے بحث کرتا ہے۔

صاف کیا جائے؟ میں سمجھتا ہوں کہ فنونِ لطیفہ کی تمام اعلیٰ درجہ کی مثالوں نے یہی کیا ہے۔ کیا تمہیں وہ پرانا قصہ یاد ہے کہ یونانی مائیں اپنے کمروں میں کسی دیوتا یا انسان کی مورت جو دنیا کی تمام چیزوں سے زیادہ حسین ہوتی تھی اس غرض سے رکھتی تھیں کہ اُن کا تصورِ حسن کے نظارہ سے ہر وقت متاثر ہوتا ہے اور اس طرح وہ شاید اس قابل ہوں کہ زیادہ خوبصورت بچے دنیا میں لاسکیں؛ عرب میں بھی مائیں کچھ اسی قسم کا کام کرتی ہیں لیکن چونکہ اُن کے ہاں صورت گری کا کوئی فن نہیں اس لئے وہ خود فطرت سے زندہ صورتیں مستعار لے لیتی ہیں۔ سیاہ روشن آنکھیں خوبصورت ہوتی ہیں اور بیویاں اپنے خیموں میں ایک چھوٹا سا ہرن رکھتی ہیں جسے غزال کہتے ہیں۔ یہ ہرن اپنی آنکھوں کے حسن اور درخشانی کے لئے مشہور ہے۔ اس پیارے جانور کو عربی بیوی اس امید سے ہمیشہ دیکھتی رہتی کہ کبھی وہ ایک ایسا بچہ دنیا میں لائے گی جس کی آنکھیں غزال کی آنکھوں کی طرح خوبصورت ہونگی۔ فنونِ لطیفہ کی اعلیٰ ترین کوشش کو ہماری یا کم از کم دنیا کی وہی خدمت بجالانی چاہئے جس کی توقع یونانی اور عربی مائیں مورت اور غزال سے رکھتی تھیں یعنی یہ کہ حالاتِ موجودہ سے بلند تر حالات کا وجود میں آنا ممکن

یہ سب کچھ کہہ چکنے کے بعد دوبارہ غور کرو کہ کسی انسانی زندگی میں جذبۂ عشق کی صحیح حیثیت اور حقیقت کیا ہے۔ محبت کا زمانہ اپنی اصلیت و ماہیت کے اعتبار سے مثالیت کا زمانہ ہے — وہ زمانہ جس میں اس سے کہیں بہتر اشیا و حالات جو اس دنیا میں ممکن ہیں انسان کے تخیل میں آتے ہیں۔ کیونکہ ہر وہ شخص جس نے محبت کی ہے کسی ایسی چیز کا تصور کر چکا ہے جو ممکن اور موجود سے بلند تر ہو۔ ہر قسم کی مثالیت فنونِ لطیفہ کا جائز موضوع ہوسکتی ہے۔ موجودیت کا معاملہ بالکل برعکس ہے۔ مانا کہ جذبات کا یہ وفور، یہ تخیل، یہ لطیف احساس سب کچھ ایک سادہ سی حیوانی تحریک کی بنیاد پر قائم ہے لیکن اس سے اُس جذبہ کے بلند ترین نتائج کی قدر و قیمت میں خفیف سا فرق بھی نہیں آتا۔ بالکل یہی بات ہم تمام انسانی جذبات کے متعلق کہہ سکتے ہیں۔ ہر جذبے کا سراغ ارتقائی طور پر ایسے مفرد اور خود غرضانہ ہیجانات تک پہنچتا ہے جن میں انسان ادنیٰ حیوانات کے ساتھ شریک ہے لیکن اگر کسی سیب کے درخت یا ناشپاتی کے درخت کی جڑیں زمین میں ہیں تو کیا اس سے یہ لازم آتا ہے کہ اس کا پھل خوبصورت اور لذیذ نہیں ہے؟ درخت کے پھل کو یقیناً اس کی نظر نہ آنے والی جڑوں سے نہیں جانچنا چاہئے لیکن اگر کوئی شخص جڑوں کو دیکھنے کے لئے زمین کھودنے لگے تو اس کے متعلق کیا کہا جائے گا؟ جب جڑیں اس طرح کھود ڈالی جائیں تو درخت کی خوبصورتی کا کیا حشر ہوتا ہے؟ موجودیین کم از کم فرانس کے موجودیین یہی کرنا چاہتے ہیں۔ اُنہیں اس بات کا شوق ہے کہ اپنے ناظرین کی توجہ اعلیٰ کی بجائے اسفل کی طرف کھینچیں، اس چیز کی طرف جسے چھپائے رکھنا چاہئے۔ اور اسی وجہ سے چھپائے رکھنا چاہئے جس وجہ سے درخت کی جڑیں تہِ زمین رہنی چاہئیں۔ اگر درخت کا زندہ رہنا مقصود ہو۔

الغرض ایامِ فریب ہی عشق کی ساعتِ زریں ہیں۔ یہ اس صناعیاتی طبقہ کو تعبیر کرتے ہیں جس میں شاعر اور داستان نویس کو اس بات کی آزادی ہونی چاہئے کہ بڑی سے بڑی بلند پروازی جو اس سے ممکن ہو کر دکھائے۔ وہ چاہے تو اس طبقہ سے باہر بھی نکل سکتا ہے لیکن اس صورت میں صرف دو سمتیں ہیں جن کا رخ وہ کرسکتا ہے۔ اس کے اوپر کی طرف تو مذہب ہے اور کوئی شاعر چاہے تو ڈینٹی

کی طرح عشق کو مذہبی کیف وسرور کے جذبہ کی شکل دینے میں کامیاب ہو جائے۔ میں نہیں سمجھتا کہ کوئی شاعر زمانۂ حال میں یہ کرسکتا ہے ہمارا عہد مذہبی وجد ونشاط کا عہد نہیں۔ لیکن اوپر کی طرف جانے کا کوئی اور راستہ نہیں ہے۔ نیچے کی طرف چلتے چلتے شاعر اتنا نیچے اُتر سکتا ہے کہ جہنم تک پہنچ جائے۔ بلاشبہ حدود مثالیت اور موجودیت کے حیوانی نقطۂ نظر کے درمیان متعدد تدریجات ہیں میں صرف اُس چیز کی طرف اشارہ کر رہا ہوں جو میرے نزدیک ایک صداقت مطلقہ ہے کہ محبت کے بیان میں اساتذۂ فن کو ایام فریب سے سروکار رکھنا چاہئے۔ اس سے نیچے اترنا ایک خطرناک کام اپنے ہاتھ میں لینا ہے۔ اور اب کہ ہم اس موضوع کے متعلق بلند پایہ ادبیات اور ان چیزوں کے درمیان جو بلند پایہ نہیں ہیں ایک ایسی حدِ فاصل قائم کرنے کی کوشش کر چکے ہیں جو موزوں اور صحیح خیال کی جاتی ہے ہم بعض مثالوں کا مطالعہ شروع کرسکتے ہیں میں انگریزی اور دوسرے شعراء کے کلام سے ایسے قطعات دست برداشتہ انتخاب کروں گا جن سے میرے مفہوم کی تشریح ہوتی ہو۔

زمانۂ حاضرہ کے شعراء میں تم شاید سب سے زیادہ ٹینی سن سے روشناس ہو اُس نے عشق کے جذبۂ مثالی کے چند نفیس نمونے پیش کئے ہیں ان میں سے ایک اس دلکش گیت کا آخری بند ہے جو اس کی مشہور نظم "ماڈ" میں آتا ہے۔ میرا مطلب اُس موقع سے ہے جہاں عاشق باغ میں انتظار کر رہا ہے اور اپنی محبوبہ کے قدموں کی چاپ اُسے قریب آتی ہوئی سنائی دیتی ہے ؎

وہ آرہی ہے میری پیاری، میری شیریں ادا،
اس کی صباخرامی میں خواہ کتنی نزاکت ہو
میرا دل اس کے قدموں کی صدا سن لے گا اور دھڑکنے لگے گا۔
ہاں! خواہ یہ دل ایک مٹی کے بچھونے میں مٹی ہو گیا ہو۔
میری خاک اس کے قدموں کی صدا سنے گی اور رقص کرے گی ———
خواہ مجھے لحد میں سوئے صدیاں گزر چکی ہوں۔
——— چونک اُٹھے گی اور اس کے پاؤں کے نیچے تڑپے گی اور گلنار اور قرمز
بن کر پھول پڑے گی۔

یہ خالص مثالی جذبے کا ایک نہایت پاکیزہ نمونہ ہے۔ تم چاہو تو یہ کہہ لو کہ شاعر کا زورِ تخیل حدِ اعتدال سے متجاوز ہو گیا ہے لیکن اسکے خلوص وصداقت میں کوئی کلام نہیں ہوسکتا کیونکہ عشق کا تخیل لازماً حدِ اعتدال سے تجاوز کر جاتا ہے۔ یہ سوال کرنا بالکل بے کار ہے کہ کیا کسی لڑکی کے قدموں کی آواز فی الحقیقت کسی مرے ہوئے آدمی کو بیدار کرسکتی ہے؟ ہمیں معلوم ہے کہ محبت بالکل قدرتی طور پر اس قسم کی باتوں کا تصور کرسکتی ہے اور یہ بات کسی ایک ملک سے مخصوص نہیں بلکہ ہر قوم اور ہر ملک کے لئے عام ہے۔ ایک عربی نظم میں جو رسول عربیؐ کے زمانہ سے بہت پہلے کی لکھی ہوئی ہے۔ بعینہٖ یہی خیال نسبتۂ سادہ الفاظ میں بیان کیا گیا ہے اور میں سمجھتا ہوں کہ کچھ ایسی ہی بات بعض پرانے جاپانی گیتوں میں بھی موجود ہے۔ اس عبارت کا اصل مطلب صرف یہ ہے کہ

عاشق کے لئے محبوب عورت کی آواز اور نگاہ اور مس بلکہ پاؤں کی آہٹ بھی موت اور زیست کے برابر اہم ہوگئی ہے۔ اس دوران میں وہ کسی اور معبود کو نہیں جانتا۔ وہی اس کی دیوی ہے کیونکہ عاشق پر جو اختیار اُسے حاصل ہوگیا ہے وہ نامحدود اور ناقابلِ مدافعت ہے۔

دوسری مثال ہم اسی نظم کے ایک اور حصے سے لیتے ہیں۔ شادی کا وعدہ دیا جاچکا ہے اور عاشق کی زبان سے کامرانی کا نغمۂ سرور بلند ہوتا ہے ؎

آہ یہ مضبوط، یہ ٹھوس زمین
کہیں میرے پاؤں تلے سے پھسل ہی نہ جائے
اس سے پہلے کہ میری زندگی بھی اس چیز کو پاسکے
جسے بعض دوسروں نے اس قدر شیریں پایا ہے۔
اس کے بعد جو کچھ بھی ہونا ہو، ہوجائے،
خواہ میں مجنون ہی کیوں نہ ہوجاؤں
میں اپنا بہار کا دن تو دیکھ چکا ہوں گا۔

یہ پیارا آسمان ابھی اور کچھ دیر تک برقرار رہے
اور اس کی وسعت سمٹتی ہوئی کہیں میرے سر پہ تاریک نہ ہوجائے
اس سے پہلے کہ میں یہ جان لوں، سچے دل سے ایک بار یہ جان لوں
کہ دنیا میں کسی کو مجھ سے بھی محبت ہے۔
اس کے بعد جو کچھ بھی ہونا ہو، ہوجائے،
ایک سراپا الم زندگی کو ان باتوں کا کیا ڈر؟
میں اپنا بہار کا دن تو دیکھ چکا ہوں گا۔

عاشق کے دل کی کیفیت یہ ہے کہ بعد میں خواہ کیا کچھ پیش آنے والا ہو، محبوب عورت کا مل جانا ہی اتنی بڑی بات ہے کہ اس سے زیست اور موت اور درد والم اور ہر چیز کی قیمت ادا ہوجاتی ہے۔ محبت کے التباس کی ایک نہایت نمایاں خصوصیت وہ شاندار استغنا ہے جو انسان کو نتائج سے بے پروا بنا دیتا ہے کم از کم اُن نتائج کا مطلق خیال نہیں کیا جاتا جن سے اخلاق یا شرافت اور آبرو پر کوئی حرف نہ آتا ہو۔ اور یہ تو بالعموم سمجھ ہی لیا جاتا ہے کہ شاعر جب اس جذبہ کو موضوعِ سخن بناتا ہے تو اس کے پیشِ نظر بلند اور پاکیزہ فطرت کے لوگ ہوتے ہیں۔ آگے چل کر جب ہم محبت کے ایک اور پہلو پر غور کرینگے تو ہم دیکھیں گے کہ اس عظیم الشان استغنا کا مضمون وکٹر ہیوگو نے ٹینی سن سے کہیں زیادہ حیرت انگیز کمال کے ساتھ باندھا ہے لیکن اس سے قبل میں چاہتا ہوں کہ تمہیں ایک امریکن شاعر کی ایک

نظم سناؤں جس میں اُس نے عشق کی دلفریب کہانی کو نہایت خوبی اور نزاکت سے بیان کیا ہے۔ یہ چیز زمانۂ حال کی نہایت دلآویز نظموں میں سے ہے اور عجب نہیں کہ ہمیشہ رہنے والے اشعار کی صف میں جگہ پائے کیونکہ یہ اب تک نظم کے چار یا پانچ مختلف مجموعوں میں شائع ہو چکی ہے۔ اس کا عنوان "اٹیلانٹا کی دوڑ" ہے۔

سب سے پہلے میں تمہیں اٹیلانٹا کی کہانی سناتا ہوں تاکہ تم نظم کی لطیف تلمیح کو زیادہ خوبی کے ساتھ سمجھ سکو۔ اٹیلانٹا ایک یونانی بادشاہ کی بیٹی تھی۔ کوئی لڑکی اس کے برابر خوبصورت نہ تھی اور اس کے ساتھ ہی دنیا میں کوئی شخص اس کے برابر تیز نہ دوڑ سکتا تھا۔ وہ اپنا وقت سیر و شکار میں گزارتی تھی اور شادی کرنا نہ چاہتی تھی لیکن چونکہ بہت لوگ اس سے شادی کرنے کے آرزومند تھے اس لئے ایک قانون بنایا گیا کہ جو شخص اُس سے شادی کرنا چاہے اُسے شہزادی کے ساتھ پہلے ایک دوڑ لگانی ہوگی۔ اگر دوڑ میں اُس شخص کی جیت رہے تو شہزادی اس سے بیاہ کرے گی لیکن اگر وہ ہار جائے تو اُس کی سزا موت ہوگی۔ ایک بیان یہ ہے کہ مرد کو پہلے دوڑنے دیا جاتا تھا اور لڑکی ہاتھ میں ایک نیزہ لئے ہوئے اُس کے پیچھے بھاگتی تھی۔ یہاں تک کہ جب وہ اُس شخص کو جالیتی تو نیزے سے مار ڈالتی تھی۔ اس دوڑ کے متعلق مختلف بیانات ہیں۔ شادی کے بہت سے خواستگاروں نے دوڑ ہار کر اس طرح اپنی جانیں گنوائیں لیکن آخر میں ایک نوجوان آیا جس کا نام ہپومینیز تھا۔ اُسے محبت کی دیوی نے سونے کے تین سیب دیئے اور کہا کہ "بھاگنے میں اگر تم یہ سیب گراتے جاؤ گے تو لڑکی ان کو اٹھانے کے لئے رکے گی اور اس طریقے پر تم دوڑ میں جیت سکو گے"۔ چنانچہ وہ دوڑا اور جب اُس نے اپنے آپ کو دوڑ ہارتے ہوئے پایا تو ایک سیب پھینک دیا۔ لڑکی سیب کو اُٹھانے کے لئے رُکی اور اس طرح ہپومینیز کسی قدر آگے نکل گیا۔ اسی ترکیب سے اُس نے دوڑ جیت لی اور اُس کی شادی اٹیلانٹا سے ہو گئی۔ قدیم یونانی روایت کے مطابق بعد میں ہپومینیز اور اُس کی بیوی شیروں کی صورت میں بدل دیئے گئے کیونکہ انھوں نے دیوتاؤں کی نافرمانی کی تھی۔ لیکن اس بات سے یہاں ہمیں کچھ سروکار نہیں۔ یونان کے اس پرانے قصے میں ایک نہایت دلکش اخلاقی نکتہ مضمر ہے اور امریکن نظم کی خوبی یہی ہے کہ اس کے مصنف ارس ٹامسن نے اس لطیف نکتے کو سمجھا اور اسے ایک عظیم فلسفیانہ صداقت کی تشریح کے لئے استعمال کیا ؎

جب بہار کا موسم عنفوانِ شباب پر ہوتا ہے، اور خواب ناک ہوائیں شہریں خوشبوؤں
کو اٹھائے ہوئے جنوب سے چل کر آتی ہیں۔
(اُس وقت) میں اپنی محبوبہ کو کسی ہرے ہرے ٹھنڈے ٹھنڈے کنج اشجار کے درمیان،
درختوں کی کسی تسبیح گاہ کے درمیان، تاریک روشوں پر اپنے سبک رو قدموں کے
چمکتے ہوئے نقش چھوڑ جاتے دیکھتا ہوں

وہ ایک بوسے کا سراغ ہوا میں چھوڑ جاتی ہے

اور مجھے ایسی سرگوشیوں میں جو گلاب کے پھولوں کی سانس کے مانند میٹھی ہیں،
پیغام دیتی ہے کہ بھاگ کر آؤ؛
میں جانتا ہوں کہ اس دوڑ میں ہارنا میرے لئے مقدر ہو چکا ہے
اور آخر میں یا مجھے معلوم ہے، کہ موت میرے لئے کھڑی ہے

لیکن میں خوش و خرم اپنا بند بند برہنہ کر دیتا ہوں
اپنے بدن کو نسیم تابستاں کے جھونکوں کی مالش کے لئے کھول دیتا ہوں اور اپنی ایک
ایک رگ، ایک ایک ریشے میں
مجھے ہیپومینیز کی چستی اور تنومندی دوڑتی ہوئی محسوس ہوتی ہے۔
آہ اے محبت کی دوڑ! ہم سب
کنج ہائے بہار میں سے ہوتے ہوئے تیرے پُر سرور میدان میں دوڑ چکے ہیں،
اور جب آخر کار ہم ہارے، تو ہم نے
زندگی اور موت اور کسی چیز کی پروا نہیں کی!

ان اشعار میں دو ایک باتیں تھوڑی سی شرح کی محتاج ہیں۔ تم جانتے ہو کہ یونانیوں کے کھیل اور دنگل سب سے زیادہ خوشگوار موسم میں قرار پایا کرتے تھے اور جو لوگ مقابلوں میں اترتے تھے وہ اپنے سب کپڑے اتار دیتے تھے۔ ساتھ ہی اُن کے بدن پر تیل کی مالش کی جاتی تھی اس سے غرض کچھ تو یہ ہوتی تھی کہ جلد دھوپ اور گرمی کے اثر سے محفوظ رہ سکے اور کچھ یہ کہ جسم زیادہ نرم اور گدرایا ہوا رہے شاعر نظم میں نوجوان کے متعلق یہ کہتا ہے کہ بہار کی یعنی انسانی زندگی کے موسم تابستاں کی حرارت بخش ہوا اسے مالش کرتی ہے۔ یہ ایک دلآویز خیال ہے۔ جو بات وہ ہم کو سمجھا رہا ہے دراصل یہ ہے:-

"اگرچہ یونانیوں کے میلے اور کھیل ختم ہو گئے لیکن محبت کی دوڑ پہلے زمانے کی طرح آج بھی لگائی جاتی ہے۔ شباب اس کا موسم ہے اور شباب کی فضا گویا مقابلے میں اُترنے والے کی مالش ہے"

مگر نظم کی اصلی خوبی اُس اخلاقی سبق اور اس دلکش اور عجیب و غریب حقیقت میں چھپی ہوئی ہے جسے شاعر نے کمال حسن تخیل سے ادا کیا ہے۔ ہم میں سے تقریباً ہر شخص کی زندگی میں ایک موقع ایسا آتا ہے جب ہمیں صرف کسی ایک ہستی کی پروا ہوتی ہے اور ہم اس ہستی کی خاطر بڑی بڑی کڑیاں جھیلتے ہیں لیکن اُس زمانے میں ہمیں رنج و کلفت اور موت کی کچھ پروا نہیں ہوتی۔ بعد کے دنوں میں جب ہم شباب کی اُن ساعتوں پر نگاہ ڈالتے ہیں تو ہم کو حیرت ہوتی ہے کہ اس زمانے میں ہمارے احساسات کیا تھے۔ یورپ میں یہ قدیم یونانی داستان آج بھی بالکل اسی طرح سچی ہے۔ تقریباً ہر شخص کو اٹیلانٹا کی دوڑ لگانی ہوتی ہے اور نتیجہ بھگتنا پڑتا ہے۔ (باقی آئندہ)

حمید احمد خاں

فریبِ ہستی

مخلوقِ خدا جہاں کہیں ہے — اک ہستیٔ نیستی قریں ہے

انجم، قمر، آفتاب، افلاک — جلوہ اِن سب کا بالیقیں ہے

لیکن یہ یقیں بطورِ اذعان — بے حجّت و بے چنان چنیں ہے

سُن سُن کے جما لیا ہے دل میں — تحقیق کا کون خوشہ چیں ہے

ہستی کی طلسم سازیوں میں — اک خواب و خیال جاگزیں ہے

اس خواب و خیال کی بدولت — دھوکے میں نگاہِ خوردہ بیں ہے

فانی کو سمجھ لیا ہے باقی — غائب یہ گمانِ حاضریں ہے

کہئے اسے سوجھ بوجھ پر کیا — متوالے کو کہتے ہیں، ذہیں ہے

رنگیں میوے کا نام نارنگ — میٹھا، کھٹّے کا جانشیں ہے

اعمیٰ کا خطاب میر روشن — بہرا دنیا میں بجبر دیں ہے

چلتی ہوئی شے کا نام گاڑی — کھویا وہ، جو ملکے تہ نشیں ہے

القصہ جدھر بغور دیکھا — رنگِ برعکس ہر کہیں ہے

بے شبہ یہ سازشِ زمانہ — دو دن کی نمائشِ زمیں ہے

کوئی بھی نہ اس سے دل لگائے — اچھی یہ دل لگی نہیں ہے

پھیلا ہے جو سازِ دل کشی کا — پھندا ہے، کمند ہے کمیں کا

بچتے رہنا ہمیشہ اس سے — یہ یار وہ مارِ آستیں ہے

جس سے ہوئی تیغ جانِ شیریں — زہراب بشکلِ انگبیں ہے

سُن لو! غالب سے نکتہ داں کا — اک شعر جو وجد آفریں ہے

ہاں کھائیو مت فریبِ ہستی
ہر چند کہیں کہ ہے! نہیں ہے!!

احسن مارہروی

ڈیمانسٹریشن

تمہید۔ منشی گوری پرشاد رنگین طبع آدمی ہیں۔ گانے بجانے کا شوق ہے، کھلانے کھلانے کا شوق ہے، اور سیر تماشے کا شوق ہے۔ پر اسی مناسبت سے کسب معاش کا شوق نہیں ہے۔ یوں دو کسی کے محتاج نہیں ہیں۔ بھلے آدمیوں کی طرح رہتے ہیں اور ہیں بھی بھلے آدمی۔ مگر کسی کام میں چمٹ نہیں سکتے۔ عزم کا کہیں پتہ نہیں ہے۔ وہ کوئی ایسا کام کرنا چاہتے ہیں جس میں آناً فاناً قارون کا خزانہ مل جائے اور وہ ہمیشہ کے لئے معاش سے بے فکر ہو جائیں، بینک سے چھ ماہی سود چلا آئے کھائیں اور مزے سے پڑے رہیں۔ کسی نے صلاح دی ناٹک کمپنی کھولو۔ اُن کے دل میں بھی یہ بات جم گئی۔ دوستوں کو ڈرامہ لکھنے کی دعوت دینی شروع کر دی۔ کمپنی کا پراسپکٹس بنا۔ کئی مہینے اُس کے خوب چرچے رہے۔ کئی بڑے بڑے آدمیوں نے حصے خریدنے کے وعدے کئے۔ لیکن نہ حصے بکے اور نہ کمپنی کھڑی ہوئی۔ ہاں اسی دھن میں گوری پرشاد نے ایک ناٹک کی تصنیف کر ڈالی اور یہ فکر ہوئی، کہ اسے کسی کمپنی کے نذر کیا جائے لیکن یہ تو معلوم ہی تھا کہ کمپنی والے ایک ہی گھاگھ ہوتے ہیں آسانی سے قابو میں آنے والے نہیں پھر ہر ایک کمپنی میں اس کا ڈراما نویس بھی ہوتا ہے اسے یہ کب گوارا ہوگا کہ اُس کے ممالک محروسہ میں کوئی غیر آدمی قدم رکھ سکے۔ وہ اس کی تصنیف میں طرح طرح کے عیب نکالے گا۔ اور کمپنی کے مالک کو بدظن کر دے گا۔ اس لئے تجویز ہوئی کہ مالکوں پر ناٹک کا کچھ ایسا وقار جما دیا جائے، کہ ڈراما نویس صاحب کی دال نہ گل سکے۔ پانچ آدمیوں کی ایک مشاورتی کمیٹی بنائی گئی۔ اُس میں سارا پروگرام مفصل طے کیا گیا، اور دوسرے دن پانچوں حضرات ناٹک کا معائنہ کرانے چلے۔ تانگے آگئے طبلے ہارمونیم وغیرہ اُس پر رکھ دئیے گئے۔ کیونکہ ناٹک کا ڈیمانسٹریشن کرنا طے ہوا تھا۔

یکایک ونود بہاری نے کہا یار تانگے پر جانے میں تو کچھ بے رعبی ہوگی۔ مالک سمجھے گا یہ حضرت کچھ یوں ہی ہیں۔ اس موقعہ پر دس پانچ روپیہ کا منہ دیکھنا مناسب نہیں ہے۔ میں تو انگریزوں کی اس مثل کا قائل ہوں کہ روپے میں پندرہ آنے تشہیر میں صرف کر کے باقی ایک آنہ میں روزگار کرتے ہیں۔ کہیں سے دو موٹر منگوانے چاہییں۔

رسک لال بولے لیکن کرائے کے موٹروں سے وہ بات پیدا نہ ہوگی جو آپ چاہتے ہیں۔ کسی رئیس کو پھانسنا چاہئے۔

بات سچی تھی۔ سبھیں نے ہی تسلیم کی۔ یہ مشورہ ہونے لگا کس رئیس سے سوال کیا جائے۔ اجی وہ بالکل کھوسٹ ہے۔ سویرے اس کا نام لے لو تو دن بھر پانی نہ ملے۔ — اچھا سیٹھ جی کے پاس کیوں نہ چلیں؟

واہ منہ دھو رکھئے۔ اُس کی گاڑیاں افسروں کے لئے رزرو ہیں۔ اپنے لڑکے تک کو تو بیٹھنے نہیں دیتا آپ کو دے دیتا ہے۔ اچھا تو کپور صاحب کے پاس کیوں نہ چلیں؟ ابھی اُنہوں نے نیا موٹر خریدا ہے۔ اجی اُس موذی کا نام نہ لو۔ کوئی نہ کوئی بہانہ کر

دے گا۔ ڈرائیور نہیں ہے مرمت میں ہے گورپرشاد نے بے صبر ہو کر کہا "تم لوگوں نے تو مفت کی زحمت مول لے لی۔ تانگوں پر چلنے میں کیا حرج تھا۔

بنو دبہاری نے پھڑکا رہنا لی۔ آپ تو گھاس کھا گئے ہیں۔ ناٹک لکھ لینا دوسری بات ہے اور معاملہ کو نپٹا لینا دوسری بات ہے۔ آٹھ آنے صفحہ سنا دے گا۔ اپنا سا منہ لے کر رہ جاؤ گے۔

امرناتھ نے فلسفیانہ انداز سے کہا "میں تو سمجھتا ہوں موٹر کے لئے کسی راجہ رئیس کی خوشامد کرنا بالکل عبث ہے۔ تعریف تو جب ہے کہ پاؤں پاؤں چلیں۔ اور وہاں ایسا رنگ جمائیں کہ موٹر سے بھی زیادہ شان رہے۔

بنو دبہاری اچھل پڑے۔ سبھی نے یہ تجویز پسند کی۔ لوگ پاؤں پاؤں چلے۔ وہاں پہنچ کر کس طرح باتیں شروع ہونگی، کس طرح تمہید باندھی جائیگی، کس طرح نعرۂ تحسین بلند ہوگا، کس طرح ڈراما نویس صاحب کو خوش کیا جائے گا۔ ان اہم مسائل پر باتیں ہوتی جاتی تھیں۔

یہ لوگ کمپنی کے کیمپ میں کوئی دو بجے پہنچے۔ وہاں کمپنی کے مالک، اُس کے ایکٹر، اور ڈراما نویس سب کے سب پہلے ہی سے انتظار کر رہے تھے۔ پان۔ الائچی۔ سگرٹ وغیرہ منگائے گئے تھے۔ علیک سلیک کے بعد رسک لعل نے سیٹھ جی (مالک کمپنی) سے کہا معاف کیجئے گا، ہمیں ذرا دیر ہوگئی۔ موٹر سے نہیں پاؤں پاؤں آئے ہیں۔ آج یہی صلاح ہوئی کہ حسن فطرت کا مزہ اٹھاتے چلیں۔ منشی گورپرشاد تو مناظرِ فطرت کے عاشق ہیں، ان کا بس ہوتا، آج گیروے کپڑے پہنے یا تو کہیں بھیک مانگتے ہوتے یا کسی کوہستانی علاقہ میں برگد کے نیچے بیٹھے چڑیوں کے نغمے سنتے ہوتے۔

بنود نے رَدّا جمایا، اور آتے بھی تو سیدھے راستے سے نہیں! جانے کہاں کہاں خاک چھانتے، چکر لگاتے، ان کے پیروں میں جیسے سنیچر ہیں!

امرناتھ نے اور رنگ جمایا۔ سادگی ان پر ختم ہے۔ نوکر چاکر تو موٹروں پر سوار ہوتے ہیں، اور آپ گلی گلی مارے مارے پھرتے ہیں جب عام روسا میٹھی نیند کے مزے لیتے ہیں۔ تو آپ کسی ندی کے کنارے۔۔ نورِ سحر کا سنگار دیکھتے ہیں۔

مست رام نے تائید مزید کی۔ شاعر ہونا بن و دنیا سے آزاد ہو جانا ہے۔ گلاب کی ایک پنکھڑی لے کر اُس میں نہ جانے کیا کیا گھنٹوں دیکھا کرتے ہیں۔ مبالغۂ فطرت نے ہی یورپ کے شعرا کو آسمان پر پہنچا دیا ہے۔ حضرت یورپ میں ہوتے تو آج ان کے دروازے پر ہاتھی جھومتا ہوتا۔ ایک دن ایک لڑکے کو روتے دیکھ کر آپ خود رونے لگے، پوچھتا ہوں، کیوں روتے ہو، تو اور روتے ہیں۔ منہ سے آواز نہیں نکلتی، بڑی مشکلوں سے طبیعت کو سکون ہوا۔

بنود - جناب، شاعر کا دل جذباتِ لطیف کا سرچشمہ، نغمۂ فطرت کا ساز، اور کیفیاتِ قلب کا آئینہ ہے۔

رسک - کیا بات کہی ہے آپ نے، واللہ! کیفیاتِ قلب کا آئینہ! شاعر کی صحبت نے آپ کو بھی شاعر بنا دیا۔

گورپرشاد نے انکسار آمیز لہجہ میں کہا، جناب میں شاعر نہیں ہوں، اور نہ مجھے شاعر ہونے کا دعویٰ ہے۔ آپ لوگ مجھے زبردستی شاعر بنائے دیتے ہیں۔ شاعر باری تعالیٰ کی وہ حیرت انگیز ایجاد ہے جو عناصرِ اربعہ کی جگہ عنصرِ لطیف سے بنا ہوا ہے۔

مست رام - آپ کے اس جملے پر سینکڑوں نظمیں نثار ہیں۔ آپ نے سنی، منشی رسک لعل شاعر کی عظمت! اس جملے کو یاد کر لیجئے۔ رٹ لیجئے۔

رسک - کہاں تک یاد کریں بھائی؟ یہ تو صنائع و بدائع میں باتیں کرتے ہیں اور انکسار کا یہ عالم ہے کہ اپنے آپ کو کچھ سمجھتے ہی نہیں اہلِ کمال کے یہی اوصاف ہیں جس نے اپنے کو کچھ سمجھا وہ گیا۔ (سیٹھ جی سے) آپ تو خود ہی ملاحظہ فرمائیں گے منشی جی نے اس ڈرامے میں اپنا دل نکال کر رکھ دیا ہے۔ بشر اس جو ایک قسم کی نازک مزاجی ہوتی ہے، وہ آپ کو چھو بھی نہیں گئی۔ اس ڈرامے کا مواد فراہم کرنے کے لئے آپ نے کچھ نہیں تو ایک ہزار ضخیم کتابوں کا مطالعہ کیا ہوگا۔ واجد علی شاہ کو متعصب مورخوں نے کتنا بدنام کیا ہے۔ یہ آپ مانتے ہی ہیں۔ اُس دفترِ بے معنی سے حقیقت کو ڈھونڈ نکالنا آپ ہی کا کام تھا۔

نبود - اسی غرض سے ہم اور آپ دونوں کلکتے گئے، اور وہاں کوئی چھ مہینے مٹیا برج کی خاک چھانتے رہے۔ واجد علی شاہ کے دستِ مبارک کا لکھا ہوا ایک ایسا نسخہ ہاتھ آ گیا جس میں انہوں نے روزمرہ کے واقعات قلمبند کئے ہیں۔ اُس زمانے کی ایک بڑھیا ابھی تک موجود ہے۔ چھ مہینے کی خوشامد کے بعد کہیں جا کر وہ یہ کتاب دکھانے پر راضی ہوئی۔

امرناتھ - کتاب نہیں ہے جناب پارۂ جواہر ہے۔

مست رام - اُس وقت اُس کی حالت ردی تھی، گورپرشاد نے اِس کوئلہ پر مہر لگا کر اشرفی بنا دیا۔ ڈراما ایسا چاہئے کہ جو سنے دل تھام لے، ایک ایک فقرہ دل میں چبھ جائے۔

امرناتھ - دنیا کے سبھی مشہور ناٹک آپ نے چاٹ ڈالے، اور صدہا کتابیں اس فن کے متعلق آپ کو حفظ ہیں۔

نبود - جبھی تو یہ ایجاد کیا ہے۔

امرناتھ - لاہور ڈرامیٹک کلب کا مالک ہفتہ بھر یہاں پڑا رہا۔ ہزارہا منتیں کیں کہ یہ ناٹک مجھے دے دیجئے۔ مگر آپ راضی نہ ہوئے۔ جہاں ایکٹر ہی اچھے نہ ہوں وہاں اپنا ڈراما کھلوانا اُس کی مٹی خراب کرنا ہے۔ اس کمپنی کے ایکٹر ماشاء اللہ اپنا جواب نہیں رکھتے، اور ہمارے ڈراما نویس صاحب کا شہرہ بھی عالمگیر ہے۔ اس کمپنی کے ہاتھوں میں پڑ کر یہ ڈراما دھوم مچا دے گا۔

نبود - ایک تو مصنف صاحب خود شیطان سے زیادہ مشہور، اُس پر یہاں کے ایکٹروں کا کمالِ فن۔ شہرت لٹ جائے گا۔

مست رام - روز ہی تو کسی نہ کسی کمپنی کا آدمی سر پر سوار رہتا ہے۔ مگر منشی جی کسی سے سیدھے منہ بات نہیں کرتے۔

نبود - بس ایک یہی کمپنی ہے جس کے تماشوں کے لئے دل بے قرار رہتا ہے۔ ورنہ اور جتنے ڈرامے کھیلے جاتے ہیں، دو کوڑی کے۔ میں نے تو تماشا دیکھنا ہی چھوڑ دیا۔

گورپرشاد - ناٹک لکھنا بچوں کا کھیل نہیں ہے خونِ جگر پینا ہے۔ میرے خیال میں ایک اچھا ناٹک لکھنے کے لئے پانچ سال کی مدت بھی کافی نہیں۔ بلکہ حقیقت تو یہ ہے کہ ~~ایک زندگی میں ایک~~ ہی لکھا جا سکتا ہے۔ یوں قلم گھسنا دوسری

بات ہے۔ بڑے بڑے آزمودہ کار نقاد اِن فن کا خیال ہے کہ انسان زندگی میں صرف ایک ڈراما لکھ سکتا ہے۔ روس، فرانس، جرمنی، سبھی ملکوں کے ڈرامے پڑھے پر ایک بھی عیب سے خالی نہیں۔ کہیں جذبات ہیں تو زبان نہیں۔ زبان ہے تو جذبات نہیں! ظرافت ہے تو گانے نہیں اور گانے ہیں تو ظرافت نہیں! جب تک یہ چاروں ارکان پورے نہ ہوں اُسے ڈراما کہنا ہی بے کار ہے۔ میں تو بہت ہی حقیر انسان ہوں آپ لوگوں کی صحبت میں کچھ شد بد آ گیا، ورنہ میری ہستی ہی کیا۔ لیکن انشاء اللہ آپ میرے ڈرامے میں یہ نقائص نہ پائیں گے۔

نبود۔ جب آپ اس صنف کے ماہر ہیں تو نقائص کیونکر رہ سکتے ہیں؟

رسک۔ دس سال تو آپ نے محض فنِ موسیقی میں کمال حاصل کرنے میں صرف کئے۔ گھر کے ہزاروں روپے باکمالوں کے نذر کر دیئے۔ پھر بھی نقائص رہ جائیں تو ظلم ہے۔

ریہرسل۔

ریہرسل شروع ہوا، اور ٹھئے، ہائے! اور واہ، واہ! کا تار بندھ گیا۔ کورس سنتے ہی ایکٹر اور پروپرائٹر اور ڈرامیٹسٹ سبھی گویا جاگ پڑے۔ تمہید نے اُن پر کوئی خاص اثر نہ پیدا کیا تھا۔ پھر ڈراما شروع ہوتے ہی آنکھیں کھل گئیں۔ سماں بندھ گیا۔ پہلا منظر آیا۔ آنکھوں کے سامنے واجد علی شاہ کے دربار کی تصویر کھچ گئی۔ درباریوں کی حاضر جوابی اور بذلہ سنجی کا کیا کہنا! لطیفے ایسے پھڑکتے ہوئے کہ سبحان اللہ! طرزِ کلام کتنا پسندیدہ۔ بندشیں کتنی چست، روزمرہ کتنا صاف۔ استعارات کیسے موزون سب کے سب سر دھننے لگے۔ تیسرا منظر ظرافت آمیز تھا۔ ہنستے ہنستے لوگوں کی پسلیوں میں درد ہونے لگا۔ فربہ اندام سیٹھ جی کی محتاط خموشی بھی متحرک ہو گئی۔ چوتھا سین دردناک تھا۔ ہنسی کے بعد سوز، آندھی کے بعد آنے والا سکون تھا۔ نبود آنکھوں پر ہاتھ رکھے سر جھکائے گویا رو رہے تھے۔ مست رام بار بار ٹھنڈی آہیں بھر رہے تھے اور امرناتھ کی تو سسکی بندھی ہوئی تھی۔ اسی طرح سین پر سین اور ایکٹ پر ایکٹ ختم ہوتے گئے۔ یہاں تک کہ جب ریہرسل ختم ہوا تو چراغ جل چکے تھے۔

سیٹھ جی اب تک ثقہ بنے بیٹھے تھے۔ ڈراما ختم ہو گیا پر اُن کے ظاہر پر باطن کا مطلق اثر نہ تھا۔ نہ چہرے پر مسکراہٹ تھی نہ آنکھوں میں حیرت، نہ خوشی، نہ رنج!

نبود بہاری نے سمجھا سیٹھ جی معاوضہ کی رقم کا خیال کر کے مبہوت ہو رہے ہیں۔ پوچھا جناب کا اس ڈرامے کے متعلق کیا خیال ہے؟

سیٹھ جی نے اسی جمود کے انداز سے کہا میں اس کے متعلق کل عرض کروں گا۔ کل آپ سب اصحاب یہیں کھانا کھائیں اب یہاں زیادہ ٹھہرنا شانِ بے نیازی کے خلاف تھا۔ پانچوں دوست باہر نکلے تو باچھیں کھلی ہوئی تھیں۔

نبود۔ پانچ ہزار کی تھیلی ہے۔ ناک ناک بد سکتا ہوں

رسک۔ میرا اندازہ تو چار ہزار کا ہے۔

امر۔ پانچ ہزار ہے یا دس، یہ تو نہیں کہہ سکتا۔ پر رنگ خوب جم گیا۔

مست رام۔ مجھے تو کامل یقین ہے کہ وہ دس ہزار سے نیچے جا ہی نہیں سکتا۔ آپ لوگ واہ واہ کر رہے تھے، میں سیٹھ جی کے قیافہ کا مطالعہ کر رہا تھا۔ آج ہی کہتا پر شاید ڈرتا تھا کہ کہیں یہ لوگ نامنظور نہ کریں۔ اُس کے ہونٹوں پر تو ہنسی نہ تھی پر دل ہی دل میں مگن ہو رہا تھا۔

گور پرشاد۔ میں نے سنا یا بھی تو جی توڑ کر۔

بنود۔ کیا کہنا ہے۔ سبھوں کی آنکھیں کھل گئیں۔

رسک۔ مجھے اُس کی خموشی سے ذرا شبہ ہوتا ہے۔

امر۔ آپ کے شبہ کا کیا کہنا، آپ کو تو خدا پر بھی شبہ ہے۔

مست رام۔ ڈراما نویس صاحب بھی بے حد محظوظ تھے۔ دس بارہ ہزار کا وارا نیارا ہے بھئی اس خوشی میں دعوت ہونی چاہیئے۔

گور پرشاد۔ پہلے کچھ نہنی ٹپہ ہو جانے دو۔

مست رام۔ جی نہیں، تب تو محفلِ نشاط ہوگی۔ آج صرف دعوت کی رہی۔

بنود۔ بھئی تم بڑے خوش نصیب ہو گور پرشاد!

رسک۔ میری رائے ہے کہ ذرا اس ڈراما نویس کو گانٹھ لیا جائے۔ اُس کی خموشی مجھے تشویشناک معلوم ہوتی ہے۔

مست رام۔ آپ تو واہی ہوئے ہیں۔ وہ حضرت ناک رگڑ رگڑ کر رہ جائیں تب بھی اُن کی نہیں چلنے کی۔ سیٹھ جی پر جادو چل چکا وہ اب اس طلسم سے نہیں نکل سکتے۔

بنود۔ تمہید کتنی زوردار تھی؟

امر۔ اسی نے تو رنگ جما دیا اب کوئی معمولی رقم پیش کرنے کا اُسے حوصلہ ہی نہ ہو سکے گا۔

تماشا

رات کو گور پرشاد کے گھر دوستوں کی دعوت ہوئی۔ دوسرے دن کوئی چھ بجے پانچوں آدمی سیٹھ جی کے پاس جا پہنچے شام کا وقت ہوا خوری کا ہے۔ آج موٹر پر نہ آنے کے لئے بنا بنایا بہانہ تھا۔ سیٹھ جی آج بے حد خوش نظر آتے تھے۔ کل کی وہ مُحرّمی صورت تبدیل ہو گئی تھی۔ بات بات پر چہکتے تھے، ہنستے تھے، فقرے کستے تھے، جیسے لکھنؤ کا کوئی رئیس ہو۔ دعوت کا سامان تیار تھا میزوں پر طشتریاں چنی جانے لگیں۔ شراب بھی موجود تھی۔ یاروں نے خوب مزے سے دعوت کھائی سیٹھ جی مہمان نوازی کے مجسمے بنے ہوئے ہر ایک مہمان کے پاس آ آ کر پوچھتے، کچھ اور منگواؤں، کچھ تو اور لیجیئے۔ آپ لوگوں کے قابل دعوت کا سامان یہاں کہاں میسر!

احباب اسے فال نیک سمجھ کر جامے میں پھولے نہ سماتے تھے۔

کھانے کے بعد معاملے کی بات چیت ہونے لگی۔ گور پرشاد کا دل امید اور خوف سے کانپنے لگا۔

سیٹھ جی - حضور نے نہایت اعلیٰ درجے کا ناٹک لکھا ہے۔ کیا بات ہے!

ڈراما نویس - یہاں خلقت اچھے ڈراموں کی قدر نہیں کرتی - ورنہ یہ ڈراما لاجواب ہوتا۔

سیٹھ جی - خلقت قدر نہیں کرتی، نہ کرے۔ ہمیں خلقت کی بالکل پروا نہیں ہے۔ میں تو اس تماشے کی تیاری میں محض بابو صاحب کی خاطر پچاس ہزار روپیہ صرف کردوں گا۔ آپ نے اتنی کاوش سے ایک چیز لکھی ہے تو میں اُس کی تبلیغ بھی اتنے ہی حوصلے سے کروں گا۔ ہماری زبان کے لئے کیا یہ کم خوش نصیبی کی بات ہے، کہ آپ جیسے اہلِ کمال اُس کی خدمت کریں۔ یہ تصنیف آپ کو حیاتِ جاوید عطا کردے گی۔

ڈراما نویس - حقیقت یہ ہے کہ میں نے ایسا ڈراما آج تک نہیں دیکھا۔ لکھتا میں بھی ہوں، اور اصحاب بھی لکھتے ہیں لیکن آپ کی پرواز کو کوئی کیا پہنچے گا۔ کہیں کہیں تو آپ نے شکسپیر کو بھی مات کر دیا ہے۔

سیٹھ جی - جناب جب طبیعت میں آمد ہوتی ہے تو ایسی ہی لاثانی چیزیں پیدا ہوتی ہیں۔ شیکسپیر نے جو کچھ لکھا روپے کے لئے لکھا دیگر حضرات بھی روپیہ کے لئے ہی لکھتے ہیں۔ ان میں وہ بات کہاں پیدا ہوسکتی ہے جو غرض سے پاک اہلِ کمال کا حصہ ہے۔ گوسائیں تلسی داس کی رامائن کیوں زندہ جاوید ہے۔ اسی لئے کہ وہ روحانیت کے زیرِ اثر لکھی گئی ہے۔ سعدی کی گلستاں اور بوستاں ہومر اور ورجل کی تصنیفیں اسی لئے زندہ ہیں کہ اُن باکمالوں نے دل کی امنگ سے لکھا ہے۔ جسے دولت کی ہوس نہیں، جو تحسین سے مستغنی ہے وہ ایک ایک لفظ ایک ایک فقرے، ایک ایک بندش پر مہینوں صرف کر سکتا ہے۔ غرض مندوں کو تو ہمیشہ یہی فکر ہوتی ہے کہ ایک چیز جلدی سے ختم کرکے دوسری چیز شروع کردیں۔

ڈراما نویس - آپ بالکل بجا فرماتے ہیں۔ ہمارے ادب کی محض اسی لئے ناقدری ہورہی ہے کہ ہم سب یا تو دولت کے لئے لکھتے ہیں یا شہرت کے لئے۔

سیٹھ جی - ذرا سوچئے آپ نے دس سال صرف فنِ موسیقی میں صرف کر دئیے۔ لاکھوں روپے کلاونتوں اور گائکوں کی نذر کر دیئے۔ کہاں کہاں سے اور کتنی جانفشانی سے اس ناٹک کے لئے مصالحہ بہم پہنچایا اس جانفشانی اور لگن کا صلہ کون دے سکتا ہے۔

ڈراما نویس - ممکن ہی نہیں۔ ایسی تصانیف کے معاوضہ کا خیال کرنا ہی ان کی ناقدری ہے۔ ان کا معاوضہ اگر کچھ ہے تو وہ ہے روحانی اطمینان اور مسرتِ قلب، اور وہ آپ کے ایک ایک لفظ سے ٹپک رہی ہے۔

سیٹھ جی - آپ نے بہت صحیح فرمایا کہ ایسی تصانیف کا صلہ صرف روحانی مسرت ہے۔ شہرت تو اکثر ایسی چیزوں کو بھی مل جاتی ہے جو ادبیات کے لئے باعثِ ننگ ہیں۔ آپ یہ ڈراما لے لیجئے اور آج ہی اس کے پارٹ تقسیم کر دیجئے۔ تین ہفتہ کے اندر تماشا اسٹیج پر آجانا چاہیے۔

ڈراما کا قلمی مسودہ میز پر پڑا ہوا تھا۔ ڈراما نویس صاحب نے اُسے اُٹھالیا۔ گور پرشاد نے بے کسانہ نگاہوں سے

بنود کی طرف دیکھا۔ بنود نے امر کی طرف، امر نے رسک کی طرف، لیکن کسی کی زبان سے ایک لفظ بھی نہ نکلا۔ سیٹھ جی نے گویا ہر ایک زبان پر مہرِ سکوت لگا دی تھی۔ ڈراما نویس صاحب کتاب لے کر رخصت ہو گئے

سیٹھ جی نے مسکرا کر کہا "حضور کو تھوڑی سی تکلیف اور کرنی ہوگی۔ ڈرامے کا ریہرسل شروع ہوتے ہی آپ کو کچھ عرصے تک کمپنی کی مہمانی قبول کرنی پڑے گی۔ ہمارے ایکٹر زیادہ تر گجراتی ہیں اور وہ الفاظ کا صحیح تلفظ نہیں کر سکتے۔ آپ کی نگرانی میں اُن کی ساری خامیاں دور ہو جائیں گی۔ ایکٹروں نے اگر پارٹ اچھے نہ کئے تو آپ کی ساری محنت خاک میں مل جائے گی۔ بولئے! آپ لوگوں کے لئے سگار لاؤ۔

سگار آگیا۔ سیٹھ جی اُٹھ کھڑے ہوئے۔ یہ احباب کو رخصتی کی دعوت تھی۔ پانچوں دوست بھی اُٹھے مگر بادلِ ناخواستہ سیٹھ جی آگے آگے دروازے تک آئے۔ پھر سب سے ہاتھ ملا کر کہا، آج آپ سب اصحاب تشریف لا کر تماشے کو زینت بخشیں۔ پھر یہ موقعہ نہ جانے کب ہاتھ آئے۔

گورپرشاد نے گویا کسی قبر کے نیچے سے کہا "ممکن ہوا تو آجائیں گے"

سڑک پر آکر پانچوں احباب ایک دوسرے کا منہ تاکنے لگے۔ پھر زور سے قہقہہ مار کر ہنس پڑے۔

نبود نے کہا "یہ تو ہم سب کا گرو گھنٹال نکلا۔

امر۔ صاف آنکھوں میں دھول جھونک دی۔

رسک۔ میں اُس کی خموشی سے پہلے ہی ڈر رہا تھا کہ کوئی پلّے سرے کا گھاگھ ہے،

مست رام۔ مان گیا اس کی کھوپڑی کو۔ یہ چپت عمر بھر نہ بھولے گی۔

گورپرشاد اس گفتگو میں شریک نہ ہوئے۔ وہ اس طرح سر جھکائے چلے جا رہے تھے۔ گویا ابھی تک صورتِ حال کو سمجھ ہی نہ پائے ہوں۔

پریم چند

لڑکا دکاندار سے، اگر میں آپ سے دو آنے کی نارنگیاں چار آنے کے سیب اور دس آنے کے انگور لوں تو سب کتنے پیسے بنے؟

دکاندار۔ ایک روپیہ۔

لڑکا۔ شکریہ۔ یہ سوال مجھے استاد نے حل کرنے کو دیا تھا۔

اصغر شبیر

غزل

نالۂ دلخراش میں آہِ جگر گداز میں
کون ستم طراز ہے پردۂ سوز و ساز میں!

چاہیئے داغِ معصیت اُسکے حریمِ ناز میں
پھول یہ ایک بھی نہیں دامنِ پاکباز میں

یا تو خرد کو ہوش کو مستی و بےخودی سکھا
یا نہ کسی کو ساتھ لے اُس کے حریمِ ناز میں

حشر میں اہلِ حشر سے دیکھیئے خوش ادائیاں
فردِ عمل تو چاہیئے دستِ کرشمہ ساز میں

اب وہ عدم عدم نہیں پرتوِ صفات سے
باغ و بہار بن گیا آئنہ دستِ ناز میں

محوِ حقیقت آشنا بندۂ دہر بےخبر
ہوش کسی کو بھی نہیں میکدۂ مجاز میں

موجِ نسیمِ صبح میں بوئے صنم کدہ بھی ہے
اور بھی جان پڑ گئی کیفیتِ نماز میں

کچھ تو کمالِ عشق نے حسن کا رنگ اڑا لیا
ایک ادائے ناز ہے بےخودیٔ نیاز میں

شورشِ عندلیب نے روحِ چمن میں پھونک دی
ورنہ یہاں کلی کلی مست تھی خوابِ ناز میں

مجھ کو تو دل کا ٹوٹنا اور بھی دے گیا مزہ
نوحۂ سوز و غم نہیں میری شکست ساز میں

اصغرِ خاکسار وہ ذرّۂ خود شناس ہے
حشر سا کر دیا بپا جس نے جہانِ راز میں

اصغر گونڈوی

ہندوستان میں عورت کی موجودہ حالت

اسے ہندوستان کی بدقسمتی کہئے یا مردوں کی ہٹ دھرمی کا نتیجہ کہ ملک کی آبادی کا نصف سے زائد حصہ آج تک ذلت اور جہالت کی تاریکیوں میں گھرا رہا۔ اور وہ فرقہ جس کی ترقی پر ملک کی ترقی کا حقیقی دارومدار تھا مدتوں تک پرانے تعصبات روایات اور رسم ورواج کی قربان گاہ پر بھینٹ چڑھایا گیا۔

اگرچہ گزشتہ دس سال کے اندر ہندوستان میں عورتوں کی تعلیمی اور معاشری حالت میں حیرت انگیز تبدیلیاں واقع ہوئی ہیں لیکن یہ امر واقعی ہے کہ اس وقت بھی اکثر گھرانوں میں ہندوستانی عورت کی زندگی مسلسل مصائب کی اک دکھ بھری داستان ہے جس کے سننے اور بیان کرنے سے دل خون کے آنسو روتا ہے۔

عورت کی زندگی کے جن خاص پہلوؤں پر ہم اس مضمون میں روشنی ڈالنا چاہتے ہیں وہ حسب ذیل ہیں۔

(۱) تعلیمی ترقی (۲) معاشری حالت (۳) حفظ صحت (۴) دیہاتی زندگی (۵) صنعت وحرفت (۶) سیاسی اور قانونی حقوق۔

تعلیم نسواں:۔ سب سے اول تعلیم کے مسئلہ کو لیجئے۔ اس میں کچھ شک نہیں کہ تعلیم نسواں کی ضرورت کو اب ہر شخص محسوس کرتا ہے لیکن اس ضمن میں جو ترقی ہونی چاہئے تھی وہ اب تک نہیں ہوئی اور لڑکوں اور لڑکیوں کی تعلیم میں اس وقت تک بھی بہت تفاوت ہے جو بجائے کم ہونے کے روز بروز بڑھ رہا ہے۔

سرکاری تعلیمی کمشن کی رپورٹوں سے ظاہر ہوتا ہے کہ ۱۹۲۹ء تک ہندوستان میں تعلیم یافتہ لڑکیوں کی شرح دو فی صدی سے زیادہ نہ تھی۔ سکول جانے والے بچوں میں پرائمری جماعتوں کے لڑکوں کی تعداد لڑکیوں سے چار گنا زیادہ ہے مڈل کی جماعتوں میں آٹھ گنا ہے۔ اور ہائی کلاسوں میں چونتیس گنا ہے۔ کالجوں میں ایک لڑکی کے مقابلے میں ۳۳ لڑکے تعلیم پا رہے ہیں۔ اس تفاوت کے اسباب ظاہر ہیں۔ اول تو لوگوں کی تعلیم کو لڑکیوں کی تعلیم کے مقابلے میں زیادہ ضروری خیال کیا جاتا ہے۔ دوسرے لڑکیوں کی تعلیمی ترقی کے راستہ میں بہت سی مشکلات حائل ہیں۔ تیسرے لڑکیوں کی تعلیم پر نسبتہً کسی قدر زیادہ خرچ آتا ہے۔

سب سے بڑی رکاوٹ تو اس معاملے میں مردوں کی بے توجہی اور خود غرضی ہے جس کو مولانا حالی علیہ الرحمۃ نے اپنی مشہور نظم چپ کی داد میں نہایت خوبی سے بیان کیا ہے۔ فرماتے ہیں۔

گزرے تھے جگ تم پر کہ ہمدردی نہ تھی تم سے کہیں
تھا منحرف تم سے فلک برگشتہ تھی تم سے زمیں

دنیا کے دانا اور حکیم اس خوف سے لرزاں تھے سب
تم پر مبادا علم کی پڑ جائے پرچھائیں کہیں

ایسا نہ ہو مرد اور عورت میں رہے باقی نہ فرق
تعلیم پاکر آدمی بننا تمہیں زیبا نہیں

یاں تک تمہاری ہجو کے گائے گئے دنیا میں راگ
تم کو بھی دنیا کی کہن کا آگیا آخر یقیں

علم و ہنر سے رفتہ رفتہ ہوگئیں مایوس تم
سمجھا لیا دل کو کہ ہم خود علم کے قابل نہیں

مقام شکر ہے کہ اب حالات بدل رہے ہیں اور مختلف شعبہ جات کی کوششوں سے جن میں نسوانی شعبہ جاتِ تعلیم خاص طور پر قابل ذکر ہیں ہندوستان میں عورتوں کی تعلیم روز بروز ترقی کر رہی ہے۔

تعلیم نسواں کے راستہ میں دوسری رکاوٹ کم سنی کی شادی ہے جس کا رواج کم و بیش ملک کے سب حصوں میں پایا جاتا ہے (Age of Consent Committee) کمیٹی کی رپورٹ سے ظاہر ہوتا ہے کہ دس اور پندرہ برس کی عمر کے درمیان پچاس فی صدی لڑکیوں کی شادی ہو جاتی ہے۔ ایک ہزار میں سے ۱۱ لڑکیاں پانچ برس سے کم عمر میں بیاہی جاتی ہیں اور اٹھاسی لڑکیاں پانچ اور دس برس کے درمیان بیوی کہلاتی ہیں۔ ظاہر ہے کہ جس ملک میں شادی کی عمر اتنی کم ہو وہاں لڑکیوں کی ایک کثیر تعداد کا تعلیم سے محروم رہ جانا کوئی تعجب کی بات نہیں۔ اول تو سکول جانے والی لڑکیوں کی تعداد ہی کم ہوتی ہے دوسرے کم سنی کی شادی کی وجہ سے ان میں سے اکثر اپنے نصاب تعلیم کے ابتدائی مدارج بھی طے نہیں کر سکتیں

تیسری مشکل عورتوں کی تعلیم کے معاملے میں روپے کی ہے۔ تعلیمی رپورٹوں کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ ایک زنانہ سکول کے قیام اور انتظام پر ایک مردانہ سکول کے مقابلے میں زیادہ خرچ آتا ہے۔ پرائمری سکولوں میں ایک لڑکے کی تعلیم کے خرچ کا اوسط آٹھ روپے سالانہ ہے اس کے مقابلہ میں لڑکی کا گیارہ روپے سالانہ ہے۔

چوتھی اور ایک بڑی مشکل اس معاملہ میں سند یافتہ استانیوں کی کمی ہے۔ اس کمی کے متعدد اسباب ہیں۔ اول تو مختلف تعصبات کی وجہ سے اس ملک میں معلمہ کا پیشہ عورتوں کے لئے عام طور پر بہت موزون خیال نہیں کیا جاتا اس لئے بہت کم ہندوستانی لڑکیاں اس کو اختیار کرتی ہیں دوسرے پردہ اور بعض اور پابندیوں کی وجہ سے وہ اپنے گھر اور شہر سے باہر نوکری کرنا پسند نہیں کرتیں چنانچہ قصبات میں لڑکیوں کے سکول قائم کرنے میں سب سے بڑی مشکل یہی پیش آتی ہے کہ اول تو وہاں استانیاں ملتیں ہی نہیں اور اگر ملتی ہیں تو تنخواہ زیادہ دینی پڑتی ہے جس کا لازمی نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ زنانہ سکول پر مردانہ سکول کے مقابلہ میں زیادہ خرچ آتا ہے چونکہ ہندوستان کی آبادی کا بیشتر حصہ قصبات میں آباد ہے لہذا وہاں کافی سکول نہ ہونے کی وجہ سے لڑکیوں کی ایک بڑی تعداد تعلیم سے بالکل محروم رہ جاتی ہے۔ استانیوں کی کمی کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ ہندوستان میں معلمہ گری کی خاص تعلیم دینے کے لئے بہت کم سکول اور کالج موجود ہیں۔ ۱۹۲۷ء تک سارے ملک میں کل سات زنانہ ٹریننگ کالج تھے جن میں دو مدراس میں تین بنگال میں ایک پنجاب میں اور ایک صوبجات متحدہ میں تھا۔ ان کالجوں میں ایک سو پندرہ طالبات تعلیم پاتی تھیں جن میں اٹھانوے عیسائی پندرہ ہندو اور دو مسلمان تھیں۔ اسی طرح ٹریننگ سکولوں کی تعداد بھی بہت کم ہے استانیوں کی کمی کی ایک اور وجہ تنخواہوں کی کمی ہے۔ مدراس کے پرائمری سکولوں

میں ایک اُستانی کی اوسط تنخواہ پندرہ روپیہ ماہوار ہے۔ بنگال میں آٹھ روپیہ ماہوار۔ یوپی میں اٹھارہ روپیہ۔ پنجاب میں پچیس روپیہ اور بہار میں گیارہ روپیہ ماہوار ہے۔ گویا ایک زنانہ پرائمری سکول کی ہیڈ معلمہ ایک آیا سے زیادہ حیثیت نہیں رکھتی۔ ظاہر ہے کہ ایسی حالت میں معلمہ گری کا پیشہ ایک معزز اوسط درجے کے گھرانے کی لڑکی کے لئے کوئی خاص دلچسپی نہیں رکھتا۔ بالخصوص جب کہ اُسے اپنے گھر سے باہر کہیں دور دراز مقام میں جاکر رہنا پڑے جہاں عموماً نہ اس کا کوئی رشتہ دار ہوتا ہے اور نہ مددگار۔

منجملہ اور مشکلات کے جو لڑکیوں کی تعلیم کے راستہ میں حائل ہیں ایک مشکل ہمارا موجودہ پردہ بھی ہے اگرچہ اب تک مسلمان لڑکیوں کی تعلیم پردہ کے اندر ہوتی رہی ہے مگر حقیقت ہے کہ سکول جانے والی مسلمان لڑکیوں کی تعداد دوسرے مذاہب کی لڑکیوں سے مقابلتہً بہت کم ہے جس کا ذمہ دار بڑی حد تک ہمارا موجودہ پردہ ہے۔

تعلیمی ترقی کے راستہ میں ہندوستان میں اور بھی بہت سی مشکلات ہیں جن میں مذہب قومیت اور زبان کی مشکلات بھی شامل ہیں۔ ایک گاؤں میں جہاں مختلف مذاہب اور اقوام کے لوگ آباد ہیں وہاں اول تو الگ الگ فرقہ وارانہ سکولوں کی ضرورت محسوس کی جاتی ہے لیکن اگر سکول علیحدہ علیحدہ نہ ہوں تو کم از کم دو تین مختلف زبانوں کی تعلیم ضروری ہے جس کے لئے علیحدہ علیحدہ اُستاد چاہئیں صرف احاطہ مبئی میں اس وقت ارسٹھ مختلف زبانیں موجود ہیں جن کی تعلیم سکولوں میں دی جاتی ہے۔ چونکہ ہندوستان کے دیہات میں غربت بہت ہے اس لئے وہاں کے لوگ ان سکولوں کا خرچ برداشت نہیں کرسکتے اور نہ گاؤں کی آبادی ہی اتنی ہوتی ہے کہ وہاں دو تین سکولوں کا قیام ضروری سمجھا جائے۔ لہٰذا ایک طرف تو بچے تعلیم سے بالکل محروم رہ جاتے ہیں اور دوسری صورت میں اُن کی ابتدائی تعلیم پر اتنا خرچ آتا ہے جو ہندوستان جیسے غریب ملک پر ایک ناقابل برداشت بار ہے۔

ایک اور بڑی خرابی یہ ہے کہ پہلی سے دوسری اور دوسری سے تیسری جماعتوں تک طالبات کی تعداد میں بہت کمی آجاتی ہے یہاں تک کہ چوتھی جماعت تک فی سکول اوسطاً صرف ۲ لڑکیاں رہ جاتی ہیں تعلیمی رپورٹوں سے ظاہر ہوتا ہے کہ بنگال میں تین سکول ملاکر ایک پڑھی لکھی لڑکی کا اوسط نکلتا ہے۔ پنجاب میں جو بلحاظ تعلیم ہندوستان کے سب سے زیادہ ترقی یافتہ صوبوں میں سے ہے ابتدائی جماعتوں میں چار لڑکیوں میں سے تین لڑکیاں دوسری جماعت تک پہنچنے سے پہلے سکول چھوڑ دیتی ہیں ان اعداد و شمار سے ظاہر ہوتا ہے کہ ہندوستان میں لڑکیوں کی ابتدائی تعلیم پر جو روپیہ خرچ کیا جاتا ہے اس کا بیشتر حصہ دراصل ضائع ہو رہا ہے۔

لڑکیوں کے لئے جو سکول قصبات میں قائم کئے جاتے ہیں ان کی انتظامی حالت بھی بہت خراب ہوتی ہے۔ اکثر سکولوں کی عمارات ردی اور خراب و خستہ حالت میں ہوتی ہیں۔ ایک انسپکٹرس نے اپنی رپورٹ میں لکھا تھا کہ دیہات میں یہ عام قاعدہ ہے کہ جو مکان لڑکوں کے سکول کے لئے ناموزون خیال کیا جاتا ہے وہاں زنانہ سکول قائم کردیا جاتا ہے۔ لیکن یہ کوئی تعجب کی بات نہیں ہے جس ملک میں بہن اپنے بھائی کا پھٹا پرانا کپڑا پہننا اور بچا کھچا کھانا باعث فخر خیال کرتی ہے وہاں اُس کی تعلیم کے لئے اس قسم کا انتظام کیا جانا کون سی اچنبھے کی بات ہے؟ ان سکولوں کے ساتھ عموماً کوئی کھلی جگہ کھیلنے کے لئے نہیں ہوتی۔ اکثر دیہاتی اور شہری سکولوں کی یہ حالت ہے کہ ایک تنگ و تاریک کمرے میں جہاں ہوا اور روشنی کا گزر تک نہیں ہوتا چند ٹوٹی پھوٹی

چٹائیوں پہ بہت سی لڑکیاں کندھے سے کندھا ملائے بیٹھی ہوتی ہیں۔ ایک کونے میں ایک اُستانی دبک کر بیٹھ جاتی ہے جہاں اُسے حرکت کرنے کے لئے بھی مشکل سے جگہ ملتی ہے۔ سردیوں میں نمی سیل اور گرمیوں میں حبس کے مارے ان کمروں میں کھڑا ہونے کو دل نہیں چاہتا لیکن یہ ننھی ننھی بچیاں جنہیں شب و روز قدرت کی کھلی فضا میں سانس لینا چاہئے ان قیدخانوں میں مجرموں کی طرح بند رہتی ہیں۔

ان سکولوں کی حالت کو بہتر بنانے کے لئے اس بات کی بڑی ضرورت ہے کہ انسپکٹرسوں کی تعداد میں خاص اضافہ کیا جائے۔ اس وقت جو انسپکٹرسیں موجود ہیں ان میں سے اکثر کو آٹھ دس ہزار میل کی طویل مسافت طے کرنی پڑتی ہے جو بہت زیادہ ہے۔ بالخصوص جب کہ انہیں اکثر تنہا دور دراز قصبات کا دورہ کرنا پڑتا ہے اور راستہ میں طرح طرح کی مشکلات کا سامنا کرنا ہوتا ہے۔

جو استانیاں دیہاتی سکولوں میں کام کرتی ہیں اُن کے لئے ان انسپکٹرسوں کی موجودگی بہت تسلی اور تسکین کا باعث ہوتی ہے۔ علاوہ ازیں چونکہ ان سکولوں میں محکمہ تعلیم کے افسر خود نہیں جاسکتے اس لئے وہاں انسپکٹرسوں کا اکثر جانا اور بھی زیادہ ضروری ہے علاوہ انسپکٹرسوں کے عورتوں کو تعلیمی بورڈوں کی ممبر بنانا چاہئے۔ جو گاہے گاہے جاکر ان سکولوں کا معائنہ کریں اور جو امور اصلاح طلب ہوں ان کے متعلق بورڈ کے سامنے تجاویز پیش کرکے اُن کی اصلاح کی کوشش کریں۔

لڑکیوں کی لازمی ابتدائی تعلیم کے متعلق اس وقت ملک میں مختلف رائیں ہیں۔ اکثر شعبہ جات اس کے خلاف ہیں ان کا خیال ہے کہ فی الحال لڑکیوں کی جبری تعلیم پر زور دینا غیر ضروری ہے کیونکہ ابھی اس کے حصول میں بہت سی مشکلات درپیش ہیں سب سے بڑی مشکل تو استانیوں کی کمی ہے۔ ظاہر ہے کہ جب موجودہ زنانہ سکولوں کے لئے سند یافتہ استانیاں کافی تعداد میں مہیا نہیں ہوسکتیں تو جبری تعلیم کو رائج کرنے کے لئے جو تعداد ضروری ہے وہ کہاں سے آئے گی۔ اس وقت پانچ صوبوں میں لڑکیوں کی ابتدائی تعلیم جبری قرار دی گئی ہے جس میں صرف دو صوبوں یعنی مدراس اور بمبئی میں اس پر عمل درآمد ہو رہا ہے

لڑکیوں کی تعلیم میں جو بڑا نقص اور کمی اب تک موجود ہے وہ صحیح نصاب تعلیم کا نہ ہونا ہے۔ سب محکمہ جات تعلیم اب اس بات پر متفق ہیں کہ لڑکیوں کے لئے ایک جداگانہ نصاب تعلیم کی اشد ضرورت ہے جو اُن کو بجائے پڑھی لکھی فیشن کی گڑیا بنانے کے صحیح معنوں میں عقلمند سلیقہ شعار بیویاں اور سمجھدار تجربہ کار مائیں بنائے۔ چنانچہ آل انڈیا ویمنز کانفرنس اس بارہ میں بہت سا مفید کام کررہی ہے

ہندوستان میں لڑکیوں کی تعلیم کو رائج کرنے اور ترقی دینے میں تین قسم کے محکمے کام کرتے رہے ہیں۔ (۱) مشن۔ (۲) سرکاری محکمہ تعلیم (۳) ہندوستانی شعبہ جات تعلیم۔ ابتدائی سالوں میں اس کام کا بیشتر حصہ مشنری کام کرنے والوں کی سرگرمیوں کا مرہون منت تھا۔ اب تک بھی ملک میں جگہ جگہ مشنری سکول اور کالج ایک کثیر تعداد میں موجود ہیں۔

مدراس میں اس وقت عورتوں کے تین کالج ہیں جن میں دو مشنری ہیں۔ ان تینوں کالجوں میں لڑکیوں کی ایک بڑی تعداد تعلیم پارہی ہے۔ مدراس عموماً تعلیم کے ہر شعبے میں دوسرے صوبوں کے پیش پیش رہا ہے اور اب بھی یہاں تک

اعلیٰ تعلیم کا تعلق ہے صوبہ مدراس دوسروں صوبوں پر فوقیت رکھتا ہے۔

بمبئی میں بھی لڑکیوں کی تعلیم بہت اچھے پیمانے پر ہو رہی ہے بمبئی کو یہ فخر حاصل ہے کہ بخلاف دوسرے صوبوں کے وہاں کی علمی اور معاشرتی سرگرمیوں میں زیادہ تر حصہ خود ہندوستانی سوسائٹیوں کا ہے۔ پونا کی سیوا سدن سوسائٹی۔ ہندوستانی عورتوں کا دارالعلوم۔ اور بمبئی کی وڈنا داشرم سوسائٹی ان سرگرمیوں کا جیتا جاگتا نمونہ ہیں۔ ہندوستانی شعبہ جات تعلیم نے جو سکول لڑکیوں کے لئے قائم کئے تھے ان میں سب سے زیادہ حصہ بمبئی کا تھا ۔ ۱۹۱۲ء میں بمبئی میں دس ہائی سکول موجود تھے۔ بنگال میں دو تھے اور باقی صوبوں میں کوئی نہ تھا۔ اس ساری ترقی کی ذمہ دار زیادہ تر پارسی قوم ہے اور یہ پارسیوں ہی کی سرگرمیوں اور کوششوں کا نتیجہ ہے کہ اس وقت بمبئی میں عورتوں کی تعلیمی اور معاشرتی ترقی کے لئے بہت سے شعبہ جات قائم ہیں۔ لڑکیوں کی جبری پرائمری تعلیم کو بھی بمبئی میں بہت فروغ حاصل ہوا ہے۔

بنگال میں چھیانوے (۹۶) فی صدی لڑکیاں پرائمری تعلیم کے درجے تک رہ جاتی ہیں۔ ضلع چٹاگانگ میں تیرہ ہزار مسلمان لڑکیوں میں سے صرف ایک لڑکی پرائمری کے درجے کے بعد تعلیم پاتی ہے۔ گویا بنگال کے سکول بجائے درسگاہوں کے ننھے بچوں کی پرورش گاہیں بن جاتے ہیں۔ جو لڑکیاں ہائی سکولوں یا کالجوں میں تعلیم پاتی ہیں ان کا مقصد محض امتحان پاس کرنا اور سند حاصل کرنا ہوتا ہے چنانچہ بنگال میں آج تک کوئی ایسا طریقہ رائج نہیں ہو سکا جس میں امتحانات شامل نہ ہوں۔ کلکتہ میں تین زنانہ کالج ہیں جن سے ایک کثیر تعداد لڑکیوں کی ہر سال گریجویٹ بن کر نکلتی ہے۔ علاوہ ان سرکاری اور چند مشنری کالجوں کے بنگال میں متعدد ہائی سکول، ایک سکول بیواؤں کے لئے اور چند صنعتی سکول وہاں کے زنانہ شعبہ جات تعلیم کے زیر اہتمام چل رہے ہیں۔ لیکن یہ امر واقعی ہے کہ بنگال میں لڑکیوں کی تعلیم صحیح طریقوں پر نہیں ہوئی اور اب تک وہاں کے زنانہ سکولوں کے نصاب میں بہت سی باتیں اصلاح طلب ہیں۔

تعلیم نسواں کے معاملے میں صوبہ پنجاب ایک خاص اہمیت رکھتا ہے۔ اگرچہ یہاں دوسرے صوبوں کے مقابلے میں لڑکیوں کی تعلیم بہت دیر سے شروع ہوئی مگر بمصداق دیر آید درست آید اس تھوڑے سے عرصہ میں اس صوبہ نے تعلیم کے شعبہ میں حیرت انگیز ترقی کی ہے۔ لاہور میں اس وقت تین زنانہ کالج اعلیٰ پیمانہ پر چل رہے ہیں اور ایک اور کالج حال ہی میں کھلا ہے مگر طالبات کی تعداد اتنی ہے کہ ہر سال کئی لڑکیاں داخلے سے محروم رہ جاتی ہیں علاوہ ان کالجوں کے لاہور اور پنجاب کے دوسرے اضلاع میں متعدد ہائی سکول مڈل سکول اور پرائمری سکول کھلے ہوئے ہیں جن میں ہزاروں کی تعداد میں لڑکیاں تعلیم پا رہی ہیں۔ علاوہ ان کے ایک ٹریننگ سکول اور کئی قسم کے صنعتی سکول قائم ہیں۔ ان شعبہ جات کے علاوہ جو سرکاری محکمہ تعلیم کے زیر اہتمام کام کر رہے ہیں قومی انجمنوں اور سوسائٹیوں نے بھی کئی سکول اور درسگاہیں کھول رکھی ہیں جن میں سے بعض گورنمنٹ سے امداد حاصل کرتے ہیں اور بعض محض انفرادی کوششوں سے چل رہے ہیں یا قومی فنڈ سے مدد لیتے ہیں۔ ان میں سے کنیا مہا ودیالہ جالندھر سر گنگا رام کا ہندو بدھوا آشرم اور صنعتی سکول اور ہائی سکول لاہور بہت مفید کام کر رہے ہیں۔ اسی طرح انجمن حمایت اسلام لاہور کے ماتحت ایک زنانہ یتیم خانہ اور کئی زنانہ سکول قائم ہیں جن میں لڑکیوں کو علاوہ پڑھنے لکھنے کے سلائی، گھر گرہستی، حفظ صحت اور دوسرے مفید

نسوانی مضامین کی تعلیم بھی دی جاتی ہے۔

صوبجات متحدہ میں لڑکیوں کی تعلیم نے مقابلۃً بہت کم ترقی کی ہے۔ صرف ایک فی صدی لڑکیاں سکول میں تعلیم پاتی ہیں اور ان میں سے اکثر پرائمری کے درجہ تک رہ جاتی ہیں لکھنؤ میں صرف ایک زنانہ کالج اور چند سکول ہیں علی گڑھ میں ایک مسلم گرلز سکول اور کالج بہت اعلیٰ پیمانہ پر چل رہا ہے صوبہ سی پی۔ بہار اور آسام تعلیم میں ابھی بہت پیچھے ہیں۔ ان صوبوں میں لڑکیوں کے لئے کوئی کالج نہیں صرف چند ہائی مڈل اور پرائمری سکول موجود ہیں لیکن اُن میں بھی طالبات کی تعداد بہت کم ہے۔

اس سارے بیان سے ظاہر ہوتا ہے کہ لڑکیوں کی تعلیم اب ہر جگہ ترقی کر رہی ہے اگرچہ اُس کی رفتار بہت سست ہے اور بمقابلہ تعلیم یافتہ مردوں کے ابھی ملک میں تعلیم یافتہ عورتوں کی بہت کمی ہے۔ تاہم مایوس ہونے کی کوئی وجہ نہیں ہے۔ کیونکہ اب خود عورتوں میں اپنی ترقی کا احساس پیدا ہو گیا ہے اور وہ اس بات پر آمادہ نظر آتی ہیں کہ اپنے مردوں کے دوش بدوش میدان ترقی میں اپنی جگہ آپ تلاش کریں گی

حفظ صحت۔ محکمہ حفظ صحت کی رپورٹوں سے ظاہر ہوتا ہے کہ ہندوستان میں تقریباً ہر سال پچاس لاکھ آدمی (جتنی ملک سویڈن کی ساری آبادی ہے) ایسی بیماریوں سے مرتے ہیں جن کا انسداد ہو سکتا ہے اور جو حفظ صحت کے اصولوں پر کاربند نہ ہونے کا نتیجہ ہوتی ہیں۔ علاوہ اس کے بیس فی صدی آدمی ایسے ہیں جو ناکافی اور ناقص غذا ملنے کی وجہ سے اپنی صحت اور طاقت کھو بیٹھتے ہیں پچاس فی صدی بچے کمائی کی عمر تک پہنچنے سے پہلے ہی راہی ملک بقا ہوتے ہیں۔ ہر قسم کی متعدی اور مہلک بیماریاں مثلاً پلیگ ہیضہ چیچک اور پیچش یہاں ہر وقت موجود رہتی ہیں۔ ملیریا بھی جو عموماً خطرناک خیال نہیں کیا جاتا بہت سی اموات کا باعث ہوتا ہے چنانچہ ۱۹۲۵ء میں صرف بنگال میں ملیریا سے پانچ لاکھ موتیں واقع ہوئی تھیں۔ ان سب خرابیوں کی وجہ یہ ہے کہ ہندوستان کے شہروں اور دیہات میں صفائی کا انتظام بہت نامکمل اور خراب ہے۔ مکانات عموماً تنگ و تاریک ہوتے ہیں بازار اور گلیوں میں غلاظت اور کوڑے کرکٹ کے ڈھیر لگے رہتے ہیں اور ہر گھر کے سامنے کا دروازہ عموماً اُس کی ردی کی ٹوکری ہوتا ہے۔ جہاں کھانے پینے کی چیزوں سے لے کر ہر قسم کی غلیظ اشیا پھینکی جاتی ہیں کنوئیں اور تالاب جہاں سے عوام الناس پانی پیتے ہیں بالکل غیر محفوظ اور طرح طرح کی بیماریوں کی آماجگاہ ہوتے ہیں۔ ان حالات میں ایک عام ہندوستانی اپنی زندگی بسر کرتا ہے لیکن عورتوں کی حالت اس سے بہت بدتر ہے چونکہ اُن کے وقت کا زیادہ تر حصہ گھروں کے اندر ہی گزرتا ہے لہذا وہ اُس تازہ ہوا اور روشنی سے بھی محروم رہتی ہیں جو ایک کام کرنے والے مرد کو باہر جانے سے نصیب ہوتی ہے۔

دوسرے عورت کی صحت پر بچے کی پیدائش کا بار بڑا سخت ہے اور اکثر کمزور عورتیں ان ذمہ داریوں اور جسمانی تکالیف کی تاب نہ لاکر جو متاہل زندگی سے ان پر عائد ہوتی ہیں عین جوانی میں تپ دق اور دوسرے مہلک امراض کا شکار ہو جاتی ہیں۔ طبی معائنوں سے ظاہر ہوتا ہے کہ پردہ دار شہری عورتوں میں جن کو کافی تازہ ہوا اور روشنی میسر نہیں ہوتی ہڈیوں کا ایک خاص مرض ہو جاتا ہے جن سے بسا اوقات وہ لنگڑی ہو جاتی ہیں جس عورت کو ایسا مرض ہو اس کے لئے بچہ کی پیدائش عموماً مہلک ثابت ہوتی ہے

ہندوستان میں عورتوں کی بہت سی بیماریوں اور موتوں کا باعث اکثر جاہل دائیاں بھی ہوتی ہیں۔ چونکہ وہ صفائی اور حفظ صحت کے اصولوں سے بالکل بے بہرہ ہوتی ہیں اس لئے اُن کی غفلت کی وجہ سے اکثر عورتیں زچگی کے زمانے ہی میں

موت کا شکار ہو جاتی ہیں۔ دوسرے اکثر ہندو گھرانوں میں عورت اس زمانے میں ایک ناپاک ہستی خیال کی جاتی ہے لہذا اُسے گھر کے ایک ایسے کونے میں جگہ دی جاتی ہے جہاں تازہ ہوا اور روشنی کا گذر تک نہیں ہوتا۔ اس کی خوراک کا کوئی خیال نہیں کیا جاتا اور اسے عموماً میلے کچیلے کپڑے پہننے کے لئے دیئے جاتے ہیں۔ حالانکہ یہ وہ زمانہ ہے جب کہ عورت کی جسمانی طاقت کو بحال رکھنے کیلئے لازم ہے کہ حفظ صحت کے جملہ اصولوں پر عمل کیا جائے۔ اسی طرح وہ گھر کا ننھا سا مہمان بھی جو سب سے زیادہ توجہ کا مستحق ہوتا ہے اپنی زندگی کے ابتدائی دن ایک تنگ و تاریک کونے میں گذارتا ہے جس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ زچہ اور بچہ دونوں کمزور اور بیمار رہتے ہیں۔ ان غفلتوں کا نتیجہ یہ ہوا ہے کہ بچہ کی پیدائش بھی جو عورت کے لئے ایک فطری فعل ہے ہندوستان میں ان امراض میں داخل ہو گئی ہے جو ہر سال کئی عورتوں کی موت کا باعث ہوتے ہیں اور ایک بڑی تعداد کو عمر بھر کے لئے مریض چھوڑ جاتے ہیں۔ ہندوستانی عورتوں کی خرابیٔ صحت کی ایک بڑی وجہ بچپن کی شادی ہے Age of Consent کمیٹی نے ایک جگہ اپنی رپورٹ میں لکھا ہے کہ کم سنی کی شادی اس ملک کے لئے لعنت (curse) ہے۔ عورتوں اور ننھے بچوں کی قبل از وقت موت کا سب سے بڑا سبب یہ قبیح رسم ہے۔ اکثر صورتوں میں بچپن کی شادی کم سن بیوی کو ہمیشہ کے لئے مریض بنا دیتی ہے اگر سب واقعات پر غور کیا جائے تو یہ رسم ستی کی رسم سے بھی زیادہ بری ہے اگرچہ ستی کے مناظر دیکھنے والوں کے لئے ایک دہشت ناک سماں پیدا کرتے تھے۔ مگر اول تو ایسے واقعات تعداد میں کم تھے اور دوسرے ستی ہونے والی عورت کو کم از کم یہ تسلی ضرور ہوتی تھی کہ مرنے کے بعد وہ ایک جاں نثار بیوی اور ایک قابل پرستش ہستی خیال کی جائیگی۔ برخلاف اس کے ایک کم سن بیوی کو عمر بھر طرح طرح کی روحانی اور جسمانی تکالیف کا سامنا کرنا پڑتا ہے جو اس کی زندگی کو موت سے بدتر بنا دیتی ہیں۔

ایک لیڈی ڈاکٹر کا بیان ہے کہ میں نے ایک بائیس برس کی لڑکی کو دیکھا جو اس وقت تک آٹھ بچوں کی ماں بن چکی تھی متواتر جسمانی تکالیف اور روحانی کلفتوں سے وہ ایک سایہ کی مانند رہ گئی تھی اُسے زندہ رہنے کی کوئی خواہش باقی نہ تھی چنانچہ اس واقعہ کے ۶ ماہ بعد وہ بغیر کسی خاص بیماری کے مر گئی۔ ڈاکٹر متو لکشمی ریڈی نے جو مدراس لیجسلیٹو کونسل کی ڈپٹی سکرٹری رہ چکی ہیں ایج آف کانسنٹ کمیٹی کے سامنے بیان دیتے ہوئے ایک لڑکی کا واقعہ بتایا جسے گیارہ برس کی عمر تک کئی اسقاط ہو چکے تھے۔ آخر ایک دن انہی مصیبتوں میں وہ ننھی سی جان ختم ہو گئی۔ نیز انہوں نے یہ بھی کہا کہ اگر میں وہ سارے واقعات بیان کروں جو بحیثیت ایک لیڈی ڈاکٹر کے میری نظر سے گزرتے ہیں تو میں یقین دلاتی ہوں کہ آپ لوگ خون کے آنسو رونے لگ جائینگے اگرچہ قانون ایسی بے جا کارروائیوں کی اجازت نہیں دیتا مگر اول تو ان مظلوم عورتوں کی قانون تک رسائی ہی نہیں ہوتی۔ دوسرے والدین اپنے نام و ناموس کی خاطر ایسے واقعات کو ہمیشہ چھپانے کی کوشش کرتے ہیں جس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ ہر روز ایسی سینکڑوں بیکس بچیاں اس قبیح رسم کے بھینٹ چڑھ رہی ہیں۔

ہندوستان میں حفظِ صحت کے لئے جو انتظامات کئے جاتے ہیں اُن میں ایک بڑی مشکل یہ بھی پیش آتی ہے کہ عوام الناس اُن پر عموماً کاربند نہیں ہوتے اور اکثر لوگ یہ خیال کرتے ہیں کہ یہ اُن کی پرانی روایات اور مذہبی اعتقادات میں خلل اندازی ہے لیکن کچھ عرصہ سے گورنمنٹ نے اس معاملہ میں اپنی ذمہ داری کو محسوس کرتے ہوئے جگہ جگہ پانی کی صفائی، اشیائے خوردنی

کی حفاظت، سڑکوں اور بازاروں کی صفائی شہروں اور مکانوں کی صحیح طرز تعمیر کے متعلق ہر قسم کے مفید قوانین وضع کرنے شروع کئے ہیں نیز مختلف بیماریوں کو روکنے کے لئے ہر طرح کے انسدادی طریقے اختیار کئے ہیں ۱۹۲۶ء تک ہندوستان میں کل ۴۴۲ ہسپتال اور ڈسپنسریاں قائم ہو چکی تھیں۔ گویا آبادی کے لحاظ سے ۰۰۰ ۵۶ آدمیوں کے لئے ایک ہسپتال موجود تھا عورتوں کے لئے اوّل اوّل کوئی علیحدہ ہسپتال نہ تھا۔ اور چونکہ اکثر عورتیں مردانہ ہسپتالوں میں جانا پسند نہ کرتی تھیں لہذا اُن میں سے اکثر طبّی امداد نہ ملنے کے باعث طرح طرح کی تکالیف کا شکار ہوتی تھیں۔ ابتدا میں چند ہمدرد مشنری لیڈی ڈاکٹروں نے آکر کام شروع کیا۔ اُن کے تجربات ظاہر کرتے ہیں کہ اول اول اس کام میں ان کو بہت سی مشکلات کا سامنا کرنا پڑا ۱۸۶۹ء میں بریلی میں پہلا زنانہ ہسپتال امریکن مشن کے زیر اہتمام کھولا گیا۔ اس کے بعد جگہ جگہ اور ہسپتال قائم کئے گئے ۱۸۸۵ء میں کونٹس آف ڈفرن فنڈ کی بنیاد ڈالی گئی جس کے ذریعہ سے ہندوستانی عورتوں کو طبی امداد بہم پہنچانے کا انتظام کیا گیا۔ ۱۹۰۳ء میں وکٹوریا میموریل فنڈ کھولا گیا جس کا مقصد دیسی دائیوں کو وظیفے دے کر اُن کو جدید طریقوں کے مطابق تعلیم دینا تھا ۱۹۱۸ء میں لیڈی چیمسفورڈ لیگ زچہ اور بچوں کی حفاظت کے لئے قائم کی گئی جس کے ماتحت ملک میں جگہ جگہ حفظ صحت کی تعلیم کے لئے سکول اور بچوں اور ماؤں کی حفاظت اور غور و پرداخت کے سنٹر کھولے گئے۔

اس وقت ہندوستان میں ۵۶ زنانہ ہسپتال اور ۲۸ ڈسپنسریاں صرف مشن کے ماتحت کام کر رہی ہیں۔ باقی جگہ جگہ سرکاری اور دوسرے محکموں کے ماتحت بھی ہسپتال کھلے ہوئے ہیں مگر ان میں سے اکثر روپے کی کمی کی وجہ سے اچھی حالت میں نہیں ہیں۔ ہندوستانی عورتوں کی طبّی امداد کے کام میں مشنری عورتوں نے بہت مفید حصہ لیا ہے۔ اور اب بھی لے رہی ہیں ان ہسپتالوں میں لیڈی ڈاکٹر زیادہ تر انگریز خواتین ہی ہیں۔ کیونکہ ہندوستانی عورتوں کے لئے لیڈی ڈاکٹر کا پیشہ بھی دوسر فنون کی طرح ناموزوں خیال کیا جاتا ہے اور ملک میں اس وقت بھی کثیر تعداد ایسے لوگوں کی موجود ہے جو اپنی لڑکیوں کو کسی ایسے فن کی تعلیم دینا جس سے وہ اپنی روزی آپ کما سکیں باعث عار خیال کرتے ہیں۔

اس وقت ملک میں چار زنانہ طبّی سکول اور ایک زنانہ طبّی کالج (لیڈی ہارڈنگ کالج دہلی) موجود ہے جس میں لڑکیوں کو دایہ گری نرسنگ اور ایم بی ایس (ڈاکٹری) کے امتحانات کے لئے تیار کیا جاتا ہے۔ ان سب میں کل چھ سو پچاس طالبات تعلیم پا رہی ہیں۔ (جن میں مسلمان لڑکیوں کی تعداد بہت کم ہے)

ڈاکٹری کی طرح فن تیمارداری بھی لڑکیوں کے لئے کچھ موزوں خیال نہیں کیا جاتا تھا لہذا بہت کم ہندوستانی لڑکیاں اس وقت اس کام میں حصہ لے رہی ہیں۔ اور جو ہیں اُن میں زیادہ تعداد عیسائی لڑکیوں کی ہے۔

علاوہ ڈاکٹروں اور نرسوں کے دیہات کے لئے تربیت یافتہ دائیوں کی بہت ضرورت ہے جو قصبات میں جاکر غریب عورتوں کے لئے طبّی امداد بہم پہنچا سکیں۔ اس مقصد کے لئے ملک میں جگہ جگہ دایہ گری کی جماعتیں کھولی گئی ہیں جہاں عام عورتوں کو وظیفے دے کر دایہ گری کے فن کی تعلیم دی جاتی ہے۔ نیز موجودہ دائیوں کو حفظ صحت کے جدید طریقوں سے آگاہ کیا جاتا ہے۔

اصلاحِ معاشرت۔ ہندوستانی عورت کو ذلت اور غلامی کی زنجیروں سے رہا کرنے اور اس کے معیارِ زندگی کو بلند کرنے کے لئے اس بات کی اشد ضرورت ہے کہ اُن معاشرتی خرابیوں کا پورے طور پر انسداد کیا جائے جو اب تک اس ملک میں موجود ہیں اور جو ہماری روزانہ زندگی ہماری قومیت اور ہمارے مذہب کا جزو بن کر ہمیں تباہ و برباد کر رہی ہیں۔ جس ملک میں لڑکی کی پیدائش ایک بہت بڑا منحوس واقعہ خیال کی جاتی ہو۔ جس میں ننھی ننھی بچیاں ہوش سنبھالنے سے پہلے شادی کے بھینٹ چڑھائی جاتی ہوں جس میں ایک بیوی کی موجودگی میں دوسری بیوی لائی جاتی ہو۔ جس میں خاوند کی موت کا باعث غریب بیوہ کو قرار دیا جاتا ہو جس میں زندہ بیوی کو مردہ خاوند کے ساتھ دہکتی ہوئی آگ کا ایندھن بنایا جا چکا ہو وہ ملک دنیا کی نظروں میں ذلیل نہ ہو تو کیا ہو۔ شکر ہے کہ اب حالات روز بروز بہتر ہو رہے ہیں اور ہندوستان اپنے ماضی سے نادم ہو کر اپنے حال اور اپنے مستقبل کو زیادہ شاندار بنانے کی کوشش کر رہا ہے خدا اس کا مددگار ہو۔ منجملہ ان خرابیوں کے جو اس ملک میں اب تک موجود ہیں ایک بڑی خرابی بچپن کی شادی ہے جس کے برے اثرات نسوانی زندگی کے ہر شعبہ میں رونما ہیں۔ دوسری خرابی جس میں اصلاح کی بہت ضرورت ہے اس ملک میں بیواؤں کی حالتِ زار ہے۔ مردم شماری کی رپورٹ سے ظاہر ہوتا ہے کہ ۱۹۲۱ء میں ہندوستان میں کل ۲۶۸۳۴۸۳۸ بیوائیں تھیں جن میں ۵۱۳۹ پانچ برس کی عمر سے کم تھیں اور ۳۹۶۶۵۵۶ پندرہ برس سے کم عمر کی تھیں چونکہ اس ملک میں نکاحِ ثانی ایک گناہ کبیرہ خیال کیا جاتا ہے لہذا یہ ننھی ننھی جانیں جو ہوش سنبھالنے سے پہلے ہی شادی کے بھینٹ چڑھائی جاتی ہیں عمر بھر بیوگی کی مصیبت جھیلنے پر مجبور ہوتی ہیں۔ اول کم سنی کی شادی دوسرے بیوگی کا رنج و الم۔ تیسرے وہ جو ہلا دینے والی مصیبتیں جو ایک ہندوستانی عورت کو خاوند کے بغیر جھیلنی پڑتی ہیں۔ یہ سب مل کر عورت کی زندگی کو فی الحقیقت جہنم بنا دیتی ہیں۔ بقول مولانا حالی علیہ الرحمۃ

بیاہی گئیں اس وقت تم جب بیاہ سے واقف نہ تھیں ۔۔۔ جو عمر بھر کا عہد تھا وہ کچے دھاگے سے بندھا
بیاہا تمہیں ماں باپ نے اے بے زبانوں اس طرح ۔۔۔ جیسے کسی تقصیر پر مجرم کو دیتے ہیں سزا
گذری امید و بیم میں جب تک رہا باقی سہاگ ۔۔۔ بیوہ ہوئیں تو عمر بھر پھر چین قسمت میں نہ تھا

پنڈتا نی رام بائی لکھتی ہیں کہ پرانے ہندو گھرانوں میں بیوہ کی زندگی ایک حسرتناک منظر پیش کرتی ہے۔ اکثر گھرانوں میں وہ ایک مجرم کی طرح سمجھی جاتی ہے جو کسی بھاری گناہ کی پاداش میں ایک سخت سزا جھیلنے پر مجبور ہو۔ سب سے زیادہ قابلِ رحم حالت کم سن بیوہ کی ہوتی ہے۔ چونکہ عموماً اس کے کوئی اولاد نہیں ہوتی اس لئے اُسے سوسائٹی اور کنبہ کے لوگ بہت حقارت کی نظر سے دیکھتے ہیں۔ اور گھر میں اس سے مثل لونڈی غلاموں کے کام لیا جاتا ہے۔ بیوہ عورت کے لئے کپڑا پہننا اور کھانا کھانا غیر ضروری خیال کیا جاتا ہے بجز اس مقدار کے جو اُس کی مصیبت زدہ زندگی کو قائم رکھنے کے لئے ضروری ہو چنانچہ اکثر بیوہ عورتیں کرتہ نہیں پہنتیں اور ایک وقت کا کھانا کھاتی ہیں بعض سر کے بال منڈا دیتی ہیں اور عمر بھر زمین پر سوتی ہیں۔ ان واقعات سے ظاہر ہوتا ہے کہ ایک بیوہ عورت کی زندگی کیسی کیسی کلفتوں کا مجموعہ ہے۔ اور یہ کوئی تعجب کی بات نہیں ہے کہ اکثر عورتیں اس درد بھری زندگی پر رسم ستی کو ترجیح دیتی ہیں۔ اگرچہ آنکھوں دیکھتے ہوئے آگ کے شعلوں میں

کو دنا کوئی آسان کام نہ تھا مگر یہ زندگی بھر جلنا اور جل جل کر مرنا بھی کچھ کم مشکل نہیں ہے"۔

ایک اور رسم جو اصلاح طلب ہے ہمارا مروجہ پردہ ہے۔ پردہ اپنی موجودہ صورت میں دراصل کسی مذہب یا ملت کے عقائد کا حصہ نہیں ہے۔ اور نہ کسی اسلامی یا غیر اسلامی ملک میں اس شدت سے اس کا رواج پایا جاتا ہے لیکن ملک ہند کی سرزمین جس طرح اور مذموم رسموں کی نشو و نما کا باعث ہوئی ہے اسی طرح اس رسم کو بھی یہاں بہت فروغ حاصل ہوا ہے اس حقیقت سے کسی کو انکار نہیں ہو سکتا کہ سختی کے ساتھ پردے کی پابندی عورتوں کی تعلیمی، جسمانی اور معاشرتی ترقی کے راستہ میں ایک بڑی رکاوٹ ہے۔ اور منجملہ اور وجوہات کے یہ بھی ایک وجہ ہے کہ مسلمان عورتیں ترقی کے ہر شعبہ میں اپنی ہمسایہ اقوام کی بہنوں کے مقابلہ میں کوسوں دور ہیں۔

عورت کی صحت پر پردہ دار زندگی کا جو برا اثر پڑتا ہے اس کی حقیقت اس بیان سے جو ڈاکٹر لینکسٹر نے مرض دق کے متعلق تفتیش کرتے ہوئے دیا تھا ظاہر ہوتی ہے۔ انہوں نے بتایا کہ ہندوستان کے اکثر شہروں میں تپ دق کے مریضوں میں عورتوں کی تعداد مردوں سے دگنی تھی۔ کلکتہ میں مسلمان عورتوں کی شرح اموات ساڑھے پانچ فی صدی تھی اور باقی عورتوں کی تین فیصدی۔

عورتوں کی تعلیمی ترقی اور معاشرتی اصلاح کے لئے جو انجمنیں اب تک ہندوستان میں قائم ہوئی ہیں اُن کا مختصر سا بیان دلچسپی سے خالی نہ ہوگا۔ اُن کی رپورٹوں کے مطالعے سے معلوم ہوتا ہے کہ ہندوستانی عورتوں میں اب اپنی ترقی اور اصلاح کا خیال پیدا ہو گیا ہے۔

سب سے اول ۱۹۱۷ء میں مدراس میں عورتوں کی ایک ایسوسی ایشن قائم کی گئی جس کا مقصد عورتوں کی تعلیمی ترقی اور اُن کے سیاسی حقوق کی حفاظت کرنا تھا۔ اس وقت اس ایسوسی ایشن کی ستر شاخیں ملک کے مختلف حصوں میں موجود ہیں ۱۹۲۵ء میں مدراس میں نیشنل کونسل آف ومن کی بنیاد ڈالی گئی جس کا مقصد ہر مذہب و ملت کی عورتوں میں باہم اتحاد اور یگانگت پیدا کرنا اور ان کی تعلیمی اور معاشرتی حالت کا سنوارنا تھا۔ اس وقت پانچ صوبوں میں اس کی شاخیں موجود ہیں۔ ان کے علاوہ بنگال مدراس اور پنجاب میں ایسی انجمنیں قائم کی گئیں جن کے ماتحت عمر رسیدہ عورتوں کے لئے جگہ جگہ درس گاہیں کھولی گئیں۔ عورتوں کی تعلیمی تحریکات کی سب سے نمایاں کامیابی آل انڈیا ومنز کانفرنس کا قیام تھا جو ۱۹۲۷ء میں معرض ظہور میں آئی۔ اس کانفرنس کے چار اجلاس اب تک ملک کے مختلف حصوں میں ہو چکے ہیں۔ اس کانفرنس کا اولین مقصد عورتوں میں تعلیم کا شوق پیدا کرنا اُن کے لئے حصول تعلیم کے وسائل مہیا کرنا اور عورتوں کی تعلیمی ترقی کے راستہ میں جو رکاوٹیں ہیں اُن کو دور کرنا تھا۔ مگر اپنے کام کے ابتدائی زمانہ میں ہی کانفرنس نے اس بات کو محسوس کر لیا کہ اس ملک میں کوئی تعلیمی یا دوسری تحریک اُس وقت تک کامیاب نہیں ہو سکتی جب تک یہاں کی معاشرتی حالت کو درست نہ کیا جائے۔ اور ان خراب رسوم کی اصلاح نہ کی جائے جو اندر ہی اندر اس ملک کو گھن کی طرح کھا رہی ہیں۔ چنانچہ کانفرنس کے مقاصد میں اصلاح معاشرت کو خاص جگہ دی گئی اور اس غرض کے لئے ملک کے مختلف

حصوں میں اصلاحی کمیٹیاں قائم کی گئیں۔ اس وقت کانفرنس کی پینتیس شاخیں مختلف صوبوں میں قائم ہو چکی ہیں جو اپنی اپنی جگہ بہت مفید کام کر رہی ہیں۔ اس کانفرنس کے ماتحت دہلی میں ایک آل انڈیا تعلیمی فنڈ قائم کیا گیا ہے جس میں اس وقت چار لاکھ سے زائد روپیہ موجود ہے (اس میں دو لاکھ کی گرانقدر رقم ہز اگزالٹڈ ہائی نس نظام حیدر آباد دکن کا عطیہ ہے) تجویز ہے کہ اس فنڈ کے سرمایہ سے دہلی میں ایک زنانہ ٹریننگ کالج بڑے وسیع پیمانے پر کھولا جائے جس میں لڑکیوں کو جدید طریقوں کے مطابق تعلیم دی جائے۔ اور اُن کے لئے ایک جداگانہ نصابِ تعلیم مرتب کر کے اُن کو خانہ داری حفظ صحت بچوں کے رکھ رکھاؤ۔ فنونِ لطیفہ مثل موسیقی تصویر کشی اور دیگر نسوانی مضامین کی تعلیم سے بہرہ اندوز کیا جائے۔ اور موجودہ نصاب کی وجہ سے جو نقائص اُن کی تعلیم میں پیدا ہو گئے ہیں اُن کو رفع کیا جائے۔ کانفرنس کے اغراض و مقاصد میں حسب ذیل امور پر خاص زور دیا گیا ہے۔ لڑکیوں کے لئے پرائمری اور اعلیٰ تعلیم کے وسائل مہیا کرنا۔ تعلیمی کمیٹیوں اور بورڈوں میں عورتوں کا تقرر۔

اصلاحی حصہ میں مفصلہ ذیل امور پر زور دیا گیا ہے۔ کم سنی کی شادی کی بیخ کنی، نکاحِ بیوگاں کی تحریک اور اُن کی حالت کو بہتر بنانے کے لئے تجاویز، تعدد ازدواج کی مخالفت۔ عورت کے مالی و سیاسی حقوق کی حفاظت۔ عورت اور مرد کے لئے ایک مساوی معیارِ اخلاق کا قائم کرنا۔ لیجسلیٹو کونسلوں، صوبجاتی کونسلوں اور دوسری تعلیمی اور اصلاحی کمیٹیوں میں عورتوں کے تقرر کی ضرورت۔

اس کانفرنس کے قیام سے ملک میں عام طور پر ایک بیداری پیدا ہو گئی ہے اور نسوانی ترقی کی تحریک کو بڑی تقویت حاصل ہوئی ہے۔ علاوہ اِن انجمنوں کے ملک میں اور بھی بہت سی انجمنیں۔ کانفرنسیں اور ادارات قائم ہیں جو اپنی اپنی جگہ مفید تعلیمی اور اصلاحی خدمات انجام دے رہے ہیں۔ ان میں سے چند حسب ذیل ہیں۔ ویمنز انسٹی ٹیوٹ بنگال (جس کی بانی مسز جی۔ ایس دت صاحبہ تھیں) سیوا سدن سوسائٹی پونا۔ آل انڈیا مسلم لیڈیز کانفرنس۔ انجمن صلیب احمر۔ سینٹ جان ایمبولنس ایسوسی ایشن۔ بنگال میں مس بوس کے سکول اور صحت گاہیں۔ آل انڈیا سوشل کانفرنس اور بہت سی اور چھوٹی چھوٹی انجمنیں اور قومی سوسائٹیاں ہر صوبے اور ہر شہر میں موجود ہیں۔

. . . .

عورت اور دیہاتی زندگی۔ ہندوستان کی آبادی کا تین چوتھائی سے زائد حصہ (۸۶ فیصدی) دیہات میں آباد ہے دیہاتی عورت کی زندگی سادگی اور محنت و مشقت کا نمونہ ہوتی ہے۔ اپنے خاص نسوانی فرائض ادا کرنے کے علاوہ ایک دیہاتی عورت کو مرد کے کاروبار میں بہت حصہ لینا پڑتا ہے۔ پنجاب کے قصبات میں جاٹ اور زمیندار عورتیں دن بھر کھیتوں میں کام کرتی نظر آتی ہیں۔ بنگال کے گاؤں میں عورتیں مردوں کے ساتھ غلہ بونے۔ بیج ڈالنے۔ اناج اکٹھا کرنے اور پانی دینے کے کام میں مصروف رہتی ہیں جو عورتیں باہر نہیں جاتیں وہ گھر میں اسی طرح کا کام کرتی ہیں۔ مثلاً زمیندار کی بیوی غلہ جمع کرنے، گھاس اکٹھی کرنے اور مال مویشی کی حفاظت میں میاں کا ہاتھ بٹاتی ہے علاوہ اس کے اناج کا پیسنا چرخہ کاتنا اپنے اور اپنے بچوں اور میاں کے لئے کپڑے تیار کرنا بھی اسی کا کام ہے۔ بھلا

کی بیوی کپڑا بننے میں مدد دیتی ہے۔ تیلی کی بیوی کولھو پر کام کرتی ہے۔ درزی کی بیوی سلائی میں ہاتھ بٹاتی ہے۔ موچی کی بیوی کھالیں اکٹھی کرتی ہے۔ دھوبن تو اپنے میاں کا آدھا کام خود کرتی ہے اور اکثر بھاری بھاری گٹھڑیاں اٹھا کر گھروں میں کپڑے لے جاتی ہے۔ کمہار کی بیوی مٹی ڈھوتی ہے اور برتن ڈھالنے میں میاں کا ہاتھ بٹاتی ہے۔ دیہات میں عورتوں کا ایک خاص کام گوبر اکٹھا کرنا بھی ہے۔ جو ایندھن کی صورت میں استعمال کیا جاتا ہے۔

حفظِ صحت کے لحاظ سے دیہاتی گھروں کی حالت بہت خراب ہے۔ عموماً ایک تنگ و تاریک کوٹھڑی میں جہاں کوئی کھڑکی یا روشن دان نہیں ہوتا ایک بڑا کنبہ رہتا ہے۔ مگر دن بھر کھیتوں کی تازہ ہوا میں رہنے اور قدرت کی کھلی فضا میں کام کرنے سے یہ فائدہ ضرور ہوتا ہے کہ ان دیہاتیوں کی صحت عموماً شہری لوگوں سے بہتر ہوتی ہے۔ لڑکیوں کی تعلیم کا دور دراز دیہات میں کوئی خاص انتظام نہیں ہے اور ہندوستان کی آبادی کا یہ بیشتر حصہ یونہی جہالت اور لاعلمی کے گڑھے میں پڑا ہوا ہے۔

عورت اور صنعت و حرفت ۔ ہندوستان کی خاص صنعتیں تین قسم کی ہیں۔ پارچہ بافی کے کارخانوں میں مزدوری کان کنی اور کھیتی باڑی۔ بنگال اور بمبئی میں ۲۵۲،۹۳۳ عورتیں کارخانوں میں کام کرتی ہیں جن میں ۵۸،۵۰۶ روئی کے کارخانوں میں اور ۵۵،۰۴۰ سن (jute) کے کارخانوں میں ہیں۔

کانوں میں بھی جگہ جگہ عورتیں زمین کے اندر کھدائی کا کام کرتی ہیں۔ اس وقت ۸۷،۰۸۱ عورتیں مختلف کانوں میں کام کر رہی ہیں۔ کانوں میں عورتوں اور بچوں سے کام کرانے کے متعلق بہت اختلاف ہے۔ اکثر لوگ اس کے مخالف ہیں کیونکہ زمین کے اندر کام کرنے سے اُن کی صحت پر بہت بُرا اثر پڑتا ہے اور چونکہ غریب عورتیں بچوں کو گھر پر نہیں چھوڑ سکتیں۔ اس لئے وہ شیر خوار بچوں کو بھی ساتھ لے جاتی ہیں۔ اور وہ گھنٹوں زمین کے نیچے گندی ہوا میں سانس لیتے ہیں جو اُن کی نشو و نما کے لئے بہت ضرر رساں ہے۔

بنگال اور آسام میں چائے کے کھیتوں میں بہت سی عورتیں کام کرتی ہیں۔ صرف آسام میں اڑھائی لاکھ کے قریب عورتیں اس کام میں مصروف نظر آتی ہیں۔ جنوبی ہند میں عورتیں چائے، کافی اور ربڑ کے کھیتوں میں کام کرتی ہیں۔ اس کے علاوہ ہندوستان کے مختلف حصوں میں عورتیں چاول، ریشم، اُون اور برتنوں کے کارخانوں میں کثرت سے نظر آتی ہیں۔ اکثر کارخانوں میں قلی کا کام عورتوں سے لیا جاتا ہے اور کئی جگہ عورتیں عمارات پر بطور مزدور کے کام کرتی ہیں۔ اور عموماً مردوں کی نسبت کم مزدوری لیتی ہیں۔

بعض وقت نوجوان عورتوں پر ایسے کاموں کا بوجھ بہت زیادہ ہوتا ہے جو اُن کی جسمانی صحت کے لئے بہت ضرر رساں ثابت ہوتا ہے بالخصوص ایسے زمانے میں جب کہ اُن کو بچوں کی پیدائش اور پرورش کی خدمات بھی انجام دینی ہوں چنانچہ اعداد و شمار سے ظاہر ہوتا ہے کہ کارخانوں اور کانوں میں کام کرنے والی عورتوں میں ننھے بچوں کی شرح اموات دوسری عورتوں کی نسبت بہت زیادہ ہے۔ اس خرابی کا انسداد کرنے کے لئے جگہ جگہ ایسے ادارات کھولے جانے چاہئیں جو ان کام کرنے والی عورتوں کے لئے ہر قسم کی سہولتیں بہم پہنچانے کا انتظام کریں اور ان کو طبی اور دوسری امداد دیں۔ نیز کارخانوں کے کام اور وقت کے متعلق عورتوں کے

لئے مناسب قوانین بنانے پر زور دیں۔

سیاسی اور قانونی حقوق ۔ ہندوستان میں اِس وقت تک ۲۶۸۰۰۰ عورتوں کو رائے دہندگی کا حق مل چکا ہے۔ رائے دہندگی کے لئے عورتوں اور مردوں کے لئے یکساں شرائط ہیں۔ اکثر صوبوں میں عورتوں کو کونسل کی ممبری کا حق مل گیا ہے۔ اور لیجسلیٹو کونسل کی ممبر بھی بن سکتی ہیں۔ مدراس میں ایک خاتون ڈاکٹر متولکشمی ریڈی وہاں کی کونسل کی ڈپٹی سکرٹری بھی رہ چکی ہیں۔ علاوہ ازیں کئی صوبوں میں عورتیں میونسپلٹیوں ڈسٹرکٹ بورڈوں اور لوکل بورڈوں کی ممبر مقرر ہوتی ہیں تعلیمی اور طبّی محکموں میں عورتوں نے بڑے بڑے عہدے حاصل کئے ہیں۔ چند عورتوں نے وکالت کا امتحان بھی پاس کیا ہے۔ اور بطور وکیل کے کام کر رہی ہیں بعض مقامات میں عورتوں نے مجسٹریٹ کی خدمات بھی انجام دی ہیں۔ حال ہی میں ہماری تین قابل خواتین مسز سروجنی نیڈو، مسز شاہنواز اور مسز سُبراین گول میز کانفرنس میں ہندوستان کی نمائندگی کر رہی ہیں۔

ہندوستان کی موجودہ جنگ آزادی میں جو حصّہ ہندوستانی عورتوں نے لیا ہے اُس کا کچھ اندازہ اُن الفاظ سے لگایا جا سکتا ہے جو مہاتما گاندھی نے گزشتہ فروری کو دہلی میں ایک تقریر کے دوران میں کہے تھے۔ آپ نے فرمایا تھا کہ "موجودہ سیاسی تحریک میں عورت نے جو حصہ لیا ہے اُس کے بیان سے زبان قاصر ہے۔ جب ہندوستان کی اس تحریک کی تاریخ لکھی جائے گی تو ہندوستانی عورت کی جانفشانی اور اُس کے ایثار کے کارنامے صفحۂ اول پر جگہ پائیں گے۔ اُن کے حیرت انگیز احساس اور اُن کی بیداری نے مجھے اس بات کا یقین دلا دیا ہے کہ خدا اس تحریک کے ساتھ ہے۔ اگرچہ عورتوں اور بچوں کو کوئی خاص سیاسی تعلیم نہیں دی گئی۔ اور نہ کبھی اُن کو ایسے کاموں کے لئے تیار کیا گیا تھا۔ مگر اُن کی سرگرمی اور اُن کا جوش سب کو حیرت میں ڈال رہا ہے اور میں نہیں جانتا کہ وہ کون سی طاقت ہے جو اس راستہ پر اُن کی رہنمائی کر رہی ہے۔ بجز خدا کے کون کر سکتا ہے۔"

جہاں تک حقوق کا تعلق ہے ہندوستانی عورت کی حالت بہت کچھ قابلِ اصلاح ہے۔ شادی، بیاہ، طلاق، جائداد اور وراثت کے متعلق اُسے مرد کے مقابلے میں بہت کم حقوق حاصل ہیں۔ ہندو عقاید کے مطابق ایک ہندو عورت عمر بھر کسی نہ کسی مرد کی محتاج رہتی ہے۔ شادی سے پہلے اُس پر باپ کی اطاعت فرض ہوتی ہے۔ شادی کے بعد خاوند کی اور بیوہ ہونے پر اُسے اپنی بقیہ زندگی اپنے بیٹے کے زیر اطاعت بسر کرنی پڑتی ہے۔ چونکہ اُسے باپ یا خاوند کی جائداد پر کوئی خاص حق حاصل نہیں ہوتا لہذا وہ کبھی ایک آزاد اور خودمختار انسان کی طرح زندگی نہیں گذار سکتی۔ برخلاف اس کے اگرچہ ایک مسلمان عورت کو اُس کے مذہب کی رو سے ہر قسم کے حقوق اور آزادی حاصل ہے مگر افسوس کہ مسلمان مردوں کی خودغرضی اور ملکی رسم و رواج کی پابندی کی وجہ سے ہندی مسلمان عورت اپنے اکثر حقوق سے محروم کر دی گئی ہے۔

ہندوستان کے مردوں کو اس بات پر ناز ہے کہ انہوں نے اپنی عورتوں کو ہمیشہ غلامی اور محکومی کی حالت میں رکھا۔ اُن کو اُن کے حقوق سے محروم کیا۔ اور انہیں کبھی دوسرے مہذب ممالک کی عورتوں کی طرح آزادی کے میدان میں گامزن نہ ہونے دیا

اُن کا یہ فخر بجا، اُن کا یہ ناز درست سہی، لیکن اُس کا نتیجہ کیا ہوا، یہی کہ اپنی عورتوں کو ذلیل کر کے خود دنیا کی نظروں میں ذلیل ہو گئے۔ اور اُن کو اُن کے حقوق اور آزادی سے محروم کر کے خود قید غلامی کی زنجیروں میں جکڑے گئے۔

برادرانِ وطن! تمہاری خواہش ہے کہ تم اس غلامی سے رہائی پاؤ۔ تمہیں ملک کی حکومت میں حصّہ ملے۔ تمہیں سلف گورنمنٹ اور کامل آزادی نصیب ہو۔ ہاں خدا کرے ہو اور جلد ہو۔ ہماری ہمدردی تمہارے ساتھ ہے۔ ہماری دعائیں تمہارے شامل حال ہیں۔ مگر ذرا سوچو اور غور کرو کہ جب تم نے اپنی عورتوں کو اپنی زندگی کی رفیقوں کو اپنی نسلوں کی ماؤں کو اُن کے جملہ حقوق سے محروم کر کے اُنہیں ذلت اور غلامی کے گڑھے میں گرا رکھا ہو تو تم کس منہ سے دوسروں سے حصولِ آزادی اور مطالبۂ حقوق کے دعوےدار ہو سکتے ہو۔ یاد رکھو کہ جب تک تم اپنے گھروں میں اپنی عورتوں کو وہ حقوق اور وہ آزادی نہ دو گے جس کی وہ صحیح معنوں میں حقدار ہیں۔ تمہیں ملک کی حکومت میں یہ چیزیں ہرگز نصیب نہ ہونگی۔ اور کیونکر نصیب ہو سکتی ہیں جب تمہیں یہ سب باتیں عورت کی زبان سے سیکھنی اور اُسی کے زیرِ تعلیم حاصل کرنی ہیں۔ وہ بحیثیت ماں کے تمہاری اولیں استاد اور بہترین رہنما ہے۔ جب تم نے اپنی ماں کی گود میں آزادی کا سبق نہ سیکھا جب تم نے اپنے اولیں استاد سے سلف گورنمنٹ کی تعلیم حاصل نہ کی جب تم نے اپنے بہترین رہنما سے ملک گیری کے قوانین نہ سیکھے تو تم بڑے ہو کر ملکی حکومت کی باگ ڈور کیونکر سنبھال سکو گے۔

اس وقت ساری دنیا کی آنکھیں تمہاری طرف لگی ہوئی ہیں جس مشکل کام کا بیڑا تم نے اُٹھایا ہے خدا تمہیں اُس میں کامیاب کرے اور وہ دن جلد لائے کہ ہم اور تم مل کر حب وطن کے راگ گائیں اور اس اجڑے گلستانِ ہند کو ایک دفعہ پھر شاد و آباد کریں۔

اصغری خانم

دل بہترین واعظ ہے، زمانہ بہترین استاد ہے، دنیا بہترین کتاب ہے، خدا بہترین دوست ہے!

مجھے کرنا چاہیئے، میں کر سکتا ہوں، میں کروں گا!

گلیمپیما

سودائے سنگیں

پردہ رخِ جاناں سے اک روز اُٹھاؤں گا
میں اپنی طرح سب کو دیوانہ بناؤں گا

ہر لب سے سنوں گا میں چرچا تری خوبی کا
نغمے تری الفت کے ہر بزم میں گاؤں گا

"تم بھولنا مت مجھ کو" کیوں تم نے کہا مجھ سے
میں بھول نہیں سکتا، ہرگز نہ بھلاؤں گا

قرباں تری راہوں پر تا حشر رہوں گا میں
مٹی ترے قدموں کی آنکھوں سے لگاؤں گا

جی بھر گیا دنیا سے، دل بجھ گیا دنیا میں
میں سارے زمانے کو افسردہ بناؤں گا

سن لی مرے مالک نے فریاد اگر میری
نالوں سے قیامت میں سو حشر اُٹھاؤں گا

کیسی یہ سزائیں ہیں؟ اے عجزِ محبت کیا
میں خاک میں مل کر بھی یہ بھید نہ پاؤں گا؟

جب یاد کیا اُس کو، تب جان پہ بن آئی
یا اُس کو بھلاؤں گا، یا جان سے جاؤں گا

اب میرے لبوں پر ہے، اے میر فغاں تیری
"آئندہ کسی سے میں دل کو نہ لگاؤں گا"

حامد علی خاں

جنگ و جدال

(ترکی ڈراما)

فصل اوّل

اشخاص ڈراما

سنیحہ خانم	عمر ۵۵ سال
نعیم بک	سنیحہ کا لڑکا عمر ۳۹ سال
فرخندہ خانم	سنیحہ کی لڑکی عمر ۳۵ سال
بہیجہ	سنیحہ کی بہو عمر ۲۳ سال
نسیمہ	سنیحہ کی چھوٹی لڑکی عمر ۱۸ سال
ممدوح بک	سنیحہ کا داماد عمر ۳۸ سال
مجدی بک	سنیحہ کا بھانجا عمر ۳۲ سال
جمال	محلسرا کی منتظمہ
آنیقہ	خادمہ
ولی	مجدی بک کا خدمت گار

سنیحہ خانم کے کوشک (کوٹھی) میں ایک بڑا ڈرائنگ روم۔ بائیں جانب، ایک پیانو جس کی پشت ڈراما دیکھنے والوں کی طرف ہے۔ داہنی جانب، پیانو کے مقابل، ایک جوڑا صوفہ۔ بائیں جانب، پیانو کے پیچھے ایک دروازہ۔ دو بڑی کرسیوں کے بیچ میں ایک چھوٹی میز۔ اسٹیج کے پیچھے کی طرف دو بڑی کھڑکیوں کے درمیان، ایک شیشوں دار دروازہ جو ایک شاہ نشین کی طرف کھلتا ہے جہاں سے سمندر و باغیچہ کے درخت نظر آتے ہیں۔ بائیں طرف، کے دروازے کے مقابل میں ایک اور دروازہ۔

پردہ اُٹھنے سے پہلے، اندر سے پیانو کی آواز آتی ہے۔ پردہ اٹھنے وقت، صوفے پر

سنیحہ خانم، پیانو کے قریب فرخندہ شہ نشین کی سلاخوں سے ٹیک لگائے نسیمہ و بہیجہ کھڑی نظر آتی ہیں۔ فرخندہ پیانو بجا رہی ہے، سنیحہ عینک لگائے سوزن کاری کے کام میں مشغول ہے

نسیمہ (یکایک لوٹ کر، خوشی کی آواز میں) اماں جان وہ لیجئے جہاز نظر آنے لگا۔

فرخندہ ۔ (پیانو سے فارغ ہو کر، اور کرسی کو پھرا کر) سچ!۔ (پوری طرح گھوم کر، سنیحہ سے) اماں جان، دیکھئے جہاز نظر آنے لگا۔

بہیجہ (کھڑے ہو کر) مگر میرا خیال ہے ممدوح بک جہاز تک نہ پہنچ سکیں گے

سنیحہ ۔ مجدی نے بھی عجیب حرکت کی۔ تین سال پیرس میں گذار کر استنبول لوٹتے ہیں، مگر اتنا نہ ہوا کہ ایک تار ہی بھیج دیتے اور تار بھیجا بھی تو آخر وقت جس میں صرف یہ لکھا ہے کہ "شام کو پہنچا" وقت کچھ نہیں لکھا۔

فرخندہ ۔ خاص کر یہ خیال کر کے کہ ہمارے تار والے جس قدر تار پہنچانے میں جلدی کرتے ہیں ۔ ہمارے ہاتھ میں وہ تار آٹھ گھنٹے سونے کے بعد پہنچا۔ ممدوح بک کو کس قدر پریشانی تھی، کہ جہاز پر جا کے اُن کا استقبال کس طرح کر سکیں گے۔

بہیجہ ۔ مگر اس میں جس کا قصور ہے وہ اس کی سزا بھگتے گا مجدی بک جس وقت جہاز سے اتر کے کنارے پر پہنچیں گے، تو متوقع ہونگے کہ ممدوح کھڑے ہوئے اُن کا انتظار کر رہے ہونگے۔ اُنہیں نہ پائیں گے تو پریشان ہونگے۔

نسیمہ ۔ ہاں، بے شک (شہ نشین کے دروازے میں کھڑے ہو کر) وہ خیال کریں گے کہ کہیں خدانخواستہ کوئی واقعہ پیش نہ آگیا ہو، کیوں باجی؟

فرخندہ ۔ مگر کیوں ایسا خیال کریں، بک کو یہاں سے گئے دس منٹ ہوتے ہونگے ۔ جہاز ابھی پہنچا ہے نا۔ بس بک بھی پہنچ گئے ہونگے ۔ ضرور ساحل پر کھڑے ہونگے۔

نسیمہ ۔ مگر بھائی جان کی اور اُن کی ملاقات نہ ہوئی تو کیسا غضب ہوگا!"

سنیحہ (مسکرا کر) یہ بھی بچپن کی بات ہے۔ ہر بات کو بڑھا ہر بات میں مبالغہ! آخر اس قدر گھبراہٹ کاہے کو ہے۔ مجدی بک یہاں آئیں گے، اور نعیم جب لوٹیں گے تو اُن سے مل لیں گے۔ اور اتنا مل لینگے کہ تم سب کا جی بھر جائیگا۔ بلکہ تھک جائیں گے اور تمہارا منہ دیکھنے سے بھی بیزار ہونگے۔

نسیمہ ۔ کیوں؟

سنیحہ ۔ وہ اسی طبیعت کا آدمی ہے ۔ اپنی عمر کا شاید دسواں حصہ بھی اپنے گھر اپنے خاندان میں نہیں گذارا اور اس کے بعد بھی نہ گذار سکا، اس کے نصیب میں یہی ہے۔

بہیجہ ۔ (غور سے ان باتوں کو سنتی ہے، پھر یکایک پیانو کے پاس جا کر، فرخندہ کا بازو پکڑ کے ہنستی ہوئی، شہ نشین کی طرف لے جاتی ہے) باجی، کیا سچ کہتی ہو؟ (فرخندہ کی باتوں کو جو وہ ہنس

ہنس کے اور آہستہ آواز سے کہتی ہے بسنتی ہے؟
اتنے میں نسیمہ اپنی ماں کے پاس آ کے کہتی ہے:-
تو اب مجدی بک آئیں گے تو ہمارے پاس نہ بیٹھیں گے
کیوں اماں جان؟

سنبیحہ - یہ وہ جانتے ہیں نے جمال بی سے کہہ دیا ہے
کہ اُن کا کمرہ درست کر دے - اگر اُس کا دل چاہے تو
یہاں ٹھہرے ورنہ اگر ہمارے ساتھ قید ہو کر رہنا اُسے
پسند نہ ہو، تو ہم اُسے باندھ کر رکھنے سے تو رہے۔

بہیجہ (شہ نشین میں فرخندہ کی باتیں سن سن کر لوٹ ہوئی
جاتی ہے، اور ایک بلند قہقہے کے ساتھ اونچی آواز سے
کہتی ہے) آپا، آپ بھی غضب کرتی ہیں، کیا عجیب
باتیں کہہ رہی ہیں۔ کس قدر عجیب آدمی ہے۔

نسیمہ (بگڑے ہوئے چہرے کے ساتھ، اپنی ماں کے
پاس سے اُٹھ کر شہ نشین کی طرف جاتی ہے) کیسا افسوس
ہے۔ میں خوش تھی کہ آئیں گے تو میں خوب اُن سے
تصویر کشی سیکھوں گی۔ مگر اس امید کو بھی الوداع کہنا
چاہئے۔

سنبیحہ - اگر صرف اتنے ہی کا رنج ہے تو گھبراؤ مت کیونکہ
اگر وہ ہمارے پاس نہ بھی ٹھہرے تو بھی جب تک شہر
میں رہیں گے میرے پاس روز نہیں تو ہفتے میں
دو ایک مرتبہ مجھ سے ملنے ضرور آئیں گے۔ اس لئے
کہ دنیا میں اس وقت سوائے میرے اُن کا اور کوئی
عزیز قریب نہیں۔ قطعاً اور لازمی طور پر آئیں گے۔
تمہارے لئے کیا یہ کافی نہیں۔

نسیمہ - (چلتے چلتے رک کر اور آدھا پھر کر اور مسکرا کر) اگر
ایسا ہو تو کیا ہی اچھا ہے۔ (شہ نشین پر جا کے اور
سلاخوں سے ٹیک لگا کے، داہنی طرف دیکھتی ہے)
لے لو، وہ دیکھو جہاز کے مسافر نکل رہے ہیں۔ غالباً جہاز
بھی اب روانہ ہونے کو ہے (دوڑ کے ایک چھوٹی میز
سے دوربین اٹھا کے پھر سلاخوں کے پاس جاتی ہے
اور داہنی طرف دوربین سے دیکھتی ہے)

بہیجہ - نسیمہ خانم مجدی بک کے آنے سے کس قدر خوش ہیں،
کیوں آپا؟

فرخندہ (نسیمہ پر نظر ڈال کر) ہاں، مجدی تصویر خوب بناتے
ہیں اس وجہ سے۔ وہ یورپ تصویر کشی ہی سیکھنے کے
لئے گئے تھے۔ ہماری چھوٹی خانم بھی کیوں نہ خوش
ہوں۔ سوچتی ہیں تا کہ خوب دل بھر کے ان سے اپنی محبوب
صنعت یعنی تصویر کشی سیکھیں گی۔

بہیجہ (مذاق میں) ہاں اپنی صنعت (نسیمہ کی طرف پھر کے)
کیوں کچھ دکھائی دیتا ہے۔

نسیمہ - اس بھیڑ میں امتیاز کرنا مشکل ہے۔ یہ وقت اطہ
کی بھیڑ بھاڑ اور اژدہام کا ہے۔ اس انسانی سیلاب
میں کسی ایک آدمی کو پہچاننا ممکن نہیں۔ پہلے میں نے
خیال کیا کہ میں دولھا بھائی کو پہچان گئی (فرخندہ کی
طرف) کیا وہ سفید کوٹ پہنتے ہیں؟

فرخندہ - معلوم نہیں، اُسے بدل کے گئے تھے یا اُسے
ہی پہنے چلے گئے میں کہہ نہیں سکتی۔

بہیجہ - اُنہیں بدلنے کا وقت ہی کب ملا جس وقت تار
ملا ہے، جہاز بلبہ لی سے روانہ ہو چکا تھا۔ تب جو کپڑے
پہنے تھے وہی پہنے ہوئے بھاگے۔ (سب ہنستی ہیں)

ذرا مجھے عنایت کیجئے۔ (نسیمہ خانم (نسیمہ کے ہاتھ سے دوربین لے کے دیکھتی ہے)

فرخندہ۔ (سنیحہ کے قریب آکر) آپ کیا دیکھ رہی ہیں اماں جان؟

سنیحہ (شفقت آمیز آواز سے) بیٹی، میں اُس ماں کی طرح دیکھ رہی ہوں جس نے اپنی تمام عمر اپنی چہیتی اولاد کی خوشیوں میں گزاری ہو، اور اپنی اس خوش قسمتی پر خدا کا لاکھ لاکھ شکر کرتی ہو، تم اسے اُس وقت سمجھ سکتی ہو جب کہ تمہارے بچوں کی بھی بہوئیں ہوں، اور وہ اپنی جوانی کی تازگی میں پُرمسرت زندگی بسر کرتے ہوں، اُنہیں دیکھ دیکھ کر تمہیں اپنا شباب یاد آئے، اور تم اپنے شباب کو گویا دوبارہ بسر کرتی ہو۔ مگر یہ بات اُنہیں نصیب نہیں جنہوں نے زندگی کے خراب رستے کو اختیار کیا ہو، اور زندگی کی راحت و سعادت سے محروم ہو گئے ہوں، یہ اُن کا حصہ ہے جنہوں نے چاہنے والے خاوند کے آشیانِ محبت میں خوش بس کر زندگی کاٹی ہو۔

فرخندہ (اُس کے پاس جاکر جھک کے اُس کے ہاتھوں کو لے کے بوسہ دیتی ہے) آہ! میری پیاری اماں جان

سنیحہ۔ (اپنے ہاتھوں سے سلائی کا کام چھوڑ کے، رومال سے آنکھوں کو پونچھتی ہے، اور تھرّائی ہوئی آواز سے) بیٹی، ایسی زندگی کے غموں میں بھی، کن الفاظ میں اپنا مطلب ادا کروں، گویا ایک درد آمیز لطف ہوتا ہے۔ اس وقت مجھے خیال آرہا ہے۔ تمہارے والد اللہ بخشے اگر آج زندہ ہوتے، تو جس طرح انہوں نے مجدی کا سفر دیکھا، آج سفر سے اُن کی واپسی دیکھتے۔ کاش وہ آج ہم میں ہوتے اور خاندان کی آج کی مسرت میں شریک ہوتے یہ ممکن نہیں۔ مگر میں اس وقت اس سے مایوس نہیں ہوئی، بلکہ یہ سوچتی ہوں اور خوش ہوتی ہوں کہ میں تم سب کو اس طرح خوش و خرم دیکھ کر اُن کے پاس جاؤں گی۔

فرخندہ (متفکرانہ) اماں جان! (فرخندہ کی آنکھیں ڈبڈبا آتی ہیں)

بھیجہ (شہ نشین سے) جہاز روانہ ہو گیا۔

سنیحہ (اُس کے پاس جاکر) کیوں تم کسی کو دیکھ سکیں۔

بھیجہ (جہاز کے آدمیوں کو دیکھنے کے لئے جس طرح کھڑی تھی، اُسے بدل کر، نسیمہ سے مسکراہٹ کے ساتھ) تم سے کچھ زیادہ ہی دیکھ لیا۔ (نسیمہ اُس سے دوربین لینا چاہتی ہے) اب کیا دیکھتی ہو ساحل پر اب کوئی نہیں رہا۔

نسیمہ (دوربین لگا کے) بیشک سب چل دیئے۔ جہاز بھی روانہ ہو گیا (دوربین کو میز پر رکھ دیتی ہے)

بھیجہ (شہ نشین میں سے) لو آگئے (نسیمہ و فرخندہ دوڑ کر شہ نشین پر آتی ہیں۔)

سنیحہ۔ خوشی کا شور

بھیجہ۔ آپا ہمیں دیکھ لیا۔ ہاتھ سے سلام کر رہے ہیں۔

فرخندہ (نیچے دیکھ کر ہنستی ہوئی) خوش آمدید۔ خوش آمدید

جمال بی (داہنی طرف سے داخل ہو کر) آنکھوں کو ٹھنڈک کلیجے کو ٹھنڈک۔ مبارک، مجدی بک تشریف لے آئے۔

سنیحہ۔ اُن کا کمرہ بالکل درست ہو گیا نا، بی؟

جمال۔ بالکل تیار ہے۔ اپنے مہمان کا انتظار کر رہا ہے۔

میری خانم۔

ممدوح بک۔ (داہنے دروازے سے مجدی بک کو پکڑے ہوئے سنیحہ کے پاس لاتا ہے) لیجئے اماں جان آپ کے آوارہ اور شریر بیٹے کو لے آیا (مجدی سنیحہ کے ہاتھ اور آنکھوں کو بوسہ دیتا ہے۔) مجھے اس قدر گھبراہٹ تھی کہ جہاز آجائیگا، اور میں استقبال کے لئے نہ پہنچ سکوں گا، آدھے راستے ہی میں رہ جاؤنگا۔

مجدی۔ (لوٹ کے ہمیں اچانک پہنچنا چاہتا تھا (فرخندہ کے ہاتھ لے کر ہونٹوں تک لے جاتا ہے) باجی جان! (نسیمہ کو دیکھ کر) او ہو! نسیمہ خانم تو تین برس میں پوری بڑی خانم ہوگئیں۔ غالباً اگر میں سڑک پر نقاب میں دیکھتا تو پہچان نہ سکتا لیکن اگر وہ یہ نہیں بھول گئیں کہ وہ مجھ سے چھوٹی ہیں، اور میں اُن کا بڑا بھائی ہوں تو انہیں معلوم ہوگا کہ انہیں میرا ہاتھ چومنا چاہئے (نسیمہ شرمائی ہوئی آتی ہے اور اُس کا ہاتھ چومتی ہے)

سنیحہ۔ رسموں کا آخری حصہ میں پورا کردوں تاکہ تم پھر آرام کرو۔ یہ کام تو نعیم کا تھا، مگر وہ چونکہ یہاں نہیں لہٰذا میرے ذمے ہوا۔ بہیجہ خانم . . . بیٹی . لو یہ تمہارے دیور ہیں (مجدی ادب سے سلام کرتا ہے، وہ سلام کا جواب دیتی ہے)

مجدی۔ تو کیا نعیم بک یہاں نہیں ہیں؟

ممدوح۔ اس وقت شاید ازمیر کے قریب ہونگے، نہ معلوم کس شکار کی تیاریاں ہو رہی ہونگی۔ وہ کبھی خالی بیٹھ سکتے ہیں۔ اُنہیں جس چیز کا شوق ہوتا ہے اُسے خبط کے درجے تک پہنچاتے ہیں۔ ایک اسپورٹسمین، کہ انگریز بھی اسی قدر ہوتے ہونگے۔ اور سچ تو یہ ہے کہ شوق کی اس افراط میں انہوں نے انگریزوں کو بھی پیچھے چھوڑ دیا ہے۔

مجدی۔ (فرخندہ سے) تم کیسی ہو، پیاری بہن۔ اس نٹ کھٹ ممدوح سے اب کوئی شکایت وغیرہ تو نہیں (ممدوح سینہ ابھار کے اپنی مونچھوں کو درست کرتا ہے) اُفوہ! اب کیا تنے جاتے ہیں۔ اس قدر عظمت فروشی

ممدوح۔ عظمت وظمت تو میں جانتا نہیں صرف اس جسارت کا انتظار کر رہا ہوں کہ میری کوئی شکایت تو کرے۔ کیونکہ پورے اطمینان کے ساتھ دعویٰ کرسکتا ہوں کہ دنیا کے تمام شوہروں سے بہتر ہوں۔ اور (سنیحہ کے قریب جاکر) دنیا کے تمام دامادوں سے اچھا ہوں۔ اس دعوے پر اکڑ بھی سکتا ہوں اور اگر اس کی تصدیق چاہتے ہو، تو دنیا کی تمام عورتوں میں سب سے زیادہ مقدس و واجب الاحترام پیاری اماں جان سے پوچھو۔

سنیحہ۔ ہاں، میں بھی نہایت خوشی سے اس کی تصدیق کرتی ہوں۔ اور اگر سچ کہنا ضروری ہے تو میں اپنے بیٹے کے مقابلے میں، اپنے داماد سے زیادہ خوش ہوں، آہ! نعیم۔ وہ اس وقت موجود نہیں، نہ معلوم کن خطروں میں سے گزر رہا ہوگا۔ میری زندگی میں اگر مجھے کوئی غم ہے تو یہ ہے کہ وہ یہاں نہیں۔ کاش کوئی اس وقت مجھے اُس کا چہرہ دکھا دے تو جو مانگے میں دوں۔ مگر یہ کہاں ممکن۔

فرخندہ (ایک طرف کو خاموش اور غمگین بیٹھی ہوئی بھیجی کی طرف آنکھ کا اشارہ کر کے مجدی سے) کہئے ان تین سال میں آپ کیسے رہے۔ کیا کیا کیا۔

مجدی۔ (سگرٹ جلا کے) بے حد اچھا رہا اور بے حد اپنے کو فائدہ پہنچایا۔ نہ معلوم تم جانتی ہو کہ نہیں، میں جب تک یہاں تھا۔ نہایت برا آدمی تھا۔ بہت سے واقعات کی بنا پر میں بددیں اور مردم گریز ہو گیا تھا۔ مگر دیار غربت کی تنہائی میں جن مناسبات، جن تعلقات سے میں خوشیوں کی توقع کرتا تھا۔ اُن سے مجھے غم و غصہ کے سوا کچھ نہ ملا۔ اور انہوں نے مجھے سکھایا کہ انسان کی خوشی ماں باپ، بھائی بہن اور عزیزوں سے مشکل ایک چھوٹی سی جماعت پر منحصر ہے۔ وہ مختصر جماعت جسے خاندان کہتے ہیں۔ اور میں اچھے خیالات کی طرف پھر لوٹ آیا۔

سلیحہ۔ مبارک مبارک مجدی تم، میں دیکھتی ہوں کہ طریق رحمان کی طرف لوٹ آئے۔ یعنی اب تم میں وہ اگلی تباہی پن کا اثر نہ رہے گا۔ مجھے امید ہے کہ تم مجھ کو کہو گے کہ میرا بیاہ کر دو۔

فرخندہ۔ (ہنس کر) میں اُس کے لئے بالکل تیار ہوں یقین مانو کہ جیسی بیوی تم چاہتے ہو میں ہی انتخاب کر سکتی ہوں اور میں اس تلاش میں تھکوں گی بھی نہیں۔

مجدی۔ اچھا تو آپ کو اطلاع دیتا ہوں کہ شادی نہ کیجئے۔ کیونکہ سب سے بڑی خرابی یہ ہے کہ مجھے ہی آپ گھبرا دیں گی۔ شادی کی خواہش کرنے سے زیادہ اور آسان کون سی چیز ہے؟ لیکن شادی کی خواہش کرنے اور ایک معقول عورت سے شادی کرنے میں اتنا فرق اور اتنا فاصلہ ہے کہ انسان کو ایک دم ڈرا دیتا ہے۔ یہ اتنا ہی مشکل ہے جتنا کسی خاتون کا دستیاب ہونا جو تمہاری طرح ہر نسوانی خوبی کی مالک اور ہر طریقہ سے لائق عزت و احترام ہو مشکل ہی نہیں محال ہے۔ اور سچی بات تو یہ ہے کہ تھوڑا سا مجھے ستا لینے تو دو۔

فرخندہ۔ (ہاتھ کے اشارہ سے بات کاٹ کر) آپ کی عنایت۔ آپ کے حسنِ توجہ کا شکریہ اور یہ بطور جواب کے نہیں بلکہ بطور اپنی رائے کے کہتی ہوں کہ ہمارے مردوں میں آپ بھی اس قدر (مسکرا کر) میں اپنے بھائیوں کو شامل کر کے کہتی ہوں نادر اور قیمتی موتی ہیں کہ آپ کے قابل عورت کا ملنا اسنبول میں تو مشکل ہے کیوں اماں جان؟

ممدوح۔ (ہنس کر) تسلیم اس عنایتِ خاص کا شکریہ اور آپ کی عمر میں گو وہ ایک ہی دفعہ نکلی ہے مگر سچی بات کے لئے آپ کو مبارکباد دیتا ہوں۔

سلیحہ۔ نہیں فرخندہ تم اِن سب مردوں کو مغرور کر دو گی اور اُس کی تو خبر نہیں مگر دوسرے کو مغرور کر دینے کی سزا بھول مت جانا تمہیں ہی بھگتنی پڑے گی۔

ممدوح۔ کیوں اماں جان کیا آپ میرے متعلق کہہ رہی ہیں؟

فرخندہ۔ اور نہیں تو تم کیا خیال کرتے ہو۔ بیشک تمہارے ہی متعلق تو گفتگو ہے۔ مگر تمہیں معلوم نہیں کہ جس بات کا اماں جان کو خوف ہے وہ تو واقع ہو چکی یعنی آپ کا غرور حدِ معروف سے دیر ہوئی آگے نکل گیا۔ (ہنس کر)

اپنے شوہر کے ہاتھ پر ہاتھ مارتی ہے)

مجدی (نسیمہ کے قریب جاکر) آپ لوگ اجازت دیجئے
ذرا چھوٹی خانم سے بھی تو بات کروں۔ لیکن آپ کو خبر
ہے کہ وہ اب تک میری نظر میں چھوٹی خانم ہی ہیں
مجھے تو اب بھی وہی نظر آرہی ہیں، جو جب میں
کسی تصویر کے بنانے میں مشغول ہوتا تو میرے
پاس پھر کر مجھے ستاتیں۔ اور میں کہتا نسیمہ دیکھو برش
کو مت چھوؤ۔ سیاہ رنگ کو ہاتھ مت لگاؤ۔ نسیمہ
تم ساری تصویر برباد کر دو گی۔ تمام رنگ ملا دو گی۔

ممدوح۔ لیکن نسیمہ خانم کو اب تمہیں دیکھنا چاہیئے کہ وہ کیا
ہو گئی ہیں۔ شاید تمہارے رنگوں کو ملا ملا کے اور
گڈ مڈ کرنے ہی کی وجہ سے اب ایسی ایسی اچھی
تصویریں بناتی ہیں کہ میں خود ان کی قابلیت و استعداد
پر حیرت کرتا ہوں۔

مجدی۔ کیا کہتے ہو۔ نسیمہ خانم یہ سچ ہے؟

نسیمہ۔ محض مبالغہ۔ بے شک اگر مجھ میں کچھ استعداد ہے
تو آپ ہی کی پیدا کی ہوئی ہے۔ اور آپ ہی کے
طفیل سے ہے۔

مجدی۔ مجھے کس قدر خوشی ہوئی تم نہیں جان سکتیں۔

سنیحہ۔ ہمارے باغ میں اس نے ایسی اچھی تصویر بنائی

مجدی۔ ہاں! میری دلی مبارکباد قبول کرو۔ چھوٹی خانم
(یکایک سنجیدگی کے ساتھ) لیکن میری بے تکلفی معاف
کرنا میں تمہیں کبھی ایک سنجیدہ بھاری بھرکم خانم کی طرح
نہیں دیکھنا چاہتا۔ اس سے تو مجھے بچاؤ۔

نسیمہ۔ آپ کی جو خوشی ہو۔

مجدی۔ آپ کی عنایت۔ اچھا اب ذرا ہم آپ کی بنائی ہوئی
تصویریں بھی دیکھ سکتے ہیں کہ نہیں؟

نسیمہ۔ بڑی خوشی سے۔

سنیحہ (سیدھی کھڑی ہو کر) مجھ سے سنو! ان باتوں کو تو
ابھی رہنے دو جمال بی نے جو تمہارے لئے کمرہ درست
کیا ہے۔ وہ دیکھو۔

مجدی۔ (کھڑے ہو کر) او ہو جمال بی تم بھی آگئیں۔ (خادمہ
مسکرا کر تسلیم کرتی ہے) کیسی ہو۔ او ہو اب بھی ویسی ہی
گول گپا۔ یہ بوڑھے لوگ بھی نوجوان رہنے میں کس قدر
کامیاب رہتے ہیں۔

جمال بی۔ حضور کیا اب بھی میں جوان کہلا سکتی ہوں؟ اب
جمال بی وہ پرانی جمال بی نہیں ہے۔

مجدی۔ یہ تو ٹھیک ہے کہ تمہاری آنکھوں میں اب وہ پہلی
سی چمک نہیں۔ مگر ذرا جھکی ہوئی ہے۔ اور ہاں یہ تو
بتاؤ علیم و بسیم کیا نام تھا اس کا۔ وہ کہاں ہے۔ جیتا ہے؟
(جمال اپنا سر ہلاتی ہے) شاید اس نے تمہیں بہت
ہلا رکھا ہے کہ خواہ مخواہ اس طرح سر ہلا رہی ہو۔ لو اب
چلو اپنا کمرہ دیکھیں (پھر کر سب کو مخاطب کر کے)
اجازت دیجئے (داہنی طرف کے دروازے سے سیدھا
جاتا ہے)

جمال بی۔ اس طرف سرکار حضور! آپ غلط رستہ سے جا رہے ہیں

مجدی۔ (دائیں طرف پھر کر، جمال بی کو تنک کر) میں بھول گیا۔
غالباً تمہارے بجائے میں بڈھا ہو گیا ہوں۔

فرخندہ۔ (ہنس کر) واہ مجدی بے دھیجہ کی طرف مخاطب
ہو کر آپ نے کیسا پایا، نہیں؟

بہیجہ - بہت اچھا - خاص کر بہت خوش مزاج -

فرخندہ - اس قدر کہ انسان ہفتوں اُن کے پاس رہے تو بھی نہ اکتائے -

سنیحہ - بچو سیر کو نہ جاؤ گے، کھانے کے وقت تک ذرا ہوا خوری کر آؤ -

فرخندہ - سچ تو ہے - بہت اچھا ہوگا (بہیجہ سے) باجی تم بھی آؤ گی ؟

بہیجہ - میں فیصلہ ہی نہیں کر سکتی، شاید میرے جانے کے بعد سب آجائیں - یہیں ٹھہروں تو اچھا ہی -

نسیمہ - بھائی جان نے کہا تھا کہ میں جمعرات تک آؤں گا

ممدوح (شہ نشین میں سگار پیتے ہوئے) ہاں نعیم بے پنجشنبہ تک آئیں گے -

فرخندہ - آپ بھی چل رہے ہیں نا ؟ اگر کوئی امر مانع نہیں -

بہیجہ - کیا امر مانع ہوگا - آؤ باجی چلیں -

ممدوح (گھنٹی بجا کے، انیقہ سے جو اندر داخل ہوتی ہے) اخبار استنبول آگیا ؟

انیقہ - ہاں حضور، نیچے ڈرائنگ روم میں ہوگا -

ممدوح - مہربانی کر کے اٹھا لاؤ (انیقہ جاتی ہے)

سنیحہ - ممدوح بک، چاہو تو تم بھی مجدی کے ساتھ سیر کو آؤ - کیوں ؟

ممدوح - اسے، جو دق ہو تو جائیں (عورتیں باہر جاتی ہیں - ممدوح سگرٹ پیتا ہوا بالا خانے میں ادھر ادھر ٹہلتا ہے - اتنے میں انیقہ اخبار لاتی ہے - ممدوح اخبار لے کر دروازے سے ٹیک لگا کر اخبار پر نظر ڈالتا ہے اور انیقہ سے، جو واپس جانے کو ہے کہتا ہے) انیقہ دیکھو، مجدی بک سے کہو میں یہاں ہوں - جب تیار ہو جائیں تو یہاں آجائیں -

مجدی (کپڑے بدل کر، بائیں طرف کے دروازے سے داخل ہوتا ہے) کیوں، بیبیاں کہاں ہیں ؟

ممدوح (جھک کر، سگرٹ کو راکھ دانی میں بجھاتے ہوئے) سب ہوا خوری کو نکل گئی ہیں - چاہو تو ہم بھی ذرا ہو آئیں - مگر ذرا اجازت دو، اس اخبار کی دو تین سطریں اور پڑھ لوں -

مجدی - تمہارا دل چاہے، تو سارا ختم کر دو [وہ بھی بالکونی (شہ نشین) میں آتا ہے] اوہ کیا اچھا منظر ہے - ہاں وہ دیکھو جا رہی ہیں - وہ اپنی چھتریوں کو ہماری طرف ہلا رہی ہیں -

ممدوح - (اخبار کو ایک طرف ڈال کے) لیجئے، اب میں آپ کے حکم کا منتظر ہوں -

مجدی - (آگے بڑھ کے، کہتے) کیا کہتے ہیں آپ کہاں چلیں - کون سی جگہ جانے کے قابل ہے - کہاں جانے کا ارادہ ہے -

ممدوح - چلئے بندرگاہ پر چلیں، تاکہ آخری جہاز کی واپسی دیکھیں - کچھ گانا سنیں اور اوپیرا دیکھیں

مجدی - بس، اسی قدر ؟

ممدوح - اور کیا چاہتے ہو - یہ پیرس یا پلازا تو نہیں محض چالیس ہزار کی آبادی کا ایک مسکین غریب شہر

مجدی - پھر مجھے تو یہ ہزار درجہ پسند ہے کہ سمندر کے کنارے بندرگاہ کا نہایت معمولی گانا سننے اور اوپیرا دیکھنے کے بجائے اس بے مثال منظر کو، اس دھندلے افق

میں، محزوں مگر آتشیں غروب کی سیر کروں۔ اور یہیں
شہ نشین میں بیٹھے ہوتے ادھر اُدھر کی باتیں کروں۔

ممدوح ۔ شاید تمہاری تصویر کشی کی رگوں میں پھر خون کا جوش
ہونے لگا۔

مجدی ۔ انسان سیاحت میں کیسے ہی لطیف مناظر، کیسے ہی
شاعرانہ گوشے، دیکھے، اُن مقامات پر جس کہ میں وطن
سے دور ہوں اُس کے دل میں اس قدر جاگزین
ہوتی ہے کہ مدتوں وہاں رہنے پر بھی اپنے ملک کی
دلآویزی، اور مناظر کی شعریت کو نہیں بھول سکتا۔

ممدوح ۔ نہایت شاعرانہ اور دلربایانہ بیان ہے، لیکن اس
کے سننے کے لئے بہیجہ خانم ہی کو ہونا چاہئے۔

مجدی ۔ بہیجہ خانم۔ خاص طور پر وہ کیوں؟

ممدوح ۔ کیونکہ تمہاری تقریر کی شعریت و لطافت کو صرف
وہی ٹھیک جان سکتی ہیں۔

مجدی ۔ اوہو، وہ شاعر بھی ہیں۔

ممدوح ۔ واقعہ یہ ہے، کہ جیسا ہمارے ایک شاعر نے کہا، وہ
شاعر تو نہیں، مگر بہت شاعرانہ ہے۔

مجدی ۔ یہ بات۔ اچھا بھائی۔ ذرا میرے یہاں سے جانے
کے بعد کے حالات تو سناؤ (ایک سوفے پر دراز ہو
جاتا ہے)

ممدوح ۔ (جیب سے سگرٹ کیس نکال کے اور مجدی کو
سگرٹ پیش کر کے) ہاں ضرور، اصل میں میں سمجھتا ہوں
یہ میرا فرض تھا۔

مجدی (سگرٹ، سگرٹ کیس میں سے اٹھا کر، اور دیا سلائی
کے بکس کے لئے ہاتھ بڑھا کر) کیوں نہیں۔ سب سے
پہلے گھر میں جو نئی دلہن آئی ہیں اُن کا حال سناؤ۔
(دیا سلائی جلا کر ممدوح کی طرف بڑھاتا ہے، ممدوح
اُس سے اپنا سگرٹ جلاتا ہے) کون ہیں؟ کس گھر کی
ہیں۔ کیسی عورت ہیں۔ (اپنا سگرٹ جلاتا ہے، اور
دیا سلائی کا بکس ممدوح کی طرف پھینکتا ہے) اور یہ
ہوا کیسے؟ نعیم بک اپنے تمام مشاغل چھوڑ کے کس
طرح اس شادی کے لئے راضی ہو گئے؟ اور پھر کیوں
اس بیچاری عورت کو تنہا چھوڑ کر عرصے کے لئے
چلے گئے؟

ممدوح ۔ یہ سب ایک قصہ ہے۔ اور ایسا کہ جس کی توقع نہیں
کی جا سکتی تھی۔ ایک دن ہم نے دیکھا کہ نعیم بک
عاشق ہیں اور دیوانگی کی حد تک عاشق، اور ایسا عاشق
جو ہر قربانی کے لئے تیار ہو۔ تم اسے یقین کر سکتے ہو؟
ایسا عاشق جو اپنے تمام کھیل تماشے اپنے تمام سیر و
شکار کو بھول گیا ہو۔ یوں سمجھو کہ ایک عاشق زار، مگر
لڑکی ہے کہ کسی طرح راضی ہی نہیں ہوتی، اور کہا
یہ جاتا ہے کہ یہ اس وجہ سے نہ تھا۔ کہ نعیم بک خوش
شکل نہیں، بلکہ زیادہ تر اس وجہ سے کہ لڑکی کسی دوسرے
کو دل دے چکی تھی یا وعدہ کر چکی تھی۔ یہ خبر پا کر بھی نعیم بک
تھے کہ لڑکی کے باپ سے درخواست پر درخواست
کئے جاتے تھے۔ لڑکی کا باپ نہایت مالدار آدمی تھا، اور
درخواستیں بھی نہایت دل نرم کرنے والے طریقوں
سے کی جاتی تھیں۔ مگر کامیابی نہ ہوتی تھی۔ آخر بہت
کوششوں کے بعد ہمارے نعیم ناامید ہو گئے لیکن
تمہارے جانے کے شاید برس ڈیڑھ برس کے بعد لڑکی

کا باپ حرکتِ قلب بند ہو جانے سے یکایک مر گیا۔ معلوم ہوا کہ اُس نے ترکے میں پانچ پیسے بھی نہیں چھوڑے۔ لڑکی کو کچھ سرکاری باپ کی پنشن کے عوض وظیفہ مقرر ہو گیا۔ لڑکی کی ایک بوڑھی خالہ تھی، وہی اُس کی تنہا رشتہ دار تھی۔ بدقسمتی سے وہ بھی تہی دست ہی تھی۔ بہر حال لڑکی جواب ہر طرف سے مایوس ہوئی تو اُس نے ایک دن نعیم بک کی درخواست قبول کر لی۔ اُس وقت نعیم کا حال قابلِ دید تھا، مارے غرور اور خوشی کے اُن کا قدم زمین پر پڑتا ہی نہ تھا۔ بالآخر بیاہ ہوا اور دلہن گھر آئی۔ چند مہینوں تک تو سب نے دیکھا کہ نعیم بک ہر چیز کو چھوڑ کر محض اپنی بیوی کے ہو گئے۔ اتفاقاً ایک دن ایک بادبانی چھوٹی کشتی نظر آئی یہ اتنی پسند آئی کہ نعیم نے اُسے خرید لیا۔ اور اس کا نام بہیجہ رکھا۔ لیکن جس خانم پر اس کا نام رکھا گیا تھا اس کشتی نے اس خانم کے ساتھ اتنی بھی وفا کا اظہار نہ کیا۔ جتنا کہ خانم کے شوہر نے کیا تھا۔ یہ کشتی ہی خانم کی مصیبتوں کا باعث ہو گئی۔ اس کا خریدا جانا تھا کہ نعیم بک کو پھر اسپورٹ، پھر شکار، سیر و تفریح، پھر آوارہ گردی کا خبط اچھلا، اور آہستہ آہستہ نوجوان عورت نے ایک دن اپنے تئیں گوشۂ نسیان میں تخت نشینِ بے التفاتی پایا۔

مجدی ۔ بیچاری لڑکی! اگر یہ چیز نعیم کو کسی اچھے نتیجے پر پہنچائے گی۔

ممدوح ۔ بیچاری لڑکی اپنی مصیبت کا بہت کچھ مقابلہ کر رہی ہے۔ اپنے زخمِ جگر کی اُس کے لب پر شکایت نہیں۔ نسوانی نخوت کے زیرِ جبر و اثر ہو کر، وہ غمزدہ عورت اس کی کوشش کرتی ہے کہ مجروح نظر نہ آئے مگر اُس کا دردِ پنہاں میں دیکھ رہا ہوں کہ روز بروز اس کی حالت خراب کر رہا ہے۔ وہ جو میری طرح نظر رکھتے ہیں اُن سے یہ باتیں چھپ نہیں سکتیں۔

مجدی ۔ اُس کے عادات و اطوار کیسے ہیں۔

ممدوح ۔ حال تو تم دیکھ رہے ہو اور دیکھو گے۔ عادات و اطوار ابھی غیر معیّن ہیں۔ کبھی تو ایسی خفیف الحرکات نظر آتی ہے کہ انسان اُس سے نفرت کرنے لگتا ہے آخر نیچے گھرانے کی ہے اور گرے ہوئے اخلاق کی معلوم ہوتی ہے لیکن پھر اس کی خفیف الحرکاتیوں ہی میں ایسا تغیر ہو جاتا ہے اور اس کے غمگیں چہرے پر ایک ایسی سنجیدگی چھا جاتی ہے کہ میں اُس کی دیوانگیوں کو حق بجانب سمجھنے لگتا ہوں۔ ایسی نوجوان اور بلاشبہ امنگوں بھری عورت کو اس عمر میں اُسے تنہا نہیں چھوڑ دینا چاہیے تھا۔

مجدی ۔ (ٹھہرے ہو کر) اپنا شام کا وقت کس طرح گذارتے ہو (سگرٹ کو راکھ دانی میں بجھنے کے لئے رکھنے کو اس طرف جھکتا ہے)

ممدوح ۔ کبھی میں تماشگاہ پر محض تفریح کو اور باجا سننے چلا جاتا ہوں کبھی ادھر ادھر دوستوں کے گھروں پر ملنے چلا جاتا ہوں۔ ایسی بہت پر لطف زندگی نہیں ہے سہی تو بالکل بے مزہ بھی نہیں۔ ذرا ٹھہرو تو میں تمہیں چند ایسے خاندانوں سے ملاؤں گا کہ تمہارے سینۂ ساکن میں طوفان برپا ہو جائے گا۔ ان میں تم ایسی ایسی لطیف چیزیں پاؤ گے جو تمہارے فضیلت کے قلعے

آسانی سے منہدم کرسکتی ہیں۔ (کھڑے ہوکر) آہ، یہ
عورتیں!

مجدی۔ آپ کا خیال غلط ہے، آپ یقین مانئے ایسی آسانی
سے نہیں۔ مگر کوئی ایسی قیامت انگیز، فتنہ زا چیز
ہو تو میرے پائے ثبات کو ڈگمگا دے تو وہ اور بات ہے

ممدوح۔ آپ کے فلسفۂ حیات کے ہی متعلق گفتگو کرنا چاہتا
ہوں۔ اچھا یہ تو بتائیے ایک لمبی مگر بے ہیجان و
یکسان حیات، استراحت اچھی یا ایک لمے کی بیتاب
اور زیر و زبر کردینے والی آتشیں پُرلطف زندگی۔

مجدی۔ میں دوسری قسم کی زندگی پر اپنی عمر فدا کرنے کو
تیار ہوں۔ یہ لاکھوں انسان جو ایک دوسرے سے
بے پروا، یا اکثر ایک دوسرے کے دشمن ہیں۔ ان
انسانوں میں دو ایسے انسان بھی مل جائیں جو ایک
دوسرے سے محبت کرتے ہوں۔ ایک دوسرے پر
جان فدا کرتے ہوں، ایسی نادر خوش قسمتی ہے کہ
انہیں دیکھنے اور اُن تک پہنچنے کے لئے ہر امکانی
کوشش کرنی چاہیئے۔ اگر خود اپنے کو محبت کی یہ ثروت
مل جائے تو اس پر ہر چیز کو فدا کرنا چاہیئے۔ اس کے
لئے سب کچھ جائز و مشروع ہے۔

ممدوح۔ (مسکرا کر) بیشک، لیکن فضیلت و سنجیدگی کا
دامن نہ چھوڑ کر

مجدی۔ ہاں بے شک، لیکن اس میں جائے تعجب کیا
ہے۔ ہر شخص زندگی کو اپنے نقطۂ نظر سے دیکھتا ہے

ممدوح۔ مبارک ہو۔ یورپ نے آپ کو (آپ کے ادعا کے
مطابق) ایک صاحب فضیلت درویش نہیں بنایا
بلکہ ایک دہشت انگیز خود کام و خود غرض انسان
بنا دیا ہے۔
چونکہ میں ننا ہی میں شاید موقع نہ پانے کی وجہ
سے پڑا ہی نہیں، اس لئے میں اُن کے مزے اور
لطف سے بھی بے خبر ہوں۔ کیا ساری برائیاں، سارے
گناہ، لذات ممنوع کی طرف دوڑنے ہی کی وجہ سے
نہیں وجود میں آتے۔ جن گناہوں سے لطف
اُٹھا چکے اُن کے مقابلے میں اُن گناہوں سے،
جن سے کوئی حظ کی امید ہی نہیں، کسی کا فضیلت
و اتقا کا دعوے کرنا کیا معنی رکھتا ہے۔

مجدی۔ اس بحث کو چھوڑیئے، کیونکہ اس بحث میں طول
ہو جانے کی بہت قابلیت ہے (نیچے کی طرف دیکھ
کر) لو بیبیاں بھی آگئیں۔ (نیچے مخاطب ہوکر)
ہم بھی آتے ہیں۔ (پھر کر) ہمیں بلا رہی ہیں، چلئے
نیچے چلیں۔

نسیمہ (دائیں دروازے سے داخل ہوتی ہے، مجدی کے)
ہاں جان آپ کو بلا رہی ہیں۔ اپنے باغ کے پھول آپ
کو دکھائیں گی۔ لیے استنبول آگیا (اخبار کو لے کر)
مگر پڑھا تو جاتا نہیں۔ (لمپ جلانے کی کوشش
کرکے) آپ یہاں دق نہیں ہوتے۔

مجدی۔ ایک لطیف غروب کے وقت، آپ کے بہنوئی جیسے
پرانے دوست کے ساتھ بیٹھنے سے کوئی دق ہو سکتا
ہے (اتنے میں داہنے دروازے سے ہاتھ میں لیڈیز
کی چھتری لئے بہیجہ اور ممدوح داخل ہوتے ہیں)

ممدوح (دو منٹ باتیں کر کے، مجدی سے) نیچے چل رہے ہیں؟

مجدی ۔ (نسیمہ کو اپنے جلائے ہوئے لیمپ کی روشنی میں اخبار
کے پڑھنے میں مشغول، اور بہیجہ کو غمگین اور اداس
ایک کرسی پر پڑا دیکھ کر) ابھی آیا، آپ چلئے (ممدوح
جاتا ہے ۔ مجدی بہیجہ کے قریب جا کر چھوٹی میز سے
ٹیک لگا کے کھڑا ہوتا ہے) آپ کو معلوم ہے کہ
میں نعیم بک کو کس قدر قابل مبارکباد خیال کرتا ہوں ۔
(بہیجہ کی تبسم آمیز اور استفسارانہ نظر کے جواب میں) نعیم بک
کو اور نیز اپنے کو ۔ نعیم بک ایک مردانہ دل، ایک بلند
حوصلہ سینہ رکھتا ہے ۔ ایسے انسان کے لئے آپ
ہی جیسی فوق العادت خوبیوں کی بیوی کی ضرورت
تھی ۔ بعض اوقات محض اتفاقاً ایسی چیزیں مہیا
ہو جاتی ہیں ۔ جو سالہاسال کی کوششوں سے بھی
حاصل نہیں ہو سکتیں ۔

بہیجہ ۔ (ہنس کر) یہ محض آپ کی لطف و عنایت ہے ورنہ
آپ نے محض اپنے حسن ظن سے جن باتوں کا مجھ میں
ہونا لازمی قرار دے دیا ہے ۔ یہ خیال نہ کر لیجئے کہ وہ مجھ میں
ضرور موجود ہیں ۔ کیونکہ جب ہم آپ کے ساتھ رہینگے
اور آپ اُن چیزوں کی پرچھائیں بھی مجھ میں نہ پائینگے
تو پھر آپ کو افسوس ہوگا ۔ اور یہ آپ پر ظلم ہوگا ۔ بر
عکس اس کے مجھے اپنے تئیں خوش قسمت خیال کرنا
چاہئے کہ میں اک ایسے خاندان میں آئی جس میں آپ
جیسے اعلیٰ قابلیت و اعلیٰ خصائل کے افراد شامل ہیں

مجدی ۔ مجھے اعتراف ہے کہ میں جب آیا تو مجھے امید نہ تھی
کہ میں اپنے تئیں ایسے ماحول میں پاؤں گا جو میرے خیالات
و افکار سے اس قدر موافق ہوگا ۔ (اور گویا وہ اسے سن
رہی ہے نسیمہ کی طرف متوجہ ہو کر) بالخصوص یہ معلوم کر کے
مجھے بے انتہا خوشی ہوئی کہ نسیمہ خانم کا تصویر کشی کا
شوق اور بڑھ گیا ہے ۔ اُن خوبصورت ممالک سے لوٹنے
کا جتنا مجھے افسوس تھا سب جاتا رہا ۔

بہیجہ ۔ ہماری وجہ سے جاتا رہا ۔ کس قدر مبالغہ ہے

انیقہ ۔ (داخل ہو کر) کھانا میز پر ہے ۔

نسیمہ ۔ لو بہن، ہم بھی ایسے بھولے کہ سیر سے آ کر سر کا رومال
بھی نہیں اتارا ۔

بہیجہ ۔ چلو ۔ جلدی چلو ۔ کھانے پر انتظار ہوگا ۔ (سب سے آگے
بہیجہ اُس کے بعد نسیمہ، سب سے پیچھے مجدی جاتے
ہیں)

(انیقہ تھوڑی دیر بالکونی میں رہتی ہے ۔ ایک میز پر امریکا کا
بنا ہوا بڑا لیمپ رکھا ہے اُسے جلاتی ہے ۔ آرام کرسیوں
اور کوچوں کے گدّوں اور تکیوں کو درست کرتی ہے، اخبار تہ
کر کے میز پر رکھتی ہے ۔ میز پر ممدوح کے سگرٹ کیس کو پڑا
پاتی ہے ۔ خوش ہو کر اُسے کھولتی ہے اور مسکراتی ہے ۔
چاروں طرف دیکھ کر جلدی جلدی سات آٹھ سگرٹ سگرٹ
کیس میں سے چرا کر اپنی جیب میں ڈال لیتی ہے پھر سگرٹ
کیس ہاتھ میں لے کر، اس میں سے ایک سگرٹ اور نکالتی
ہے ۔ اور دیا سلائی رگڑ کر سگرٹ جلاتی ہے اور بڑے مزے
لیکر سگرٹ کے کش کھینچتی ہے ۔ سگرٹ پیتی ہوئی پھر بالاخانے
پر جاتی ہے ۔ دیکھتی ہے کہ بتی اونچی ہو کر دھواں دینے لگی
ہے ۔ اسے نیچا کرتی ہے) ہائے بتی بڑھ گئی میں نے دیکھا ہی
نہیں (جھک کر سوفے کے تکیے اٹھاتی ہے) اُف یہ تو
لمپ کے دھوئیں سے سیاہ ہو گئے ۔ خانم دیکھیں گی تو

قیامت برپا کردیں گی۔ تکیوں کو اٹھا کر جھٹک کر جھاڑتی
ہے اور پھر اپنی جگہ رکھ دیتی ہے۔ اب اُس کا سگرٹ
ختم ہوجاتا ہے، اسے نیچے باغیچہ کی طرف پھینک دیتی ہے)
کھانا اب ختم ہوچکا ہوگا۔ (داہنے دروازے سے ذرا باہر جاتی
ہے، دس سیکنڈ کے بعد پھر لوٹ کر آتی ہے) ابھی کھا رہے
ہیں۔ اب آنے ہی کو ہیں۔

سنیحہ۔ (تھوڑی دیر بعد داخل ہوکر) انیقہ دیکھ جمال بی
کو ذرا میرے پاس بھیج دے۔

انیقہ۔ بہت اچھا (نکلتے ہوئے دیکھتی ہے کہ مجدی اور فرخندہ
ساتھ آرہے ہیں۔ اُن کے لئے راستہ دیتی ہے، وہ
داخل ہوتے ہیں، پھر نکلتے ہوئے نسیمہ و بہیجہ و ممدوح
کو ساتھ آتا دیکھتی ہے، اُن کے لئے بھی راستہ چھوڑتی
ہے، پھر جاتی ہے۔)

مجدی۔ آج رات آپ لوگوں کے ساتھ کھانا کھانے میں
جو لطف اُٹھایا ہے، اُس سے میں عرصے سے محروم
تھا۔ ہاں، یورپ، پیرس اچھے ہیں۔ حتیٰ کہ کہہ سکتا
ہوں کہ اعلیٰ ہیں۔ لیکن واقعہ یہ ہے کہ ابتدائے آفرینش
سے، روح انسان غربت و تنہائی سے اس قدر متنفر
ہوتی ہے کہ اچھے سے اچھے پُرلطف اشغال بھی اُسے
عالمِ غربت میں بے مزہ معلوم ہوتے ہیں۔

ممدوح۔ آپ ہمیں بہت یقین دلانے کی کوشش کر رہے ہیں۔

فرخندہ۔ بک، مجدی بک محض ہمیں خوش کرنے کے لئے
جو باتیں کہہ رہے تھے، آپ نے بے صبری سے انہیں
کاٹ دیا۔

مجدی۔ خوش کرنا، چاپلوسی، رشک کمو تو بجا ہے۔ مجھے
محض تصنع اور بناوٹ کی باتوں سے خوش کرنے کی کیا
ضرورت ہے۔ میرے دل میں جو آپ سب کی محبت اور
عزت ہے، اُس کے ہوتے ہوئے مجھے چاپلوسی اور تصنع کی
کیا حاجت ہے۔ اور کیا تصنع محبت سے بڑھ کر ہے۔
(ممدوح اُس کی طرف سگرٹ کیس بڑھاتا ہے، اُس
سے ایک سگرٹ لے کر، اور ممدوح کی جلائی ہوئی دیا
سلائی سے اپنا سگرٹ جلا کر، اور اُسے سلام کرکے
ایک طرف کو بیٹھ جاتا ہے، اور فرخندہ کو جو سنیحہ کے پاس
اور نسیمہ کو جو کھڑکی کے پاس سوفے پر دراز ہے اور بہیجہ
کو جو بالکونی کے دروازے میں کھڑی ہے، اور ممدوح
کو جو ایک جھولنے والی آرام کرسی میں بیٹھا جھول رہا ہے
مخاطب کرکے اور اُن پر نظر ڈال کے) نہیں میں آپ
کو یقین دلاتا ہوں یہ محض چاپلوسی نہیں شکرِ نعمت ہے
اپنے قلب یا زیادہ صحیح یہ ہے کہ اپنی روح، اپنی ذات
کی تسلی اور فریضۂ منت ادا کرنے کو کہہ رہا تھا۔ جو کچھ
کہہ رہا تھا۔ میں، حقیقت یہ ہے کہ اس وقت تک
اپنے تئیں اس قدر مستحقِ محبت و شفقت نہ سمجھتا تھا
آہ! آپ کو کیا معلوم جب میں یہاں سے پیرس گیا
تھا۔ ایسا مایوس دل لے کر گیا تھا کہ لوگوں سے نفرت
کرتا ہوا گیا تھا۔ لیکن تین سال ایک غیر ملک میں، ایک
غیر قوم میں رہ کر جو اپنی ہر حرکت، ہر حالت سے مجھے یہ
جتاتے تھے کہ میں اُن میں کا نہیں، اور اُن میں زندگی
بسر کرتے وقت میں ہر روز ہزاروں علامتیں اس کی
پاتا تھا کہ میں تنہا ہوں اور اُن سے علیحدہ ہوں۔ آج
اپنے ملک، اپنے خاندان میں پاکر جس کے کل افراد

اپنے خیالات اپنے حرکات وسکنات سے یہ ظاہر
کرتے ہیں کہ میں ویسا ہی ہوں۔ جیسے وہ ہیں اور
وہ ویسے ہی ہیں جیسا میں ہوں۔ آج اپنے تئیں ان
میں پاکر میں وہ رقتِ قلب محسوس کرتا ہوں کہ بے تہا
آنکھیں نم آلود ہو جاتی ہیں۔
(سنبیحہ اتنے میں داخل ہوتی ہے اور جمال سے کہتی
ہے۔ جمال ذرا آؤ دیکھوں تم نے مجدی بک کے
لئے کمرہ کیسا درست کیا ہے۔ کیا کیا ہے۔)

جمال بی۔ بہت اچھا، تشریف لے چلئے (بائیں جانب
سے دونوں جاتی ہیں)

ممدوح (قہوہ کی پیالی کے آخری قطرے کو پی کر، اور پیالی
کو پاس کی میز پر رکھ کر) فرخندہ! فرخندہ ذرا ہمیں پیانو
نہیں سناتیں؟

فرخندہ (ہنس کر اور پھر بیٹھ کر) کیا آپ مجھے پیانو کا ایسا
استاد سمجھتے ہیں کہ میں مجدی بک کے سامنے پیانو
بجانے کی جسارت کروں۔ جو تین سال تک پیرس
میں رہ کر اور اپنے موسیقی کے شوق کی وجہ سے نہ
معلوم کیسی نادر محفلوں میں شریک ہو کر آئے ہیں۔

مجدی۔ اوہو، تم نے اظہار استغنا و انکار کے لئے محض
بہانہ تو نہیں ڈھونڈا۔ بیشک میں یہ تو نہ کہوں گا کہ پیرس
کے سہ سالہ قیام میں میں اپنا زیادہ وقت وہاں کے
استادانِ موسیقی کے کمال کے دیکھنے میں نہیں گذارا۔ مگر
یقین مانئے کہ وہاں کے کمال کو دیکھ کر میں اپنے ملک کے
لئے ہر وقت یہی تمنا کرتا تھا کہ کاش ہمارا ملک بھی اسی
کی طرح اہم ترقی پر پہنچے۔ اور یہ بھی یقین مانئے کہ یہاں

کی مشکلات اور بے پروائی کے محیط میں رہ کر کسی ترک
خانم کا موسیقی کی آرزو کرنا اور اس آرزو کو قوت سے
فعل میں لانا مجھے رہینِ منت و مسرت کرتا ہے۔
آپ نہیں جان سکتیں کہ موسیقی سے محروم رہ کر،
ہم کن بڑی خوشیوں اور کن محاسن سے محروم رہتے
ہیں۔

ممدوح۔ میں اس معاملے میں آپ کا ہم فکر ہوں۔ واقعہ یہ
ہے کہ اگر میں نہ ہوتا، اور یہاں میری جگہ کوئی اور ہوتا
تو جو پیانو آج آپ کو کھلا نظر آرہا ہے وہ بند نظر آتا۔

مجدی۔ بے شک وہی ہوتا جو ہمارے اور گھروں کے پیانوؤں
کا حال ہے۔ اور پھر یہ اُن کی کتنی بڑی عنایت ہے
کہ آپ کی خاطر وہ پیانو کھولتی ہیں۔ موسیقی سننے اور سنانے
ہی کے لئے پیدا ہوئی ہے۔ ورنہ تنہا گانے سے کوئی
لطف نہیں آتا۔ اور اگر آتا ہے تو وہ اس کے مقابلے
میں کس قدر حقیر ہے جو کسی کو سنانے سے آتا ہے۔
حال آنکہ ہماری زندگی ایسی ہے کہ چاہے کوئی دلدادۂ
موسیقی ہو یا اس سے بے پروا وہ کسے موسیقی سنائے
اس کے نکات کون سمجھے گا۔ اور کہاں سننے اور
سمجھنے کے لئے جائیں۔

فرخندہ۔ بیشک، اور انسان، وہی چیز ہمیشہ انہیں
آدمیوں کو سناتے سناتے تھک جاتا ہے۔

مجدی۔ میری درخواست معلوم نہیں قبول ہوگی کہ نہیں
میں چونکہ نیا آیا ہوں، لہٰذا میرے نئے پن کی خاطر،
مجھے امید ہے کہ آپ سنانے سے گریز نہ کریں گی۔

فرخندہ (ہنس کر کھڑی ہوتی ہے۔) اگر آپ کے سامنے

کچھ سناؤں بھی تو بہیجہ خانم سے پہلے اس کی جسارت نہیں
کرسکتی۔
بہیجہ (جو نسیمہ سے باتیں کر رہی ہے، اپنا نام سُن کر)
کیا کہا بہن۔
ممدوح۔ ضرور، بہیجہ خانم، یقیناً فرخندہ خانم سے بہتر
پیانو بجاتی ہونگی۔ ایسی حالت میں بقول فرانس
والوں کے، جو سب سے قابل ہو وہ سب سے پہلے
آئے۔ اس وقت کے جلسے میں سب سے پہلے
لطفاً آپ کو آنا چاہیئے۔
بہیجہ (اُٹھ کر) توبہ توبہ۔ مگر چونکہ آپ حکم دیتے ہیں لہذا
تعمیل ضروری ہے۔ (پیانو کے پاس جاتی ہے۔ مجدی
دوڑ کر موم بتیاں جلاتا ہے۔ تسلیم (بیٹھتی ہے اور
ہاتھ کے اشارے سے سلام کرتی ہے، پھر لوٹ کے
اور ہنس کے) میں نہیں جانتی کیا شروع کروں۔ آپ
کی کیا فرمائش ہے۔
ممدوح (مجدی سے) ہاں بتائیے، آپ کیا سننا
چاہتے ہیں؟
(مجدی فرمائش کرتا ہے۔ بہیجہ گانے کے نوٹ کے
اوراق الٹ پلٹ کر کے انتخاب کرتی ہے اور شروع
کرتی ہے
مجدی اُس کے کمال سے متعجب ہوتا ہے،
اور زبانِ حال سے گویا یہ کہتا ہوا کہ کتنا اچھا گاتی ہے
ممدوح کے پاس جاتا ہے۔ دونوں بالکونی میں کھڑے
ہوتے ہیں۔ فرخندہ اور نسیمہ بھی وہاں ہیں۔ تھوڑی
دیر موسیقی، مجدی دروازے میں کھڑے ہو کر اور

استغراق سے سن کر) آہ یہ کس روحِ نالاں کا نالۂ دلکش
ہے۔ کیوں ممدوح بک؟
ممدوح۔ اس میں کس شبہ کی گنجائش ہے؟ لیکن
مصنف کی پُرغم زندگی سے بڑھ کر کوئی زندگی پیش
بھی نہیں کی جاسکتی۔
مجدی۔ آہ اس گانے میں اک پُراز فریاد و پُراز شکوہ و
شکایت عورت کی جگر دوز لطافت و نزاکت ہے۔
(فرخندہ، ہنستی ہوئی بالاخانے سے ممدوح کو
بلاتی ہے۔ مجدی اب کمرے میں تنہا رہ جاتا ہے
پیانو کے قریب مفتونانہ جاکر، بہیجہ کے پیچھے کھڑا
ہوتا ہے، پیانو ختم ہوتے ہی) میں آپ کو دلی
مبارکباد دیتا ہوں۔ آپ نے کس قدر استادانہ
بجایا ہے، کیسی کامیابی سے، عدیم المثال
اور عدیم النظیر کامیابی کے ساتھ آپ بجا رہی تھیں یا
مجھ پر حالتِ غشی طاری ہوگئی۔
بہیجہ۔ معلوم ہوتا ہے آپ موسیقی کے عاشق ہیں۔
مجدی۔ دیوانہ وار عاشق۔ اس ۳۲ سالہ زندگی میں میں
نے جس حرارت سے موسیقی کو چاہا کسی چیز کو نہ
چاہا۔ خاص کر اور جس چیز کو چاہا ہوں اُس سے سینکڑوں
ظلم و ستم کی توقع رکھو، لیکن موسیقی تمہیں لطف
ولطافت کے سوا اور کچھ نہیں دیتی۔
ممدوح۔ ہاں ذرا وہ چیز سناؤ جو تم نے پچھلے دنوں سنائی
تھی۔ اُف کس غضب کی ہے۔
مجدی۔ ذرا شروع کرنے سے پہلے میرا نغمہ سن لو۔ پیرس
گئے ہوئے، مجھے ایک ہی ہفتہ ہوا ہے۔ ایک

احمق فرانسیسی جنہیں ہمارے حال سے واقف ہونے کا دعوے تھا۔ میرے عشقِ موسیقی کو دیکھ کر مجھ سے کہتے تھے۔ میں دیکھتا ہوں مشرق میں موسیقی نے بہت ترقی کی ہے۔ میں نے کہا آپ نے کاہے سے جانا؟" بولے۔ "آپ کی موسیقی کی واقفیت سے!"

اُس بیچارے کو کیا معلوم کہ کتنی مشکلات، اور کتنی سیاحتوں کے بعد مجھے یہ واقفیت حاصل ہوئی تھی۔ اُسے کیا معلوم کہ ہمارے اوپیرا ہمارے تھیٹر، اٹلی اور فرانس کے دوسرے تیسرے درجے کے تھیٹر اور اوپراؤں کی محض نقل ہیں۔ آپ ہی سوچئے اس محیط میں پل کر میں موسیقی کے عشق میں کہاں کہاں گیا۔ یورپ میں، قطبِ شمالی یا قطبِ جنوبی کی سیاحت کو جانے والے اور ناکام واپس آنے والوں کو تمغے اور انعام ملتے ہیں۔ میری سیاحت، اور موسیقی کا تعاقب، کچھ ان سیاحوں سے کم نہیں۔

(سب ہنستے ہیں۔ بہیجہ نوٹوں کے اوراق کو الٹ پلٹ کر کے، ایک کو انتخاب کرتی ہے اور بجانا شروع کرتی ہے، ممدوح اور فرخندہ پھر ہاتھ میں ہاتھ ڈالے، بالکونی میں آ جاتے ہیں۔ پیانو کے پاس مجدی اور بہیجہ تنہا رہ جاتے ہیں۔ بہیجہ پیانو کو بجاتے وقت دزدیدہ نظروں سے مجدی کو دیکھتی ہے، وہ بھی اک نگاہِ تدقیق سے اُس کے پاؤں اور چہرے اور جسم پر نظر ڈالتا ہے اور اُس کی نظروں میں ایک اندازِ مفتونیت پیدا ہوتا ہے۔ عین اُس لمحے میں ان کی نظریں دوچار ہوتی ہیں۔ ایک کی نظر میں آتشِ مفتونیت، دوسری کی نگاہ میں اول حیرت اُس کے بعد ممنونیت دکھائی دیتی ہے۔ بہیجہ اس نظر کی معنائے مفتونیت سے خوش ہو کر، مگر تھوڑا سا کانپ کر پیانو کے بجانے میں تھوڑا سا رکتی ہے۔ اتنے میں فرخندہ اور ممدوح بالکونی کے اندر گھس کے مجدی کی طرف جاتے ہیں)

(پردہ گرتا ہے)

باقی

سجاد حیدر یلدرم

تم کہاں سے آ رہے ہو؟

مشرق سے

تم کہاں کو جا رہے ہو؟

مغرب کو

تم کس کی تلاش میں ہو؟

کھوئے ہوئے کی تلاش میں

اُسے تم کہاں پاؤ گے؟

مرکز میں!

عالمِ افسردگی

(۱)

پھیکی پھیکی ہیں چاندنی راتیں ۔۔۔ اب کہاں وہ شباب کی باتیں
بادۂ حسن سے سحر محروم ۔۔۔ میگساری سے ہے نظر محروم
اب وہ رنگینیاں چمن میں نہیں ۔۔۔ نزہتیں لالہ و سمن میں نہیں
شام نا آشنائے مدہوشی ۔۔۔ آہ! وہ دورِ خود فراموشی!
کیف دل میں نظر میں نور نہیں ۔۔۔ پی رہا ہوں مگر سرور نہیں
روح میں لرزشِ حیات نہیں ۔۔۔ اب تو مے میں بھی کوئی بات نہیں

لطف باقی رہا نہ جینے میں
دل ہی بے حس پڑا ہے سینے میں

(۲)

آہ! وہ دن اور آہ! وہ راتیں!! ۔۔۔ سب جوانی کی تھیں کراماتیں
اب وہ بے تابیٔ شباب کہاں! ۔۔۔ آتشِ شوقِ بے حساب کہاں!
حسن ہی حسن جلوہ فرما تھا ۔۔۔ عشق ہی عشق نغمہ پیرا تھا
مری ہر سانس اک فسانۂ حسن ۔۔۔ بزمِ ہستی نگار خانۂ حسن
جلوۂ حسن غیر فانی سا ۔۔۔ نغمۂ عشق جاودانی سا
شادمانی ہی شادمانی تھی ۔۔۔ کیا حقیقت نما کہانی تھی!
دل، کہ تھا حشر گاہِ جوش و خروش ۔۔۔ تابشِ صد شرار در آغوش
آخرِ کار چاک چاک ہوا ۔۔۔ بجھ گیا اور بجھ کے خاک ہوا
بے قراری نہ آہ و زاری ہے ۔۔۔ ایک افسردگی سی طاری ہے

کھویا کھویا سا پھر رہا ہوں میں
گویا صحرا میں لٹ گیا ہوں میں

اثر صہبائی

سُسرے کا پُرسا

اب سے دُور مرزا کی جھم جھم کی سانجھن بڑی ماندی پڑیں۔ چلے کے اٹھواٹے دو اٹھواٹے بعد ہی دودھ پلیا بچہ
ہٹ چکا تھا۔ اجاپے کے روگ نگوڑے ایسے تو ہوتے ہی ہیں کہ ادھر آئیں ادھر جائیں۔ ایک جوگ ہوجاتا ہے۔ ایسی ہی کوئی بھاگ
بھری ہوتی ہوگی جو ہاتھ پیروں کی سلامتی سے پلنگ کو لات مار کر کھڑی ہوجائے۔ نہیں تو اسی روں روں میں جگ گزر جاتے ہیں۔
ٹہی سے چپڑ الگ کے رہ گیا سالنوں کا شمار تھا۔ کہ باوا کی سناؤنی آئی۔ میاں نے ساس سسرال والوں نے کہا بستم بستم دلہن بیگم کے
کانوں میں اس کی بھنک بھی نہ پڑے نہیں تو دشمن بھٹکا بھی نہیں کھائینگے۔ مرزا چپکے چپکے سفر کی تیاری کر بہانہ بنا گھر سے نکلا۔ مرزا کے سسر
اللہ جنت نصیب کرے ایک ریاست کے رکن تھے۔ اور وہاں کے سرداروں میں ان کا شمار۔ ولایت کے تعلیم یافتہ۔ بڑے ہنسوڑ
اور بلبل ہزار داستان۔ مرزا کی خوشدامن رنواس میں بیری ہوئی تھیں اور مہارانی کی ناک کا بال تھیں۔ مہارانی بے اولادی تھیں۔ بچوں
کی پروانہ۔ انہوں نے اپنی لڑکی کا ہاتھ مرتے وقت مہارانی کے ہاتھ میں دیا۔ اور چل بسیں۔ مہارانی نے بڑے ناز ونعمت سے اس
لڑکی کو پالا اور مرزا سے بیاہ دیا۔ مرزا کو کوئی سروکار اپنے خسرے سے نہ تھا جو کچھ تھے وہ مہاراجہ اور مہارانی۔ اب جو سسرے کی سناؤنی
آئی بیٹھ ریل میں روانہ ہوا۔ یہ مشہور ہوگیا تھا کہ انہوں نے نکاح کر لیا ہے۔ بڈھے تو تھے نہیں۔ اچھے خاصے کڑ بڑے تھے۔
کہاں تک رنڈوے بیٹھے رہتے۔ بیٹھتے بھی۔ تو ملنے جلنے والے کاہے کو بیٹھنے دیتے۔ دو ہزار کی تنخواہ۔ ہزار بارہ سو ماہوار کی املاک۔
بل بل کرکے لوگ بیٹیاں دینے کو تیار۔ لڑکی ملی صورت شکل کی اچھی۔ چاروں علم تحصیلے ہوئے۔ عربی۔ فارسی، اردو اور انگریزی میں
تو فراٹے بھرے۔ لیکن ایسی گھڑی گرہ بندھی سے دے کر کے وہ بیمار پڑے نو برس کھٹیا کاٹی۔ آدمی تھے سمجھدار سوچے کہ کیوں
اپنے ساتھ ایک جان جوان برباد کی۔ بیوی کو سمجھایا۔ وہ بھی پڑھی لکھی فہمدار خلع پر راضی ہوگئی۔ یہ سب کاروائی اندر خانے
ہوئی۔ اور کسی کے فرشتوں کو خبر نہ ہوئی۔ اُس کا نکاح اپنے منشی سے چپ چپاتے کر۔ اپنے ہی پاس رہنے دیا۔ اس سے ایک
لڑکا ہوا۔ سب نے سردار صاحب کو بیٹے کی مبارکباد دی اور ان کے جیتے جی کسی پر بھی یہ بھید نہ کھلا۔ جاڑوں کا موسم مہاوٹوں
کا زمانہ۔ مرزا کوئی چار بجے صبح اندھیرے منہ محلے پر پہنچا۔ وہ ٹھنڈی ہوا برف سے نکل کر آرہی معلوم ہوتا تھا جاڑے کا پیٹ
پھٹ گیا ہے۔ گھٹا ٹوپ چھائی ہوئی۔ مینہ موسلا دھار۔ بجلی کے اب چمک کے پھر نہ چمکوں۔ بادل کہیں اب گرج کے پھر
نہ گرجیں۔ مرزا اوپر تلے اناپ شناپ بارہ تیرہ کپڑے پہنے اس پر بھی دانت بجتے سُو سُو کرتا۔ بیٹھ سواری میں کوٹھی پر پہنچا۔ سارے
خدمتگار اپنے اپنے کونوں کھدروں میں دبکے پڑے۔ اتر۔ برآمدے میں پڑی کرسی پر بیٹھ گیا۔ لگا دن نکلنے کا انتظار کرنے۔
اور سوچنے کہ الہٰی سسرے کو کیا یاد کر کے روؤں۔ سب اپنے پیارے یاد کئے کہ ذرا جی بھر آوے۔ حضرت امام حسینؑ کی

مصیبت کو یاد کیا کہ کچھ تو آنکھ ڈبڈبائے۔ لیکن مارے سردی کے آنسو ایسے جم کر ٹھوس ہوئے کہ ذرا ٹپکنے کا نام نہ لیں۔ کرسی پر بیٹھا پہلو بدلتا بسکوٹ کھاتا رہا۔ کبھی جی میں کہتا کہ کم بخت کوئی ایسا بڈھا ڈھا تو رہی جس کو برصبح ہوتے سردی سے ٹھسکا لگے یا ڈھون ڈھون کرے۔ بچّے کو بھی کیا بام بھون کے بادل بھگے کھلائے ہیں کہ نہ تو نہا کے بھگوئے نہ کپڑے گیلے کرکے کلبلائے اور بے چین ہو کے روئے۔ اللہ اللہ کرکے بچے کے رونے کی آواز آئی۔ اور آدمیوں کی بیرچال سنائی دی۔ مرزا نے دستک دی۔ گول کمرہ کھلا۔ اور مرزا اندر داخل ہوا۔ دیوان پر ایک طرف کو بیٹھ گیا۔ لگا انتظار کرنے کہ ساس اب بلائیں جب بلائیں کوئی ڈیڑھ دو گھنٹے کے بعد مغلانی نے آکر کہا۔ بیگم صاحب یاد فرماتی ہیں۔ مرزا نے اتنے میں جلدی جلدی خوب آنکھیں مل لال کیں اور خوب ناک کو مل دل سرخ کر لیا۔ اور یہ خیال کر کے دنیا کیا کہے گی کہ سسرے کے لئے دو آنسو بھی نہ گرائے۔ رومال آنکھوں پر رکھ رونے کی آواز نکالتا ہو ہو کرتا۔ رستے کو آنکھوں پر رکھے ہوئے رومال کے نیچے سے دیکھتا خوابگاہ میں سے ہوتا ہوا۔ سنگار خانے میں داخل ہوا۔ دیکھا ایک اونچے تخت پر سفید سوزنی بچھی ہے۔ اس پر ساس بیٹھی ہوئیں۔ کوئی چھتیس سنتائیس برس کا سن۔ رنگ گورا بھبوکا۔ سفید ململ کی کالی کنّی کی ساڑھی بندھی۔ موم کی بتی معلوم ہو رہی تھیں۔ مرزا نے سامنے جا کر بہتیرا گلا پھاڑا اور ہو ہو کی۔ لیکن وہ ذرا اپنی جگہ سے ٹس سے مس نہ ہوئیں، اور ایک آنسو نہ ٹپکایا اور ساکت بیٹھی رہیں۔ اب مرزا گیا کہ الٰہی اس سانگ کو کیونکر ختم کرے۔ آخر سسکیاں لیتے لیتے تھوڑی دیر میں سکوت اختیار کیا لیکن آنکھوں پر سے رومال ہٹانے کی ہمّت نہ ہوئی کہ سارا بھانڈا کھُل جائے گا۔ یہ بھی آخر کب تک۔ ناشتہ انگریزی آیا۔ جاڑوں کی لمبی راتیں۔ مرزا بھوک کا کچا۔ اور سردیوں میں بھوک ویسے بھی کھُل جاتی ہے۔ لیکن یہ سوچ کہ ایک تو سسرال دوسرے آیا تعزیت کے لئے۔ اگر ناشتہ اچھی طرح کیا تو دس دیکھتے کیا کہینگے کہ داماد ہو کے سسرے کا ذرا رنج نہیں۔ اُدھر ساس کی صلاح کی کہ آپ بھی شریک ہو جیئے۔ انہوں نے کہا کہ میں نے نفس کشی شروع کی ہے۔ ایک ذرا سا ٹکڑا جوار کی روٹی کا کھا لیتی ہوں۔ مرزا نے کہا کہ آپ کھائیں گی نہیں تو رونے کی طاقت کہاں سے آئیگی۔ آدمی اَن کا کیڑا ہے۔ نہ کھائے تو کمزور ہو جائے۔ اور کمزور سے رویا کیا خاک جائے۔ وہ بولیں اے ہے جبھی تو میں بھی کہوں کہ الٰہی مجھے رونا کیوں نہیں آتا۔ بچوں کھاؤں گی نہیں تو رونے کا دم کہاں رہیگا۔ مرزا نے کہا کہ ہمارے ہاں ایک مغلانی تھیں کلّو خانم۔ آل نہ اولاد۔ وہ اور ایک انکے بڑے میاں۔ مزاج کے کھُردرے ہر وقت کی لکا فضیحتی۔ غرض ساری عمر یونہی جوتیوں میں دال بٹی۔ بڑے بیمار اور کوئی برس بھر جورو سے لی خدمت۔ بیچاری کھنڈ لیاں رگڑتے اور کپڑے دھوتے عاجز آگئی۔ آخر کو ایک سادانی سی ہو گئی۔ ایک دو دن کی بیماری ہو تو خیر بہتیری آدمی ٹلّے نویسی کرے۔ سال کے بارہ مہینے کون پٹی پکڑ کے بیٹھے۔ کلّو خانم کا جی چاہا ایک دن کھبر کو۔ خصم کی بھی الٹ پلٹ کرتی جاتی اور کھبر بھی گھونٹتی جاتی جب کھبر گھٹ گھٹا ہوئی تیار سا در چاہیں کہ چولھے پر سے اتاریں ہچکی کی آواز آئی۔ دوڑی ہوئی درے میں گئیں۔ دیکھیں تو بڑے میاں کے دیدے کھلے کے کھلے۔ اور سانس ندارد۔ کہنے لگیں دوئی خدا کی مار کیا بیری مردوا ہے۔ نگوڑا عمر بھر خوشی بہری نہ دیکھ سکا آج ذرا کھبر کو جی چاہا تھا تو موئے کو ابھی مرنا تھا۔ کم بخت کی جان جو ابھی سے پیٹتی ہوں ہمسائیاں پل کے جان پر آ سوار ہونگی۔ سارے دن کی میں بھوکی رو دیا کس خندی سے جائے گا۔ ادھر کھبر کتے کیوں چھوڑنے لگے۔ کونسے اس ہنڈی کے سگے ہیں آ بورچی خانے

میں نکال غوری میں کھیر جلتی گرم لگیں جھپا جھپ اڑانے ۔ ہنڈیا ڈوئی ۔ غوری سب چاٹ چوٹ صاف کی ۔ جھجری میں سے بھر کٹورا پانی پیا ۔ اب چپکے سے مردے پاس آئی ۔ ڈھاٹا باندھا آنکھیں جوں توں بند کیں ۔ سب کاموں سے فارغ ہو ۔ وہ کلیجہ پھاڑ کے دہاڑیں کہ سارے ۔ محلے والے ٹوٹ پڑے ۔ وہ پیٹیں وہ چیخیں کہ اوسانوں میں آنا مشکل ہو گیا ۔ جوں جوں ہمسائیاں صبر کی تلقین کرتیں ۔ یہ اور بچھنیاں کھاتیں ۔ اور کسی طرح سامانوں میں نہ آتیں ۔ ہمیشہ کہا کرتی تھیں کہ آنکھیں روتیں اور جی ہنستا تھا ۔ کولنا موئے سے کسی نے دیکھا تھا جو روتی ۔ سوکن رونے میں چلی اور گز کا گھونگھٹ کاڑھ گھونگھٹ روئے من ہنسے میرا جیوڑا کرے کلیل ۔ نفاست کے مرنے سے ہیں جنتیوں میں آگئی ۔ یہ قصہ مرزا نے ختم ہی کیا تھا کہ مرزا کے خسر کی چچی جو اس ریاست کے سب سے بڑے جاگیردار کی بہو تھیں ۔ وہ کہنے لگیں میاں تم نے تو ایک قصہ سنایا اب ایک واقعہ اس بندی کا بھی سن لو ۔ میرے خسر بڑے نواب صاحب بیمار پڑے اور ایک دن تو ایسی حالت ہوئی کہ سانسوں پر شمار ہو گیا ۔ آخر دونوں وقت ملتے ۔ ادھر چراغ میں بتی بڑھی ادھر پٹ سے ان کا دم نکلا ۔ ہم تین دیورانیاں جٹھانیاں تھیں ۔ اور آپس میں بڑا اخلاص پیار ۔ چاہیں کہ ہم آواز نکالیں ۔ ہماری خوشدامن نے ایسی ہنکار سنائی کہ ہم تینوں بہوئیں دم بخود ہو کے رہ گئیاں ۔ اور انہوں نے جھٹ پاوا جان پر دوشالہ ڈال خود مودی خانے میں جا ۔ جلدی سے روا نکالا ۔ گھی لیا ۔ روا بھون ۔ قند ڈال ۔ کٹا ہوا میوہ ملا ۔ ہریرہ بنایا ۔ اور نکال باد یئے میں غٹ غٹ چڑھا گئیں ۔ ہم یہ سب ان کے کرتب سمجھ گئے ۔ انکی بہوؤں میں میں سب سے چھوٹی تھی میں نے اپنی جٹھانیوں سے کہا ۔ کہ دیکھا بڑا صیلا کو اب یہ اپنا منہ تازہ کر فیل مچائیگی ۔ چلو ہم بھی تیار ہو جائیں ۔ ہم تینوں ہوا کی طرح باورچی خانے میں پہنچے ۔ قورمے کی پتیلی بچی بچی تیار ۔ اور اٹھارہ روٹیوں کی ٹوکری ۔ کوٹھڑی میں گھس گئے ۔ نکال بوٹے کے بوٹے اور ایک ایک روٹی کا ایک ایک نوالہ اور دو دو نوالے بنا اتارنے شروع کئے ۔ جھجری رکھ لی پاس ۔ بھر بھر کٹورے پانی کے پاس دھرے ۔ مارے جلدی کے نوالہ حلق میں پھنسے تو پانی کے گھونٹ سے اتار لیں ۔ غرض خوب پیٹ بھر کر کھانا کھایا اور کواڑ کی آڑ میں سے اپنی ساس کو بھی دیکھتے جائیں ۔ انہوں نے ہریرہ ختم کر کے ایک پانی کا کٹورا بھر پیا ۔ اور چار پان کا بنا بیڑا جلدی جلدی اسے چبانا شروع کیا ۔ جب وہ جبڑے کے قابو میں آگیا ۔ کلہ تازہ کر ۔ ایک دم ایسی چیخ کر آواز نکالی کہ ہے ہے لوگو! وہ بندی بیوہ ہو گئی ۔ ہے ہے اس بندی کا سرتاج ۔ ہے ہے وہ بندی لٹ گئی ۔ اور دھڑا دھڑ مارنے شروع کئے منہ تکیوں پہ ہاتھ ۔ ہمارے منہ روٹیوں پہ اور آنکھیں ان پر تھیں ۔ ہم اپنے کام سے فارغ ہو چکے تھے ۔ ریلا کر ایک پر ایک گرتی تینوں جنیاں پہلے کوٹھڑی کے کیواڑوں پر دھڑ دھڑ گریاں کہ کنڈی خوب بجی اس کے بعد چیختے دہاڑتے گاؤ تکیے پر وہ ہاتھ لدمار کر رھے اور وہ بیان کئے ۔ ادھر ہماری ساس ادھر ہم ۔ ان کا تو بنا ہریرہ ہو گیا جلد ہضم اور ہماری روٹیاں بوٹیاں رہی قائم ۔ وہ تو گھنٹے دو گھنٹے میں ہی ہو بلکان تولہ ہو پڑ گئیں ۔ اور ہم تینوں وہ رات بھر بیان کرتے رہے کہ سارے شہر میں واہ واہ ہو گئی کہ بہوئیں ہوں تو سردار الملک کی جیسی ۔ اور سسرے کو دیں تو اس طرح کہ بیٹیاں بھی صدقے کی تھیں ۔ انہوں نے یہ سارا قصہ اس مزے سے سنایا کہ ہنسی ضبط نہ ہو سکی ۔ اور اس بناوٹی غم کے بعد جو پیٹ میں گدگدیا

ہو ہنسی کا سب کو دورہ پڑا تو ہنستے ہنستے پیٹ میں بل پڑ گئے۔ اور قہقہوں کی آواز خوابگاہ سے نکل کر کوٹھی کے باغ میں اور وہاں سے شاہراہ پر پہنچی۔ مرزا بچارے کو خیال ہؤا کہ اگر رئیس کو اس کی اطلاع ہوئی کہ سردار صاحب کا داماد جان جوان سوتیلی بیوہ ساس کے ساتھ ان قہقہوں چہچوں میں مصروف ہے تو غضب ہو جائیگا جوں جوں ہنسی کو ضبط کرتا اور بے قابو ہو کر ہنستا۔ ان ہنسی بدل لگیوں میں ناشتہ کھانا اس طرح ہؤا جیسے بیان ہو چکا۔ دوپہر کا کھانا بھی بات نباہنے کو نہ کھایا گیا۔ ہنسی سے بھوک اور کھلی کلیجہ ٹوٹا جارہا تھا۔ مرزا نے صبر کیا کہ خیر رئیس کے پاس جب جائیں گے تو چار کا وقت ہوگا۔ تیسرے پہر وہاں خوب شکم سیر ہو لیں گے۔ دو بجے مرزا کوٹھی سے سواری میں بیٹھ اپنے سسرے کے مقبرے گیا۔ یہ اپنی پہلی بیوی کے پاس آسودہ ہیں چاروں طرف ایک چھوٹی سی باغیچی ہے۔ بیچ میں ایک سنگ رُخام کا مجر ہے۔ مرزا نے فاتحہ دیں۔ مٹھائی تقسیم کی اور کوئی بچار کے عمل میں رئیس کے محل میں پہنچا۔ رئیس کو اطلاع ہوئی۔ وہ حمام میں تھے۔ چار بھجوائی۔ خوب میوہ اور کھانے کا سامان چاندی کی کشتیوں میں لگ کر آیا۔ اس وقت جس قدر درباری امیر اور مصاحب رئیس کے تھے وہ مرزا سے ہمدردی کر رہے تھے اور اس کے سسرے کے اخلاقوں کی تعریف اور رئیس سے تعلقات بیان کر رہے تھے۔ ابھی مرزا نے چار کی پیالی اٹھا کر ایک گھونٹ بھی نہ لیا تھا۔ کہ ان میں سے ایک بولا اچھی طرح چار پیجئے تکلّف نہ فرمایئے۔ دوسرا بولا۔ کیا کھایا پیا جائے۔ جب انسان کو غم ہوتا ہے بھوک بند ہو جاتی ہے۔ کھایا کیا خاک جائے۔ سردار صاحب کے ہے۔ اور کون۔ یہی داماد ہی بیٹے۔ جتنا بھی رنج کریں تھوڑا۔ ایسی صورت میں کیا حلق سے اُترے گا بچارے کے۔ مرزا یہ باتیں سن کر دھم ہو گیا۔ اور بُردوں کی جان پر صبر کر کے آدھی پیالی سسک سسک کر پی۔ ہاتھ روک لیا۔ اور کشتیاں ویسے ہی اُٹھ چلدیں۔

آغا حیدر حسن (دہلوی)

فطرت اور انسان

شیکسپیر کا مشہور شعر ہے۔

Blow, blow. Thouwinter wind

Thouart not so unkind

As mans in gratitude

اس شعر کا بے ساختہ ترجمہ ہو گیا ہے اس پر چار اور موسموں کا اضافہ کر کے اصل سے مختلف حیثیت کی ایک نظم بنا دی ہے۔

چل اے ہوائے زمستاں! چل اور زوروں سے چل — تو سرد مہر ہے احباب سے زیادہ نہیں
جلا خوشی سے جلا آفتاب تابستاں! — کہ تجھ میں شائبۂ آتش عناد نہیں
برس میں بارش بے اعتبار! تجھ سے بتر — وہ دوست جن کی وفا پر کچھ اعتماد نہیں

نثار۔ باد خزاں! تیری بے ریائی پر — وہ جن کے ظاہر و باطن میں اتحاد نہیں
میں تیرا بندۂ احسان ہوں اے نسیم بہار! — کہ تو نے جو کئے احسان وہ تجھکو یاد نہیں
اسد بظاہر قدرت کی سادگی کی قسم — فریب خوردۂ اہل زمانہ شاد نہیں

اسد ملتانی

گریۂ حسرت

چھوڑ کر مجھ کو ہمیشہ کے لئے جاتے ہو کیوں؟
تم تو تھے آرامِ جاں پھر جاں کو تڑپاتے ہو کیوں؟

کیا مری قسمت، قیامت تک نہ پلٹا کھائے گی؟
کیا مجھے فرقت تمہاری عمر بھر تڑپائے گی؟

آہ! اِس دنیا میں راحت کا نشاں ملتا نہیں
اے مسرت! ہم کو تیرا آستاں ملتا نہیں

ہاں مگر امید سے روشن ہے ساری کائنات
ورنہ ظاہر ہے کہ کیا ہم اور ہماری کائنات

اِس فراقِ عارضی پر بے سبب روتے ہیں ہم
آہ کتنے بے خبر انجام سے ہوتے ہیں ہم

زندگی جب تک ہے اے جانِ حزیں غم کا گلہ؟
اِس زیاں خانے میں آکر بیش اور کم کا گلہ؟

آہ یہ تاریک، یہ منحوس گھر خالی مرا!
جانے والے! جا خدا حافظ، خدا والی ترا

اب ملیں گے ہم، تو مِل کر پھر جدا ہونگے نہ ہم
یوں جئیں گے ہم کہ جی کر پھر فنا ہونگے نہ ہم

حامد علی خاں

(یہ افسانہ سویڈن کی مشہور افسانہ نگار سلما لیگرلاف سے ماخوذ ہے جنہیں ۱۹۰۹ء میں ادبی قابلیت کی وجہ سے نوبل پرائز ملا۔)

ایک کسان نے ایک راہب کو مار ڈالا اور بھاگ کر جنگلوں میں چلا گیا۔ وہ باغی قرار دیا گیا اور اُس کے سر کے لئے انعام مقرر کیا گیا۔ جنگل میں اُسے ایک اور مجرم ملا۔ یہ ایک نوجوان ماہی گیر تھا جو کسی دور دراز جزیرے کا رہنے والا تھا۔ اُس پر مچھلیوں کا جال چرانے کا الزام تھا۔ دونوں ایک ساتھ رہنے لگے۔ ایک غار کو انہوں نے اپنا گھر بنا لیا۔ ایک جگہ کھانے پکانے لگے، اکٹھے سیر کو جانے لگے اور ایک دوسرے کی حفاظت کرنے لگے۔ کسان کبھی جنگل سے باہر نہ جاتا تھا لیکن ماہی گیر جس کا جرم بہت بڑا نہ تھا اپنی پیٹھ پر شکار لادکر گاؤں کے نواح میں بستی سے الگ تھلگ اور علیحدہ علیحدہ مکانوں تک ہو آیا کرتا تھا۔ سیاہ پہاڑی مرغ، چمکیلے پروں والی مرغیاں، ہرن اور لمبے لمبے کانوں والے خرگوش دے کر وہ لوگوں سے دودھ مکھن، تیروں کے پیکان اور کپڑے لے آیا کرتا اور ان چیزوں پر وہ دونوں گذر اوقات کرتے۔

وہ غار جس میں انہوں نے اپنا گھر بنایا تھا پہاڑ میں دور تک چلا گیا تھا۔ اُس کے منہ پر حفاظت کے لئے انہوں نے بڑی بڑی سلیں اور خاردار جھاڑیاں لگا دی تھیں۔ اوپر پہاڑ کی بلندی پر چیڑ کا ایک دیو پیکر درخت کھڑا تھا جس کی پیچ در پیچ جڑیں اُن کے آتش دان کے دھوئیں کو اپنے ساتھ لپٹا کر اونچی اونچی بھاری بھاری ٹہنیوں تک لے جاتی تھیں اور وہاں اُس کی سیاہی کو بہت کچھ جذب کر کے لوگوں کی نظروں سے چھپا کر ہوا میں ملا دیتی تھیں۔ اُن کے غار تک پہنچنے کے لئے اُس ندی کو عبور کرنا پڑتا تھا جو پہاڑ کی ڈھلوان سے یکا یک پھوٹ پڑی تھی۔ اُن کے تعاقب کرنے والوں کو کبھی خیال بھی نہ گزرا تھا کہ اس مسرور و نغمہ ریز آبجو کے اُدھر اوٹ میں اُن کا شکار رہے۔ اول اول اُن کی تلاش اس طرح کی گئی جیسے کسی وحشی درندے کی کی جاتی ہے۔ علاقے کے تمام کسان جمع ہو کر جنگل میں اس طرح پھرا کرتے جیسے وہ کسی بھیڑیے یا ریچھ کے شکار کے لئے نکلے ہیں۔ تیر کمان والے جنگل کو گھیر لیتے، اور برچھیوں والے جنگل کی جھاڑی جھاڑی اور پہاڑ کا کونا کونا چھان مارتے۔ دونوں باغی خوف کے مارے دبک کر اپنے تاریک غار میں بیٹھے رہتے، اور کانپ کانپ کر دشمنوں کا شور و غل اور نعرے سنا کرتے۔ حتیٰ کہ وہ اُن کے پاس سے گذر جاتے۔

ایک دفعہ کا ذکر ہے کہ دن بھر ماہی گیر بے حس و حرکت غار میں پڑا رہا، لیکن قاتل اس عذاب کو برداشت نہ کر سکا اور باہر نکل آیا، جہاں سے وہ اپنے دشمنوں کو دیکھ سکتا تھا۔ انہوں نے بھی اس کو دیکھ لیا۔ اور اس کے پیچھے دوڑے۔ لیکن وہ اس حالت

کو بزدلانہ خوف میں پڑے رہنے پر ہزار بار ترجیح دیتا تھا۔ وہ ندیوں کو پھاندتا۔ غاروں میں کودتا، پہاڑوں کی عمودی دیواروں پر چڑھتا اُن کے آگے آگے بھاگتا رہا۔ خطرے کے تازیانے کے نیچے اُس کی حیرت انگیز قوت اور چالاکی کیسر بیدار ہو گئی۔ اُس کے بدن میں فولاد کی کمانی جیسی لچک پیدا ہو گئی۔ اُس کا ہر قدم جم کر پڑتا تھا۔ اس کی ہر گرفت مضبوط ہوتی تھی۔ اُس کی آنکھیں اور کان پہلے سے دُگنے تیز ہو گئے تھے۔ وہ جھاڑیوں کے پیچھے دشمنوں کی ہلکی سے ہلکی سرگوشی کے معنی سمجھتا تھا ہر بڑے پتھر کی اوٹ اُسے مشتبہ معلوم ہوتی تھی۔

جب وہ دوڑتا ہوا کسی چوٹی کے اوپر پہنچ جاتا تو نیچے اپنے تعاقب کرنے والوں پر ایک نگاہ ڈالتا اور حقارت آمیز الفاظ سے ان کو پکارتا اور اپنی طرف بلاتا۔ جب اُن کی برچھیاں فضا میں تیرتی ہوئی اُس تک پہنچتیں تو وہ اُن کو پکڑ لیتا اور پھر اُنہیں کی طرف دے پھینکتا۔ جب وہ خاردار جھاڑیوں کو چیرتا ہوا اپنا راستہ بناتا تو کوئی اپنے اندر اس کو ایک مسرور اور آزاد نغمہ گاتا ہوا سنائی دیتا۔ پہاڑ کی ایک بے برگ و گیاہ چوٹی جنگل میں سے سر نکالے ہوئے کھڑی تھی اور اس کے عین اوپر چیڑ کا ایک نہایت بلند درخت تھا۔ اس کے بھورے سرخ تنے پر دور تک کوئی ٹہنی نہ تھی۔ چوٹی کے قریب پہنچ کر گھنی شاخوں میں ایک باز کا گھونسلا تھا۔ خونی ایسا بے خوف ہو گیا تھا کہ ایک دن وہ اس گھونسلے میں جا کر چھپ گیا۔ اور اُس کے تعاقب کرنے والے اُسے نیچے جنگلی گھاٹیوں میں ڈھونڈتے رہے۔ لوگ اُس کی تلاش میں شور و غل مچا رہے تھے اور وہ اوپر بیٹھا باز کے بچوں کی گردنیں مروڑ رہا تھا۔ بڑے پرندے غصے اور اضطراب میں چیخ چیخ کر اُس کے آس پاس چکر لگاتے تھے اور رہ رہ کر اس کے منہ کو نوچ لینا چاہتے تھے۔ وہ اپنی تیز چونچوں سے اس کی آنکھوں پر حملہ آور ہوتے، اپنے مضبوط بازوؤں سے اس کو تھپیڑ لگاتے اور اپنے پنجوں سے اس کے سخت موسم زدہ چمڑے کو بُری طرح زخمی کرتے۔ مگر خونی ہنس ہنس کر ان کے ساتھ لڑتا رہا۔ اس جنگ کی خوشی میں تعاقب کرنے والوں کا اسے خیال تک نہ رہا اور وہ یکایک کھڑے ہو کر اپنے خنجر سے پرندوں کا مقابلہ کرنے لگا۔ جب پھر اسے اپنے دشمنوں کا خیال آیا تو اُس نے مڑ کر دیکھا: لوگ کسی دوسری طرف نکل گئے تھے۔ تعاقب کرنے والوں میں سے کسی نے اس خوفناک بلندی کی طرف نگاہ نہ اٹھائی تھی۔ انہیں کیا خبر تھی کہ ایسے وقت میں جب کہ اُس کا پیمانۂ حیات چھلک جانے کے قریب ہے وہ خوشی کے نشے میں چور ایک طفلِ مکتب کی طرح پرندوں سے کھیل رہا ہے۔ لیکن اپنے آپ کو محفوظ پا کر بھی وہ سر سے پاؤں تک کانپ گیا۔ اُس نے اپنے لرزتے ہوئے ہاتھوں سے ایک شاخ کو پکڑا۔ اُس بلندی سے جہاں وہ نامعلوم طور پر چڑھ گیا تھا اُس نے چکراتے ہوئے سر کے ساتھ نیچے کی طرف نگاہ کی۔ کیا ہو اگر وہ یہاں سے گر جائے...... اگر پرندے اس کی آنکھیں نکال ڈالیں...... اگر اُس کے دشمن اسے دیکھ لیں؟ ہر ممکن اور ناممکن خطرے کے خیال سے مرعوب ہو کر وہ کانپتا ہوا درخت سے اتر آیا۔ وہ زمین پر چت لیٹ گیا اور پھسلنے پتھروں پر سے رینگتا ہوا پہاڑ سے نیچے آ رہا۔ یہاں وہ کمزور و ناتواں ہو کر چیڑ کے چھوٹے چھوٹے پودوں کی گھنی ہوئی شاخوں کی اوٹ میں نرم نرم گھاس پر لیٹ گیا۔ اُس وقت ایک اکیلا آدمی بھی اُس کو گرفتار کر سکتا تھا۔

x x x

ماہی گیر کا نام ٹارڈ تھا۔ اُس کی عمر سولہ سال تھی لیکن وہ خوب مضبوط اور دلیر تھا۔ اب اُسے جنگل میں رہتے پورا ایک سال ہو گیا تھا۔

کسان کا نام برگ تھا، اور لوگ اسے "جن" کہا کرتے تھے۔ وہ خوبصورت اور وجیہ تھا۔ سارے علاقے میں اُس کا ساقد آور اور مضبوط آدمی موجود نہ تھا اُس کا سینہ خوب کشادہ اور کمر چیتے کی طرح پتلی تھی۔ اُس کے ہاتھ خوبصورت اور نازک تھے۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ اُس نے کبھی کوئی سخت کام نہیں کیا۔ اُس کے بال بھورے تھے اور چہرے پر ایک ملاحت سی تھی۔ جب جنگل میں رہتے سہتے اُسے ایک عرصہ گزر گیا تو اُس کی صورت میں ایک رعب اور ہیبت پیدا ہو گئی۔ بھری ہوئی کشادہ پیشانی اور گھنی بھووں کے نیچے اُس کی آنکھوں میں دل کے اندر اتر جانے والی ایک تیزی پیدا ہو گئی۔ اُس کے ہونٹ اپنی جگہ پر پہلے سے بھی زیادہ مضبوطی کے ساتھ جمے ہوئے نظر آنے لگے۔ اس کے چہرے میں کنپٹیوں کے زیادہ گہرا ہو جانے کے باعث اور سختی پیدا ہو گئی اور اس کے رخساروں کی ہڈیاں نمایاں طور پر باہر نکل آئیں۔ اس کے تمام عضلات جسم کی نرمی مفقود ہو گئی لیکن مسکے پٹھے فولاد کی طرح مضبوط ہو گئے۔

ٹارڈ نے ایسا شاندار اور طاقتور انسان اور کوئی نہ دیکھا تھا۔ اُسے برگ کے قامت میں کوہ کی بلندی اور جسم میں طوفان کی طاقت نظر آتی تھی۔ وہ ایک مالک اور آقا کی طرح اُس کی خدمت کرتا۔ اور ایک دیوتا کی طرح اُسے معزز جانتا تھا۔ شکار میں وہی برچھی بھالے اٹھا کر چلتا۔ وہی شکار اُٹھا کر گھر لاتا، وہی پانی بھرتا، وہی آگ جلاتا۔ دیو قامت برگ اُس سے یہ تمام خدمات لیتا لیکن شاذ و نادر ہی اُس کے لئے کوئی مہربانی کا کلمہ منہ سے نکالتا۔ وہ اُسے ایک چور سمجھ کر حقارت کی نگاہ سے دیکھتا۔

باغیوں کا گزارا لوٹ مار پر نہ تھا بلکہ وہ پرندوں اور مچھلیوں کا شکار کر کے اپنا پیٹ پالتے تھے۔ اگر برگ نے کسی مقدس آدمی کو قتل نہ کیا ہوتا تو لوگ کبھی کے اُن کے تعاقب سے تنگ آ گئے ہوتے، اور انھوں نے انہیں اُن کے حال پر چھوڑ دیا ہوتا، لیکن وہ ڈرتے تھے کہ اگر ایک خادم دین کے خون کا بدلہ نہ لیا گیا تو اُن کے دیہات پر خبر نہیں کیا آفت آئے۔ جب ٹارڈ شکار کے کر وادی میں جاتا تو لوگ اُسے روپے اور معافی کا لالچ دے کر برگ کے مسکن کا پتہ پوچھتے۔ لیکن وہ انکار کر دیتا۔ اور جب وہ اُس کے پیچھے پیچھے چل دیتے تو وہ اُن کو اُس وقت تک جنگل میں بھٹکاتا پھرتا کہ آخر وہ تنگ آ کر واپس چلے جاتے۔

ایک دفعہ برگ نے اُس سے پوچھا کہ "کیا جب تم گاؤں میں جاتے ہو تو لوگ تمہیں مجھ سے منحرف کرنے کی کوشش کرتے ہیں؟" تو ٹارڈ نے جواب دیا "ہاں، وہ مجھے ایک بہت بھاری رقم دینے کا وعدہ کرتے ہیں؟" اس پر برگ نے حقارت سے کہا "کتنا احمق لڑکا ہے جسے روپے کی قدر و قیمت بھی معلوم نہیں!" ٹارڈ نے اُس کی طرف دیکھا، اُس کی آنکھوں میں کوئی ایسی جھلک تھی جو دیو قامت برگ نے اس سے پہلے کبھی نہ دیکھی تھی۔ جوانی کے دنوں میں کسی حسین عورت کی نگاہوں میں بھی اُسے وہ سحر نظر نہ آیا تھا۔ اپنے بچوں کی آنکھوں میں اپنی بیوی کی نظروں میں بھی اُس نے وہ محبت نہ دیکھی تھی جو اُسے ٹارڈ کی آنکھوں میں جھلکتی ہوئی نظر آئی۔ اُس کی آنکھیں کہہ رہی تھیں "تم میرے خدا ہو، میرے حاکم۔ میں نے تمہیں اپنی آزاد روح پر حکومت کرنے کے لئے انتخاب کیا ہے۔ تم میرے سر کو حقارت سے

ٹھکرانے ہو ٹھکرادو۔ مجھے مارو اگر تم چاہو، لیکن میں تم سے کبھی بے وفائی نہ کروں گا۔"

اس کے بعد برگ نے پہلی سی بے تکلفی چھوڑ دی۔ ٹارڈ اپنے عمل میں اب کچھ اور دلیر ہوگیا لیکن اُس کی گفتگو میں حیا بدستور باقی رہی۔ موت کا خوف اب اُس کے دل پر معلوم نہ ہوتا تھا۔ وہ جان بوجھ کر یخ بستہ جھیلوں پر چلا کرتا، دھوکے میں ڈالنے والی دلدلوں سے گزرتا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے اُسے خطرے میں پڑ کر لطف حاصل ہوتا ہے۔ چونکہ سمندر کے وحشی طوفان سے نبرد آزما ہونے کا اب اُسے موقع نہ ملتا تھا اس لئے وہ اپنے حریفانہ ذوق کی تسکین اب انہی باتوں سے کرتا تھا۔ لیکن رات کے وقت وہ جنگل کی تاریکی سے ڈرا کرتا تھا، بلکہ دن کو گنجان درختوں کے گہرے سائے سے بھی اُسے خوف آتا تھا۔ جب برگ اُس سے اس کی وجہ دریافت کرتا تو وہ کچھ حیران سا ہو جاتا۔

ٹارڈ انگیٹھی کے قریب بستر میں نہ سوتا تھا بلکہ ہر شب جب برگ سو جاتا وہ آہستہ آہستہ سرک کر دروازے کے قریب ایک بڑے پتھر پر آ لیٹتا۔ برگ کو یہ بات معلوم ہوگئی اور اگرچہ اُس کے ذہن میں اس کی وجہ بھی آگئی تھی تاہم اُس نے ٹارڈ سے اس کے متعلق دریافت کیا۔ ٹارڈ نے کچھ جواب نہ دیا۔ مگر اس کے بعد مزید سوالات سے بچنے کے لئے وہ دو تین دن بستر میں سوتا رہا۔ لیکن پھر دروازے کے قریب اپنی اصلی جگہ پر آگیا۔

ایک رات برف کا شدید طوفان آیا۔ ایسا طوفان کہ درختوں کے گھنے سایوں میں بھی برف کے انبار لگ گئے۔ اُس رات باغیوں کے غار میں بھی برف آگھسی۔ ٹارڈ صبح اُٹھا تو اُس نے اپنے آپ کو پگھلتی ہوئی برف کی ایک چادر میں لپٹا ہوا پایا۔ اس کے دو دن بعد وہ سخت بیمار ہوگیا۔ وہ سانس لیتا تھا تو درد کی ٹیسیں اُس کے پھیپھڑوں کو چیرتی ہوئی اٹھتی تھیں۔ جب تک اُس کی قوت نے اُس کا ساتھ دیا وہ درد کو برداشت کرتا رہا، لیکن ایک شام وہ آگ میں پھونک مارنے کے لئے جھکا تو وہیں گر گیا اور پھر اُس سے اٹھا نہ گیا۔ برگ اُس کے پاس آیا اور اُس سے گرم بستر میں چلنے کے لئے کہنے لگا۔ ٹارڈ نے کوئی حرکت نہ کی صرف اُس کے گلے سے کراہنے کی سی آواز نکل رہی تھی۔ برگ نے اس کو اٹھا کر بستر میں پہنچا دیا۔ جب وہ اسے اٹھا رہا تھا تو اسے ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے وہ ایک نفرت انگیز سانپ کو اٹھا رہا ہے، اور اُسے اپنے منہ کا مزا ایسا محسوس ہوتا تھا جیسے اُس نے مرے ہوئے گھوڑے کا گوشت کھا لیا ہے۔ ایک ادنیٰ چور کے جسم کو چھونا اُسے سخت ناگوار تھا۔ برگ نے اُسے اپنا ریچھ کی کھال کا کمبل اوڑھا دیا اور اُسے پانی لا کر پلایا۔ یہی کچھ اُس کے امکان میں تھا، لیکن بیماری زیادہ خطرناک نہ تھی اور ٹارڈ جلد ہی صحت یاب ہوگیا۔ اب جب کہ برگ کو چند روز کے لئے اُس کی تیمارداری اور اُس کے حصے کا کام کرنا پڑا تھا وہ ایک دوسرے سے زیادہ قریب ہوگئے تھے۔ جب وہ دونوں آگ کے سامنے بیٹھے تیر تراشتے تھے تو ٹارڈ کبھی کبھی برگ کے ساتھ گفتگو کر لیتا تھا۔

ایک دفعہ شام کا وقت تھا، ٹارڈ نے کہا "برگ، تم ایک اچھے خاندان میں سے ہو۔ تمہارے رشتہ دار وادی کے امیر ترین لوگوں میں سے ہیں۔ تمہارے آباؤ اجداد نے بادشاہوں کی خدمات انجام دی ہیں اور بڑے بڑے معرکے سر کئے ہیں۔"

برگ نے جواب دیا "ہاں انہوں نے بڑے بڑے سرکشوں کو زیر کیا ہے اور بڑے بڑے بادشاہوں کو نیچا دکھایا ہے "

مارڈ نے پھر کہا "تمہارے باپ دادا کرسمس کے دنوں بڑی عظیم الشان دعوتیں دیا کرتے تھے اور تم نے کبھی جب تم اپنے گھر میں تھے ایسی ہی دعوتیں دی ہیں۔ سینکڑوں مرد اور عورتیں تمہارے وسیع ہال کی بنچوں پر بیٹھ سکتے تھے ۔۔۔ وہ ہال جو سینٹ اولف کے یہاں آنے سے قبل تعمیر ہوا تھا۔ شربت سے بھری ہوئی چاندی کی بڑی بڑی صراحیاں اور بڑے بڑے پیالے تمہاری میزوں پر گردش کیا کرتے تھے "

برگ نے پھر لڑکے کی طرف دیکھا۔ وہ اپنے سر کو اپنے ہاتھوں میں لئے اور اپنے گھنگریلے بالوں کو پیچھے کی طرف سنبھالے بستر کے کنارے پر بیٹھا ہوا تھا۔ اُس کا چہرہ بیماری کی وجہ سے زرد اور صاف ہوگیا تھا۔ لیکن اُس کی آنکھوں میں ابھی تک بخار کے شعلے چمک رہے تھے۔ اُس کے تصور میں برگ کے عظیم الشان ہال، اُس کی نقرئی صراحیوں اور پیالوں، اُس کے بیش قیمت لباسوں والے مہمانوں، اور خود برگ کی ذی مرتبہ شخصیت کی تصویریں کھنچ رہی تھیں اور وہ ان تخیلات میں محو آپ ہی آپ مسکرا رہا تھا۔

برگ نے محسوس کیا کہ اُس کے اُن شوکت و شان کے دنوں میں بھی کسی نے اُس کی طرف ایسی عزت و احترام کے جذبات سے چمکتی ہوئی نظروں سے نہ دیکھا تھا جس طرح آج یہ لڑکا اس کی طرف دیکھ رہا تھا۔ وہ اِن نظروں سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہا لیکن اس کے باوجود ایک بیزاری کا سا احساس اُس پر طاری تھا۔ وہ اپنے دل میں کہہ رہا تھا کہ ایک ادنیٰ چور کو میری عزت اور تعریف کرنے کا کوئی حق نہیں ہے۔

اُس نے کہا "کیا تمہارے ہاں دعوتیں نہیں ہوتی تھیں؟"

مارڈ ہنس پڑا اور کہنے لگا "اُن پہاڑی چٹانوں میں جہاں میرے ماں اور باپ رہتے ہیں، باپ طوفان زدوں کو لوٹتا ہے اور ماں جادوگرنی ہے۔ جب موسم طوفان آلود ہوتا ہے تو وہ ایک دریائی بھیڑیے پر چڑھ کر جہازوں کی طرف جاتی ہے اور ان بدقسمتوں کو طوفان کے بھیڑیے اٹھا کر سمندر میں پھینک دیتے ہیں اُن کی مالک وہ ہوتی ہے"

برگ نے پوچھا "وہ اُن کو کیا کرتی ہے"

مارڈ نے کہا "تمہیں معلوم نہیں جادوگرنیوں کو ہمیشہ نعشوں کی ضرورت رہتی ہے۔ وہ اُن کو اپنا غلام بناتی ہے یا شاید وہ ان کو کھاتی ہے۔ چاندنی راتوں کو وہ وحشی لہروں پر سوار ہو جاتی ہے اور سمندر میں ڈوبے ہوئے بچوں کی آنکھیں اور انگلیاں تلاش کرتی ہے"

برگ نے کہا "آہ کتنی دہشت ناک بات ہے!"

مارڈ نے اطمینان کے لہجے میں جواب دیا "ہاں عام لوگوں کے لئے ہیں۔ ایک جادوگرنی کے لئے نہیں۔ وہ تو اس کے بغیر رہ نہیں سکتی"

برگ کے لئے یہ بات زندگی کو ایک بالکل مختلف نقطہ نظر سے دیکھنے کے مترادف تھی۔ اُس نے جلدی سے سوال کیا

تو گویا جس طرح جادوگرنیاں جادو کرنے پر مجبور ہیں اسی طرح چور بھی چوری کرنے پر مجبور ہیں؟"

لڑکے نے جواب دیا "ہاں کیوں نہیں۔ ہر شخص جس بات کے لئے پیدا کیا گیا ہے وہ اُسے مجبوراً کرنی پڑتی ہے" لیکن ایک حیا آمیز شرارت سے بھری ہوئی مسکراہٹ نے اُس کے ہونٹوں پر ایک ہلکا سا خم ڈال دیا، اور اُس نے سلسلۂ گفتگو کو جاری رکھتے ہوئے کہا "مگر دنیا میں ایسے چور بھی ہیں جنہوں نے کبھی چوری نہیں کی"

برگ نے کہا "اس سے تمہارا کیا مطلب ہے؟"

ٹارڈ ابھی اُسی پُراسرار طریق پر مسکرا رہا تھا، اور اپنے ساتھی کو ایک معمے میں ڈال کر خوش معلوم ہوتا تھا۔ اُس نے کہا "جس طرح بعض پرندے اڑتے نہیں اُسی طرح بعض چور چراتے نہیں"

برگ نے اُس کے معمے کا مطلب معلوم کرنے کے لئے تجاہلِ عارفانہ سے کام لیکر کہا "ایسے شخص کو چور کیسے کہا جا سکتا ہے جس نے کبھی چوری نہ کی ہو"

ٹارڈ کے ہونٹ مضبوطی سے آپس میں مل گئے۔ ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے وہ اس معاملے کے متعلق زیادہ گفتگو نہیں کرنا چاہتا۔ ذرا سے وقفے کے بعد اُس کے منہ سے خود بخود یہ الفاظ نکل گئے "لیکن اگر کسی کا باپ چوری کرتا ہو تو —"

برگ نے کہا "آدمی کو مکان یا روپیہ تو ورثے میں مل سکتا ہے لیکن چور تو اُسی کو کہیں گے جس نے خود چوری کی ہو"

ٹارڈ نے ہنس کر جواب دیا "لیکن اگر کسی کی ایک ماں ہو اور وہ ماں اُس کے پاس آکر روئے چلائے اور کہے کہ اپنے باپ کا جرم اپنے سر لے لو، اور وہ شخص جلاد کا منہ چڑا کر جنگل میں بھاگ نکلے تو اُس کو تم کیا کہو گے۔ آہ، انسان ایک مچھلیوں کے جال سے لئے بھی جسے اُس نے کبھی دیکھا تک نہ ہو باغی قرار پا سکتا ہے"

برگ نے اپنی مٹھی نہایت غصے کے ساتھ پتھر کی میز پر ماری۔ "دیکھو، اس طاقتور اور خوبصورت لڑکے نے اپنی تمام زندگی ایک دوسرے شخص کے لئے برباد کردی۔ اپنے بھائی بندوں کی محبت، دولت، عزت ہر شے سے ہمیشہ کے لئے اپنے آپ کو محروم کر دیا اور خوراک اور لباس کی بیہودہ پریشانیوں کے لئے اپنی زندگی وقف کر دی۔ اور یہ احمق کم بخت برگ سے ایک معصوم انسان کی تحقیر کراتا رہا"

وہ اُسے نہایت سختی کے ساتھ بُرا بھلا کہہ رہا تھا لیکن ٹارڈ پر اُس کے غصے کا اثر اُس سے زیادہ نہ تھا جتنا ایک بیمار بچے کو اپنی ماں کی ہمدردانہ زجر و توبیخ کا ہوتا ہے۔

× × × × × × × ×

وسیع و عریض جنگلی پہاڑیوں میں سے ایک کے اوپر دلدل سے بھری ہوئی ایک سیاہ جھیل تھی۔ یہ چٹان کو تراش کر بنائی گئی تھی اور اس کے کنارے لمبے سیدھے اور کونے ایسے تیز تھے کہ معلوم ہوتا تھا انسانی ہاتھوں نے تراش کر اسے بنایا ہے۔ اس کے تین طرف سیدھی چٹان کی تین دیواریں اُٹھی ہوئی تھیں اور پتھروں سے چمٹے ہوئے بے شمار پہاڑی چیڑ کے بلند قامت درخت کھڑے تھے جن کی جڑیں انسانی بازوؤں کے برابر موٹی تھیں جھیل کی سطح کے قریب، جہاں تھوڑی تھوڑی سی دورنگ پانی

کے تھپیڑوں نے گھاس کو نابود کر دیا تھا، یہ ننگی جڑیں اس طرح پیچ و خم کھا کر پانی سے باہر نکلی ہوئی تھیں جیسے ہزاروں سانپ لہروں سے بچنے کے لئے باہر نکل رہے ہوں اور اسی کشمکش میں متحجر ہو کر رہ گئے ہوں، یا یہ مدتوں کے ڈوبے ہوئے عفریتوں کے سیاہ شدہ ڈھچر تھے جن کے وجود سے جھیل اپنے آپ کو پاک کر لینا چاہتی تھی؟ بازو اور ٹانگیں شدت تشنج سے خم کھا گئی تھیں۔ لمبی لمبی انگلیوں نے چٹانوں کے پتھروں کو اپنے چنگل میں گرفتار کر لیا تھا اور عظیم پسلیاں محرابیں بن گئی تھیں جن کے سہارے قدیم درخت کھڑے تھے لیکن وقتاً فوقتاً یہ آہنی بازو، یہ فولادی انگلیاں جن کے بل پر یہ بلند و بالا پیڑ استادہ تھے۔ اپنی گرفت ڈھیلی کر دیتی تھیں اور پھر شمال کی تیز ہوا درخت کو اٹھا کر جھیل کے اندر پھینک دیتی تھی، جہاں اس کی شاخوں کا تاج میلے پانی اور کیچڑ میں جا دھنستا تھا۔ درخت کی ٹہنیوں میں جھیل کی مچھلیوں کو چھپنے کے لئے نہایت اچھی جگہ مل جاتی تھی لیکن اس کی جڑیں کسی گھناونے دیو کی باہوں کی طرح پانی سے باہر نکل کر جھیل کی سطح کو کریہ المنظر بنا دیتی تھیں۔

جھیل کی چوتھی جانب پہاڑوں کی سطح ڈھلوان تھی۔ یہاں ایک چشمہ نکلتا تھا لیکن قبل اس کے کہ اس چشمے کا پانی نہریں کر اپنا ایک راستہ بنائے وہ ناہموار زمین پر بیسیوں پیچ و خم کھا کر ننھے ننھے جزیروں کی ایک بستی آباد کر دیتا تھا جن میں سے بعض تو اتنے چھوٹے تھے کہ ان پر بمشکل ایک پاؤں ٹک سکتا تھا اور بعض اتنے بڑے کہ اُن پر بیس بیس درخت اگ رہے تھے اس جگہ جہاں چٹانیں اس قدر بلند نہ تھیں کہ دھوپ کو کلیتہً روک دیتیں ہلکے ہلکے پتوں والے درخت، سرسبز جھاڑیاں اور خوشبودار پھول بھی اگے ہوتے تھے جھیل کے قریب لمبی لمبی گھاس کا ایک جنگل تھا جس کی بلندی آدمی کے قد کے برابر تھی اور اس میں سے سورج کی روشنی اسی طرح سبز ہو کر پانی پر پڑتی تھی جس طرح وہ حقیقی جنگل کی زمین پر اپنا عکس ڈالتی ہے۔ انہیں سرکنڈوں کے درمیان کہیں کہیں چھوٹے چھوٹے جوہڑ بھی تھے جن میں نیلوفر کے سفید سفید پھول ایک عالم خواب میں تیرتے تھے اور اس حسن حساس کو جو غروب آفتاب کے ساتھ ہی اپنی آنکھیں موند لیتا ہے گھاس کی لمبی لمبی پتیاں عجیب دلربایانہ انداز سے دیکھتی تھیں۔

ایک دن کہ فضا نہایت روشن تھی باغی مچھلیاں پکڑنے کے لئے اسی قسم کے ایک جوہڑ پر آ نکلے۔ وہ سرکنڈوں میں سے گزر کر دو اونچے اونچے پتھروں پر آ کھڑے ہوئے اور اپنے کانٹے پانی میں ڈال کر وہیں بیٹھ گئے۔ یہ دو آدمی جن کی زندگی اب کلیتہً جنگلوں اور پہاڑوں میں گذر رہی تھی اس درجہ فطرت کی قوتوں کے اختیار میں آ گئے تھے کہ اُن میں اور پرندوں میں اب کوئی فرق نہ رہا تھا سورج چمکتا تھا تو ان کی طبیعتیں بھی شگفتہ اور مسرور ہو جاتی تھیں، لیکن شام ہوتی تھی تو وہ خاموش ہو جاتے تھے اور رات کا تو ان پر اس قدر غلبہ ہوتا تھا کہ اُس وقت ان کی تمام قوتیں سلب ہو جاتی تھیں۔ چنانچہ اس وقت اُس سبز روشنی نے جو گھاس میں سے چھن چھن کر پانی پر پڑتی تھی اور پانی میں سے پیلی سبز اور سنہری کرنیں بن کر واپس آتی تھی انہیں کچھ مسحور سا کر دیا۔ اُن کا تعلق بیرونی دنیا سے بالکل منقطع ہو چکا تھا۔ گھاس کی لمبی لمبی پتیاں ہلکی ہلکی نسیم میں لہراتی تھیں، ایک دوسری سے بج کر ایک دھیما دھیما نغمہ پیدا کرتی تھیں اور آہستہ آہستہ اُن کے چہروں کو آ کر چھوتی تھیں۔ وہ اپنی کھوری کھالیں پہنے کھورے رنگ کے پتھروں پر بیٹھے ہوتے تھے، یوں کہ اُن کے لباس کا رنگ اور پتھروں کا رنگ گھل مل کر ایک ہو گیا تھا۔ دونوں ساتھی

آمنے سامنے بیٹھے پتھر کے بتوں کی طرح ایک دوسرے کی طرف دیکھ رہے تھے۔ گھاس کے اندر اُن کو رنگ برنگ کی بڑی بڑی مچھلیاں تیرتی، چمکتی اور جھلملاتی نظر آتی تھیں۔ جب اُنہوں نے اپنی ڈوریاں پانی میں پھینکیں اور لہروں کے حلقے بن بن کر پھیلنے لگے تو انہیں ایسا معلوم ہؤا جیسے پانی کی حرکت لحہ بہ لحہ بڑھتی ہی جاتی ہے۔ پھر انہوں نے دیکھا کہ اس حرکت کا باعث اکیلے وہی نہیں ہوتے بلکہ پانی کے نیچے گہرائی میں ایک جل دیوی سو رہی ہے جس کا آدھا جسم انسان کا ہے اور آدھا مچھلی کا۔ اُس کا منہ اوپر کی طرف ہے، اور لہریں اُس سے اس طرح لپٹی ہوئی ہیں کہ وہ اُسے پہلے نہیں دیکھ سکے۔ پانی کی سطح اُسی کے سانس سے متحرک تھی۔ لیکن اُسے وہاں موجود پاکر باغیوں کو کوئی حیرت نہ ہوئی۔ اور جب کچھ دیر کے بعد وہ وہاں سے غائب ہوگئی تو وہ نہ بتا سکتے تھے کہ انہوں نے اُسے خواب میں دیکھا تھا یا بیداری میں۔

سبز روشنی اُن کی آنکھوں سے گزر کر اُن کے دماغوں پر ایک ہلکے سے نشے کا سا اثر کر رہی تھی۔ اُن کا تخیل اُن کے سامنے عجیب و غریب تصویریں بنا رہا تھا، ایسی تصویریں جن کے متعلق وہ ایک دوسرے کو کبھی کچھ نہ بتاتے تھے۔ اُس روز انہیں کوئی شکار نہ ملا۔ تمام دن خوابوں اور خیالوں میں گزر گیا۔

یکایک سرکنڈوں میں سے چپوؤں کی آواز آئی اور وہ سنبھل کر بیٹھ گئے۔ چند لمحوں کے بعد ایک بھاری سی کشتی نمودار ہوئی جو ایک درخت کا تنا تراش کر بنائی گئی تھی۔ کشتی کو ایک نوجوان لڑکی چلا رہی تھی اور اُس کے ہاتھ میں چپوؤں کی بجائے پتلی پتلی چھڑیاں تھیں۔ وہ نیلوفر کے پھول اکٹھے کر رہی تھی۔ اُس کے بال لمبے لمبے اور گہرے سنہری رنگ کے تھے۔ اُس کی آنکھیں موٹی موٹی تھیں اور چہرے پر ایک عجیب قسم کی زردی تھی جس میں ہلکے گلابی رنگ کی جھلک نظر آتی تھی اُس کے رخساروں پر بھی اُس کے چہرے سے کچھ زیادہ رنگت نہ تھی۔ لیکن اُس کے ہونٹوں پر کسی قدر سرخی نمایاں تھی۔ اُس نے سفید کتان کی قبا پہن رکھی تھی جس پر ایک سونے کے بند والی چرمی پیٹی لگی ہوئی تھی۔ وہ اُن کے پاس سے بغیر اُن کی طرف دیکھے گذر گئی۔ وہ بالکل خاموش بیٹھے رہے۔ انہیں اپنے ظاہر ہو جانے کا اتنا اندیشہ نہ تھا جتنا اُس کے بے خلل نظارے کا شوق تھا جب وہ چلی گئی تو پتھر کے بُت، پھر آدمی بن گئے اور بولنے لگے۔

ایک نے کہا اُس کا چہرہ نیلوفر کی طرح سفید تھا، اور اُس کی آنکھیں اُس پانی کی طرح سیاہ تھیں جو جھیلوں کی جڑوں میں ہمارے سامنے چمک رہا ہے۔

وہ دونوں اس قدر خوش تھے کہ انہیں بے اختیار ہنسی آ رہی تھی۔ ایسی ہنسی جیسی وہ اس جھیل پر آکر اس سے پہلے کبھی نہ ہنسے تھے، ایسی ہنسی جو چٹان کی دیواروں کے ساتھ ٹکرانے تو جھیلوں کی جڑوں کو ڈھیلا کر دے۔

برگ نے پوچھا، "کیا وہ خوبصورت تھی؟"

مارڈ نے کہا "وہ اتنی جلدی گزر گئی کہ میں کچھ نہ کہہ نہیں سکتا لیکن شاید وہ خوبصورت تھی۔"

"غالباً تمہیں اُس کی طرف دیکھنے کی جرات ہی نہیں ہوئی۔ کیا تم نے خیال کیا تھا کہ وہ جل دیوی ہے؟"

اس کے بعد پھر انہوں نے ہنسنے کی ایک عجیب خواہش محسوس کی۔

× × × × × × × × ×

بچپن میں ٹارڈ نے ایک ڈوبے ہوئے آدمی کو دیکھا تھا۔ اُس کی لاش سمندر کے کنارے پر پڑی ہوئی تھی۔ دن کے وقت اُسے اس سے بالکل خوف نہ آیا، لیکن رات کو اُسے طرح طرح کے ڈراؤنے خواب آتے رہے۔ اس نے دیکھا کہ اُس کی نظر میں سمندر پر جمی ہوئی ہیں اور سمندر کی ایک ایک لہر مردہ اجسام کو اٹھا اٹھا کر اُس کے پاؤں میں پھینک رہی ہے۔ پھر اس نے دیکھا کہ چٹانیں اور جزیرے ڈوبے ہوئے آدمیوں سے پٹے پڑے ہیں، ڈوبے ہوئے آدمی جو مر چکے ہیں لیکن حرکت کرتے ہیں اور بولتے ہیں، اور اسے اپنی اکڑی ہوئی اُنگلیوں سے ڈراتے ہیں۔

یہی حالت اب ہوئی وہ لڑکی جسے اُس نے کشتی میں دیکھا تھا اُسے خواب میں نظر آئی۔ اب وہ اس سے جھیل کی تہ میں ملا۔ جہاں روشنی جنگل کی روشنی سے بھی زیادہ سبز تھی اور جہاں اُس کے پاس یہ معلوم کرنے کے لئے کافی وقت تھا کہ وہ خوبصورت ہے۔ پھر اُس نے دیکھا کہ وہ جھیل کے عین درمیان چیڑ کے ایک بہت بڑے درخت کی جڑوں پر بیٹھا ہوا ہے اور درخت متحرک ہے، کبھی وہ نیچے چلا جاتا ہے اور کبھی پھر پانی کی سطح کے اوپر آجاتا ہے۔ پھر اس نے اُس لڑکی کو ایک نہایت ہی چھوٹے سے جزیرے پر دیکھا وہ ایک سرخ پہاڑی درخت کے نیچے کھڑی اُس کی طرف دیکھ دیکھ کر ہنس رہی تھی۔ آخری خواب میں وہ آپس میں اتنے گھل مل گئے تھے کہ لڑکی نے اُس کا منہ چوم لیا تھا لیکن اس وقت صبح ہو چکی تھی اور اُسے برگ کے جاگنے کی آواز آرہی تھی، لیکن وہ اپنی آنکھیں نہ کھولتا تھا تاکہ کچھ دیر اور اس نظارے سے لطف اندوز ہوئے۔ جب وہ جاگا تو اس خواب کے اثر سے اس کی آنکھیں چوندھیائی ہوئی سی تھیں اور اُس کا سر چکرا رہا تھا۔ کل سے آج وہ زیادہ اس لڑکی کے خیال میں محو رہا۔ شام کے قریب اُس نے برگ سے پوچھا "کیا تمہیں اس لڑکی کا نام معلوم ہے؟"

برگ نے چونک کر اُس کی طرف دیکھا اور کہا "ہاں، تمہارے لئے یہ بہتر ہے کہ تم جلد سے جلد اُس کا نام جان جاؤ۔ اُس کا نام آن ہے اور وہ میری رشتہ دار ہے۔"

اب ٹارڈ کو معلوم ہوا کہ اسی زرد رو حسینہ کی وجہ سے برگ جنگلوں اور پہاڑوں کی یہ وحشیانہ زندگی گزار رہا ہے۔ اپنے حافظے پر زور ڈال کر وہ اُن باتوں کو یاد کرنے لگا جو اُس نے کبھی اس عورت کے متعلق سنی تھیں۔

آن ایک آزاد کسان کی لڑکی تھی۔ اُس کی ماں مر چکی تھی اور اپنے باپ کے گھر میں اب اُسی کی حکومت تھی۔ وہ مطمئن تھی کیونکہ وہ ایک خود مختار فطرت کی مالک تھی اور شادی کر کے اپنے شوہر کی محکوم نہ بننا چاہتی تھی۔ آن برگ کی عم زاد بہن تھی، اور یہ افواہ مدت کی پھیلی ہوئی تھی کہ برگ کو اپنے گھر کی بہ نسبت آن اور اُس کی سہیلیوں کے پاس رہنا زیادہ پسند ہے۔ ایک کرسمس کے دن جب کہ برگ کے ہال میں ایک عظیم الشان دعوت ہونے والی تھی، اُس کی بیوی نے ایک راہب کو مدعو کیا جس سے اُسے توقع تھی کہ وہ برگ کو اُس کی غلط روش سے آگاہ کرے گا کہ ایک دوسری عورت کے لئے اپنی بیوی سے بے پروائی کرنا کتنا بُرا ہے۔ برگ اور اس کے علاوہ دوسر

لوگ بھی اس راہب سے سخت نفرت کرتے تھے کیونکہ اُس کی شکل صورت اچھی نہ تھی۔ وہ نہایت جسیم تھا اور اس کا رنگ بالکل سفید تھا۔ اُس کے گنجے سر پر بالوں کا حلقہ، اُس کی گیلی گیلی آنکھوں پر گھنی گھنی بھویں، اُس کا چہرہ اُس کے ہاتھ اور اُس کے کپڑے سب سفید تھے لوگ اکثر اُس کی طرف دیکھ کر بیزاری کا اظہار کرتے تھے۔

لیکن راہب ایک بے خوف آدمی تھا؛ اور چونکہ وہ سمجھتا تھا کہ زیادہ آدمیوں کے سامنے کہے ہوئے الفاظ زیادہ وزنی ہوتے ہیں، اس لئے وہ اٹھا اور کہنے لگا "لوگ کوئل کو حد درجے کا بے حمیت پرندہ سمجھتے ہیں، اس لئے کہ وہ اپنے بچے دوسروں کے گھونسلوں میں نکالتی ہے لیکن ایسا آدمی جو اپنے گھر بار اور اپنی بیوی بچوں کو چھوڑ کر کسی غیر عورت کی ذات میں اپنی مسرت کو ڈھونڈتا ہے، میں اسے پرلے درجے کا بے حمیت انسان سمجھتا ہوں" اَن، اُٹھی اور چلا کر کہنے لگی "برگ یہ بات تم سے اور مجھ سے کہی گئی ہے میں نے ایسی ذلت کبھی نہ اٹھائی تھی۔ افسوس، میرا باپ یہاں نہیں ورنہ وہ مجھے اس توہین سے بچا لیتا" یہ کہہ کر وہ جانے لگی، لیکن برگ اُس کے پیچھے دوڑا۔ اَن نے کہا "خبردار، اب میرے پاس مت آؤ۔ میں اب کبھی تمہاری شکل دیکھنا نہیں چاہتی" وہ نہ رکا اور برآمدے میں آکر اُس نے اُسے ٹھیرا لیا، اور پوچھا کہ تم بتاؤ میں کیا کروں۔ اُس نے جواب دیا کہ یہ تمہیں خود اچھی طرح معلوم ہونا چاہئے کہ تم کیا کرو۔ چنانچہ برگ ہال میں آیا اور اُس نے راہب کو قتل کر دیا۔

برگ اور ٹارڈ دونوں کے دل میں اس وقت ایک ہی خیال تھا۔ پھر برگ نے کہا "تم نے اُس وقت اَن کی طرف دیکھا ہوگا۔ میری بیوی نے بچوں کو اپنے پاس جمع کر لیا اور اَن پر لعنت بھیجی۔ پھر بچوں کے منہ اُس کی طرف پھیر دیئے تاکہ وہ اُس عورت کو اچھی طرح دیکھ لیں جس کے لئے ان کے باپ نے قاتل بننا پسند کیا۔ لیکن اَن اُس وقت اس قدر خاموش اور اس قدر حسین تھی کہ لوگ اُس کی طرف دیکھ کر کانپ رہے تھے۔ اُس نے میرا شکریہ ادا کیا اور مجھ سے التجا کی کہ میں بھاگ کر جنگل کو چلا جاؤں۔ اُس نے مجھ سے کہا کہ لوٹ مار کا پیشہ کبھی اختیار نہ کرنا، اور اپنے خنجر کو کبھی کسی ادنیٰ مقصد کے لئے استعمال نہ کرنا"

ٹارڈ نے کہا "تمہاری بہادری نے اُس کی عزت کو دوبالا کر دیا تھا"

برگ کو لڑکے کا جواب سُن کر حیرانی سی ہوئی۔ اسی طرح وہ پہلے بھی اُس کی باتیں سُن کر حیران ہو جایا کرتا تھا۔ ٹارڈ کافر تھا، کافروں سے بدتر۔ اُس نے کبھی کسی ناجائز بات کی مذمت نہ کی تھی۔ اُس میں ذمہ داری کا احساس بالکل مفقود معلوم ہوتا تھا۔ لیکن جو کچھ ہونا تھا ہوا۔ اُسے خدا، مسیح اور اولیا کا علم تھا۔ لیکن وہ صرف اُن کے نام ہی جانتا تھا جیسے کوئی شخص کسی دوسری قوم کے دیوتاؤں کے نام جانتا ہو۔ جزائر شیریں کی روحیں اُس کی معبود تھیں۔ روحوں میں اعتقاد اُس کی جادوگریوں کا پیدا کیا ہوا تھا۔

اور اب برگ نے ایک کام اپنے ذمے لیا۔ ایسا کام جیسے کوئی خود اپنی گردن کے لئے پھندا تیار کرے۔ اُس نے جاہل لڑکے کو بتایا کہ خدا ایک بزرگ و برتر ہستی ہے، جو عدل و انصاف کی مالک ہے، غلط کاروں سے انتقام لینے والی اور گناہ گار بندوں کو ابدی جہنم میں مبتلا کرنے والی ہے۔ اور اُس نے اُس کے دل میں مسیح، اُس کی ماں، اور تمام بزرگانِ دین اور اُن مردوں اور عورتوں کی محبت پیدا کی جو خدا کے تخت کے سامنے بیٹھ کر اُس کے غضب سے بچنے کی دعائیں کیا کرتے ہیں۔ اُس نے اس کو وہ

سب کچھ سکھایا جو نوعِ انسان نے خدا کے غصّے کو ٹھنڈا کرنے کے لئے سیکھا ہے۔ اُس نے اُس کو اُن نیک لوگوں کے قصّے سنائے جو مقاماتِ مقدسہ کے سفر ہزاروں صعوبتیں جھیل کر کرتے ہیں، جو اپنے گناہوں سے پشیمان ہو کر اپنے آپ کو سزائیں دیتے ہیں، اور جو دنیا اور اُس کی مسرتوں کو خدا کے لئے چھوڑ دیتے ہیں۔

جوں جوں برگ بولتا جاتا تھا لڑکے کا رنگ زرد ہوتا جاتا تھا اور وہ پہلے سے زیادہ توجہ کے ساتھ اُس کی باتوں کو سنتا تھا۔ نئے نئے خیالات کے تصور سے اُس کی آنکھیں کشادہ ہوتی جاتی تھیں۔ برگ خاموش ہو گیا ہوتا لیکن اُس کے خیالات کی رو کنے والی نہ تھی۔ رات چھا گئی جنگل کی سیاہ رات، جس کی خاموشی میں اُلو کی آواز عجیب وحشت پیدا کرتی ہے۔ خدا اُس وقت اُن کے اس قدر قریب آگیا تھا کہ اُس کے تخت کی روشنی میں ستارے ماند پڑ گئے تھے، اور انتقام کے فرشتے پہاڑوں کی بلندیوں پر اتر آئے تھے نیچے زمین کی گہرائیوں میں سے آگ کے شعلے بلند ہو ہو کر زمین کے بیرونی خم کو چھوتے تھے اور گناہ اور بدی کے فرزندوں کی اِس آخری جائے پناہ کو بھی نیست و نابود کر دینے پر تُلے ہوئے تھے +

× × × × × × × ×

خزاں آگئی اور اُس کے ساتھ ہی طوفان آیا۔ ٹارڈ شکار کے لئے اکیلا جنگل میں گیا، اور برگ گھر میں کپڑوں کی مرمت کرنے لگا۔ ٹارڈ ایک صحرائی بلندی پر چڑھ رہا تھا اور اُس کے آس پاس درختوں سے ٹوٹے ہوئے خشک پتے ہوا میں چکر لگاتے رقص کرتے ہوئے نیچے اتر رہے تھے۔ بار بار اُسے ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے کوئی اُس کے پیچھے پیچھے چل رہا ہے۔ اُس نے کئی مرتبہ ٹھہر کر پیچھے نظر ڈالی لیکن ہر مرتبہ اُسے یہی معلوم ہوا کہ یہ ہوا اور پتوں کی سرسراہٹ ہے۔ آخر اُس نے گھونسا تان کر رقص کرنے والے پتوں کو دھمکایا اور اپنے راستے پر چلتا رہا۔ لیکن اُس نے اپنے تصور کی آوازوں کو خاموش نہ کیا تھا۔ وہ برابر کام کر رہی تھیں۔ پہلے تو ایسا معلوم ہوا کہ ننھے بچے اُس کے پیچھے ناچ رہے ہیں، پھر ایک بہت بڑے سانپ کے پھنکارنے کی آواز آئی۔ سانپ کے ساتھ ساتھ ایک بھیڑیا بھی معلوم ہوتا تھا۔ ایک خونخوار جانور، جو منتظر تھا کہ کب سانپ اشارا کرے اور کب وہ لپک کر اُس کی پیٹھ پر سوار ہو جائے۔ ٹارڈ نے اپنی رفتار تیز کر لی۔ لیکن اسی رفتار سے اُس کے تصورات کی رفتار بھی تیز ہو گئی۔ جب اُس نے محسوس کیا کہ اب وہ اُس سے دو ہی قدم پیچھے رہ گئے ہیں اور حملہ کیا ہی چاہتے ہیں تو اُس نے مڑ کر دیکھا۔ وہاں کچھ بھی نہ تھا۔ وہ کچھ دیر کے لئے آرام کرنے کو ایک پتھر پر بیٹھ گیا۔ پتے آ آ کر اُس کے قدموں میں رقص کرنے لگے۔ جنگل کے تمام درختوں کے پتے، سبز، سرخ اور زرد پتے۔

ٹارڈ نے کہا "تم گناہ گار ہو۔ آہ ہم سب گناہ گار ہیں۔ خدا کی نگاہوں میں کوئی بھی معصوم نہیں۔ اور تمہیں تو اُس کے غضب کے شعلوں نے جلا ہی ڈالا ہے"۔

اس کے بعد وہ پھر اپنے سفر پر روانہ ہو گیا۔ ہر طرف سکون چھا رہا تھا لیکن جنگل اُسے اپنے پیروں کے نیچے ایک طوفانی سمندر کی طرح لہریں لیتا ہوا معلوم ہوتا تھا۔ اُسے ایک ایسی آواز آ رہی تھی جسے اُس نے اس سے پہلے کبھی نہ سنا تھا۔ سارا جنگل

اس آواز سے بھرا ہوا تھا۔ کبھی یوں معلوم ہوتا جیسے کوئی سرگوشیاں کر رہا ہے، پھر جیسے کوئی فریاد کرتا ہے، پھر جیسے کوئی اونچی آوازیں دھمکی دیتا ہے، پھر جیسے کوئی طیش میں آ کر کسی کو کوستا ہے۔ کبھی ایک قہقہہ سنائی دیتا اور کبھی ایک لمبی آہ۔ غرض یہ آواز سینکڑوں آوازوں کا مجموعہ بنی ہوئی تھی۔ اُس نامعلوم ہستی نے جو کبھی دھمکیاں دیتی تھی اور کبھی غضب آلود ہو جاتی تھی؛ جو کبھی قہقہے لگاتی تھی اور کبھی آہیں بھرتی تھی؛ جو محسوس ہوتی تھی اور موجود نہ تھی اُس کو دیوانہ بنا دیا۔ وفورِ خوف سے وہ کانپنے لگا۔ ایسی دہشت اُس پر اس سے پہلے صرف ایک دفعہ طاری ہوئی تھی جب وہ اپنے غار میں دبک کر بیٹھا ہوا تھا اور باہر لوگ اس کی تلاش میں شور و غل مچاتے ہوئے گزر رہے تھے۔ اُسے آج پھر ایسا معلوم ہو رہا تھا جیسے اس کے پیچھے پے بہ پے درختوں کی ٹہنیاں ٹوٹ رہی ہیں اور اس کے خون کے پیاسے لوگ اپنے اسلحہ بجاتے اور وحشیانہ نعرے لگاتے بھاری بھاری قدموں کے ساتھ اس کا تعاقب کر رہے ہیں۔

فضا میں شور صرف طوفان ہی کا نہ تھا بلکہ اس میں کوئی اَور چیز بھی تھی۔ ایسی چیز جو طوفان سے بھی زیادہ ہیبت ناک تھی۔ اُس میں آوازیں تھیں جن کا مطلب اُس کی سمجھ میں نہ آتا تھا۔ اور ایک شور تھا جو کسی اجنبی زبان سے مشابہ تھا۔ اُس نے اپنی بحری زندگی کے زمانے میں اس سے بڑے بڑے طوفانوں کا شور سنا تھا لیکن اُس نے ہوا کو اتنے تاروں والا رباب بجاتے ہوئے آج تک نہ سنا تھا۔ ہر درخت کی آواز مختلف تھی، ہر نالے کا راگ الگ؛ اور پھر پہاڑ کی سنگین دیوار سے ٹکرا کر اُن کی صدائے بازگشت کی ایک اَور ہی شان تھی۔ وہ اِن تمام آوازوں سے آشنا تھا لیکن ان کے ساتھ آج کچھ اَور عجیب قسم کے شور بھی تھے جنھوں نے اُس کے دماغ کے اندر ایک طوفان مچا رکھا تھا۔

جنگل کی تاریکی سے تنہائی میں اُسے ہمیشہ وحشت ہوتی تھی۔ اُسے سمندر کی کھلی فضا اور ساحل کی ننگی چٹانیں پسند تھیں۔ درختوں کے سائے میں یہاں اُسے آسیب اور روحوں کا عمل معلوم ہوتا تھا۔

پھر یکایک اُسے معلوم ہوا کہ طوفان میں سے اُسے کون بلا رہا ہے۔ یہ خدا تھا — منتقمِ اعظم، انصاف پرور، عادل۔ خدا اُس کے ساتھی کے لئے اُس کا تعاقب کر رہا تھا۔ وہ چاہتا تھا کہ ٹمارڈ ایک خادمِ دین کے قاتل کو انتقام کے سپرد کر دے۔

ٹمارڈ نے بلند آواز کے ساتھ طوفان میں سے بولنا شروع کیا۔ اُس نے خدا کو بتایا کہ وہ کیا کرنا چاہتا ہے لیکن کیوں نہیں کر سکتا۔ اور اُس کے دل میں کئی مرتبہ خواہش پیدا ہوئی تھی کہ وہ برگ سے خدا کے ساتھ صلح کر لینے کی التجا کرے لیکن اُسے کبھی اس التجا کے لئے الفاظ نہ ملے تھے اور اس کی زبان گھبراہٹ میں بند ہو گئی تھی۔ اُس نے کہا "جب مجھے معلوم ہو گیا کہ دنیا پر ایک عادل خدا کی حکومت ہے تو میں نے جان لیا کہ برگ ایک خائب و خاسر انسان ہے۔ میں راتوں کو اپنے دوست کے لئے روتا رہا۔ میں جانتا ہوں کہ خواہ وہ کہیں بھی ہو خدا کی نظروں سے وہ چھپ نہیں سکتا لیکن میں یہ باتیں اُس سے کہہ نہ سکا۔ اُس کی محبت نے میری تمام گویائی سلب کر لی ہے۔ مجھ سے یہ نہ کہو کہ میں اُسے جا کر کچھ کہوں۔ سمندر سے یہ نہ کہو کہ پہاڑوں کی بلندی کو جا چھوئے۔"

وہ خاموش ہو گیا۔ اور طوفان کی عمیق آواز جو اُس کے نزدیک خدا کی آواز تھی وہ بھی خاموش ہو گئی۔ یکایک ہوا ٹھہر گئی،

آفتاب نکل آیا، چیونٹوں کے چلنے کی سی آواز آئی اور سرکنڈوں میں سرسراہٹ سی ہوئی۔ ان باتوں نے اُس کے حافظے میں آن کی یاد تازہ کر دی۔

اس کے بعد طوفان پھر شروع ہو گیا، اور اُس نے اپنے پیچھے کسی کے قدموں کی چاپ اور کسی کے زور زور سے سانس لینے کی آواز سنی۔ اس دفعہ اُسے مڑ کر دیکھنے کی جرأت نہ ہوئی۔ کیونکہ وہ جانتا تھا کہ یہ سفید رنگ راہب ہے۔ راہب برگ کی دعوت سے واپس آ رہا تھا۔ اُس کا سر کلہاڑی کے ایک گہرے زخم سے پھٹا ہوا تھا۔ اور اُس کا تمام جسم خون سے لتھڑا ہوا تھا۔ اور اس نے آہستہ سے کہا بتاؤ وہ کہاں چھپ رہا ہے؟ اُس کو انصاف کے حوالے کر دو تاکہ تم اُس کی روح کو بچا سکو۔"

ٹمارڈ نے دوڑنا شروع کیا۔ اُس کا خوف لحظہ بہ لحظہ بڑھ رہا تھا اور وہ اس سے نکل بھاگنا چاہتا تھا لیکن جوں جوں وہ دوڑتا تھا وہ عمیق و پُرشوکت آواز بلند ہوتی جاتی تھی۔ جو اُس کے نزدیک خدا کی آواز تھی۔ خدا خود اُس کا تعاقب کر رہا تھا اور اُس سے قاتل کو طلب کر رہا تھا۔ برگ کا جرم جس قدر خوفناک اُسے آج معلوم ہو رہا تھا اس سے پہلے کبھی نہ ہوا تھا۔ ایک ننھے انسان کو قتل کر دیا گیا تھا، ایک خادم دین کو لوہے سے کاٹ ڈالا گیا تھا۔ اور قاتل کو ابھی زندہ رہنے کی مجال تھی! ابھی! اُسے آفتاب کے نور اور زمین کے پھلوں سے لطف اندوز ہونے کی جرأت تھی! ٹمارڈ ٹھہر گیا، اُس نے اپنی مٹھیاں زور سے بند کیں اور پھر اس طرح چلّایا جیسے وہ کسی پر حملہ آور ہو رہا ہے۔ اس کے بعد ایک مجنون کی طرح وہ جنگل کی خوف انگیز دنیا سے نکل کر نیچے وادی کی طرف بھاگا۔

× × × × × × × ×

جب رات کو ٹمارڈ غار میں داخل ہوا تو باغی پتھر کی بنچ پر بیٹھا کچھ سی رہا تھا۔ آگ میں سے مدھم سی زرد روشنی نکل رہی تھی اور برگ اپنے کام میں کچھ غیر مطمئن سا نظر آتا تھا۔ ٹمارڈ کا دل رحم سے بھر آیا۔ آہ یہ شاندار انسان یکایک کتنا غریب اور کتنا ناخوش معلوم ہونے لگا تھا۔

برگ نے نظر اُٹھا کر اُس کی طرف دیکھا اور کہا "تم ایسے مضمحل کیوں ہو؟ کیا تم بیمار ہو؟ یا تم ڈر گئے ہو؟"

اس پر ٹمارڈ نے پہلی مرتبہ اپنے خوف کا ذکر کیا۔ "جنگل میں عجیب ہی معاملہ ہے۔ میں نے وہاں روحوں کی آوازیں سنی ہیں، اُن کو چلتے پھرتے دیکھا ہے۔ میں نے سفید سفید راہب دیکھے ہیں۔"

"لڑکے!"

"وہ دامن سے چوٹی تک میرے پیچھے گاتے شور مچاتے چلے گئے۔ میں اُن سے بھاگتا رہا مگر وہ میرے پیچھے دوڑتے اور گاتے رہے۔ کیا میں اُن سے مخلصی حاصل نہیں کر سکتا؟ مجھے اُن سے کیا کام؟ دنیا میں ہزاروں لوگ ہیں جن کو مجھ سے زیادہ ان کی ضرورت ہے۔"

"ٹمارڈ، تم پاگل ہو گئے ہو؟"

ٹمارڈ بولا، اور اسے خبر تک نہ ہوئی کہ وہ کیا کہہ رہا ہے۔ اُس کا شرمیلا پن یکایک غائب ہو چکا تھا اور الفاظ اُس کے

منہ سے گویا بہتے چلے جا رہے تھے۔ "سفید رنگ راہب جن کے چہروں پر موت کی زردی چھا رہی ہے۔ اُنکے کپڑے خون سے بھرے ہوئے ہیں۔ وہ اپنی چادروں سے اپنے چہروں کو چھپا رہے ہیں لیکن اُن کی پیشانیوں کے زخم پھر بھی میری نگاہوں سے نہیں چھپتے۔ کلہاڑی کے بڑے بڑے سرخ زخم۔"

برگ کا رنگ زرد ہو گیا۔ اُس نے غم آمیز آواز میں کہا "مارڈ، یہ صرف راہبوں ہی کو معلوم ہے کہ تمہیں کلہاڑی کے زخم کیوں نظر آتے ہیں۔ میں نے تو راہب کو خنجر سے مارا تھا۔"

مارڈ کانپتا اور ہاتھ ملتا ہوا کھڑا ہو گیا۔ "وہ مجھ سے تمہیں طلب کرتے ہیں۔ آہ، وہ مجھے تم سے بے وفائی کرنے پر مجبور کر دیں گے۔"

"کون؟ راہب؟"

"ہاں، ہاں، وہ میرے سامنے عجیب عجیب نظارے لاکھڑے کرتے ہیں۔ وہ اُن کو میرے پاس لاتے ہیں۔ وہ مجھے سمندر کی روشن اور کھلی فضا دکھاتے ہیں۔ وہ مجھے راہبوں کی بستی میں سے جنتے ہیں جہاں زنج زنگ ہو رہا ہے۔ میں اپنی آنکھیں بند کر لیتا ہوں لیکن اس پر بھی یہ سب چیزیں مجھے نظر آتی ہیں۔ میں اُن سے کہتا ہوں 'جاؤ مجھے مجبور نہ کرو۔ مانا کہ میرے دوست نے ایک خون کیا ہے لیکن وہ برا نہیں ہے۔ مجھے تنہا چھوڑ دو۔ اور میں اُس سے کہوں گا کہ وہ اپنے کئے پر پشیمان ہو جائے اور اپنے گناہوں کا کفارہ دے دے۔ وہ اپنے گناہ کو یقیناً محسوس کرے گا، اور مزار مقدس کی زیارت کے لئے جائیگا۔'"

برگ نے پوچھا "پھر راہب کیا جواب دیتے ہیں؟ کیا وہ مجھے معاف نہیں کرتے اور مجھے زندہ جلا دینا چاہتے ہیں؟"

مارڈ نے جواب دیا "میں اُن سے پوچھتا ہوں کہ کیا میں اپنے بہترین دوست سے بے وفائی کروں جو دنیا میں میرا سب کچھ ہے۔ اُس نے مجھے ریچھ سے اُس وقت بچایا جب اُس کے پنجے میری گردن پر پہنچ چکے تھے۔ ہم نے بھوک اور سردی کے ستم اکٹھے برداشت کئے ہیں۔ جب میں بیمار تھا تو اُس نے اپنے کپڑے اتار کر مجھے پہنا دیئے تھے۔ میں اُس کے لئے لکڑی اور پانی بہا کر لا رہا ہوں۔ میں نے سوتے میں اُس کی حفاظت کی ہے اور بارہا اُس کے دشمنوں کو بہکا کر اُس کے مامن سے دور لے گیا ہوں۔ اُنہیں مجھ پر یہ گمان کیوں ہے کہ میں اپنے دوست سے بے وفائی کرونگا؟ میرا دوست خود پادری کے پاس جا کر اپنے گناہ کا اقرار کرے گا، اور پھر ہم دونوں خدا کی مغفرت کے امیدوار رہیں گے۔"

برگ چپ چاپ سنتا رہا اور اُس کی آنکھیں مارڈ کے چہرے کا جائزہ لیتی رہیں۔ پھر اُس نے کہا "تم پادری کے پاس جاؤ اور اُسے ٹھیک ٹھیک بات بتا دو۔ تمہیں انسانوں میں واپس چلے جانا چاہئے۔"

"آہ، میرے تنہا جانے سے کیا فائدہ؟ تمہارے گناہ کی وجہ سے مُردوں کی روحیں میرا پیچھا نہیں چھوڑتیں۔ تم دیکھتے نہیں ہو کس طرح کانپ رہا ہوں؟ تم نے خود خدا پر اپنا ہاتھ اٹھایا ہے۔ تمہارے گناہ سے بڑھ کر بھی کوئی گناہ ہے؟ تم نے مجھ سے کیوں کہا کہ خدا عادل ہے؟ آہ، یہ تم ہی تو ہو جو مجھے اپنی ذات سے بے وفائی کرنے پر مجبور کر رہے ہو۔" وہ برگ کے سامنے اپنے گھٹنوں پر جھک گیا۔

خونی نے اپنا ہاتھ اُس کے سر پر رکھ دیا اور اُس کی طرف دیکھنے لگا۔ اُس نے اپنے رفیق کے خوف کو معیار قرار دے کر سوچنا شروع کیا تو اُسے اپنا گناہ بڑھتے بڑھتے ایک پہاڑ کی مانند نظر آنے لگا؛ اور اُس نے اپنے آپ کو خدا کی مشیت سے جو ساری دنیا پر

حکومت کرتی ہے جنگ کرتے ہوئے پایا۔ اُس کا دل پشیمان ہو گیا۔

اُس نے کہا "لعنت ہو مجھ پر، میں نے کیا کیا جو کچھ کیا۔ اور یہ دکھ بھری زندگی، خوف اور محرومی کی زندگی، کیا یہ میرے گناہ کا کفارہ نہیں ہو گئی؟ کیا میں نے اپنی دولت اور اپنے آرام کو چھوڑ نہیں دیا؟ کیا میں اپنے دوستوں اور اُن تمام مسرتوں سے جن سے زندگی عبارت ہے محروم نہیں ہو گیا؟ اب اور میں کیا کروں؟"

جب ٹارڈ نے یہ باتیں سنیں تو وہ تڑپ کر کھڑا ہو گیا "تم اپنے کئے پر پریشان بھی ہو سکتے ہو! میری باتوں نے تمہارے دل پر اثر کیا ہے؟ آؤ، آؤ، جلدی آؤ۔ آؤ! ابھی وقت ہے کہ ہم کسی طرف کو نکل چلیں"۔

دیو قامت برگ چونک اٹھا "ہیں، تم نے ـــــ"۔

"ہاں، ہاں، ہاں۔ میں نے تمہارا بیٹا اُن کو بتا دیا ہے۔ جلد آؤ۔ آؤ، اب آ جاؤ تم توبہ کرو گے تو خدا تمہارا گناہ معاف کر دے گا۔ ہمیں بچ نکلنا چاہئے۔ ہم بچ نکلیں گے"۔

قاتل زمین کی طرف جھکا جہاں اُس کے قدموں میں اُس کے آبائی جنگی تبر پڑی ہوئی تھی "چور کے بچے میں نے تیرا اعتبار کیا ـــ تجھ سے محبت کی"۔

لیکن جب ٹارڈ نے اُسے زمین کی طرف جھکتے دیکھا تو اُس نے سمجھ لیا کہ اب اُس کی اپنی زندگی خطرے میں ہے۔ اُس نے اپنی پیٹی میں سے اپنی کلہاڑی نکالی اور قبل اس کے کہ برگ سر اٹھائے اُس نے اپنا وار کر دیا۔ برگ سر کے بل زمین پر آ رہا۔ اور اُس کے خون کے فوارے غار میں چلنے لگے۔ ٹارڈ نے دیکھا کہ اُسکے اُلجھے ہوئے گھنے بالوں میں کلہاڑی کا ایک بڑا سا سرخ زخم منہ کھولے چمک رہا ہے۔

اس کے بعد دیہاتی غار میں آ پہنچے۔ اُنہوں نے ٹارڈ کی تعریف کی اور کہا کہ تمہیں پوری معافی ملنی چاہئے۔

ٹارڈ نے اپنے ہاتھوں کی طرف نگاہ ڈالی گویا وہ اُن زنجیروں کو دیکھ رہا تھا جو اُسے اپنے محبوب دوست کو قتل کرنے کے لئے کھینچ لاتی تھیں، زنجیریں جو خالی ہوا سے بنی تھیں اور جھیل کی سبز روشنی سے، اور جنگل کے متحرک سایوں سے، اور طوفان کے راگ سے، اور پتوں کی سرسراہٹ سے، اور خیال کے سحر انگیز تصورات سے۔ پھر اُس نے زور سے ایک نعرہ لگایا "اللہ اکبر!"

وہ نعش کے ساتھ لپٹ گیا اور رو رو کر اُس سے باتیں کرنے لگا۔ دیہاتیوں نے اپنی برچھیوں کو جوڑ کر ایک تختہ بنا لیا تاکہ آزاد کسان کے مردہ جسم کو اس پر ڈال کر اُس کے گھر پہنچا دیا جائے۔ لوگوں کے دلوں پر ایک ہیبت طاری تھی اور وہ نعش کی موجودگی میں اپنی آوازوں کو بلند نہ کر سکتے تھے۔ جب لوگوں نے اس کو برچھیوں پر رکھ کر اٹھایا تو ٹارڈ کھڑا ہو گیا۔ اُس نے اپنے سر کو جھٹکا دے کر بالوں کو پیچھے کیا جو اُس کی آنکھوں کے سامنے آ گئے تھے، اور کانپتی ہوئی آواز میں بولا:۔

"اُن سے کہہ دینا کہ اسے وہ جس کے لئے دیو قامت برگ نے قاتل بننا پسند کیا، ماہی گیر ٹارڈ نے جس کا باپ طوفان زدوں کو لوٹتا ہے اور جس کی ماں جادوگرنی ہے، برگ کو قتل کر دیا کیونکہ برگ نے اس کو بتایا تھا کہ عدل دنیا کا اساسی پتھر ہے"۔

منصور احمد

تہذیب

گو یہ دعوے سچ ہے اے تہذیب کی روشن جبیں!
وجد آتا ہے زمانے کو ترے اشغال پر
تیری ہی تعلیم سے کرتا ہے حاصل روزگار
سیکھتی ہے تیرے ہی مکتب میں بزمِ آب و گل
تیری ہی رعنائیوں سے یہ سبق لیتے ہیں ہم
حرفتوں کی کارفرما، صنعتوں کی کردگار!
مانگتی ہے بھیک میں تجھ سے تبسّم کائنات
شمع سے رہتا ہے بالا تیرے پروانوں کا رنگ
بے مشقّت خلق ہوتی ہے طرب سے بہرہ یاب
ساتھ ساتھ آتی ہیں حوریں ناز فرماتی ہوئی
نغمے کی کلیاں چٹکتی ہیں تری گُفتار میں
کھیلتی ہے تیری صبح و شام بازاروں کے ساتھ
تند گامی سے تری اے مرکبِ برق آفریں
ولولوں کے واسطے ہوتا ہے سازِ فتح یاب
وجد میں آتی ہے اہلِ انجمن کی زندگی
عیش کا جویا شباب آمادہ ہو کر خواب پر

جگمگا اُٹھتا ہے پرتو سے ترے صحنِ زمیں
ناچتی ہے خلق تیرے گھنگروؤں کی تال پر
بات کرنے کا فسوں، خاموش رہنے کا وقار
کس طرح سے مسکرا کر فتح کر لیتے ہیں دل!
انجمن میں یوں اُٹھاتے ہیں نزاکت سے قدم!
شعر و موسیقی پر آتی ہے ترے دم سے بہار
تیری لَو سے جگمگا اُٹھتی ہے محرابِ حیات
شوخ تر ہوتا ہے مے سے تیرے پیمانوں کا رنگ!
دہر میں بجتا ہے جب تیری مشینوں کا رباب
جب تری عنّابیاں اُٹھتی ہیں اٹھلاتی ہوئی
سحر ہوتا ہے تری پازیب کی جھنکار میں
جشن ہوتا ہے ترا سکّوں کی جھنکاروں کے ساتھ
کانپ کر اپنی طنابیں کھینچ لیتی ہے زمیں
ناز سے اٹکھیلیاں کرتا ہوا تیرا شباب
سرسراہٹ سے، وہ تیرے ریشمی ملبوس کی
کروٹیں لیتا ہے تیرے بسترِ سنجاب پر

کنگنوں میں تیرے ہوتی ہے وہ رنگیں روشنی — مسکراتی ہے کلائی نوعروسِ دہر کی

پینگ نو دیتی ہے دل کو نرگسِ بیمار میں — کشتیاں کھینچتی ہے تو موجِ لبِ رخسار میں

کانپتی ہے مشعلوں کے جگمگانے کی ادا — یوں سکھاتی ہے حیا کو مسکرانے کی ادا!

لوچ آجاتا ہے تجھ سے حسن کی رفتار میں — لوچ بھی ایسا جو ہوتا ہے اُپی تلوار میں

شب کے سناٹے میں جنت کو صدا دیتی ہے تو — چاندنی کو نورِ افشاں میں ملا دیتی ہے تو!

نازنینوں کے تبسم میں پئے تکمیلِ کار — تو ملا دیتی ہے اک موہوم سی موجِ ستار!!

شورشِ ہستی میں کیا کیا زیر و بم رکھتی ہے تو
کس تکلف سے عناصر پر قدم رکھتی ہے تو

(۲)

لیکن اے آرائش و انداز کی پروردگار! — روحِ انسانی کو راس آتی نہیں تیری بہار

مسخ ہو جاتی ہے تجھ سے فطرتِ نوعِ بشر — ضرب پڑتی ہے براہِ راست تیری، روح پر

جامۂ اخلاص ہو جاتا ہے تن پر تار تار — ہونٹ ہو جاتے ہیں مصنوعی تبسم کے شکار

برق دے کر دیدۂ بے نور کرتی ہے ہمیں — ایکٹر بننے پہ تو مجبور کرتی ہے ہمیں!

تیرگی کی شمع پر جلتے ہیں پروانے ترے — ذوقِ کاوش کو سُلا دیتے ہیں افسانے ترے

وہ تری اکسیر ہے اکسیر کو کرتی ہے خاک — ناز کر دیتا ہے تیرا زندہ قوموں کو ہلاک

علم کی افراط سے کرتی ہے جرأت کو خراب — نوجوانمردی کو دیتی ہے جہالت کا خطاب!

اُس صلابت کو کہ جس پر زندگی کا ہے مدار — لوریاں دے دے کے کرتی ہے نزاکت سے دوچار

تو امیروں سے دلاتی ہے فقیروں کو خراج — چھین لیتی ہیں تری برنائیاں شاہوں کے تاج

نازنیں سے خنجرِ براں ہیں گردن کے لئے — سم ہیں تیرے "نونگے" نیر دے جوش کے لئے

جیب میں رکھتی ہے تو وہ تیز خواب آور دوا — کہتے ہیں جس کو زبانِ شعر میں "حسن و ادا"

دیکھتے ہی آتش و آہن میں لگ جاتا ہے زنگ — انکھڑیوں میں تو وہ رکھتی ہے شکر خوابی کا رنگ!

زخم کو آسودۂ مرہم بنا دیتی ہے تُو — اخگروں کو قطرۂ شبنم بنا دیتی ہے تُو

تندرستوں کو عطا کرتی ہے بیماروں کا لوچ — لرزشِ صہبا میں گم کرتی ہے تلواروں کا لوچ

جس بدن کو تو پنہاتی ہے حریر و پرنیاں — اُس بدن کی سوکھ جاتی ہیں بالآخر ہڈیاں

رابطہ ہے جن کو تیرے خلعتِ گلفام سے — جلد چھل جاتی ہے اُن سب کی زرہ کے نام سے!!

تیرا مارا دو گھڑی کلفت میں رہ سکتا نہیں — معرکے میں آنچ تلواروں کی سہہ سکتا نہیں

غازیوں کو مسکرا کر آئینہ دیتی ہے تُو — قیمتِ آئینہ میں تلوار لے لیتی ہے تُو

زلف تیری توڑ دیتی ہے سپاہی کی کمند — بخشتی ہے شیر کے سینے کو قلبِ گوسفند

اوّل اوّل محو کر دیتی ہے تصویروں میں تُو — پھر جکڑ لیتی ہے اہلِ فن کو زنجیروں میں تُو

شیشۂ دل چُور کر دیتا ہے تیرا جامِ جم — ہات سے چھوٹے ہوئے جامِ بلوریں کی قسم!!

چھین لیتا ہے زمانے سے تری تانوں کا شور — فکر کی رفعت ارادوں کی جوانی دل کا زور

گوشِ جاں کو نغمۂ شیریں سے بھر دیتی ہے تُو — پھر اُنہیں نغموں میں آخر دفن کر دیتی ہے تُو!!!

کس قدر معشوقیت ہے تیری شانِ قہر میں — غرق کرتی ہے تبسم کی گلابی لہر میں!!

باز آئے ہم ترے اس مرگ پرور حلم سے — اے سیہ رو! جہل ہی اچھا ہے ایسے علم سے

رہ چکے جس وقت تک رہنا تھا قسمت میں غلام

اے سبک سر! دُور سے لے ہم غریبوں کا سلام

جوش

تاریخِ عالم پر ایک نظر

کب ہوا؟	کیا ہوا؟
۳٬۰۰۰٬۰۰۰٬۰۰۰ سال ہوئے	زمین سورج کے بطن سے پیدا ہوئی۔
۸۰۰٬۰۰۰٬۰۰۰ ،، ،،	زمین پر زندگی کے آثار نمودار ہوئے
۵۰۰٬۰۰۰ ،، ،،	انسان پیدا ہوا (دروغ برگردنِ سائنس)
۱۰۰٬۰۰۰ ،، ،،	زمانہ حجریۂ قدیمہ جب لوگ غاروں میں رہتے تھے۔
۱۲٬۰۰۰ قبل مسیح	دنیا کا پہلا (؟) تمدن شہر ایلم میں
۵٬۰۰۰ ق م	زمانۂ حجریۂ جدیدہ مشرق قریب میں ختم ہوا اور دھاتوں کا زمانہ شروع ہوا۔ دھاتوں کی دریافت سے ابتدائی تمدن نے فروغ پایا۔
	بابل اور شاید اس کے جلد بعد مصر کا تمدن اسی زمانے میں شروع ہوا۔
۴٬۵۰۰ ،،	شاہ مینیز مصر کے پہلے شاہی خاندان کے بانی نے شہر ممفس کی بنا ڈالی۔ قدیم مصر میں کل اکتیس شاہی خاندان ہوئے جنھوں نے تقریباً ۴ ہزار سال تک حکومت کی۔ زراعت و آبپاشی، ساحت و ہیئت، جہاز رانی و تجارت، زر و مبادلہ، قانون و طب، حکومت و مذہب، کتابت و تزئین مصر نے ان سب علوم و فنون میں ترقی کی۔
۴٬۰۰۰ ،،	چین کے تمدن کا آغاز (یوں چینیوں کا دعویٰ ہے کہ ان کے تمدن کی عمر ایک لاکھ سال ہے) چینی معاشرت کا نظام جاگیری تھا جو تقریباً دو ہزار سال (۲۲۰۰ تا ۲۴۶ ق م) تک قائم رہا۔ چین کا عظیم الشان تمدن زیادہ تر مادی تھا۔ بارود، چھاپہ، کمپاس چینیوں ہی کی ایجادیں ہیں۔
۳٬۰۰۰ ،،	اہرام مصر تعمیر ہوئے۔ فرعون خافو نے ہرم عظیم بنایا۔
۲٬۱۰۰ ،،	حمورابی شاہِ بابل نے اپنے منصفانہ قوانین نافذ کئے۔ یہ سب سے پہلا مجموعۂ قوانین ہے جو ہم تک پہنچا ہے۔
۲٬۰۰۰ ،،	آریائی یا ہندی یورپی لوگوں نے ایک بیان کے مطابق وسط ایشیا سے اور ایک دوسرے شاید زیادہ واثق بیان کے مطابق شمال مشرقی روس سے جنوب کی طرف بڑھنا شروع کیا۔ ان کی حکومت پدرسری قسم کی تھی اور ان کا مذہب مظاہر پرستی۔ انہیں لوگوں کی عظیم الشان نقل مکانیوں کے سلسلے میں جو ایک ہزار سال تک جاری رہیں آریا ہندوستان میں، ایرانی ایران میں، میدی لیدی بابل و اشوریا میں، اکی دوری آیونی

یونان میں، لاطینی اطالیہ میں اور کلٹ جرمنی، فرانس، سپین اور انگلستان میں جا کر متمکن ہو گئے۔

۱۹۲۵ ق م ہتیوں نے شہر بابل پر قبضہ کر لیا۔

۱۸۰۰ء ابراہیم (قبیلہ یا حضرت ابراہیم؟) نے بابلی شہر اُر کو چھوڑا۔ غالباً اسی زمانہ میں ہندوستان میں وید مرتب ہو رہے تھے۔

۱۶۰۰ء جزیرہ کریٹ کا تمدن اپنے کمال پر تھا۔

۱۴۰۰ء موسیٰ کی قیادت میں یہودی مصر چھوڑ کر نکلے۔

آریا پنجاب سے بڑھ کر گنگا کی وادی پر قابض ہونے لگے۔

۱۳۶۲ مصر میں توتخ آمین تخت نشین ہوا۔

۱۲۷۵ اشوریوں نے شمال سے آ کر بابل کو فتح کیا۔ سناحرب کا عہد (۷۰۵ تا ۶۸۱) اشوری تمدن کا زریں زمانہ ہے۔ یہ لوگ اپنی جنگی قابلیت اور خونریزی کے لئے مشہور تھے۔ اس سے قبل ۳۰۰۰ ق م سے یہ لوگ بالائی دجلہ کے علاقے میں ہمسایہ قوموں کے لئے ایک آفت بنے رہے تھے۔

۱۰۱۵ حضرت داؤدؑ کی حکومت تا ۹۷۵

۱۰۰۰ زرتشت نے زرتشتیت یعنی نور و ظلمت کے مذہب کی تلقین کی۔ اس کے نزدیک ارمزد روشنی اور راستی کا خدا ہے لیکن اہرمن جو تاریکی اور بدی کا دیوتا ہے ہمیشہ اس کی مخالفت پر آمادہ رہتا ہے۔ اس کشمکش میں انسان کا کام ارمزد کی حمایت ہے۔

۸۵۰ تا ۷۵۰۔ ایشیائے کوچک میں ہومر اور اس کے معاصر شعرا کا زمانہ

۸۰۰ تا ۵۱۳ ہندوستان میں "شاستروں کے فلسفے کا دور"

۷۷۵ حضرت سلیمانؑ کا عہد تا ۷۳۵۔ یہودیوں کا تمدن اس زمانے میں چمکا۔ اس کے بعد وہ دو فرقوں اسرائیل اور یہود میں منقسم ہو گئے۔

۷۵۳ شہر روما کی بنا پڑی۔

۶۰۶ مختلف قوموں نے شامل ہو کر اشوریوں کے خلاف بغاوت کا جھنڈا بلند کیا اور نینوا کو مسمار کر دیا۔ بابل میں کلدانیوں نے اپنا سکہ جمایا۔ بحیرۂ روم کے کنارے فینیقیوں نے اپنا پھریرا اڑایا۔ فینیقی تجارت کے دھنی اور جہازرانی کے ماہر تھے۔ موجودہ مغربی رسم الخط انہیں کی ایجاد ہے۔ دور بابل کے شمال مغرب میں لیدیوں اور شمال مشرق میں میدیوں نے اپنی اپنی سلطنت قائم کر لی۔ میدیو کے جنوب کی طرف ایرانیوں کا علاقہ تھا۔

۵۵۷ تا ۴۷۷ گوتم بدھ جس نے ہندوستان میں اپنے مذہب کی اشاعت کی۔ اس نے مساوات اور نیکی کی تعلیم دی اور کرم اور نروان کے ذریعے سے نوع انسان کے نجات پانے کا منتہ دکھایا۔ ذات پات کی تفریق اور برہمنوں کے تفوق سے ہندو معاشرت کی حالت خراب ہو چکی تھی۔ بدھ نے اس کی اصلاح کرنی چاہی۔ بدھ مت پہلے چند صدیوں ہندوستان میں پھیلا لیکن آٹھویں صدی کے بعد برہمنوں نے اسے نیچا دکھایا اور ہندوستان میں اس کا قلع قمع کر دیا۔

۵۵۱ ق م تا ۴۷۹ - کنفیوشس نے چین میں اپنے خیالات کی ترویج کی۔ اُس نے انسانیت، عدل، فرماں بری اور دیانت داری کا سبق نوعِ انسان کو پڑھایا۔ مذہبی رہنما لاؤتسی کا بھی قریب قریب یہی زمانہ ہے۔

۵۴۶ ایرانی فرمانروا کیخسرو نے بمقام سارڈس لیدیوں کو فاش شکست دی۔ اس کے آٹھ سال بعد بابل نے بھی اس کا لوہا مان لیا۔

۵۲۱ ایران میں دارا کا عہدِ حکومت تا ۴۸۵ - ایرانی تمدن کو ترقی ہوئی۔ امن و امان قائم ہوا۔ تجارت پھیلی۔ مذہبوں کو رواداری کی نعمت ملی۔ اس زمانے سے آریائی قومیں انسانی ترقی کی ذمہ دار ٹھہریں۔

۵۰۹ روما ایک جمہوریہ بن گیا جو برابر ۲۷ ق م تک قائم رہی۔

۴۹۰ جنگ میراتھان جس میں یونانیوں نے ایرانیوں کو پچھاڑا اور یورپ کو ایشیا کے استبداد سے بچا لیا۔ ۴۴۵ تا ۴۳۱ پیریکلیز کا زمانہ جس میں ایتھنز اپنے معراجِ کمال پر پہنچا۔ یونانیوں نے طبیعیات اور خصوصاً فلسفے کو ترقی دی اور دنیا میں پہلی بار عقل کی مشعل بلند کی۔

۴۵۱ روما میں بارہ تختیوں کا قانون نافذ ہوا یہ روما کے مہتم بالشان قانونی نظام کا آغاز تھا جس کا بالآخر کم و بیش ساری دنیا پر اثر پڑا۔

۳۹۹ سقراط نے اپنی صداقت آموزی کی پاداش میں زہر کا پیالہ پیا۔ سقراط کا شاگرد افلاطون تھا (۴۲۷ تا ۳۴۷) اور افلاطون کا شاگرد ارسطو (۳۸۴ تا ۳۲۲) جس کی نظیر زمانہ پھر کبھی پیش نہ کر سکا۔

۳۲۶ سکندر اعظم نے ہندوستان پر حملہ کیا۔ سکندر کی بدولت مشرقی دنیا کے بعض ممالک پر یونانی تمدن کا اثر پڑا۔ یونانیوں نے اس زمانے کے ہندوؤں کی بہت تعریف لکھی ہے۔

۳۲۱ چندر گپت نے ہندوستان میں بمقام پاٹلی پترا (پٹنہ) پہلے بڑے شاہی خاندان کی طرح ڈالی۔

۲۷۳ تا ۲۳۲ - اشوک کا عہد جو امن و امان اور اخلاقی ترقی کا زمانہ تھا۔

۲۶۴ تا ۱۴۶ - روما اور کارتھیج کی باہمی لڑائیاں جس میں بالآخر روما کامران رہا۔

۲۱۴ چینی شاہنشاہ شی ہوانگ ٹی نے دیوارِ عظیم بنانی شروع کی۔

۱۴۶ رومیوں نے اِدھر یونانی شہر کورنتھ اُدھر کارتھیج پر حملہ کر کے دونوں کو مسمار کر دیا۔

۱۳۳ تا ۳۱ جمہوریۂ روما کی عظمت و جبروت کا دور۔ روما نے مغرب کے اکثر حصوں پر قبضہ کر کے وہاں اپنے مفید قوانین نافذ کئے۔

۶۶ روما کی فوجیں دریائے فرات کے کناروں پر پومپے کی سپہ سالاری میں پہنچیں۔

۴۴ مشہور رومی قائد و مدبر جولیس سیزر کا قتل

۳۱ ایکٹیم کی لڑائی ہوئی جس میں اوکٹیوئیس نے انٹنی کو شکست دی۔ چار سال بعد ۲۷ ق م میں اوکٹیوئیس روما کا شاہنشاہ بن گیا۔

۴ ق م مسیح پیدا ہوا۔ اُس نے دنیا کو ایثار و محبت کی تعلیم دی۔

۳۰ء مسیح کی وفات

۹۶ء تا ۱۸۰ء روما میں پانچ نیک نہاد شاہنشاہوں کا زمانہ جب روما نے اپنے مشرقی و مغربی مقبوضات میں تمدن کی روشنی پھیلائی۔ امن وامان قائم ہوا۔ قانون وعدل کا سکہ رائج ہوا۔ تجارت کو ترقی ہوئی۔ شاندار سڑکیں بنیں + روما نے یونان کی شائستگی کو برقرار رکھا اور مغرب کے جہلا کی تعلیم وتربیت کا کام اپنے ذمے لیا۔ اور اسے خوش اسلوبی سے نبھایا۔

۱۵۰ء ہندوستان کاشغر ختن وغیرہ میں کنشک کی حکومت

۲۲۰ء چین میں ہان خاندان کا خاتمہ اور اُن تفرقہ پردازیوں کا آغاز جو چار سو سال تک جاری رہیں۔

۲۲۶ء اردشیر پہلا ساسانی بادشاہ ایران میں تخت نشین ہوا۔

۲۴۲ء مانی نے اپنے مسلک کی تلقین کی ۲۷۶ء میں اُسے سولی پر چڑھا دیا گیا۔

۳۱۳ء قسطنطین اعظم نے مسیحی کلیسا سے صلح کر لی۔ ساٹھ سال کے شدید مظالم کے بعد عیسائیوں سے رواداری کا سلوک کیا جانے لگا۔

۳۳۰ء قسطنطین نے قسطنطنیہ کا شہر آباد کیا اور اُسے اپنا دار السلطنت بنا لیا، تقریباً گیارہ سال تک قسطنطنیہ مغربی تمدن کا عظیم الشان مرکز بنا رہا +

۳۷۲ء ہنی حملہ آوروں نے مشرقی یورپ کو تہ وبالا کیا۔

۴۱۰ء گاتھی حملہ آور الارق نے روما کو تاخت وتاراج کیا۔ ۴۷۶ء میں روما کی سلطنت کا خاتمہ ہوگیا اور اُس کی بجائے سپین میں مغربی گاتھ افریقہ میں وینڈل، اطالیہ میں مشرقی گاتھ، فرانس وغیرہ میں فرینک، جرمنی اور انگلستان میں سیکسن اور اینگل قوموں نے اپنی خود مختار حکومتیں قائم کرلیں +

۵۰۰ء تا ۶۰۰ء ہندوستان میں پرانوں کا زمانہ۔ موجودہ ہندومت رونما ہوئی۔ بکرماجیت کے دربار کے نو رتنوں میں کالیداس ڈرامانگار نے شہرت پائی۔

۵۲۷ء تا ۵۶۵ء مشرقی شاہنشاہ جسٹنطین کا عہد جس نے اپنی "کوڈ" یعنی شہرہ آفاق رومی مجموعہ قوانین میں روما کی قانونی کارگذاری کو دنیا کے سامنے پیش کیا۔

۵۷۱ء پیغمبر اسلام کی پیدائش۔

۶۲۲ء حضرت محمد نے ہجرت کی۔ اور وحدانیت کا نعرہ بلند کیا۔ اسلام نے بت پرستی کی بیخ کنی کی، مساوات اور حریت اور اخوت کی عملی تلقین کی۔ سادگی اور راستبازی پر زور دیا۔ اور انسانی ترقی کے لئے اعتدال کی راہ دکھائی۔

۶۲۷ء ٹانگ خاندان کا دوسرا فرماں روا ٹے ٹسنگ چین کا شاہنشاہ ہوا۔ اُس کی سلطنت انام سے لے کر بحیرۂ کیسپین تک پھیلی ہوئی تھی۔ ان دنوں چینی تمدن اپنے عروج پر تھا۔ قانون کی تبویب کی گئی، ادبی امتحانوں کے طریقے کی اصلاح کی گئی چینی علوم وفنون کو فروغ ہوا۔

۶۲۸ء عربوں کی ایک جماعت پیغمبرِ اسلام کا نامہ متعلق بہ دعوتِ اسلام لے کر چینی شاہنشاہ کے سامنے حاضر ہوئی جس نے انہیں کینٹن میں ایک مسجد بنانے کی اجازت دی۔ یہ مسجد دنیا کی قدیم ترین مساجد میں سے ہے +

۶۳۴ء حضرت عمرؓ کی خلافت تا ۶۴۴ء

۶۳۶ء ابوالعاص عاملِ یمن نے ہندوستان پر حملہ کیا۔

۷۱۱ء عربوں نے طارق بن زیاد کی قیادت میں ہسپانیہ کو فتح کیا۔ سات آٹھ صدیوں تک یورپ اندلس کے عربی تمدن سے متمتع ہوتا رہا۔ یورپ کے اکثر مشہور علما اندلس کے دارالعلوموں کے تعلیم یافتہ تھے ۷۱۵ء میں خلیفہ ولید کی سلطنت پیرنیز سے کاشغر چین تک پھیلی ہوئی تھی

۷۳۲ء چارلز مارٹل نے عربوں کو تور (فرانس) پر شکست دی جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ مسیحیت نے یورپ کے بیشتر حصے میں اپنا مخصوص تمدن قائم رکھا

۸۰۰ء پوپ نے شہر روما میں فرانسیسی حکمران شارلمین اعظم کے سر پر سنہری تاج رکھا اور اُسے شاہنشاہ کا لقب دیا۔ اس "مقدس رومی سلطنت" کے قیام سے گویا پاپائیت مشرقی شاہنشاہوں سے آزاد ہوگئی اور مسیحیت کے لئے ایک نوع کی دینی و دنیوی مرکزیت پیدا ہوگئی +

اس زمانے میں مشرق و مغرب میں چار زبردست متمدن حکومتیں قائم تھیں۔ ہسپانیہ میں خلافتِ قرطبہ۔ وسطِ یورپ میں "مقدس رومی سلطنت" مشرقی یورپ میں بازنطینی سلطنت اور عراق میں خلافتِ بغداد جس کی تہذیب کی روشنی دور دور تک پھیلی (۷۵۰ء تا ۹۵۰ء) +

۸۵۰ء تا ۱۰۰۰ء "شمالیئے" اور خانہ بدوش مسیحی و اسلامی دنیا پر ٹوٹ پڑے۔ میگیار لوٹ مار کے بعد ہنگری میں بس گئے۔ شمالی وائکنگ انگلستان فرانس روس پر جھپٹے بلکہ امریکہ تک جا پہنچے (۱۰۰۰ء) فرانس میں وہ نارمنڈی میں آباد ہوگئے۔ روس میں انہوں نے روسی سلطنت کی بنیاد ڈالی، جزیرہ صقلیہ بھی جہاں سے دو صدیوں تک اسلامی تمدن کے اثرات اطالیہ و یورپ میں پھیلے تھے اُن کے زیرِ اقتدار آگیا۔ (۱۰۶۰ء)

۹۲۲ء عربی مورخ طبری نے انتقال کیا۔ طبری کی تاریخ آٹھ ہزار صفحات پر مشتمل ہے اس میں کم از کم ایک ہزار صفحات قبلِ اسلام کے واقعات سے متعلق ہیں۔

۱۰۳۷ء بوعلی سینا مشہور طبیب و فلسفی کی موت

۱۰۵۴ء حریری (بغدادی) مقاماتِ حریری کے مصنف کی پیدائش۔ وفات ۱۱۲۲ء

۱۰۵۸ء تا ۱۱۱۱ء امام غزالی مشہور اسلامی متکلم فلسفی جس نے فلسفے کے خلاف مذہب کے حق میں متعدد وقیع تصنیفات چھوڑیں۔

۱۰۶۶ء نارمنڈی کے ڈیوک ولیم فاتح نے ہیسٹنگز کے مقام پر انگریزی فوج کو شکست دی اور موجودہ انگریزی شاہی خاندان کی بنیاد ڈالی۔ انگلستان کا برِاعظم اور بیرونی دنیا سے قریبی تعلق پیدا ہوا۔

۱۰۹۶ء تا ۱۲۹۲ء مسلمانوں اور عیسائیوں کے درمیان صلیبی لڑائیاں ہوئیں۔ مبارزا ور جاگیردار جن کے نظامِ جاگیری نے بربریت

حملوں کے دوران میں یورپ کی معاشرتی شیرازہ بندی کو قائم رکھا تھا ہزاروں لاکھوں کی تعداد میں ارضِ مقدس کی طرف چل کھڑے ہوئے صلیبی لڑائیوں سے بازنطینی سلطنت کچھ عرصے کے لئے مسلمانوں کی دست برد سے بچ گئی۔ ان سے پاپائیت کی قوت بڑھ گئی اور عیسائیت کی صورت مسخ ہوئی لیکن ساتھ ہی تجارت کو فروغ ہوا۔ امرا کی طاقت چکنا چور ہو کر یورپ میں مضبوط مطلق العنان ملوکیت کے لئے رستہ صاف ہو گیا۔ اور سب سے بڑھ کر یہ کہ اسلامی تمدن اور علوم کی روشنی مغرب میں پھیلنے لگی +

۱۱۹۳ء محمد غوری نے تھانیسر کی لڑائی کے بعد دہلی فتح کر کے ہندوستان میں مسلم حکومت کی بنیاد ڈالی۔ اس کے بعد تقریباً چھ صدیوں تک پہلے افغانی پھر ترک پھر مغل مسلمان ہندوستان پر حکمران رہے اور ہندوستان میں امن و امان اور ایک نیا زیادہ جمہوری تمدن قائم ہوا

۱۱۹۸ء ابن رشد مشہور قرطبی فلسفی مر گیا

۱۲۱۳ء چنگیز خاں نے چین پر حملہ کیا اور نوے شہروں کو برباد کر دیا۔ اس کے جانشین اوگدے خاں نے روس کو فتح کیا (۱۲۴۰ء) پولینڈ کو تباہ و برباد کیا (۱۲۴۱ء)۔ اور یہ مغرب کی خوش قسمتی تھی کہ آئندہ سال اوگدے مر گیا۔ تاتاریوں کی سلطنت اس وقت پیکن سے لے کر پولینڈ میں دریائے دینوب کے کناروں تک پھیلی ہوئی تھی +

۱۲۱۵ء انگریزی بادشاہ جان نے "سندِ اعظم" پر دستخط ثبت کر دیئے۔ یہ انگریزی سیاسی آزادی اور تہذیبِ حاضر کے جمہوری اداروں کا آغاز تھا

۱۲۶۰ء تا ۱۲۹۴ء کبلے خاں تاتاری تخت پر جلوہ افروز ہوا۔ وہ اپنے زمانے کے بہترین فرمانرواؤں میں سے تھا اسی کے عہدِ سلطنت میں یورپ نے چین کی قدیم تہذیب سے استفادہ کیا۔ اور یوں بارود، کمپاس، چھاپہ اور کاغذ سازی کے وہ فنون سیکھے جن کے تصادم سے عہدِ وسطیٰ کی تہذیب پاش پاش ہو گئی اور ایک نیا مضبوط تمدن رونما ہوا +

۱۲۵۸ء ہلاکو خاں نے بغداد کو تباہ کر دیا۔ ۱۲۷۱ء مارکوپولو مشہور اطالوی سیاح نے چین کا رخ کیا۔

۱۳۰۰ء اطالوی شاعر دانتے نے اپنی عشقیہ نظم "ویتا نووا" (نئی زندگی) لکھی۔ بعد میں اُس نے اپنی شہرہ آفاق نظم "ڈیوینا کومیدیا" یا "ڈیوائن کومیڈی" (ربانی سرور یہ) لکھی۔

۱۳۰۹ء تا ۱۳۷۶ء پوپ کی "بابلی قید" فرانسیسی فرمانروا نے پوپ کو اپنی حراست و حفاظت میں لے لیا۔ اس سے پاپائیت کی گذشتہ شان و شوکت اور احترام جاتا رہا۔

۱۳۴۳ء تا ۱۳۸۹ء حافظ شیراز جس نے غزل گوئی کو ایک روحانی (آسمانی) درجہ بخشا

۱۴۰۶ء مورخ ابنِ خلدون جس نے فلسفۂ تاریخ کے متعلق اپنا لاجواب "مقدمہ" لکھا مر گیا۔

۱۴۲۹ء ژان دارک نے اورلیاں (فرانس) پر انگریزوں کو شکست دی۔ مدت سے انگلستان اور فرانس میں صد سالہ جنگ جاری تھی۔ ژان دارک کا ظہور گویا حب الوطنی کا روحانی جلوہ تھا۔ کچھ عرصے سے مغربی یورپ میں قومی بیداری کے آثار نمایاں ہو رہے تھے۔ اب قومی ربط و ضبط کے نتیجے ظاہر ہونے لگے +

۱۴۳۴ء اطالوی شہر فلارنس کی شائستگی اپنے عروج پر تھی + یہ یورپ میں نشاۃ الثانیہ کا دور تھا جب مختلف خود مختار شہروں نے علم و

تہذیب کا جھنڈا بلند کیا اور علماء وفضلا کے ایک گروہ نے پرانے یونانی ولاطینی علم وادب کچھ عربوں کی رہنمائی میں کچھ اپنی تجسس سے سیکھ کر یورپ بھر میں اُن کی ترویج کی۔ بوکاچیو (۱۳۱۳ء تا ۱۳۷۵ء) ادیب، کوپرنیکس (۱۴۷۳ء تا ۱۵۴۳ء) سائنس دان، رافیل مصور (۱۴۸۳ء تا ۱۵۲۰ء) وغیرہ وغیرہ اس عہد کے مشاہیر ہیں +

۱۴۵۳ء ترکوں نے قسطنطنیہ کو فتح کیا۔ بہت سے یونانی علماء نے آکر اطالیہ کے شہروں میں پناہ لی۔ اور ان کی مساعی سے پرانے علوم کی اشاعت کو ترقی ہوئی +

۱۴۹۲ء ہسپانیوں نے غرناطہ پر حملہ کیا اور عربوں کو اندلس سے نکال دیا +

اسی سال میں کولمبس نے امریکہ کو دریافت کیا + ترکوں کے دباؤ کی وجہ سے دولِ یورپ اپنی مشرقی تجارت کو برقرار رکھنے کی نئی راہیں ڈھونڈنے لگیں۔ اس کے علاوہ کمپاس کی مدد سے اب بحری سفروں میں پہلا سا خطرہ نہ رہا۔ نیز زمین کی گولائی کا تعین نئی جغرافیائی اکتشافات کے لئے محرک ثابت ہوا۔

۱۴۹۹ء سوٹزرلینڈ ایک جمہوریہ بن گیا +

۱۵۱۷ء لوتھر نے پوپ کے خلاف اعلان جنگ کر کے اپنے "پچانوے اصول" وٹنبرگ (جرمنی) کے گرجے کے دروازے پر آویزاں کر دیئے۔ یہ تھا اصلاحِ تحریکِ کلیسا اور پراٹسٹنٹیت کا آغاز۔ اس کے بعد تقریباً سوا سو سال تک یورپ میں مذہبی لڑائیاں اپنے زوروں پر رہیں اور مسیحیت دو بڑے فرقوں رومن کیتھلک اور پراٹسٹنٹ میں منقسم ہوگئی +

۱۵۱۹ء تا ۱۵۵۶ء ہسپانوی سلطنت کے اقتدار کا زمانہ۔ پوپ نے امریکہ کی دریافت کے بعد کرۂ ارض پر ایک فرضی خط کھینچ دیا تھا جو جزیرہ ایزورز کے پاس سے ہو کر گزرتا تھا۔ اس خط کے مشرق کی طرف کی دنیا پرتگالیوں کو دی گئی اور مغربی طرف کی ہسپانیہ کو + اس سلسلے میں میگیلن ہسپانوی نے ۱۵۱۹ء میں دنیا کے گرد اپنا حیرت انگیز بحری سفر کیا۔ وہ جنوبی امریکہ کی جنوبی راس کے گرد ہوتا ہوا جزائر فیلیپائن کو دریافت کر کے تین سال کے بعد سپین پہنچا +

لیونارڈو ڈونچی نے انتقال کیا۔ یہ مصور جو ایک سنگتراش سائنس دان انجنیئر موسیقی دان اور اور بہت کچھ تھا۔ دنیا کے قابل ترین افراد میں شمار ہوتا ہے "آخری طعام" اور "مونالیزا" اس کی مشہور تصویریں ہیں۔ "مونالیزا" دنیا کی سب سے مشہور تصویر سمجھی جاتی ہے +

۱۵۲۰ء تا ۱۵۶۶ء سلیمان اعظم ترکی سلطان کا عہد جس کی سلطنت بغداد سے ہنگری تک تھی

۱۵۲۶ء پانی پت کی پہلی لڑائی ہوئی اور ہندوستان میں مغلیہ خاندان کی حکومت قائم ہوگئی۔

۱۵۴۱ء مشہور مصور مائیکل انجیلو نے اپنی تصویر "آخری عدل" کو پانچ سال کی شبانہ روز محنت کے بعد مکمل کیا +

۱۵۵۶ء ہندوستان میں اکبر اعظم تخت نشین ہوا۔ اس نے ہندوؤں اور مسلمانوں کے اتحاد کے لئے عملی ذرائع اختیار کئے۔ اکبر کے عہدِ زریں میں ابوالفضل وفیضی سے مصنف ٹوڈرمل سا مدبر عرفی سا شاعر اور تان سین سا موسیقی دان پیدا ہوا +

۱۵۶۴ء گیلیلیو مشہور ہیئت دان پیدا ہوا۔ وہ پہلا شخص تھا جس نے اپنی حیرت انگیز دوربینوں کے ذریعے سے ستاروں کے متعلق

نئی نئی باتیں دریافت کیں (۱۶۱۰ء) مثلاً زحل کے دائرے چاند کے پہاڑ وغیرہ۔ کلیسا نے اسے ان نئی اکتشافات کے جرم میں دھر پکڑا

۱۵۸۱ء ڈچ قوم نے ہسپانوی شاہنشاہ کے خلاف بغاوت کرکے اپنی آزادی کا اعلان کیا اور ہسپانیوں کو ملک سے باہر نکال دیا۔

۱۵۸۸ء انگریزی بحری بیڑے نے ہسپانوی بیڑے کو شکستِ فاش دی۔ اس کے بعد انگلستان گویا سمندر کا حکمران بن گیا۔

۱۵۸۹ء ہنری چہارم نے آکر فرانسیسی قومیت کو یکسوئی کا رستہ دکھایا۔ مذہبی تفرقہ پردازی کا خاتمہ کیا۔

۱۵۹۶ء تا ۱۶۵۰ء فرانسیسی فلسفی ڈیکارٹ جس نے انسان کے ذاتی محاکمہ کی اہمیت پر زور دیا۔

۱۶۰۲ء شیکسپیر نے اپنا مشہور ڈرامہ "ہیملٹ" شائع کیا۔

۱۶۰۷ء تا ۱۶۶۹ء ریمبرینٹ ڈچ مصور جس کی تصاویر میں ڈچ قوم کی سیرت کا عمیق آئینہ ہے۔

۱۶۲۰ء بیکن نے اپنی مشہور کتاب "نووم آرگنیم" تصنیف کی۔ افادہ و ترقی اس کے اصول ہیں اور اس کے مقاصد انسانی مصائب کا ازالہ اور نوعِ انسان کی بہی خواہی۔

۱۶۲۲ء مولیئر سب سے بڑے فرانسیسی "سروری" ڈرامانگار کی پیدائش۔ وہ فرانسیسی زبان کا شیکسپیر ہے

۱۶۳۱ء مغل شاہنشاہ شاہجہان نے تاج محل تعمیر کرنا شروع کیا۔ یہ عظیم الشان مقبرہ جو اسلامی فنِ تعمیر کی بہترین یادگار ہے ۱۶۴۲ء میں مکمل ہوا

۱۶۳۸ء جاپان نے مختلف عیسائی مشنریوں کے مناقشوں سے تنگ آکر عملاً یورپی لوگوں کا داخلہ ملک میں بند کر دیا۔ یہ بندش دو سو سال سے زائد عرصے تک قائم رہی۔ جاپان تیسری صدی میں ایک نیم متمدن ملک بنا تھا۔ اس کا نظامِ معاشرت جاگیری تھا

۱۶۴۲ء کرامول نے انگریزی بادشاہ چارلز اول کے خلاف بغاوت کا جھنڈا بلند کیا۔ شاہ پسندوں اور جمہوریوں میں سات سال تک لڑائی ٹھنی رہی جس کے اختتام پر کرامول نے بادشاہ کو سولی پر چڑھا کر ایک "دولتِ عامہ" وضع کی جو گیارہ سال تک قائم رہی۔

۱۶۴۸ء یورپ میں تیس سالہ جنگ کا خاتمہ ہوا۔ یہ آخری مذہبی لڑائی تھی۔ اس کے بعد یورپ میں مذہبی لڑائیوں کا خاتمہ اور خالص سیاسی تحریکات و محاربات کا آغاز ہوا۔ ڈچ قوم کی آزادی تسلیم کی گئی۔ ڈچوں نے ۱۶۰۹ء سے ۱۶۷۲ء تک سمندروں پر اپنی طاقت کا پھریرا اڑایا۔ اس کے بعد انگلستان نے ان کے بحری اقتدار کا خاتمہ کر دیا۔

۱۶۵۸ء تا ۱۷۰۷ء اورنگ زیب کا عہد جس میں مغل سلطنت اپنے معراجِ کمال پر تھی

۱۶۵۹ء ناول "رابنسن کروزو" کے مصنف ڈیفو کی پیدائش۔ ناول نویسی کا آغاز گویا اسی ناول سے ہوا

۱۶۸۸ء انگلستان میں "انقلاب" برپا ہوا۔ عوام نے بادشاہ کے استبداد کا خاتمہ کر دیا اور ایک خالص دستوری حکومت قائم کر لی۔

۱۶۸۹ء لوئی چاردہم فرانس کے فرمانروائے اعظم کے خلاف انگلستان ہالینڈ وغیرہ کا ایک اتحادِ عظیم۔ لوئی اپنے زور و قوت کے زعم میں اپنے ہمسایہ ملکوں پر چھاپہ مار کر انہیں فرانس میں شامل کر لینا چاہتا تھا۔ اس کے یہ منصوبے روک دیے گئے۔

۱۶۹۷ء پیٹر اعظم روس چھوڑ کر ہالینڈ میں جہاز سازی کا فن سیکھنے گیا۔ واپس آکر اس نے روس کی تعمیر و تنظیم کا کام اپنے ذمے لیا۔ اور وہ حیرت انگیز اصلاحات نافذ کیں جن کے اثر سے روس جو ایک دقیانوسی ملک تھا ایک مہذب قوم بن گیا۔

۱۷۲۵ء تا ۱۸۰۵ء فرانسیسی مصور گرُز جس نے اپنی بے وفا بیوی کے حسین چہرے کو اپنی تصویروں کا نمونہ قرار دے کر عالمگیر شہرت حاصل کی۔ "فاختاؤں والی لڑکی" "ٹوٹا ہوا ظرف" وغیرہ اُس کی مشہور تصویریں ہیں۔

۱۷۲۷ء نیوٹن سائنس دان نے وفات پائی۔ نیوٹن قوتِ ثقل کے نظریے کا موجد تھا۔

۱۷۶۳ء ہفت سالہ جنگ کا خاتمہ ہوا۔ اس جنگ سے پہلے ایک طرف انگلستان اور فرانس کے درمیان مدت سے امریکہ اور ہندوستان میں مقابلہ و مناقشہ چلا آتا تھا اور دوسری طرف یورپ میں ایک نئی طاقت روز بروز زور پکڑ رہی تھی یہ تھی فریڈرک اعظم شاہِ پرشیا کی قوت۔ اس جنگ میں اِدھر انگلستان نے فرانس کو پسپا کیا، اُدھر فریڈرک نے اپنے دشمن اتحادیوں کو پے در پے فاش شکستیں دے کر یورپ بھر کو حیرت میں ڈال دیا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ ایک طرف تو یورپ اور بالخصوص جرمنی میں آسٹریا کے مقابل میں پرشیا کا اقتدار بڑھا اور دوسری طرف بیرونی دنیا میں انگلستان کا رعب و داب بڑھا۔ اور اُس کی سلطنت وسیع تر ہونے لگی۔ یورپ میں فرانس، سپین، سویڈن، ہالینڈ ان کا زور کم ہوا اور انگلستان، پرشیا اور روس کی طاقت زیادہ ہوتی گئی۔

۱۷۷۴ء وارن ہیسٹنگز ہندوستان کا پہلا گورنر جنرل مقرر ہوا۔

۱۷۷۶ء امریکی نوآبادیوں نے انگلستان سے آزاد ہو جانے کا اعلان کیا۔

۱۷۷۸ء روسو نے انتقال کیا۔ وہ دورِ حاضر کے جمہوری نظریے کا بانی تھا۔

۱۷۸۱ء واٹ نے انجن ایجاد کیا۔ انگلستان میں "صنعتی انقلاب" کا زمانہ شروع ہوا اور انگلستان دنیا کا صنعتی کارخانہ بننے لگا۔ اٹھارھویں صدی کے اخیر سے لے کر تا حال یورپ اور خصوصاً انگلستان میں متعدد حیرت انگیز طبیعی ایجادات و اختراعات ہوئیں۔ سائنس کی ترقی نے دنیا کو اور کا اور بنا دیا۔

۱۷۸۹ء فرانس کے عظیم الشان "انقلاب" کا آغاز۔ اِس انقلاب نے یورپ کی سیاسی کایا پلٹ دی۔ فرانس میں جمہوری سلطنت قائم ہوئی۔

۱۸۰۴ء نپولین فرانس کا شاہنشاہ بنا۔ گیارہ سال تک یورپ میں اتحادوں اور لڑائیوں کا سلسلہ جاری رہا۔

مشہور جرمن فلسفی کانٹ نے وفات پائی۔ یہ زبردست فلسفی خدا اور انسانی آزادی دونوں کا معتقد تھا۔

۱۸۰۶ء شہرہ آفاق جرمن شاعر گوئٹے نے اپنی بہترین تصنیف فاؤسٹ کا پہلا حصہ شائع کیا۔ اُس نے اسے ۱۷۷۳ء میں لکھنا شروع کیا اور ۱۸۳۱ء میں ختم کیا۔

۱۸۱۰ء ہسپانیہ کے جنوبی امریکہ کے مقبوضات آزاد جمہوری حکومتوں میں تبدیل ہو گئے۔

۱۸۱۵ء واٹرلو کی لڑائی جس میں نپولین نے شکست کھائی۔ اس جنگ کے بعد تھوڑی دیر کے لئے یورپ میں پھر استبداد نے زور پایا۔

۱۸۱۷ء تا ۱۹۰۴ء انگریزی مصور واٹس جس کی تصویروں میں ایک مشہور تصویر "امید" ہے۔

۱۸۲۱ء انگریزی شاعر کیٹس مر گیا اور شیلے نے "ایڈونیس" کے عنوان سے اُس کا دردناک مرثیہ لکھا۔

۱۸۲۷ء جرمن موسیقی دان "بیٹ ہوون" نے انتقال کیا۔

۱۸۲۹ء یونان نے جو ترکی سے باغی ہو چکا تھا آزادی حاصل کرلی۔

۱۸۳۰ء یورپ میں جابجا انقلاب برپا ہوئے۔ لیورپول سے مانچسٹر تک (انگلستان میں) پہلی ریل چلی۔

۱۸۴۱ء کارلائل نے اپنی کتاب "ہیروز اینڈ ہیرو ورشپ" (اکابر اور اکابر پرستی) شائع کی۔ اس میں اُس نے حضرت محمدؐ، شیکسپیئر، کرامول، نپولین وغیرہ پر اظہار خیالات کیا۔

۱۸۴۴ء امریکی مصنف ایمرسن نے اپنے شہرہ آفاق "مضامین" شائع کئے

۱۸۴۸ء یورپ میں جابجا انقلاب برپا ہوئے۔ فرانس اور روما میں عارضی طور پر جمہوری حکومتیں قائم ہوئیں۔

۱۸۵۷ء ہندوستان میں غدر ہوا اور سارا ہندوستان باقاعدہ طور پر انگریزی حکومت کے زیر اثر آگیا۔

۱۸۵۹ء چارلز ڈارون نے اپنی کتاب "اوریجن آف سپیشیز" (اصلِ انواع) شائع کی۔ مذہب کے رسمی خیالوں کی بیخ کنی بڑے شد و مد سے ہونے لگی۔

۱۸۶۱ء اطالیہ متحد ہوگیا اور وکٹر ایمینوئل بادشاہ ہوا۔

۱۸۶۲ء وکٹر ہیوگو نے جو فرانس کا سب سے بڑا شاعر اور دنیا کا ایک بڑا مصنف تھا اپنی بہترین تصنیف "لے مزرابل" (بدبخت لوگ) شائع کی۔

۱۸۶۵ء بعض یورپی قوموں کے ایک متحدہ بحری بیڑے نے اپنے تشدد سے جاپانیوں کو مجبور کیا کہ وہ بیرونی دنیا سے راہ و رسم قائم کرنے پر راضی ہو جائیں۔ جاپان نے اس ذلت کو اس قدر محسوس کیا کہ یورپ کے سامنے اپنی خودداری برقرار رکھنے اور بوقت ضرورت اُس کا مقابلہ کرنے کو تینتیس سال کی قلیل مدت میں وہ ایک دقیانوسی مشرقی ملک کی بجائے مغربی وضع کا ایک شائستہ و منظم دولت بن گیا۔

۱۸۶۷ء مشہور اشتراکی مفکر کارل مارکس نے اپنی کتاب "سرمایہ" شائع کی۔ یہ تھا اشتراکیت کا اعلانِ جنگ سرمایہ داری کے خلاف۔ آج کل کی تمام اشتراکی تحریکیں یہیں سے شروع ہوتی ہیں۔

۱۸۷۰ء فرانس اور جرمنی کے درمیان جنگ شروع ہوئی۔ یورپ میں فرانس کے رعب و داب کا خاتمہ ہو کر جرمن قوم کا اثر پھیلا اور اُس کی قوت کا اعتراف کیا جانے لگا۔

۱۸۷۶ء ٹالسٹائے روس کے بہترین مصنف نے اپنا ناول "اینا کیرینینا" شائع کیا۔

۱۸۷۷ء روس اور ترکی کے درمیان جنگ۔

سرسید احمد خاں نے علی گڑھ کالج کی بنیاد رکھی۔ سرسید کی قومی تحریک نے ہندی مسلمانوں کو ان کی غفلت سے بیدار کردیا۔

۱۸۷۸ء برلن کا عہد نامہ جس کی رو سے ترکوں کی سلطنت میں سے بہت سے علاقے نکل کر بلقانی ریاستوں کی شکل میں تبدیل ہوگئے۔

۱۸۸۲ء جرمنی اطالیہ اور آسٹریا میں اتحادِ ثلاثہ قائم ہوا۔

۱۸۸۵ء انڈین نیشنل کانگرس کی بنیاد پڑی۔ اُس کا نصب العین شروع میں ہندوستانیوں کے سیاسی حقوق کا حصول اور بعد میں ہند کی آزادی کا حصول ہوگیا

۱۸۹۰ء دول یورپ نے باہمی سمجھوتہ کرکے افریقہ کے مختلف حصوں کو اپنی اپنی سلطنت میں شامل کرنا شروع کردیا۔

۱۸۹۷ء روس اور فرانس میں اتحاد ہوا۔ انگلستان نے ۱۹۰۴ء میں فرانس کے ساتھ اور ۱۹۰۷ء میں روس کے ساتھ مفاہمت کرلی۔ دوسری مفاہمت کی رُو سے ایران کو "دو اثر کے حلقوں" میں منقسم کرلیا گیا۔ ایک روسی دوسرا انگریزی۔

۱۸۹۸ء فرانسیسی سنگتراش "رودین" نے اپنا بت "بالزاک" نمائش میں پیش کیا۔ مائیکل انجیلو کے بعد وہ سب سے بڑا سنگتراش مانا جاتا ہے

۱۹۰۴ء تا ۱۹۰۵ء جنگِ روس و جاپان۔ مشرق نے دورِ حاضر میں پہلی بار ایک مغربی قوت کو نیچا دکھایا۔ مشرق میں بیداری کے آثار پیدا ہو چلے

۱۹۰۵ء بنگال (ہندوستان) میں سودیشی کی تحریک شروع ہوئی اور قومی جوش پھیلا۔ ہندوستان نے سیاست، علم، ادب، شعر، آرٹ سب شعبوں میں ترقی کرنی شروع کی اور گوکھلے، ٹیگور، اقبال، بوس، گاندھی سے مشاہیر پیدا کئے۔

۱۹۰۹ء موسیو بلیریو ایک ہوائی جہاز میں اڑکر فرانس سے انگلستان جا پہنچا۔ اس کے بعد ہوابازی میں اتنی ترقی ہوئی کہ آج ہوائی سفر (مغرب میں) عام ذریعۂ آمد و رفت ہوگیا ہے۔ انیسویں اور بیسویں صدی میں سائنس کی ایجادات مثلاً ریل، تار، ہوائی جہاز، گراموفون، لاسلکی وغیرہ نے دنیا کو ایک اور دنیا بنا دیا ہے۔

۱۹۱۲ء چین ایک جمہوریہ بنا۔ مطلق العنانی اور زیاں کاری کا زمانہ ختم ہوا اور ترقی کا خون چین کے رگ و پے میں دوڑنے لگا۔ رسم و رواج کی اصلاح شروع ہوئی اور نئے خیالات کی بے انتہا تیزی سے ترویج ہونے لگی۔ پندرہ سال بعد کینٹن کے سیاسی گروہ نے ملکی حکومت کی باگ ڈور اپنے ہاتھ میں لے کر چین کی قوت کو مستحکم کرنا شروع کیا۔

بلقانی ریاستوں نے ترکی کے خلاف اعلانِ جنگ کیا اور اُس کا کچھ علاقہ چھین لیا۔

انگریزی کپتان سکاٹ نے قطبِ جنوبی میں اپنی اکتشافی سیاحت کے دوران میں فاقے سے جان توڑ دی۔

۱۹۱۴ء جنگِ عظیم کا آغاز ہوا۔ یہ ہولناک جنگ ۱۹۱۸ء تک جاری رہی۔ اس کے بعد دنیا کچھ کی کچھ ہوگئی۔ مغلوب قوموں میں آزادی کا احساس پیدا ہوا۔ اعلیٰ و اسفل طبقوں میں کشمکش شروع ہوئی۔ عورتوں میں خود اختیاری کی رَو دوڑی۔ افراد کے دل میں ذاتی آزادی کے خیالات نے ایک ہلچل مچادی۔

۱۹۱۵ء آئین سٹائن نے اپنا نظریہ "اضافیت" مکمل طور پر شائع کیا۔ اس نظریے سے زمان و مکان کے اساسی تصورات میں ایک انقلابِ عظیم برپا ہوگیا۔

۱۹۱۷ء روس میں انقلاب ہوا۔ بولشویک برسرِ اقتدار ہوگئے۔ اشتراکیت نے پہلی بار اپنی ایک منظم حکومت قائم کی۔ سویٹ روس بہت سی متحدہ جمہوری حکومتوں پر مشتمل ہے۔

انگلستان نے اگست میں اعلان کیا کہ اس کا مقصد ہندوستان کو بتدریج خود اختیاری حکومت عطا کرنا ہے۔

۱۹۱۹ء ورسائی کا عہدنامہ ہوا۔ جرمنی کو ذلیل کیا گیا۔ یورپ میں کئی نئی قومیں (پولینڈ، زیکوسلوویکیا، فنلینڈ، ایسٹونیا، لیٹویا) رونما ہوئیں۔ ترکی کے ٹکڑے ٹکڑے ہوگئے۔ بعض نئے ملکوں کو اتحادیوں نے اپنے زیرِ سایہ لے لیا۔ جرمنی میں جمہوری حکومت قائم ہوئی۔ آسٹریا اور ہنگری چھوٹی چھوٹی ریاستیں ہو کر رہ گئے۔

۱۹۲۰ء لیگِ اقوام کا پہلا اجلاس ہوا۔ بین الاقوامی عدل کی ایک عدالت ہیگ میں قائم کی گئی۔ آئندہ گیارہ سال میں بہت سی بین الاقوامی انجمنیں بنیں۔ چھ سال بعد جرمنی لیگ کا رکن بنا۔
دمشق و شام کے عربوں میں بے چینی پیدا ہوئی۔

۱۹۲۱ء انگریزی ڈراما نگار برنارڈ شا نے اپنا ڈراما "بیک ٹو میتھوزلا" شائع کیا۔ اس میں اس نے دکھایا کہ انسان آغازِ آفرینش میں کیا تھا آج کیا ہے اور ۳۱۹۲۰ء میں کیا ہوگا +

۱۹۲۲ء ترکوں نے حملہ آور یونانیوں کو پے در پے شکست دے کر ایشیائے کوچک سے باہر نکال دیا۔ اس کے دو سال بعد خلافت کو ملیامیٹ کر کے مصطفےٰ کمال نے جدید ترکی کی بنیاد ڈالی اور قدامت پسندی کے خیالات کو خیرباد کہی۔ اسلامی ممالک میں آئندہ چند سالوں میں بیداری کے آثار عیاں ہوئے۔ ایران میں رضا شاہ اور افغانستان میں امان اللہ نے حکومت کی باگ ڈور سنبھالی۔ مصر میں زاغلول پاشا مراکش میں عبدالکریم۔ شام میں دروسیوں اور نجد میں ابنِ سعود نے اپنا سر بلند کیا۔
مسولینی نے اطالیہ میں اپنی مستبدانہ حکومت قائم کر لی، بظاہر شاہی حکومت رہی لیکن درا صل مسولینی قومی رہنما بن گیا۔

۱۹۲۴ء لینن روسی جمہوری مدبر و ناظم کی موت۔ ۱۹۱۷ء کے انقلاب کی روح و رواں لینن ہی تھا اور اُس نے اپنی محنتِ شاقہ اور مسلسل عرق ریزی سے روس کو ایک عظیم الشان اشتراکی دولت بنا دیا +

۱۹۲۶ء ہندوستان کے بنگالی سائنس دان بوس نے اپنے اس نظریے کو کہ پودوں اور دھاتوں میں حیوانوں کی طرح جان ہوتی ہے آکسفورڈ میں ایک علمی مجلس کے سامنے پیش کر کے مغرب کے علما و فضلا کو حیرت میں ڈال دیا +

۱۹۲۸ء امریکہ کے مجوزہ کیلگی معاہدے پر اقوام نے اپنے دستخط ثبت کئے اور اقرار کیا کہ وہ جنگ سے احتراز کریں گی۔
جنگِ عظیم کے بعد امریکہ کی قوت روز بروز بڑھتی گئی +
روس اپنے "پنجسالہ لائحہ عمل" پر عمل کرنے لگا +
چین خانہ جنگی سے فارغ ہو کر کچھ نہ کچھ متحد ہو گیا۔

۱۹۲۹ء انگلستان اور مصر میں مفاہمت ممکن نہ ہو سکی۔ امیر امان اللہ افغانستان کے تخت سے دست بردار ہو گیا۔
کانگرس نے "پورنا سوراج" کا مطالبہ کیا اور ہند کی آزادی کا اعلان کر دیا۔

۱۹۳۰ء گاندھی نے ستیہ گرہ کی پُرامن تحریک شروع کی۔ ہندوستان میں جابجا حب الوطنی اور ایثار کا جوش رونما ہوا +

۱۹۳۱ء ہندوستان میں شورش پھیلی، ہندو مسلم اختلافات بڑھے۔ انگلستان کی معاشی حالت بد سے بدتر ہوتی گئی۔ انگلستان میں قدامت پسندوں کی حکومت قائم ہوئی۔ ایک عالمگیر معاشی سرد بازاری رونما ہوئی۔

۱۹۳۲ء یکم جنوری "ہمایوں" کی دسویں سالگرہ!

"مؤرخ"

کسی کی باتیں

افق پہ تاریکی چھا رہی ہے　　خموشی دنیا میں آ رہی ہے
شبِ سیہ نیند لا رہی ہے　　پیامِ راحت سنا رہی ہے
وہ شور خاموش ہو چکے ہیں
فضا کی گودی میں سو چکے ہیں
مگر مرے دل میں ایک محشر اُٹھا رہی ہیں کسی کی باتیں

کہاں وہ گزرے ہوئے زمانے　　کہاں وہ اس دَور کے فسانے
وہ داستاں ختم کی قضا نے　　اب آئی ہیں کیوں مجھے ستانے
غمِ گزشتہ کی یاد کیسی؟
یہ آفتِ خانہ زاد کیسی؟
جو سو چکا غم اُسے بھلا کیوں جگا رہی ہیں کسی کی باتیں

یہ ظلم و جور و جفا کی دنیا　　یہ رنج و کرب و بلا کی دنیا
یہ دردِ لا انتہا کی دنیا　　یہ قہر والے خدا کی دنیا
اسے فراموش کر رہا تھا
کہ زخم سینے کا بھر رہا تھا
مگر وہ خونیں حکایتیں پھر سنا رہی ہیں کسی کی باتیں

وہ صورت اب خاک میں دبی ہے　　لبوں پہ اب مہرِ خامشی ہے
مگر مری جان پر بنی ہے　　وہی مرے دل کو بے کلی ہے
لحد کی تاریکیوں سے یکسر
مرے تخیل کا زخمہ لے کر
سکوتِ شب میں رباب سا اک بجا رہی ہیں کسی کی باتیں

ممتاز حسن

مہابلی

(ایک ایکٹ کا تاریخی ڈراما)

ارکان

مہابلی جلال الدین اکبر .... شاہنشاہِ ہندوستان
ابوالفضل .... دستورِ اعظم
دیرا .... رانا اودے سنگھ والئے چتوڑ کی مہارانی
پدمنی .... رانا اودے سنگھ کی بہن
پرتاب سنگھ .... ایک راجپوت کماندار
عبدالکریم .... شاہی فوج کا ایک افسر
حاجب ....
مقام .... چتوڑ کے سامنے شاہی فرودگاہ
وقت .... دونوں وقت مل رہے ہیں

(شاہنشاہ اکبر ابوالفضل سے سرگرمِ تکلم ہے)

اکبر۔ ہاں! کہہ تو سکتے ہیں کہ میدان اپنے ہاتھ رہا۔ مگر اسے فتح کہنے کو دل نہیں مانتا۔ سچ تو یہ ہے کہ راجپوتوں کی اس شکست پر ہزار فتح قربان ہے ٹڈی دل لشکر اور مٹھی بھر سپاہیوں کا کیا مقابلہ ... مُلا جی! یہ شجاعت کی فتح نہ تھی۔ یہ فن سپہ گری کی کامیابی نہ تھی۔ فقط تعداد کا سیلاب تھا جو راجپوتوں کو بہا لے گیا۔ آہ! ان کا نوعمر سپہ دار جس کی شکل آنکھوں سے اوجھل ہونے میں نہیں آتی معرکۂ جنگ میں اس طرح جھوم رہا تھا۔ گویا کسی کھیل میں مشغول ہے۔ مادرِ گیتی ایسے فرزند ہر روز پیدا نہیں کیا کرتی سبحان اللہ راجپوت کس شان سے لڑے۔

ابوالفضل۔ ہاں میں نے بھی سنا ہے کہ باغیوں نے ہمارا خاصہ مقابلہ کر لیا۔

اکبر (بات کاٹ کر) وہ جانتے تھے کہ اس میدان میں اترنا موت کے منہ میں جانا ہے لیکن انہوں نے پروا نہ کی۔ اور ملک الموت سے دست و گریباں ہو گئے ایک ایک سپاہی کٹ کٹ کر گرا مگر قدم پیچھے نہ ہٹا۔ قبضہ پر ہاتھ رہا۔ گو ہاتھ پر ضعف کا قبضہ تھا۔ ملک گیری و جہاں کشائی کے لئے بہت میدان ہے مگر ایسے جیدار سپاہی کہاں۔

ابوالفضل۔ عالم پناہ۔ اس کے یہ معنی ہوئے کہ نتائج و عواقب سے بے پروا ہو کر حماقت کر دینا شجاعت کا دوسرا نام ہے۔

(دُور سے گانے کی آواز آتی ہے)

اکبر۔ ہاہا کیا لَے ہے اور کس قدر زناٹے میں ڈوبی ہُوئی حاجب!

(حاجب آتا ہے)

حاجب۔ حاضر جہاں پناہ!

اکبر۔ کون گاتا ہے۔

حاجب۔ ہندو فقیر ہیں۔ اور بار بار باریابی پر مصر ہیں۔ بہت ٹالا مگر جانے کا نام نہیں لیتے۔ اور ویسے بھی حکم یہی ہے کہ فقیروں اور گویّوں سے زیادہ تعرض نہ کیا جائے۔

اکبر۔ تو حاضر کرو۔ دیکھیں کیا کہتے ہیں۔

(حاجب جاتا ہے)

ابوالفضل۔ قبلۂ عالم! یہ آواز غمازی کر رہی ہے کہ یہ فقیر نہیں۔ ہر کس و ناکس کا خلوت کدۂ شاہی میں آنا جان نثاروں کے لئے موجب صد اضطراب ہے۔

اکبر۔ جس طرح چراغ سے چراغ جلتا ہے ویسے ہی اعتماد سے اعتماد پیدا ہوتا ہے فضل جی! دشمن پر اعتماد کرو گے تو وہ بھی رام چلا جائیگا۔ یہ نسخہ مجرّب ہے۔ اور کبھی خطا نہیں گیا۔

(حاجب فقیروں کو لے کر حاضر ہوتا ہے)

ایک فقیر۔ مہابلی پر رام رحیم کا سایہ۔ کوئی کشٹ پاس نہ پھٹکے سکھ کی نیند سونے کی جاگرتا ہو۔

اکبر۔ سائیں جی کس ملک سے آنا ہوا۔

فقیر۔ بابا جب دیش تھا تھا۔ اب دیس پردیس ایک ہو رہا ہے۔ نہ ہمارا کوئی دیش نہ ہم کسی دیش کے بسیا۔ بھارت ماتا نے گود سے اچھال کر پھینک دیا اب پڑے بھٹکتے ہیں۔

اکبر۔ یہ فقیری بانا کب سے پہنا۔

فقیر۔ جب پہلا پھٹ گیا یہ پہن لیا۔

اکبر۔ کوئی بیوی بچہ۔

فقیر۔ آگے ناتھ نہ پیچھے پگا۔

اکبر۔ مجھ سے ملنے کا کس طرح دھیان آیا۔

فقیر۔ سُنتے تھے کہ مہابلی سادھو اور گنیّن کی پالنا کرتے ہیں اس لئے پرکشا کے لئے چلے آئے۔

دوسرا فقیر۔ پربھا کو راجا کے گن گاتے سُنا۔ تو من کیا کہ مرنے سے پہلے ایسے مہابلی کے درشن کریں گے۔

ابوالفضل۔ تم آج ہی ظلِ الٰہی کے دیدار سے بہرہ اندوز ہونا چاہتے تھے کیا تمہیں معلوم تھا کہ سفرِ آخرت کا وقت قریب ہے۔

پہلا فقیر۔ موت جگہ اور سماں نہیں ڈھونڈتی۔

اکبر۔ بیشک موت کے لئے ہر وقت تیار رہنا چاہیے۔

دوسرا فقیر۔ جب روئی کا چولا بدل ڈالا تو مٹی کا چولا بدلنے میں کیا جاتا ہے۔

اکبر۔ یہ تو کہو یہ نور کا گلا کہاں سے پایا عورت کی آواز کی گھلاوٹ ہے مرد کی آواز کی گرج ہے میں نے ایسا نغمہ تان سین سے بھی نہیں سُنا۔

فقیر۔ یہ سب مہابلی کی سبھا کا چمتکار ہے۔ بھلا ہم گنوار گانا بجانا کیا جانیں۔

(حاجب ایک سربمہر لفافہ لاکر ابوالفضل کو دیتا ہے۔ اور ابوالفضل بزبان فارسی اکبر کو پڑھ کر سناتا ہے اسے سن کر)

اکبر۔ عبدالکریم کو حاضر کرو۔

(حاجب جاتا ہے۔ دونوں فقیر ایک دوسرے کو کن انکھیوں سے دیکھتے ہیں عبدالکریم داخل ہوتا ہے۔ اسے دیکھ کر دونوں فقیر جھک جاتے ہیں)

اکبر۔ فقیرو۔ تمہارے تیور کہہ رہے ہیں کہ تمہاری اس شخص سے پہلے کی جان پہچان ہے۔ ہاں کہو کب اور کس حالت میں اس سے ملنا ہوا۔

پہلا فقیر۔ اس سنسار میں ہزاروں سامنے آتے ہیں اور نکل جاتے ہیں کون کہہ سکتا ہے کہ کس کو کب اور کس طرح دیکھا۔ اور جو اس شخص کے بچن اس کے چہرے کی طرح سچے ہوئے۔ تو مہابلی کی تمام باتوں کا سندیہ آپ سے آپ مل جائے گا۔

(باہر سے شور و غل سنائی دیتا ہے)

ابوالفضل۔ حاجب ذرا لپک کر دیکھنا یہ کیسا غل ہے۔

(حاجب آتا ہے)

حاجب۔ (ابوالفضل سے) حضور ایک راجپوت گرفتار ہوا ہے جو مسلمانوں کے ایسا لباس پہنے چکر لگا رہا تھا۔ حکم شاہی کے لئے سپاہی اسے پکڑ لائے ہیں۔

(سپاہی پرتاب سنگھ کو لاتے ہیں)

اکبر۔ کون ہو تم اور یہاں کس غرض سے آئے تھے۔

ابوالفضل۔ جاسوس ہو پہاڑی کی چوٹی زیادہ محفوظ تھی اس سن دسال کیلئے

پرتاب۔ کون ہوں یہ میری کٹار بتا سکتی ہے اور کیوں آیا یہ کسی راجپوت سے پوچھنا بیکار۔

اکبر۔ ان فقروں کو جانتے ہو۔

پرتاب۔ میں دہلی کا نوکر نہیں ہوں تو اُس کے مہاراج کی جان کا لاگو ہوں اس لئے آپ مجھے جواب دینے پر مجبور نہیں کر سکتے۔

اکبر۔ جان کی خیر چاہتے ہو تو صاف صاف کہو۔

پرتاب۔ بھارت ورش میں یہ پہلی بار ہے کہ کسی کو یہ خیال آئے کہ راجپوت کو موت سے ڈرا سکتے ہیں۔

ابوالفضل۔ نوجوان۔ آخر تمہارے بیوی بچے ہیں اُن پر رحم کرو۔

پرتاب۔ راجپوت کی بیوی اس کی آن ہے۔ اور اس کی زندگی صرف اپنے دیش کے لئے ہے۔

اکبر۔ یہ باتیں اکثر کہی جاتی ہیں۔ اور پھر کہنے والا پشیمان ہوا کرتا ہے عقل سے کام لو۔ ان اڑان گھاٹیوں سے کچھ فائدہ نہیں پہنچ سکتا۔ مرد ہو تو جو دل میں ہے کہہ ڈالو۔

پرتاب۔ صرف اتنا بتا سکتا ہوں۔ کہ کوئی تدبیر کوئی تعزیر میرے منہ سے ایک لفظ نہیں نکال سکتی۔

اکبر۔ یہ سمجھنا تمہاری بھول ہے کہ میں کچھ نہیں جانتا

پرتاب۔ اتنا جانتا ہوں جو جانتے ہیں وہ پوچھا نہیں کرتے۔

اکبر۔ زندگی سے بیزار ہو اس لئے اس قدر گستاخ ہو بہت خوب اگر مرنے پر تلے ہو۔ تو جاؤ کل طلوع آفتاب سے پہلے تمہیں چتوڑ کے چوک میں پھانسی پر لٹکایا جائے گا۔ ملاجی۔ حکم جاری کرو۔ سپاہیو اسے لے جاؤ۔

(سپاہی پرتاب سنگھ کو لے جاتے ہیں)

پہلا فقیر۔ مہابلی! دلی کے والی! یہ حکم مہاراج جیسے نیائی اور دیالو کو سجتا نہیں دوشن ہملا ہے ڈنڈا دو کسی پر پڑ رہا ہی! اسکا دھیان رکھئے مہاراج

اکبر۔ مجھے اس گناہ سے بچانا۔ اور اسکی زندگی کی گرہ کو کھولنا تمہاری لب کشائی پر منحصر ہے۔

(فقیر بانا اتار دیتے ہیں اور دو عورتیں اس بھیس سے نمودار ہوتی ہیں)

پہلا فقیر۔ لیجئے یہ رہا سب راز! میں چتا کی رانی دیر ارانا اودے سنگھ کی مہارانی ہوں اور یہ ان کی بہن پدمنی ہے۔ جب ہم نے دیکھا کہ آپ کا قبضہ چتوڑ پر ہو گیا۔ رانا لڑائی سے لنگیا تلے ہے اور راجپوتی آن کو بٹا لگا کر پہاڑیوں میں منہ ڈھانپ پڑ رہا ہے۔ تو ہم دونوں نے مردانہ کپڑے پہنے اور سینا کو سنبھال کر یدھ پر تیار ہوئیں پر ہمارا حملہ ایسا تھا جیسا پہاڑ پر بادل کی بوند کا پڑنا۔ آپ کا کچھ نہ بگڑا اور ہماری فوج پس گئی دیش ہاتھ سے نکل گیا نراس ہو گئے۔ تو ہم دونوں نے اس شخص سے بدلہ لینے کا پرن کیا جس کے کارن یہ سب کچھ ہوا ہمارا ارادہ تھا کہ آپ کو کٹار کے گھاٹ اتاریں اور پھر آپ ڈھیر ہو جائیں۔ پر آپ کی شکل دیکھتے ہی ہماری بجلیاں بل نہ رہا اور کٹار کی دھار پر پانی پھر گیا اس شخص کی (عبدالکریم کی طرف اشارہ کرکے) ہم نے جان بچائی ہمیں آشا تھی کہ وہ ایک مرد اور سپاہی ہے اور کسی وقت ہمارے آڑے آئے گا پھر اس نے جو بس ہو سکتا تھا بو دیا۔ اب سرکار جو چاہے ہمیں سزا دے پر پرتاب بے قصور ہے اُسے چھوڑ دیا جائے۔

(دونوں دوزانو ہوجاتی ہیں)

اکبر۔ عالیشان مہارانیو! قابل پرستش دیویو! اٹھو اٹھو اور مجھے شرمسار نہ کرو۔ ایسی بہادر، شریف خاتونوں کو مجھ سے ناچیز انسان کے سامنے جھکنا زیب نہیں دیتا۔ تمہاری صداقت، شجاعت، عصمت، شجاعی اور خودداری کا اعتراف کرنے کے لئے ملاجی کی زبان اور قلم درکار ہے۔ عبدالکریم نے تمہاری شکایت نہیں کی اور تمہارے حق میں کلمۂ خیر کے سوا کچھ نہیں کہا۔ عبدالکریم کی اطلاع سے پہلے میں جان گیا تھا کہ اس لباس میں حسن نسوانی مستور ہے۔ رانا بھاگ گیا یہ اس کی غلطی تھی میں اس کا ملک نہیں چاہتا مجھے تو اس کے دل کی ضرورت تھی۔ میری ایک نگاہ ملک کے ملک فتح کرسکتی ہے لیکن اس کی کامرانی تب قابل ستائش ہے جب وہ دلوں کو مسخر کرے۔ آپ مجھ سے کیوں خائف ہیں کیا اس لئے کہ میرا اور آپ کا مذہب مختلف ہے۔ یہ تو کوئی مغائرت کی بات نہیں کسی کو میٹھا پسند کسی کو نمک۔ ایک کو سبز رنگ بھاتا ہے دوسرے کو زرد۔ تو یہ باتیں تو جھگڑے کی نہیں میرا مرنا جینا ہندوستان کے ساتھ ہے۔ ان سے لڑوں گا تو انہیں ذبح کر ترکستان نہ بھیجاؤں گا۔ تو پھر یہ نفرت کیوں۔

ابوالفضل۔ مذہبی مذہب کی تمیز رنگ و بو تو یہ بھی چند روزہ بات ہے جب ایک دوسرے کو سمجھ جائیں گے۔ تو شوالہ و مسجد پہلو بہ پہلو بنائیں گے۔

اکبر۔ قول سے کس طرح یقین آئیگا فضل جی۔ فعل خود ان کو قائل کر دیگا۔ اچھا مہارانیو کہو میں تمہاری کیا خدمت کرسکتا ہوں۔

پدمنی۔ ہماری موت کا حکم دیجئے کہ ہم اور ہماری رسوائی ایک ساتھ بھسم ہوجائیں۔

اکبر۔ کیا کہہ رہی ہو۔ اس شان دار کارنامے کو کون باعث رسوائی کہہ سکتا ہے۔

دیرا۔ مہاراج! اس سے زیادہ رسوائی اور جگ ہنسائی کی بات اور کیا ہوگی۔ کہ مہارانا چتوڑ کے رنواس کی دو استریاں غیر کی چوکھٹ پر کھڑی ہوں۔ یہ بات چھپانے سے نہیں چھپ سکتی مہابلی! اب تو یہ زندگی جینا اجیرن ہوگیا ہے صرف موت ہی ہماری پردہ پوش ہے۔

اکبر۔ فرض کرو میں یہ استدعا نہ مانوں۔

دیرا۔ تب ہم کہیں گے کہ مہابلی میں اتنا بھی بل نہیں کہ ایک کمزور عورت کی ننھی سی بات کو پورا کرسکیں۔

اکبر۔ فضل جی۔ آپ کی تاریخ میں اس عزم و استقلال کا کیا جواب ہے۔

ابوالفضل۔ آپ کے ہاں سب عورتیں آپ جیسی ہیں۔

دیرا۔ رام رام ہمارا ان سے کیا مقابلہ۔ ان کی لاج ان کی آن کے ہم تو پاسنگ بھی نہیں اتنی رسوائی انہیں کب کی مار ڈالتی۔

اکبر۔ ہندوستان کی مایۂ ناز مہارانیوں مانگو مانگو کیا چاہتی ہو۔

دیرا۔ ہم کیا جانیں مانگنا کسے کہتے ہیں۔

اکبر۔ تو میں بتاتا ہوں کہ بے مانگے دینا کسے کہتے ہیں کل صبح شاہانہ احتشام کے ساتھ چتوڑ کا تاج تمہارے حوالہ کیا جائے گا۔

دیرا۔ یہ شرطیں کون مانے گا۔

اکبر۔ آہ عورت کو خوش کرنا مشکل ہے۔ تو میں آپ کا ملک بلا کسی شرط واپس کرتا ہوں۔

ابوالفضل۔ جہاں پناہ

اکبر۔ جو ہوا سو ہوا۔

پدمنی۔ کیا دنیا اس سے بڑھ کر مہابلی پیدا کرسکتی ہے۔

دیرا۔ مہابلی کی جے۔

(پردہ)

نور الٰہی محمد عمر

زندگی سے

اے زندگی! خبر نہیں مجھ کو کہ کیا ہے تُو؟ — تاریکیٔ قضا ہے کہ نُورِ خدا ہے تُو؟

ظلمت ہے تُو کہ نور مگر یہ ضرور ہے — میں ہم نوا ترا ہُوں مری ہم نوا ہے تُو

مل جل کے کاٹنا ہے یہ مشکل سفر ہمیں — میں رہنما ترا ہوں مری رہنما ہے تُو

کیا ڈھونڈتے ہیں ڈھونڈنے والے کہ زندگی! — سب کچھ ہے تجھ میں تُو ہے سوا ماسوا ہے تُو

بہتر ہے یہ تلاشِ حقیقت کو چھوڑ کر — دیکھے تجھے کوئی کہ حقیقت نما ہے تُو

ناممکن البیاں ہے جو عشاق کیلئے — شاید کہ حُسنِ شاہدِ حق کی ادا ہے تُو

جی کر جہاں میں جان لے کوئی تو جان لے — کوئی بھی ورنہ کہہ نہیں سکتا کہ کیا ہے تُو

گرگٹ کی طرح رنگ بدلتی ہے ہر گھڑی — کچھ تھی ابھی ابھی کچھ اور اب کیا سی کیا ہے تُو

ہر دم نیا ظہور ہے اک تیرے نور سے — تاریک کائنات کا روشن دیا ہے تُو

پیدا ہے تجھ سے گنبدِ کون و مکاں میں گونج — کس مطربِ اسیر کی مضطر صدا ہے تُو؟

حرکت، سکوں، کمال سبھی تیرے دم سے ہیں — یہ صورتیں فنا کی ہیں رُوحِ بقا ہے تُو

تجھ سے چلے جو بچ کے وہی تیری ضرب کھائے — تجھ سے ملے جو بڑھ کے اُسی کا عصا ہے تُو

تیرا بنے جو جان چھڑکتی ہے اُس پہ تُو — جس دل میں تیرا درد ہو اُس کی دوا ہے تُو

ہمکار ہے تو اُس کی جو مختار ہو گیا — مجبور ہو چکا ہے جو اُس کی قضا ہے تُو

پھر زندہ کر دے زندہ دل اے زندگی مجھے
تو ظلمتوں میں ڈھونڈ لے تابندگی مجھے

بشیر احمد

فلسفۂ زندگی

بے کار ہے فلسفے کو چھوڑو | دُنیا کے بُرے بھلے کو چھوڑو
چل نکلو کہیں مکاں سے باہر | رکھو قدم آستاں سے باہر
اِس قید کا غم سہو گے کب تک | صید اپنے بنے رہو گے کب تک
دنیا ہے وسیع زیست آزاد | آزاد ہے جو وہی ہے دل شاد
بس چھوڑ دو دل کی کاہشوں کو | اور توڑ دو اُٹھ کے بندشوں کو
آئین، تمیز، علم، دستور | وہ جن سے ہیں اہلِ عقل مشہور
اور وہ جنھیں کہتے ہیں کتابیں | انسان کے فکر کی شرابیں
ان سب سے رہا کرو خودی کو | جی لینے دو کچھ تو زندگی کو

دیکھو وہ چمک رہا ہے سورج | کیا باغ میں پھولوں کی ہے سج دھج
کیا پتے ہیں کیسے ہلتے ہیں | کیا چڑیاں ہیں کیسے قہقہے ہیں
ہے آج خوشی کے راج کا دن | جو کچھ ہے فقط ہے آج کا دن
ناچو ہنسو کودو خوب کھیلو | دوڑو چلو اچھلو ڈنڈ پیلو
کیا دھوپ ہے پھولتی ہیں کلیاں | پھولوں میں عجب ہیں رنگ رلیاں
ہر ذرہ ہے روشنی سے مسرور | ہر پتہ ہواؤں میں ہے مخمور
چڑیاں ہیں خوش اور خوش ہیں حیواں | صد حیف کہ وقفِ غم ہو انساں

کھیتوں میں چلو کساں کے پاس | انساں کو ہے کھیت کی ہوا راس
ملتی ہے جو آدمی سے فطرت | بن جاتی ہے زیست دل کی قوت
کھیتی ہے پسینے کی کمائی | محنت کی ہے معجزہ نمائی
قدرت سے ہے ہم کلام دہقاں | دہقان ہے بہترین انساں
باتیں کرو اُس سے آج چل کے | جھگڑے ہیں فضول آج کل کے
کل کیا ہوا تم سے کل ہو کیا کچھ | تم سوچتے کچھ ہو اور خدا کچھ
چھوڑو بھی یہ سوچنے کا دھندا | عاقل کے لئے ہے سوچ پھندا
اُٹھو کہ جگا رہی ہے فطرت | دوڑو کہ بلا رہی ہے فطرت

گھربار سے نکلو دور جاؤ — کچھ دیکھو جہاں کو کچھ دکھاؤ
دہقان سے مل کے ہل چلاؤ — سستاؤ کماؤ مسکراؤ
تا تم کو بھی لطفِ زیست آئے — دل کام میں حق کا بھید پائے

یا آؤ اور اُن سے آ کے مل لو — تہذیب سے واسطہ ہے جن کو
شائستہ ہیں جو پہ مضمحل ہیں — مغرور کبھی کبھی خجل ہیں
دولت کے معاملے ہیں ہر سُو — شہرت کے مقابلے ہیں ہر سُو
کیا بغض و جفا کی کاوشیں ہیں — کیا لطف و وفا کی کوششیں ہیں
پڑتی ہے جو دقتوں پہ دقت — پاتی ہے فروغ اُن کی فطرت
دُنیا ہے وہ زیست کا اکھاڑا — جس کو غم و حرص نے اجاڑا
لیکن جو بسا اُجڑ اجڑ کر — پیہم جو بنا بگڑ بگڑ کر
اِس جنگ میں تم بھی کام آؤ — انساں ہو تو کر کے کچھ دکھاؤ
آئے کوئی ہے جو مردِ میداں — مشکل میں پڑی ہے نوعِ انساں
مشکل ہی مگر ہے رُوح پرور — ہستی ہے سوار مشکلوں پر
ہے صاحبِ اختیار ہستی — بڑھنے کو ہے بے قرار ہستی

چل نکلو پھر اپنے گھر سے تم بھی — رہ جائے نہ دل میں بات دل کی
ارماں جو ہیں دل کے وہ نکالو — دیکھو سنو دوڑو ڈھونڈو پا لو
آزاد ہوں قوتیں تمہاری — مشکور ہوں ہمتیں تمہاری
دہقان بنو کہ مردِ مزدور — فطرت کو مشقتیں ہیں منظور
دیہات میں ہے سکوں کی برکت — شہروں میں ترقیوں کی حرکت
ہے زیست بلند بھی نگوں بھی — حرکت بھی ہے اُس میں اور سکوں بھی
دونوں سے ہے زندگی کی قوت — دونوں سے ہے زندگی کی عظمت
خوب اپنی جگہ پہ ہے ہر اک شے — تھوڑی بھی ہے گر تو وہ بہت ہے
پھر اُٹھو بھی فلسفے کو چھوڑو — اور زیست کی سمت منہ کو موڑو

زندہ وہی فلسفی ہے اِس جا
خود زندگی فلسفہ ہے جس کا

بشیر احمد

ایک خط

تمہیں یہ خط دیکھ کر حیرت ضرور ہوگی۔ لیکن میں بھی انسان ہوں۔ اگر پتھر ہوتی تو شاید یہ کبھی محسوس نہ کرتی کہ میرے پہلو میں دل ہے۔ مجھے تو تم نے قفس میں ڈال دیا۔ سورج۔ چاند۔ اور آسمان کی رنگینیوں کو بھی او جھل کر دیا ہوتا۔ پھر شاید میرے سوئے ہوئے احساسات کبھی نہ جاگتے۔

تم سمجھو گے کہ میرے دماغ میں خلل ہے۔ شاید میں خود نہیں جانتی کہ مجھے کیا ہوا۔ کل میں ایک حد تک خوش تھی۔ اچھا کھانے کو ملتا۔ اچھا پہننے کو۔ رہنے کو خوبصورت مکان۔ موٹریں۔ نوکر چاکر۔ ہر قسم کا آرام نصیب تھا۔ لیکن رات میں باغ میں پھرنے کو نکلی۔ چاندنی رات تھی۔ نکھری نکھری روشنی پھولوں سے فضا معطر۔ اس پر کسی نے بانسری پر اک راگ بجانا شروع کر دیا۔ خدا جانے مجھے کیا ہوا۔ میری آنکھوں سے جیسے اک پردہ اٹھ گیا۔ اور میں نے محسوس کیا کہ میری زندگی کس قدر خالی ہے۔ رنگینیوں سے، شیرینیوں سے خالی۔ وہ پانچ سال جو میں نے تمہارے ساتھ گزارے ہیں۔ میری آنکھوں کے سامنے سے گزرے۔ میں سترہ سال کی تھی جب تم سے بیاہی گئی۔ ماں باپ نے مجھ سے نہ پوچھا کہ میں تم سے شادی کرنا چاہتی بھی ہوں یا نہیں بس میری منگنی کر دی گئی۔ لوگوں نے کہا بڑی بھاگوان ہے۔ کیسا اچھا میاں ملا ہے۔ حسین، تعلیم یافتہ، جوان۔ اونچے گھر میں جائے گی وہاں کسی چیز کی کمی نہیں۔ میں نہ جانتی تھی کہ شادی کسے کہتے ہیں۔ ہمارے گھروں میں لڑکیوں کو زندگی سے بے بہرہ رکھنے کی ہر طرح کوشش کی جاتی ہے۔ خیر میں تمہاری دلہن بنی۔ زندگی کے راز مجھ پر کھلنے لگے۔ بس پھر وہ پانچ سال شروع ہوئے جن میں میری روح کو ملیامیٹ کرنے کی کوئی کوشش باقی نہ رہی۔ لیکن میں یہ نہ جانتی تھی ——— کل رات تک۔

تم صبح اٹھتے ہو۔ جلدی جلدی کپڑے پہن کر پکارتے ہو "ناشتہ تیار ہے؟" پھر دفتر چلے جاتے ہو، چار بجے واپس آ، چائے پی ٹینس کے کپڑے پہن، کلب کا رخ کرتے ہو۔ رات کو اکثر کھانا باہر ہی کھاتے ہو۔ پھر جا کسی کنے میں ناچتے ہو۔ رات کے دو تین بجے واپس آ پڑ کر سو رہتے ہو۔ جو کبھی بھول کر کھانا گھر پر کھا لیتے ہو تو کھانے کے بعد حکم ہو جاتا ہے کہ "بس کوئی شور نہ کرے ہمیں دفتر کا کام کرنا ہے!"

میرے لئے دن پہاڑ، راتیں سنسان، کئی دفعہ جی چاہتا ہے کہ چیخوں، پکاروں، کسی طرح وقت کو جلدی جلدی گزار دوں۔ کبھی دل کو کتابوں میں ڈالتی ہوں۔ کبھی سلائی میں کبھی گھر کے کام میں لیکن پڑھتے پڑھتے۔ اور سیتے سیتے آنکھوں میں بھی درد ہونے لگتا ہے۔ گھر کے کام میں بھی اب جی نہیں لگتا۔ شاید اگر تم امیر نہ ہوتے۔ میرے لئے نوکر چاکر نہ ہوتے۔ کھانا خود پکانا ہوتا جھاڑو خود دینا ہوتا۔ تو میرا جی کچھ لگ جاتا لیکن اب تو زندگی گزارنی دشوار ہو رہی ہے قسمت نے مجھے اس ایک خوشی

نے بھی محروم رکھا۔ جو ایک عورت کو نصیب ہوتی ہے۔ میرے کوئی بچہ نہیں۔ کل تک میں اس بات پر پہروں آنسو بہاتی۔ لیکن آج میں خوش ہوں ـــــ ہاں خوش، کیونکہ میرے پاؤں اس بیڑی میں جکڑے ہوئے نہیں۔ میں آزاد ہوں!

یہ نہیں کہ تمہیں مجھ سے محبت نہیں۔ تم مجھے چاہتے ہو۔ میرے آرام کا ہر وقت خیال رکھتے ہو۔ لیکن اسی طرح جیسے تم اپنے چہیتے گھوڑوں اور کتوں کا خیال رکھتے ہو۔ شاید ان سے کچھ زیادہ، لیکن تم کبھی یہ خیال نہیں کرتے کہ میں بھی ایک روح رکھتی ہوں۔ ایک روح جو تڑپتی ہے روشنی اور موسیقی کے لئے۔ اگر میں سیر کو جانا چاہتی ہوں تو بند موٹر میں جانا ہوتا ہے۔ کبھی پردے والے بکس میں بیٹھ کر سینما دیکھ لیتی ہوں۔ لیکن تم برابر یہی کہتے ہو کہ ایسی چیزیں بہت نہ دیکھنی چاہئیں۔ ایک دو سہیلیاں ہیں۔ کبھی ان کے ہاں چلی جاتی ہوں۔ لیکن روز روز کون کسی کے گھر جائے۔ تم ہی بتاؤ میری زندگی میں کیا لطف ہے؟ کیا مجھے تم سے محبت نہیں؟ شاید۔ ہو گی۔ پانچ سال کا ساتھ ہے۔ ایک قسم کا لگاؤ ہو ہی جاتا ہے۔ پھر ہندوستانی عورت شوہر کی الفت کو اپنا فرض سمجھتی ہے۔ لیکن میں کیا جانوں کہ محبت کیا چیز ہے؟ میں تو صرف اپنے چچاؤں۔ ماموؤں اور بھائیوں ہی سے ملی تھی کہ تم سے بیاہی گئی۔ مردوں کی صحبت ہندوستانی لڑکیوں کے لئے بُری سمجھی جاتی ہے لیکن عورتوں کی صحبت ہندوستانی مردوں کے لئے بُری نہیں سمجھی جاتی۔ تم روز کئی لڑکیوں کے ساتھ بولتے۔ ہنستے۔ ناچتے ہو۔ اور ہمیں اندر بند کر رکھا ہے۔ کیا ہمارا جی نہیں چاہتا کہ ہم بھی اور لوگوں سے ملیں، ہنسیں، بولیں۔ تبادلۂ خیالات کریں؟

تم پڑھ پڑھ کر حیران ہو رہے ہو گے کہ یہ خیال میرے دل میں کس طرح آئے۔ آج تک میں نے کبھی ایسی باتیں نہیں کیں۔ ہاں کل تک یہ خیالات میرے دل میں نہ تھے لیکن رات ...... اس بانسری کے راگ نے میرے سوئے ہوئے دل میں ایک درد پیدا کر دیا۔ مجھے یہاں ہر طرح کا آرام ہے ...... لیکن اب میں آرام نہیں چاہتی۔ میں زندگی چاہتی ہوں ہاں زندگی جس میں مشکلیں ہوں۔ تڑپ ہو۔ کوشش ہو۔ موسیقی ہو!

اس لئے اور صرف اس لئے میں آج رات تمہیں چھوڑ کر جا رہی ہوں۔ تم چونک پڑو گے۔ تمہاری آنکھیں غصے سے سرخ ہو جائیں گی۔ پھر تم سمجھو گے کہ ضرور میں نے مذاق کیا ہے۔ لیکن یہ سچ ہے۔ بالکل سچ!

شاید خیالات کے اُس ہجوم کا جو کل رات مجھ پر ٹوٹ پڑا آغاز اُس وقت ہوا تھا جب تم نے اپنے کسی کام کے لئے ایک ٹائپسٹ کو بلایا۔ وہ بھی ایک لڑکی تھی۔ میری طرح۔ لیکن کس قدر آزاد! میں نے اُس سے باتیں کیں۔ وہ خوش تھی، ہاں مجھ سے زیادہ خوش۔ گو اس کے پاس موٹریں نہ تھیں۔ نوکر نہ تھے۔ وہ ایک فلیٹ میں ایک اور لڑکی کے ساتھ رہتی تھی۔ لیکن وہ دونوں سارا دن کام کرتیں، اور شام کو خوش خوش تفریح کے لئے باہر چلی جاتیں۔ اپنا کماتیں اور کھاتیں۔ نہ کسی کا حکم و ہدایت، نہ کسی کی روک تھام۔ اپنی زندگی کی آپ مالک۔ اپنے نفس کی خود مختار۔ مجھے تو تم نے اور تم سے پہلے ماں باپ نے ایک کھلونا بنائے رکھا۔ میرا دماغ میری روح ترقی سے محروم ہیں۔ زندگی سے مجھے تم دور ہی دور رکھتے ہو۔ شاید اگر تم مجھے اپنی سچی رفیق بناتے تو یہ دن نہ آتا۔ لیکن تم تو اپنے کام یا اپنے خیالات کے متعلق مجھ سے کبھی کچھ کہتے ہی نہیں۔ کبھی سیاسیات کے متعلق گفتگو ہوئی

توجہاں میں نے تم سے اختلاف رائے کیا۔ تم بگڑ کر کہنے لگے "عورتوں کو ان باتوں سے کیا واسطہ"۔

ہمارے پاس ہی مسٹر اور مسز گوپال داس رہتے ہیں۔ میاں بیوی ہر کام مل کر کرتے ہیں۔ شام کو اکٹھے ٹینس کھیلتے ہیں رات کو مل کر باہر جاتے ہیں۔ آخر میں بھی تو تعلیم یافتہ تھی۔ اگر تمہیں بیوی کو قفس ہی میں ڈالنا تھا۔ تو کسی ان پڑھ سے شادی کر لی ہوتی اور اگر مجھ سے کی تھی۔ تو یہ پردہ یہ بندشیں ہی دور کر دی ہوتیں۔ لیکن اب میں خوش ہوں کہ تم نے مجھے تھوڑی سی آزادی دے کر بہلا نہ لیا اب میں تمہارے احسانات سے آزاد ہوں اور پوری آزادی حاصل کر سکتی ہوں۔

لوگ مجھے ہی برا بھلا کہیں گے۔ طرح طرح کی باتیں بنائیں گے۔ تعلیم کو بھی برا کہیں گے۔ ہاں میں بھی کہتی ہوں کہ اگر لڑکیوں کو قید ہی رکھنا ہے تو بہتر ہے کہ ان کو تعلیم نہ دی جائے۔ تاکہ وہ اپنی زنجیروں کو محسوس نہ کر سکیں۔ میرے والدین کو بھی رنج ہوگا تمہاری اماں کی دلی مراد پوری ہوگی۔ نئی بہو آئیگی۔ اور خدا تمہیں بچہ دیگا۔ مجھے دنیا کی باتوں کی پروا نہیں۔ تمام عمر ان باتوں کی پروا کرتے کرتے دکھ سہنا بیوقوفوں کا کام ہے۔ ماں باپ کے رنج کا خیال ہے لیکن اب تمہارے ساتھ رہنے میں میرے لئے سوائے دکھ کے اور کچھ نہیں۔ تو کیا انہیں مجھے یوں غمگین دیکھ کر رنج نہ ہوگا؟ اور پھر کبھی وہ دن بھی آئیگا جب وہ یہ بات سمجھنے لگیں گے کہ میں نے جو کیا درست کیا۔ ہاں۔ کبھی تو دنیا میں عورتوں کے ساتھ انصاف ہوگا۔

تم مجھے ڈھونڈنے کی کوشش نہ کرنا۔ جب دو روز کے بعد تم شملہ سے واپس آؤ گے۔ تو میں یہاں سے دور ہونگی میرے ساتھ وہی ٹائپسٹ ہوگی۔ ہاں تم نے یہی بڑی غلطی کی کہ اپنی قیدی چڑیا کو آزاد چڑیا سے ملنے دیا۔ آج صبح وہ میرے پاس آئی اور آج شام ہم دونوں یہاں سے دور کسی اور شہر کو، ایک نئی دنیا کو چل دیں گے۔ میں وہ زیور لے چلی ہوں جو میرے والدین نے شادی پر مجھے دیا تھا۔ جو چیزیں تم نے دیں وہ سب یہیں چھوڑے جاتی ہوں۔

کل تک مجھے اس کا وہم و گمان نہ تھا کہ آج رات میں تم کو چھوڑ کر چلی جاؤں گی۔ لیکن چاندنی رات اور بانسری کی ایک لے نے مجھ پر جادو کر دیا۔ اور ان خیالات کو جو مدتوں میرے دماغ کے کسی ایسے کونے میں بند تھے جو مجھ سے بھی چھپا ہوا تھا آزاد کر دیا۔ میں زندگی کی تلاش میں جا رہی ہوں۔ میں ایک عورت بننا چاہتی ہوں۔ نہ کہ تمہارا کھلونا۔ بہتر یہ ہے کہ تم مجھے طلاق دے دو۔ خدا حافظ۔ اگر تم پھر شادی کرو تو احتیاط رکھنا کہ تمہاری بند چڑیا کہیں آزاد چڑیوں سے ملنے نہ پائے۔ اور چاندنی رات اور موسیقی سے بھی اسے ذرا دور دور رکھنا!

"زاہدہ"

غزل

بہت دل تھام کر بیٹھا پر آخر کار اُٹھ بیٹھا
تری محفل میں دیکھی عزتِ اغیار اُٹھ بیٹھا

بہت بیزار کر رکھا تھا ناصح کی نصیحت نے
خدا کا شکر ہے یہ بیہودہ گفتار اُٹھ بیٹھا

یہ حالت تھی مری شب بھر وفورِ بے قراری سے
ترا سو بار دھیان آیا تو میں سو بار اُٹھ بیٹھا

مجھے مطلب؟ میں کیوں؟ کس کیلئے؟ کس واسطے ٹھہروں؟
کیا تم نے جو لطف و مہر سے انکار اُٹھ بیٹھا

یہ اب ترکِ تعلق کے ہیں مجھ پر کس لئے طعنے
تمہیں دیکھا وفا و مہر سے بیزار اُٹھ بیٹھا

دلِ بیتاب تھا ناکامیٔ دیدار کا باعث
یونہی اُن سے ہوئیں میری نگاہیں چار اُٹھ بیٹھا

یہ کیا حالت ہے میری آہ یہ کیا ہونے والا ہے
مرے بالیں سے کیوں روتا ہوا غمخوار اُٹھ بیٹھا

یہ کس ظالم کے آنے کا ہوا احباب میں چرچا
یہ کس کا نام لے کر یک بیک بیمار اُٹھ بیٹھا

گیا تھا دل میں کیا کیا حسرتیں لے کر وہاں اکبر
کسی نے جب نظر تک بھی نہ کی ناچار اُٹھ بیٹھا

جلال الدین اکبر

بہار و خزاں

آئی خزاں چل دی بہار!

وہ باغ وہ صحن چمن　　وہ گل وہ نرگس وہ سمن

رگ رگ میں اپنی خوں کا جوش　　دل میں تپش سر میں خروش

جب زندگانی تھی عمل　　اس نخل میں لگتا تھا پھل

وہ زور و قوت اب کہاں؟　　وہ لطف و راحت اب کہاں؟

خاموش ہے بانگِ ہزار　　ہے کچھ تو ہے بس یہ پکار

آئی خزاں چل دی بہار!

جو ہو حقیقت سے دو چار　　دیکھے خزاں کی وہ بہار

کیا ہے خزاں کی بھی فضا　　بہتر بہار اس سے ہے کیا؟

حسنِ ازل کا ہے نشاں　　اس میں عیاں اُس میں نہاں

یہ ہے ہنسی رونا ہے وہ　　پانی ہے یہ سونا ہے وہ

اک وہم ہے سود و زیاں　　پر لطف ہے سرِ شے [illegible]

جو کچھ بھی آئے اُس کو دیکھ　　جو حق [illegible] تو دیکھ

غم میں خوشی کو ہے قرار　　خوش ہو کے لے دل پھر پکار

آئی خزاں چل دی بہار!

مت اے دلِ ناداں ترس　　آئے گی پھر اگلے برس

آئے گی آئے گی بہار　　پھر منہ دکھائے گی بہار

کھوئے ہوئے کو مت ترس　　اللہ بس باقی ہوس

حق کو ہے گر منظور کچھ　　وہ دن نہیں ہے دُور کچھ

ہوگا چمن جب لالہ زار　　اور چار سُو ہوگی پکار

چل دی خزاں آئی بہار!

بشیر احمد

آئی خزاں ——— چل دی بہار

CALCUTTA ART PG WORKS, LAHORE.
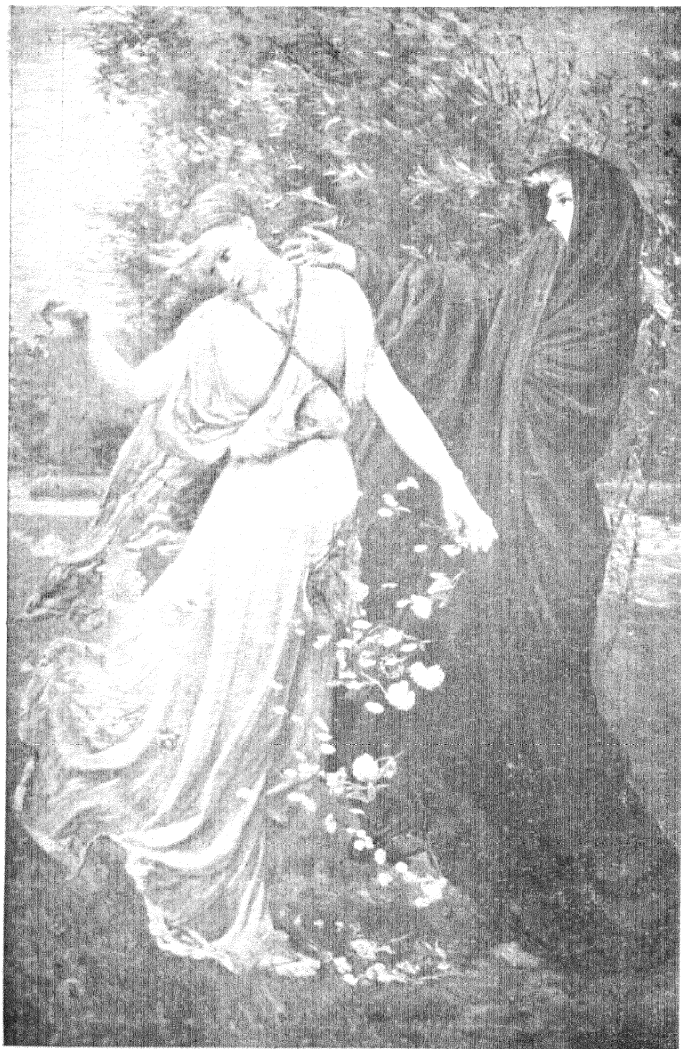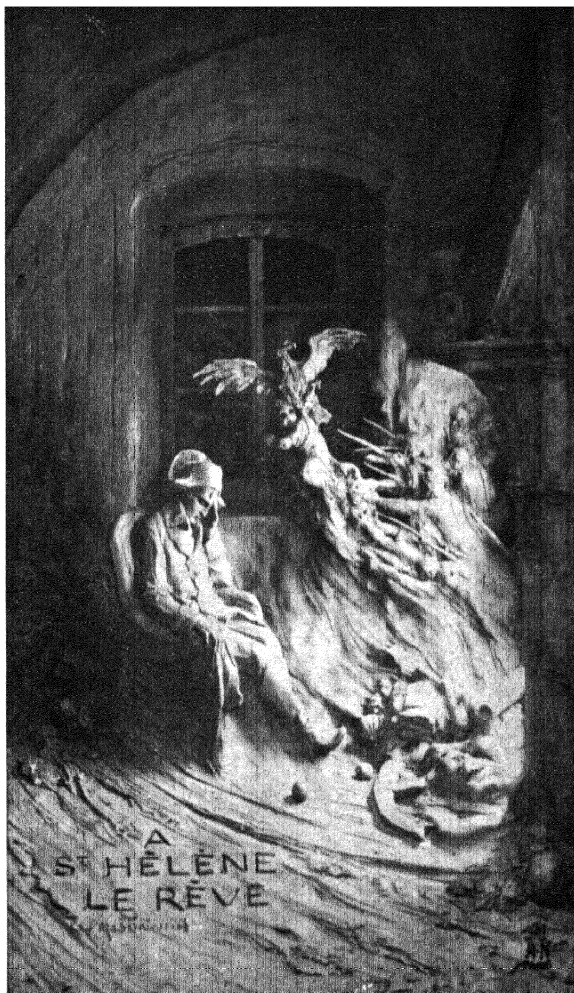
نپولین کا خواب

نپولین اور اُس کا خواب

متمدن دُنیا سے ہزاروں کوس دُور بحرِ اوقیانوس کے ایک پتھریلے جزیرے میں قید کی تنہائی و خاموشی کے اندر اپنی خلوت میں بیٹھا کوئی آنکھیں بند کئے اپنے خیالوں میں غرق ہے: میں کیا تھا، اپنی ہمت سے میں کیا سے کیا بنا، پھر قسمت نے مجھے کیسے اوندھے منہ گرا دیا۔ شاید خواب دیکھ رہا ہے کہ بغض و حسد کینہ کی اپنی زہریلی سنگینوں سے اُس کی عظمت کے "عقاب" کا پیچھا کر رہے ہیں!

دنیا کا یہ سب سے بڑا سپہ سالار، یہ عدل پرور مقنن، یہ دور اندیش مدبر، یہ شہرت و عظمت و قوت کا انسانی مجسمہ جو آخر کار اپنی ہوس کے ہاتھوں آپ تباہ ہوا۔ یہ غیر معمولی انسان کارسیکا کے ایک معمولی وکیل کا بیٹا ہے!

جب یہ پیدا ہوا (۱۵ اگست ۱۷۶۹ء) فرانسیسی اس کے عزیز وطن پر قابض تھے۔ یہ بچپن سے اُن سے نفرت کرتا تھا مگر حالات کچھ ایسے درپیش ہوئے کہ یہ اپنا وطن چھوڑ کر اجنبی ظالموں کے ملک میں پہلے ایک جنگی مدرسے میں داخل ہوا اور پھر رفتہ رفتہ ان کی فوج میں ایک ادنیٰ افسر بن گیا۔ اس وقت فرانس میں انقلابی آشوب کا دور دورہ تھا۔ فرانسیسیوں نے اپنے بادشاہ کو تخت سے اتار کر اس کا سر قلم کر دیا تھا۔ اور یورپ کی تمام قوموں کو بغاوت و انقلاب کی عام دعوت دی تھی (۱۷۹۳ء) مطلق العنان بادشاہ مل کر فرانس پر چاروں طرف سے حملہ آور ہو رہے تھے۔ فرانس سخت خطرے میں تھا۔ انقلابی اندرونی بیرونی سب دشمنوں کے قلع و قمع کی زبردست تیاریوں میں ہمہ تن مصروف تھے۔ ہر سو جانبازوں اور سورماؤں کی طلب تھی۔ ایسے نازک وقت میں کارسیکا کا یہ محکوم جلا وطن حاکم قوم کے کام آیا۔ اِدھر یہ اُس کے کام آیا، اُدھر اس نے اپنا نام چمکایا۔ نپولین فرانس کا رہائی دہندہ بنا، فرانس نپولین کا حلقہ بگوش ہو گیا۔

ذکاوت و فطنت، عزم و شجاعت کے کیسے کیسے کارنامے اُس کے ہاتھوں سرانجام ہوئے! جب موقع اس کے لئے بڑھے تو وہ ان سے فیضیاب ہونے کو سب سے پیش پیش نظر آیا، جب مشکلوں نے اُسے گھیر لیا تو اس کی تمام قوتیں بروئے کار آ گئیں، جب قسمت نے للکارا کہ کوئی ہے تو نپولین کی لبیک نے زمین و آسمان تک ایک گونج پیدا کر دی۔

اُس نے بتدریج لیکن بسرعت ترقی پائی۔ ابتدا میں توپ خانے کا افسر ہوا۔ اس نے انگریزی بیڑے کی شکست میں نمایاں حصہ لیا (۱۷۹۳ء)۔ یہ اس کی پہلی فتح تھی۔ دو سال بعد جب مرکزی حکومت خطرے میں پڑی تو وہی اس کا نجات دہندہ بنا۔ اطالیہ کی یلغار (۹۷-۱۷۹۶ء) اور مصر کی یلغار (۱۷۹۹ء) اس کی بلند ہمتی کی عظمت کا زندہ اور کھلا ثبوت ہے۔ اس نے "نظامت" کی حکومت کا خاتمہ کر کے اپنی "قنصلیت" کی بنا ڈالی اور سیزر کی طرح اپنے پاؤں جمائے۔ پانچ سال بعد وہ فرانس کا بادشاہ بن گیا (۱۸۰۴ء) وہی کارسیکا کے ایک معمولی وکیل کا لڑکا، اجنبی فرانسیسیوں کی فوج کا ایک ادنیٰ افسر۔ بجز چند وقفوں کے اُنیس سال تک وہ یورپ کی ساری طاقتوں سے مصروف پیکار رہا۔ فرانسیسی محض اس کے حکم بردار بندے نہ تھے بلکہ وہ دل و جان سے اُس کے فدا کار بھی تھے۔ یکے بعد دیگرے اُس نے ایک ایک قدیم سلطنت کو نیچا دکھایا اور اس کے ساتھ پہلے فرانس اور پھر یورپ کے اکثر اور ممالک میں اس نے اپنا اقتدار قائم

کیا۔ اور اپنے شہرہ آفاق قوانین کی روشنی کونے کونے میں پھیلا دی +

آسٹریا پر اس نے تین بار چڑھائی کی (۱۸۰۵ء، ۱۸۰۶ء، ۱۸۰۹ء) اور مغرور شاہنشاہ کو مجبور کر دیا کہ وہ خود دولت نپولین کو اپنی بیٹی نکاح میں دے (۱۸۱۰ء) پرشیا کو اس نے اپنی طاقت کا لوہا منوایا (۱۸۰۶ء)۔ روسیوں کو اس نے پسپا کیا (۱۸۰۷ء) اطالیہ (۱۸۰۵ء) صقلیہ (۱۸۰۶ء)، ہالینڈ (۱۸۰۶ء) سپین (۱۸۰۸ء) کے تخت پر اس نے اپنے بھائی اور دوسرے عزیز بادشاہ بنا کر بٹھا دیئے، اپنے سب سے بڑے دشمن انگلستان کے مال کی درآمد اس نے بر عظم میں حکماً بند کر دی۔ (۱۸۰۶ء) یوں سارے یورپ پر اپنی عالمگیر طاقت اپنی حریص قوت اور ساتھ ہی اپنی خردمندی و نظام بندی کا شاندار سائبان پھیلا دیا (۱۸۱۰ء) لیکن قوموں نے اس تحفظ و صیانت کے خلاف بغاوت کا جھنڈا اٹھایا۔ روس پر نپولین کی دوسری یورش ناکام رہی (۱۸۱۲ء) روسیوں نے ماسکو کو جلا کر خاکستر کر دیا لیکن ہتھیار نہ ڈالے۔ یہ پسپائی جس میں نپولین کی "فوجِ عظیم" کے چار یا پانچ لاکھ سپاہی ضائع ہوئے اس کے زوال کا پیش خیمہ تھا۔ آزادی کی جنگ شروع ہوئی (۱۸۱۳ء) نپولین نے زک اٹھائی اور اتحادیوں نے اسے فرانس سے جلاوطن کر دیا (۱۸۱۴ء)۔ ان کی نظروں سے بچکر وہ آئندہ سال پھر فرانس میں آ جھمکا لیکن واٹرلو کی شہرہ آفاق لڑائی میں شکست کھا کر اس نے آخر اپنے آپ کو انگریزوں کے حوالے کیا (۱۸۱۵ء) اور انہوں نے اسے سینٹ ہیلینا کے دور دراز جزیرے میں نظر بند کر دیا جہاں چھ سال کی قید کے بعد وہ ملکِ عدم کو چل بسا (۱۸۲۱ء) +

وکٹر ہیوگو واٹرلو کی لڑائی کی نسبت کہتا ہے کہ "یہ تقدیر الٰہی کا دن ہے اور اس دن کو وہ قوت لے کر آئی ہے جو انسان سے زیادہ قوی ہے"۔ پھر کہتا ہے کہ "کیا نپولین کے لئے ممکن تھا کہ اس لڑائی کو مار لیتا؟ ہمارا جواب ہے نہیں! کیوں نہیں؟ ویلنگٹن کی وجہ سے؟ نہیں! بلوکھر کی وجہ سے؟ نہیں! خدا کی وجہ سے! "وقت آگیا تھا کہ اس عظیم الشان انسان کا خاتمہ کر دیا جائے"۔ انیسویں صدی میں اس کا گذارہ نہ تھا"۔ لیکن "شکست نے شکست خوردہ کو فروغ دیا۔ سرنگوں بونا پارٹ سرفراز نپولین سے بلند تر نظر آنے لگا"۔ خود نپولین نے بعد میں کہا کہ "میری شہرت میری چالیس کامیاب لڑائیوں پر منحصر نہیں۔ واٹرلو بہت سی فتوحات کی یاد مٹا دیگی، آخری بات پہلی باتوں کو بھلا دیتی ہے لیکن وہ چیز جو دنیا کبھی نہ بھولیگی میرے آئین و قوانین کی کتاب ہے۔ میں چاہتا تھا کہ ایک یورپی نظام قائم کروں اور ایک یورپی ضابطۂ قانون۔ پھر سارے یورپ میں صرف ایک قوم ہوتی"۔ یہ تھا نپولین کا ایک خواب اور کیسا جدید خواب تھا!

نپولین کی شخصیت میں تین بڑی قوتیں کام کرتی تھیں۔ خود اعتمادی، توانائی اور تخیل + اسے اپنے آپ پر پورا بھروسہ تھا۔ جب روسی پسپائی کے دوران میں اس سے سوال کیا گیا کہ فرانس میں اس کے مفاد کا محافظ کون ہوگا؟ تو اس نے کہا "میرا نام"! اس کا قول تھا کہ "میں ہر وقت کام میں مصروف رہتا ہوں اور فکر و غور میں منہمک"۔ "میں تخیل و تجربہ کا حامی ہوں، کیوں" اور "کیونکر" ایسے مفید سوالات ہیں کہ ان کو جتنی بار بھی دہرایا جائے کم ہے"۔ میدان جنگ کا خاکہ ذہن میں کھینچ کر وہ اپنی جنگی تجاویز کی کمزوریوں کو دل میں دہرایا کرتا تھا۔ یہاں تک کہ بقول خود اس کی حالت ایسی پر ہیجان ہو جایا کرتی تھی "جیسی ایک لڑکی کی ہو جس کے ہاں بچہ پیدا ہونے لگے"۔ اسی کے لفظوں میں اس کے کارناموں کا بیان سنو۔ "میں نے شاذ و نادر تلوار میان سے نکالی۔ اپنی لڑائیوں کو میں نے اپنی آنکھوں سے جیتا نہ کہ اپنے ہتھیاروں سے"۔ اپنی ہمت کو وہ "رات کے دو بجے والی ہمت" پکارتا ہے۔ اور اپنے زور و قوت کے جوش میں کہتا ہے "میری روح سنگِ مرمر کی ہے۔ بجلیاں اس پر

پے بہ پے گرتی رہیں لیکن اسے توڑ پھوڑ نہ سکیں "۔ "اگر آسمان ہمارے سروں پر گر پڑے تو ہم اپنی سنگینوں سے اُسے روک لیں"۔ واٹرلو کی شکست کے بعد بھی وہ اپنے بھائی شاہ جوزف کو لکھتا ہے کہ "سبھی کچھ کھویا نہیں گیا۔ میں اب بھی تین لاکھ فوج اکٹھی کر سکتا ہوں۔ اپنی توپوں کو میں گاڑی کے گھوڑوں سے کھنچوا سکتا ہوں۔ میں دشمن کو اب بھی مار بھگا سکتا ہوں۔ لیکن یہ لازم ہے کہ ہر فرد میری مدد کرے اور محض غُل نہ مچاوے"۔ اور اپنی فوج کے نام اعلان جاری کرتا ہے کہ "جنگجوؤ! اگرچہ میں تم سے دور رہوں گا۔ میری نظر تمہاری پیش قدمی پر رہے گی۔ تم فرانسیسیوں کی عزت و آزادی کے محافظ ہو۔ تم ایسے ہی بنے رہو جیسے تم گذشتہ بیس سال بنے رہے اور میں جانتا ہوں کہ تم کبھی شکست نہیں پاؤ گے"۔ مشہور بات ہے کہ لودی کے پُل پر جب اس کے بہادر افسروں نے کہہ دیا کہ گولوں کے طوفان میں پُل کے پار ہو سکنا ناممکن ہے تو اس نے جھنجھلا کر کہا۔ "ناممکن! ناممکن تو فرانسیسی زبان کا لفظ ہی نہیں"۔ لیکن بایں ہمہ وہ قسمت کا قائل تھا۔ "جو کچھ ہوتا ہے پہلے سے لکھا ہوتا ہے۔ ہماری ساعت مقررہ ہے اور کوئی اسے ملتوی نہیں کر سکتا۔ یقین مانو کہ ایک زبردست طاقت ہے جو ہم سب کی رہنما ہے۔ میں محض اس طاقت کا آلۂ کار ہوں"۔ البتہ جو موقع بھی "قسمت" سے ملے اسے کھونے کو وہ کبھی تیار نہ تھا۔ خصوصاً اس لئے کہ بقول اس کے "قسمت ایک عورت کی طرح متلوّن مزاج ہے ابھی کچھ ابھی کچھ"۔ اس کا ایک خاص مقصدِ زندگی تھا۔ وہ سمجھتا تھا کہ وہ قوموں کے معاملات کی درستی کے لئے مامور کیا گیا ہے "میں عوام کا آدمی ہوں۔ میری نبض ان کی نبض کے ساتھ ہم آہنگ ہے"۔ "مجھے حاجت ہے اور میری تمنا ہے کہ پچاس کروڑ آدمی مجھ سے محبت کریں"۔ موجودہ زمانے کا یہ سب سے بڑا جنگجو روح کو تلوار پر ترجیح دیتا ہے یہ کہہ کر کہ "ایک روز فتحیں حاصل ہوں گی بغیر گولوں اور بغیر سنگینوں کے"۔ یہ تھا نپولین کا ایک اَور خواب اور کیسا زرّیں خواب تھا! لیکن بقولِ شخصے آسمانوں میں فیصلہ ہو چکا تھا کہ زمین کا یہ فتنہ فرو کیا جائے اور جیسا کہ ہیوگو نے کہا ہے واٹرلو میں ولنگٹن اور بلوکھر کا نہیں بلکہ خدا کا ہاتھ تھا جس کے وار کی نپولین تاب نہ لا سکا۔

انگلستان نے اُسے سینٹ ہیلینا میں قید کر دیا اور بڑی سختی سے اس کی نگہداشت کی۔ انگلستان کو اس درشتی پر بُرا بھلا کہا گیا ہے۔ نپولین اور انگلستان کا آگ پانی کا بیر تھا۔ اس حالت میں انگریزوں سے بہتر سلوک کی توقع رکھنا فضول ہے۔ جزیرے کی آب و ہوا صحت کے لئے زہرِ قاتل کا حکم رکھتی ہے۔ سو اس میں شک نہیں کہ نپولین قبل از وقت مر گیا۔ گو یہ بھی ظاہر ہے کہ اگر وہ تھوڑی مدت اور نہ مرتا تو اس کی زندگی محض موت کی اِک توقع ہوتی یعنی "اگر اور جیتا رہتا یہی انتظار ہوتا"!

سینٹ ہیلینا کسی زمانے میں ایک آتش فشاں پہاڑ تھا۔ قیدی شاہنشاہ کی بھی کچھ یہی کیفیت تھی۔ مکان و مکین میں خوب قریب کی نسبت تھی۔

سینٹ ہلینا میں نپولین کے دن کبھی مطالعہ اور تصنیف و تالیف میں کبھی گہرے خیالوں اور پریشانیوں میں اور کبھی بیزاری اور آخری زمانے میں صبر و سکون میں کٹ گئے۔ کل تقریباً چالیس مصاحب و ملازم اس کے ہمراہ فرانس سے آئے تھے چھ سال میں یہ تعداد نصف کے قریب رہ گئی۔ اس دور دراز حبس گاہ میں کون ٹھہرتا۔ نپولینیت بھی دیر تک دِل آویز نہ رہی۔

مکان آدمیوں کی بہ نسبت زیادہ چوہوں سے آباد تھا۔ ان کی قلابازیوں کے علاوہ نپولین کو اپنے ہمراہیوں کی ریشہ دوانیوں کو

غم انگیزیوں سے روز و شب واسطہ پڑتا تھا۔ ایک موقع پر اس نے کہا "ہمیں اپنے تخیل پر قابو رکھنا چاہیے ورنہ ہم دیوانہ ہو جائیں گے"۔ "جب تک ہم یہاں مقیم ہیں میں چاہتا ہوں کہ میرے دوست خوش رہ کر مجھے بھی خوش رکھیں۔ نہ کہ اداس بن کر مجھے بھی اداس کر دیں"۔ "کیا تم سمجھتے ہو کہ میرا کوئی وقت عمگینی میں نہیں گذرتا؟ راتوں کو میں جاگ اٹھتا ہوں اور سوچتا ہوں کہ میں کیا تھا اور کیا ہو گیا؟"

شاہنشاہ صبح کو دیر میں بستر سے اٹھتا تھا تاکہ دن زیادہ لمبا معلوم نہ ہو۔ کبھی وہ کھانے پر گورگو سے باتیں کرتا ہے۔ تو پچانے اور آتش باری کی گفتگو چھڑ جاتی ہے کہ اس سے بچاؤ کی کیا کیا صورتیں ہیں۔ سہ پہر کے وقت وہ اپنی خوابگاہ میں صوفے پر لیٹا ہوا پڑھتا ہے، کبھی پڑھتے پڑھتے تنگ آ جاتا ہے کتاب ہاتھ سے چھوٹ کر اس کے گھٹنوں پر گر پڑتی ہے اور سامنے اس کے بچہ کی ماں اور بچے کی تصویر کو ٹکٹکی باندھے دیکھنے لگ جاتا ہے۔ پاس ہی ایک سفید رنگ والی الماری پر دو عقابوں کے مجسمے اور موم بتیاں ہیں اعقاب نپولین کا شاہنشاہی نشان تھا، ان کے درمیان اس کے بیٹے کا چھوٹا سا مرمریں مجسمہ ہے۔ جوزے فین اس کی پہلی چہیتی بیوی کی تصویر بھی آویزاں ہے اور قریب ہی فریڈرک اعظم کا مینی کلاک لٹک رہا ہے۔ کبھی جہاز کے پہنچنے والے دن نئی کتابیں آتی ہیں تو اس کی خوشی کی انتہا نہیں ہوتی۔ کتابوں کو اس قدر جلد جلد پڑھتا ہے کہ ایک کتاب مشکل سے ایک گھنٹہ لگتا ہے۔ کتاب کو دیکھتا ہو ناپسند ہو تو فوراً اور پسند آئے تو گھنٹے بھر میں پڑھ کر اُسے وہیں فرش پر پھینک دیتا ہے۔ چونکہ ہر کتاب سے آتا ہے اور یوں یہ دن گذر جاتے ہیں۔ عموماً وہ اپنے کسی دوست کو اپنی نوکھی زندگی کے واقعات لکھاتا ہے۔ واٹرلو کا حال بار بار لکھاتا ہے اور کہتا ہے یہ واقعہ مجھے مغموم بنا دیتا ہے۔ نپولین کے خود نوشتہ حالات بے انتہا دلچسپ ہیں۔ بالآخر وہ خود ہی اپنی زندگی کا سب سے سخت گیر نکتہ چین بنا گو ساتھ ہی اُس نے آنے والے مؤرخ سے اپنا پورا حصہ بھی طلب کیا اور موجودہ و آیندہ اعتراضات کا زعم خود خوب جواب لکھ دیا۔ "مجھے ہوس تھی؟ ہاں بلا ریب تھی لیکن میری ہوس بہترین قسم کی تھی اور وہ یہ تھی کہ میں عقل کی مملکت کی بنیاد قائم کروں جس کے اندر تمام انسانی قواء کی مکمل نشو و نما اور انتہائی لطف اندوزی ہو"۔ ایک انگریزی اخبار اس کے ہاتھ آتا ہے جس میں لکھا ہے کہ نپولین نے بے شمار خزانے کہیں چھپا رکھے ہیں۔ اس پر وہ فوراً اچھل پڑتا ہے۔ غصے سے لال ہو جاتا ہے اور ایک دن لیکن جواب لکھواتا ہے کہ اس کے خزانے چھپے ہوئے نہیں بلکہ وہ نئے بندرگاہوں نئے پلوں نئی سڑکوں نئی تعمیرات نئے کوچوں نئی عمارت گاہوں نئے قانونوں اور سینکڑوں نئی چیزوں میں اظہر من الشمس ہیں۔

وہ سمجھتا ہے کہ وہ سب کچھ سمجھتا بوجھتا ہے۔ وہ کس طرح اٹھا کس طرح گرا کیا تھا کیا ہوا؟ "میرے زوال کا باعث سوائے میرے کوئی اور نہیں۔ میں ہی اپنا سب سے بڑا دشمن ہوں اپنی بری قسمت کا سبب میں خود ہی ہوں"۔ گویا قسمت کی قوت نے بھی اُسے تباہ نہیں کیا بلکہ خود نپولین ہی نپولین کو زک دے سکا! بوروڈینو؟ ڈریسڈن؟ "اُسے کہاں مرنا چاہیے تھا" "نہیں نہیں واٹرلو پر موت سب سے اچھی ہوتی! لوگوں کی محبت، ان کا سوگ!" "سب کچھ دیکھو تو میری زندگی بھی ایک عجیب راگ تھی!"

آخر کار زندگی کا آخری سال آن پہنچا۔ اور یہی شخص جو ایک زمانے میں بلا توقف پانچ سو میل تک گاڑی میں سفر کر سکتا تھا۔ دن بھر میں سو میل تک گھوڑے کی سواری کر سکتا تھا، پانچ گھنٹوں میں اسی میل سرپٹ گھوڑا دوڑا سکتا تھا مسلسل اٹھارہ اٹھارہ گھنٹے کام

کئے جانا، چھوٹی سے چھوٹی جزئیات میں دلچسپی لینا اور ذرا ذرا سی ہدایات میں اپنی نمودبینی کے جوہر دکھاتا جو اس جزیرے میں قید ہو کر اپنی قید سے گھبرا کر کبھی پڑھنے اور لکھنے لکھانے میں مصروف ہو جاتا کبھی اپنے دشمنوں کو برا بھلا کہتا! اپنی عمر کے آخری سال میں صبر و سکون کا دلدادہ ہو گیا۔ اس نے خود پھاوڑا ہاتھ میں لیا اور اپنے مصاحبوں اور ملازموں کے ساتھ مل کر سات ماہ میں ایک باغ تیار کر دیا ایسا کہ "ظالم" انگریزی حاکم کی بیٹی بھی چھپ کر ایک روز اس چمن کی سیر کو آئی۔ یہ آخری معجزہ تھا جو نپولین کی ذکاوت نے دنیا کو دکھایا +

بتدریج اُس کی طبیعت بگڑتی گئی۔ جگر و معدہ خراب ہو گیا "میں کس قدر قابلِ رحم وجود بن گیا ہوں۔ میں جسے کبھی نیند کی بھی کم حاجت ہوتی تھی اب اپنے دن سستی اور زیاں کاری میں گذارتا ہوں۔ آنکھیں کھولنا بھی تو اب میرے لئے دشوار ہو گیا ہے۔ گذرے دنوں میں اکثر ایسا ہوا ہے کہ میں نے چار چار منشیوں کو بیک وقت چار مختلف مضمونوں پر اپنے خیالات لکھوائے ہیں۔ ان دنوں میں میں نپولین تھا!"

وہ اپنی لمبی چوڑی وصیت لکھواتا ہے۔ اسے یہ ملے اُسے وہ ملے میرے بیٹے کو میرا کارسیکا کا مکان دیا جائے وغیرہ وغیرہ اور "یہ میری خواہش ہے کہ میری راکھ دریائے سین کے کنارے پر دفن کی جائے فرانسیسی لوگوں کے درمیان جن سے میں نے ہمیشہ محبت کی ہے"۔

پھر دوستوں اور عزیزوں سے اُس کی توجہ ہٹ جاتی ہے اور اس کا دل اور باتوں کی طرف مائل ہوتا ہے اپنی بیہوشی میں وہ چیختا ہے "دیزے! ماسینا! فتح ہمارے ہاتھ ہے! جلدی کرو! بڑھے چلو! بس ہم نے مار لیا انہیں ۔ ۔ ۔ ۔"

آخری رات! درد و کرب کی ایک سنگین رات!

نور کے تڑکے مونتولون اُسے کچھ بڑبڑاتے سن پاتا ہے:

"فرانس! ۔ ۔ ۔ فوج! ۔ ۔ ۔ سپہ سالار ۔ ۔ ۔ ۔ جوزے فین!" نپولین کے آخری الفاظ ہیں! اس کے جلد بعد وہ یک لخت جوش میں آکر اٹھتا ہے اور مونتولون کے گلے کو پکڑ کر اس زور سے بھینچتا ہے کہ وہ بیچارہ چیخ بھی نہیں سکتا۔ ایک اور مصاحب پاس کے کمرے سے آکر اُسے چھڑاتا ہے۔ خدا معلوم شہنشاہ اپنی آخری جنگ میں کس دشمن کا گلا گھونٹ رہا تھا! یہ عجیب خواب تھا!

باقی دن وہ آرام میں آہستہ آہستہ سانس لے کر گذارتا ہے۔ پانچ بجے ہوائیں زور میں آتی ہیں اور دو تازہ بوئے ہوئے درختوں کو جڑ سے اکھیڑ کے رکھ دیتی ہیں۔ ادھر یہ طوفان بپا ہے ادھر یہ شخص اپنے بستر مرگ پر آہستہ آہستہ جانکنی کی تکلیفیں جھیل رہا ہے۔ اب درد کا کوئی نشان نہیں رہا۔ اب اس کی آنکھیں کھلی کی کھلی رہ گئی ہیں گویا خلا کو تک رہی ہیں۔ اب اس کے گلے میں موت کا پھندا ہے۔

ادھر سورج سمندر کے سینے میں ڈوبتا ہے ادھر شاہنشاہ کے دل کی دھڑکن ختم ہو جاتی ہے! نپولین کی قبر ایک الگ تھلگ سی تنہا وادی میں بنائی گئی ایک چشمے کے کنارے دو بید مجنوں کے درختوں کے سایہ تلے۔ والئی جزیرہ نے اجازت نہ دی کہ اس پر کوئی کتبہ نصب کیا جائے۔ سو فقط نپولین بونا پارٹ لکھا گیا۔ نہ انگلستان نے اجازت دی کہ اس کی نعش فرانس لے جائی جائے۔ صرف ایک انگریز سنتری اس کی قبر پر تعینات کر دیا گیا! انیس سال بعد ۱۸۴۰ء میں جب آخر نپولین کی ہڈیاں پیرس پہنچیں تو دار السلطنت میں ایک ہیجان پیدا ہو گیا جو کچھ مدت کے بعد ایک قومی انقلاب کی صورت میں ظاہر ہوا۔

نپولین مر کر بھی زندہ رہا!

بشیر احمد

غزل

چمن کا شوق ہے لیکن چمن کہاں دیکھا
قفس میں ہم نے بہت خوابِ آشیاں دیکھا

بس ایک شغل کی حاجت ہے بے قراروں کو
کسی نے کب اثرِ نالہ و فغاں دیکھا

حریفِ ہمتِ دل کیا ہو دوریٔ منزل
نگاہِ شوق نے وہ تیرا آستاں دیکھا

نظر کی نذر چڑھی تیری رونمائی میں
دکھائی پھر نہ دیا کچھ تجھے جہاں دیکھا

کبھی ہے حسن تمہارا کبھی ہمارا شوق
وہی ہے ذکر جسے زیبِ داستاں دیکھا

سب اپنے اپنے خیالات میں ہیں سرگرداں
نہ ہم سخن کوئی پایا نہ ہمزباں دیکھا

رہا نہ پھر مرے دل میں خیالِ آزادی
قفس کو میں نے جو ہم رنگِ آشیاں دیکھا

نہ اپنے درد کا دکھ ہے نہ غم کا غم مجھ کو
دل اپنا شاد ہوا تم کو شادماں دیکھا

کسے نصیب ہے راحت، کسے ملا آرام
جدھر کو دیکھا ہجومِ بلا کشاں دیکھا

ق

کسی کو خستۂ ہنگامۂ زمیں پایا
کسی کو کشتۂ بیدادِ آسماں دیکھا

سرور دل میں ہے وحشتؔ تو نور آنکھوں میں
نہ دیکھ کر اُسے کہتا ہوں میں کہ ہاں دیکھا

رضا علی وحشت

یہ کبھی نہ کہو کہ اس بات کا علم کہ زندگی بغیر خوشی کے کیونکر بسر ہو سکتی ہے ایک نوع کی خوشی ہے۔ اس طرح تو ایک شراب نہ پینے والا بھی کہہ سکتا ہے کہ شراب سے کُلّی پرہیز کرنے کا علم اصلی بدمستی ہے ۔ خوشی زندگی کا مقصد نہیں، زندگی کا کوئی بھی مقصد نہیں، زندگی تو خود ایک مقصد ہے اور دلیری اس میں ہے کہ ہم اپنی خوشی کو ایک زیادہ پُرکیف زندگی کے لئے قربان کردیں۔

اُردو شاعری اور ملکی سرمایہ

تعصب و تنگ نظری نے اردو شاعری پر جتنے بیجا الزامات عائد کئے ہیں اُن میں سے ایک نام نہاد الزام یہ بھی ہے کہ اس کا دامن ملکی و مقامی سرمایہ سے یکسر خالی ہے۔ بڑی بلند آہنگی کے ساتھ اعتراض کیا جاتا ہے کہ اگرچہ اردو زبان نے ہندوستان ہی میں جنم لیا یہیں اس نے پرورش پائی۔ ہندی فضا میں اس کی نشو نما ہوئی۔ اسی سرزمین میں وہ پھولی پھلی اور پروان چڑھی لیکن حیرت ہے کہ اس کی شاعری پر مرز بوم کا کوئی اثر نہ پڑا۔ اول سے آخیر تک یہ شاعری مقامی رنگ و بو سے بالکل بیگانہ ملکی خصوصیات سے یکسر ناآشنا اور ہندی طرز و اسلوب سے کوسوں دور رہی۔ اس کی ہر ادا سے ایرانیت ٹپکتی ہے۔ وہ فارسی شاعری کے نقش قدم پر چلتی ہے۔ ہر بات میں اس کی تقلید کرتی ہے۔ اس کے پاس اپنا ذاتی سرمایہ کچھ نہیں ہے۔ اس کی ساری ٹھاٹ باٹ بدیسی ہے۔ اس لئے موجودہ دور کے نام نہاد وطن پرستوں کا ایک طبقہ مصر ہے کہ اردو شاعری سے تمام غیر ملکی عناصر کو یک لخت خارج کر دیا جائے اور خالص ہندی ساز و سامان سے اس کی محفل سجائی جائے۔ اگر ان سے اس کایا پلٹ کی تجویز کے فوائد دریافت کئے جائیں تو وہ یہی کہیں گے کہ انسان کو بدیسی چیزوں کے مقابلہ میں دیسی چیزیں زیادہ مرغوب ہوتی ہیں ہر شخص کو ملکی پیداوار کے تذکرہ سے فطرتاً بہت زیادہ حظ و انبساط اور لذت و فرحت حاصل ہوتی ہے۔ دوسرے یہ کہ جن چیزوں کو اپنی آنکھوں سے کبھی دیکھا تک نہ ہو ان کا صحیح تصور قائم نہیں ہو سکتا۔ اس لئے انسان ان سے کماحقہٗ لطف اندوز نہیں ہوتا۔

لیکن غور کرو تو معلوم ہوگا کہ یہ اعتراض حق و صداقت پر مبنی نہیں ہے کیونکہ اردو کی کوئی صنفِ سخن ایسی نہیں پائی جاتی جو وطنی خصوصیات۔ ملکی سرمایہ۔ ہندی شعائر اور مرز بومی اثرات سے بالکل بیگانہ و بے تعلق ہو۔ نظیر اکبر آبادی کے کلیات کا بڑا حصہ مقامی رنگ میں ڈوبا ہوا ہے۔ اردو وصف نگاری کے اکثر و بیشتر مضامین ہندوستان کی قدیم روایات۔ نیم مذہبی فسانہ و حکایات۔ دیسی مذاق و تہذیب اور یہیں کی موسمی کیفیتوں اور مقامی دلفریبیوں سے ماخوذ ہیں۔ حالی کی "برکھا رت" نند کی "برسات"۔ آزاد کی "گائے"۔ شوکت کے "نیم"۔ عظمت اللہ کے "پیپل"۔ ڈاکٹر اقبال کے "نئے شوالے" کو کون شخص بدیسی یا اجنبی قرار دے سکتا ہے۔ چکبست نے ہندی دیو مالا اور رامائن کے واقعات کو جس حسن و خوبی کیساتھ میر انیس کے رنگ میں بیان کیا ہے اس سے ہزاروں برس پیشتر کی ہندی معاشرت کا سماں آنکھوں کے سامنے پھرنے لگتا ہے خود میر انیس کو دیکھئے۔ واقعات بیان کرتے ہیں کربلائے معلیٰ کے۔ کردار سارے عرب ہیں۔ لیکن اہل بیت و اہل حرم کے آداب و مراسم۔ عادات و خصائل اور خیالات و جذبات سب لکھنؤ کی شریف زادیوں کے مطابق فرض کر لئے ہیں مثلاً

فق ہو گئی ماں سن کے یہ فرزند کی تقریر   بانو نے کہا ہائے میری بچی کی تقدیر

دولہا کا سخن سن کے کلیجے پہ لگا تیر
خاموش تھی گھونگھٹ میں دلہن صورتِ تصویر
چاہا کہ کہے کاش ہماری اجل آئے
کچھ منہ سے نہ نکلا مگر آنسو نکل آئے

(۲) غم تھا کہ کوئی دم میں یہ مسند ہوئی خالی
اب سر پہ رنڈاپے کی بلا چرخ نے ڈالی
کچھ منہ سے نہ کہہ سکتی تھی وہ ناز کی پالی
یہ ہونٹ چبائے کہ اڑی پان کی لالی
آپڑتے تھے اشک آنکھوں سے رخسار پہ ڈھل کر
رہ جاتی تھی وہ مہندی لگے ہاتھوں کو مل کر

بھلا عرب میں گھونگھٹ - پان کی لالی اور مہندی کا کب دستور تھا ؟ یہ خالص ہندوستانی چیزیں ہیں۔

برسات - بسنت - ہولی اور دیوالی وغیرہ پر مسلسل غزلیں قصیدے اور مثنویاں سب کچھ پائی جاتی ہیں - یوں تو بعض قصائد میں خالص ہندوستانی چیزوں کے ساتھ تشبیہ و استعارہ کی متعدد مثالیں ملتی ہیں لیکن محسن کاکوری نے ایک زبردست، نعتیہ قصیدہ بالکل ہندوانی رنگ کا لکھا ہے جو اپنی ندرتِ بیان اور جدتِ ادا کی وجہ سے اردو ادبیات میں ایک ممتاز درجہ رکھتا ہے۔ اس کی ابتدائی چند بیتیں ملاحظہ ہوں۔

سمت کاشی سے چلا جانبِ متھرا بادل
برق کے کاندھے پہ لاتی ہے صبا گنگا جل
گھر میں اشنان کریں سرو قدانِ گوکل
جاکے جمنا پہ نہانا بھی ہے اک طول امل
خبر اڑتی ہوئی آئی ہے مہابن میں ابھی
کہ چلے آتے ہیں تیرتھ کو ہوا پر بادل
دیکھئے ہوگا سری کرشن کا کیونکر درشن
سینۂ تنگ میں دل گوپیوں کا ہے بےکل

پوری تشبیب اسی رنگ کی ہے اس کے بعد گیارہ اشعار کی ایک غزل بھی اس میں اسی انداز کی شامل کردی گئی ہے۔

قصیدہ سے قطع نظر مثنویوں میں ہندی خصوصیات کا وافر ذخیرہ موجود ہے۔ اردو زبان کی سب سے مشہور و مقبول مثنویاں میر حسن کی "سحر البیان" - اور پنڈت دیا شنکر نسیم کی گلزارِ نسیم" ہیں - ثانی الذکر میں "گل بکاؤلی" کا مشہور و معروف قصہ نظم کیا گیا ہے جو مضمون و مواد کے لحاظ سے خالص ہندی چیز ہے۔ اول الذکر مثنوی میں بھی دربار - جلوس - شادی برات - دلہن کی آرائش - اور باغ و بہار کے منظر کی تصویریں کھینچنے میں شاعر نے خاص ہندوستانی رنگ و روغن سے کام لیا ہے۔

لیکن اردو شاعری کا اصل سرمایہ غزل ہے چند مرثیہ نگاروں اور نظیر اکبرآبادی کے سوا تمام قدیم سرآمد شعرا کے دواوین کا اکثر و بیشتر حصہ غزلیات پر مشتمل ہے۔ دوسرے اصنافِ سخن کی مقدار کھانے میں نمک کی سی ہے، اس لئے یہاں اُن کا بیان بھی ان کی مقدار کے لحاظ سے نہایت ایجاز و اختصار کے ساتھ کردیا گیا ہے تفصیلی معلومات کے لئے "شعر الہند" کا مطالعہ مفید ثابت ہوگا جس کا ایک پورا باب ملکی سرمایہ کی بحث کے لئے وقف کردیا گیا ہے۔ غزل اپنی کثرت و اہمیت کے لحاظ سے زیادہ تفصیل

والیضاح کی مستحق ہے۔

واضح رہے غزل کا تعلق داخلی شاعری سے ہے لہذا خارجی واقعات سے اس کو بہت کم لگاؤ ہے۔ اس کے اہم عنصر جذبہ و تخیل ہیں جو نفس بشری کے ساتھ وابستہ ہونے کی وجہ سے مکان و زمان یا وقت و مقام کی قید سے آزاد ہیں۔ مکان و زمان میں ہزاروں تبدیلیاں کیوں نہ ہوں لیکن نفس انسانی کی کارفرمائیاں ایک ہی قانونِ قدرت کی پابند ہوتی ہیں۔ جذبہ و تخیل کا طرز عمل شاذ و نادر بدلتا ہے۔ اس لئے غزل میں بہ لحاظ مواد و مضمون دیسی اور بدیسی کا سوال بہت کم پیدا ہوتا ہے۔ البتہ ملاحظہ طلب امر یہ ہے کہ شاہد سخن کی آرائش و زیبائش کے لئے کس قسم کے ساز و سامان کام میں لائے گئے ہیں۔ معترضین کا بیان ہے کہ غزل کی کل تشبیہیں استعارے اور تلمیحیں غیر ملکی اشخاص۔ بیرونی پیداوار۔ اور بدیسی اشیا سے تعلق رکھتی ہیں۔ اگرچہ ہندوستان کے وسیع و زرخیز ملک میں ہر قسم کے درخت پھول پھل پیدا ہوتے ہیں ہزاروں دریا پہاڑ۔ وادی اور صحرا موجود ہیں۔ یہاں لاکھوں ہیرو اور بہادر گذرے ہیں۔ یہاں کی قدیم روایات۔ اساطیر۔ اور تہذیب و معاشرت نہایت شاندار ہے لیکن اردو کا غزل گو شاعران سے کام لینا جانتا ہی۔ وہ ایرانی شعرا کی تقلید میں گل و بلبل۔ سرو و قمری۔ سوسن و نرگس۔ سنبل و ریحان۔ جیحوں و سیحوں۔ دجلہ و فرات۔ کوہ قاف و کوہ الوند۔ کوہ طور و کوہ بیستوں۔ رستم و سہراب۔ جم و فریدوں۔ سکندر و دارا۔ نوشیرواں و سلیمان۔ ارسطو و فلاطوں۔ مانی و بہزاد۔ لیلیٰ مجنوں۔ شیریں فرہاد۔ وامق و عذرا وغیرہ کے ذکر سے بزم ادب کی رونق بڑھانا چاہتا ہے۔

غیر ملکی رجال و ابطال کے حوالہ و تلمیح اور بدیسی چیزوں کے ساتھ تشبیہ و استعارہ کی خوبی یا برائی پر بحث کرنے سے قبل ہم عرض کر دینا چاہتے ہیں کہ معترضوں کا یہ بیان بھی راستی و صداقت سے دست و بغل نہیں ہے کیونکہ دوسرے اصناف سخن کی طرح غزل بھی بڑی حد تک ہندی خصوصیات و ملکی سرمایہ کی حامل ہے۔ ایسے اشعار کی کمی نہیں جن کا انداز بیان بالکل ہندی طرز کا ہے اور جن میں تشبیہ و استعارہ کی بنیاد خالص ہندوستانی چیزوں پر رکھی گئی ہے۔ مثال کے طور پر صاحب "شعر الہند" نے کثیر التعداد اشعار نقل کئے ہیں جن میں سے یہاں چند شعر بطور مشتے نمونہ از خروارے ہدیۂ ناظرین ہیں۔

ولی:—	زلف ہے تیری موج جمنا کی	تل نزیک اس کے جوں سناسی ہے
حاتم:—	ہولی کے اب بہانے چھڑکا ہے رنگ کس نے	نام خدا تجھ اوپر اس آن عجب سماں ہے
سودا:—	ترکش الیند سینہ عالم کا چھان مارا	مژگاں نے تیرے پیارے ارجن کا بان مارا
آبرو:—	کب تلک دھونی رماتے جوگیوں کا سا پھروں	بیٹھے بیٹھے در پہ تیرے میرا آسن جل گیا
مصحفی:—	شمس و قمر نے دیکھ لیا کیا اس کے گورے مکھڑے کو	کوٹھے پر دن رات پڑے جو چیل ایسے منڈلاتے ہیں
انشا:—	دل میں سما رہا ہے یوں داغ عشق اپنے	جس طرح کوئی بھونرا ہوئے کنول میں بیٹھا
جرأت:—	درد دل اس بت بیدرد سے کہئے تو کہے	جا کے یہ رام کہانی تو سنا اور کہیں
ناسخ:—	ہجوم رکھتے ہیں جانبازیوں تیرے آگے	جو اڑیوں کا دوالی میں جیسے جمگھٹ ہو

آتش:- خاکِ شہیدِ ناز سے بھی ہولی کھیلئے ۔ رنگ اس میں ہے گلال کا بو ہے عبیر کی

بحر:- ہوا دھوپ میں بھی نہ کم حسن یار ۔ کنھیا بنا جو سنولا گیا

ظفر:- پھرتا ہے جوگی بنا تیرے لئے آفتاب ۔ خط شعاعی نہیں سر پہ کھلی ہے جٹا

امیر:- نہ سمجھا تھا کہ ان طوقوں میں پھر مجھ کو پھنسائے گے ۔ کرو گے چوڑیاں ٹھنڈی تم آکر میرے مدفن پہ

ان مثالوں سے ظاہر ہے کہ ہر دور کے شاعروں نے اپنے کلام کی آرائشگی اور شاہدِ سخن کی شائستگی کے لئے ہندی مال مسالے بھی استعمال کئے ہیں لیکن سچ پوچھئے تو فارسی ترکیبوں اور تشبیہوں سے بندش میں جو چستی و صفائی۔ طرزِ ادا میں جو دلکشی و سہولت کلام میں جو شوکت و جزالت اور اظہارِ بیان میں جو اعجاز نما اختصار اور اثر پیدا ہوتا ہے وہ ہندی تشبیہوں اور استعاروں کو کبھی نصیب نہیں ہو سکتا۔ وصف نگاری کے لئے ہندوستان کی قدرتی یا مصنوعی پیداوار موضوع شاعری بن سکتی ہے چنانچہ بہت سے شاعروں نے یہاں کے قدرتی مناظر و مرایا۔ رسم و رواج۔ تہوار و تقریب۔ تہذیب و معاشرت نیم مذہبی حکایات و افسانہ پر دل کھول کر طبع آزمائی کی ہے مضمونِ شاعری کی حد تک ہندی خصوصیات کی کمی نہیں لیکن محفلِ غزل کی آرائش اور شاہدِ سخن کی شائستگی کے لئے ہندوستانی ساز و سامان کی کثرت فروغِ حسن کا باعث نہیں بن سکتی۔ ہندی الفاظ و تشبیہات کی زیادتی کلام کی لطافت و پاکیزگی کو زائل کر کے ثقالت و کرختگی پیدا کر دیتی ہے۔ اوپر جو اشعار درج کئے گئے ہیں وہ شیرینی و پاکیزگی صفائی و روانی شستگی و تاثیر کے لحاظ سے ان اشعار کا مقابلہ نہیں کر سکتے جن میں فارسی عنصر غالب ہوتا ہے۔

اردو زبان اب دنیا کی دوسری ترقی یافتہ زبانوں کی طرح اپنی مستقل اور آزادانہ حیثیت رکھتی ہے جس طرح دنیا کی کوئی غیور قوم اپنے شعائرِ ملی و خصائلِ قومی سے دست بردار ہونا پسند نہیں کرتی اسی طرح اردو زبان کی خودداری بھی کسی نام نہاد وطن پرست فرقہ کی رضاجوئی و خوشنودی کی خاطر اپنی شاندار روایات اور لسانی خصوصیات سے کنارہ کشی اختیار نہیں کر سکتی۔ تہذیب و تمدن کا یہ مسلمہ اصول ہے کہ جب دو یا زیادہ قوموں کا اجتماع یا انصادم ہوتا ہے تو ان پر فطرتاً جذب و اتخاذ اور اثر و تاثیر کا عمل ہونے لگتا ہے لیکن کسی قوم کو یہ حق حاصل نہیں کہ وہ دوسروں کو اپنے ہی شعائر و خصائل اختیار کرنے پر مجبور کرے۔ اردو شاعری ہندی ماحول و فضا سے خود بخود متاثر ہو کر یہاں کی لطیف و پاکیزہ چیزوں کو اپنے اندر حسبِ ضرورت جذب کرتی رہی ہے لیکن کسی طبقہ یا جماعت کا یہ مطالبہ درست نہیں کہ وہ اپنی تمام قدیم خصوصیات اور لسانی امتیازات سے دست بردار ہو کر خالص ہندی رنگ قبول کرلے اور ہر محفل میں صرف ہندی زیور اور لباس کے ساتھ جلوہ گر ہوا کرے خواہ یہ جامہ اس کے تنِ نازک پر پھبتا ہو یا نہ۔

اس میں شک نہیں کہ اردو شاعری نے تشبیہات و استعارات۔ تلمیحات و کنایات۔ اوزان و بحور۔ طرزِ ادا و اسلوبِ بیان اور ردیف و قافیہ سب کچھ فارسی سے لیا ہے جس کو تاریخِ ہند کے اسلامی دور میں ادب العالیہ اور حاکم و مقتدر زبان ہونے کا شرف حاصل تھا لیکن اس سے یہ نتیجہ اخذ کرنا کہ اردو شاعری کوئی اپنا ذاتی سرمایہ یا آزادانہ وجود ہی نہیں

رکھتی ٹھیک ویسا ہی ہے جیسے کوئی کہے کہ موجودہ مغربی ادب و شاعری کے تمام دفتر بے پایاں محض بے معنی و بے سود ہیں کیونکہ سب نے یونانی و رومی ادبیات و صنمیات اور کلیسائی روایات و اخلاقیات سے خوشہ چینی کی ہے۔

فارسی کے نمونہ پر اردو شاعری کی نشو و نما عین قانونِ قدرت و اصول لسانی کے مطابق ہوئی ہے جس پر کسی طرح نقالی و انجذابِ گدایانہ کا الزام عائد نہیں ہو سکتا۔ تمثیلاً فارسی اور اردو شاعری کے درمیان ماں بیٹی کا رشتہ قائم کیا جا سکتا ہے ہر ملک میں عام بول چال کی زبان ادب و شاعری کی شستہ و سنجیدہ زبان سے قدرے مختلف ہوتی ہے ممکن ہے کہ ہندوستانی بولی جو آگے چلکر اردو سے نامزد ہوئی برج بھاشا سے نکلی ہو لیکن اس سے کوئی انکار نہیں کر سکتا کہ ریختہ یا اردو کی شاعری خاص ایرانی شاہدِ سخن کی دختر نیک اختر ہے۔ اصولِ فطرت و قانون قدرت کا یہی تقاضا ہے کہ بیٹی اپنی ماں کے نقش قدم پر چلے۔ اسی کا طرزِ گفتگو سیکھے۔ اسی کے خیالات و جذبات سے متاثر ہو۔ اسی کی چال ڈھال اختیار کرے۔ اسی سے تہذیب و شائستگی کا سبق حاصل کرے جب اردو شاعری نے آنکھیں کھولیں اور گوش ہوش وا کئے تو ہر مجلس اور ہر محفل میں اپنی ماں کو زینت بخش پایا اس کے دلکش نغموں سے ہندوستان کا گوشہ گوشہ گونج رہا تھا۔ اس کے منہ سے فصاحت و بلاغت کے پھول جھڑتے تھے۔ ہر شخص خواہ وہ گوشۂ عزلت کا مسکن گزیں ہو یا دولت و امارت کا مسند نشیں۔ خواہ اس کا قلب صنم آشنا ہو یا حق آگاہ۔ خواہ وہ زاہد خشک ہو یا رند لاابالی۔ خواہ وہ زنّار بند ہو یا سبحہ گردان اس کی ایک ایک ادا کا شیدائی تھا ننھی بچی اپنی مامتا بھری ماں کے آغوش میں پلتی اور اس کی فصیح زبان سیکھتی گئی۔ خوش قسمتی سے اس کو اتالیق بھی ایسے ملے جو یگانۂ روزگار تھے بعض اناڑی اناؤں مثلاً برجی۔ پوربی۔ دکھنی۔ گجراتی وغیرہ کی صحبت سے کچھ سخت و ثقیل الفاظ اس کی زبان پر چڑھ گئے تھے لیکن قابل اتالیق اس کی اصلاح کرتے گئے۔ سب سے زبردست استاد ناسخ تھے جنہوں نے نہایت سختی کے ساتھ اس کی زبان سے کرخت و ثقیل الفاظ اتارے کمسن لڑکی بمرورِ زمانہ بڑھتی اور شائستہ ہوتی گئی یہاں تک کہ ذوق۔ مومن اور غالب جیسے ماہرینِ فن کی تعلیم و تربیت نے اسی ایرانی شاہدِ سخن کا ہمدوش بنا دیا۔ رفتہ رفتہ وہ اپنے ظاہری و باطنی محاسن کے لحاظ سے دنیا کی مہذب سے مہذب شاعری سے آنکھ ملانے کے لائق بن گئی۔ الغرض اردو شاعری نے فارسی شاعری سے جو کچھ حاصل کیا وہ اس کی گدایانہ خردہ چینی نہیں بلکہ اُس کی جائز میراث ہے، اولاد کو والدین سے جو کچھ وراثتاً منتقل ہوتا ہے اُسے کوئی منصفانہ قانون ناحق تصور نہیں کرتا۔

قدیم ہندوستان میں سنسکرت جس کے معنی آراستہ پیراستہ اور منزہ و مصفا کے ہیں اعلیٰ طبقہ کے لوگوں کی زبان تھی جو مہذب و شائستہ شمار ہوتے تھے۔ اگرچہ اس کا دامن علمی و ادبی خزانوں سے مالا مال تھا لیکن وہ گوتم بدھ سے کئی صدی پیشتر ہی مردہ و متروک ہو چکی تھی۔ اس کے بعد گپتا عہد میں سنسکرت کی نشاۃ ثانیہ ہوئی اور مختلف علوم و فنون کی کتابیں تصنیف ہوئیں لیکن اس کا دائرہ عمل نہایت تنگ و محدود تھا صرف بڑے بڑے برہمن پنڈت تمام علمی و فنی خزانہ کے کلید بردار تھے۔ عوام الناس کو استفادہ کا موقع حاصل نہ تھا علاوہ بریں اس سے تمام وہ خوبیاں اور دلکشیاں رخصت ہو چکی تھیں جو ایک زندہ متحرک و ترقی پذیر زبان کا طرۂ امتیاز سمجھی جاتی ہیں۔ اردو کی پیدائش کے وقت سنسکرت کے علمی ذخیرہ پر نہایت تاریک پردہ پڑا ہوا تھا۔ البتہ مٹھی بھر برہمنوں کو مذہبی رسوم کی ادائی کے لئے اس کے چند اشلوک ازبر تھے۔ اس وقت ملک کے متفرق حصوں میں مختلف پراکرتیں رائج تھیں پراکرت

کے معنی ہیں جو طبیعت سے نکلے۔ پس پراکرتیں وہ زبانیں تھیں جنہیں طبیعتوں نے اپنی اپنی زمین میں پیدا کر دیا تھا۔ یہ عوام کی زبانیں تھیں جنہیں وہ گھروں اور بازاروں میں بولتے تھے۔ آگے چل کر سنسکرت کی اصطلاحی معنی مہذب و مقدس کے اور پراکرت کے معنی غیر مہذب و ناشائستہ کے ہو گئے۔ یہ پراکرتیں یا دیسی زبانیں محض بول چال میں استعمال ہوتی تھیں۔ ان کا دامن علمی و ادبی خزانوں سے بالکل خالی تھا۔ ان کی ترقی مسلمان علم دوست فرمانرواؤں کی حمایت و سرپرستی کی شرمندۂ احسان ہے۔ ہندوستان کے مسلمان بادشاہوں کی علم پروری و معارف نوازی صرف عربی و فارسی تک محدود نہ تھی بلکہ ان کی وسیع المشربی و فراخ حوصلگی نے دیسی زبانوں کو بھی اپنے سایۂ عاطفت میں جگہ دی۔ ہندی اور بھاشا کے شاعروں پر بھی انعام و اکرام کی بارش ہوتی رہتی تھی۔ غیر مسلم مورخین کو بھی اعتراف ہے کہ مسلمان حکمرانوں نے دیسی زبانوں کو فروغ و ترقی دینا اپنی سیاسی حکمت عملی میں شامل کر لیا تھا انہیں کی حمایت و سرپرستی کی بدولت پراکرتوں کو جو مدت سے صرف بول چال کے لئے استعمال ہو رہی تھیں تھوڑے ہی زمانہ میں علمی و ادبی زبان بننے کا شرف حاصل ہوا۔ غرض کہ دیسی زبانیں اُس وقت ارتقا کے ابتدائی مدارج طے کر رہی تھیں۔ ان میں اتنی قوت و صلاحیت کہاں تھی کہ وہ کسی نوزائیدہ زبان کے ادب و شاعری کو اپنے اعلیٰ انشا سے متاثر کرتیں۔

جب ہندوستان میں سنسکرت اور پراکرت زبانوں کا یہ حال تھا اُس وقت فارسی شاعری ارتقا و ترقی کے تمام منازل طے کر کے معراج کمال کو پہنچ چکی تھی۔ اس نے دنیا کی مہذب و شائستہ زبانوں میں نہایت اعلیٰ و ممتاز درجہ حاصل کر لیا تھا۔ اگر ہندوستان کی کوئی زبان شستگی و پاکیزگی میں اس کی ہمسری کا دعویٰ کر سکتی تھی تو وہ صرف سنسکرت تھی لیکن مدت سے وہ مردہ، متروک اور عوام کی آنکھوں سے اوجھل ہو چکی تھی۔ جب اردو شاعری کتم عدم سے معرض وجود میں آئی تو ایک طرف اس نے اپنی مہذب و شائستہ مادر مشفقہ کا آغوش دایا پایا جو اپنے فاتحانہ وحاکمانہ اقتدار کے باعث ہر محفل اور ہر مجلس میں عزت و احترام کی نظر سے دیکھی جاتی تھی۔ دوسری طرف اسے غیر مہذب و ناشائستہ اور محکوم و مغلوب پراکرت اناثیں اور کھلائیاں نظر آئیں۔ اس نے فطرتاً و طبعاً اول الذکر کی طرز و روش اختیار کی اس کے آغوش میں پل کر جوان ہوئی۔ بیٹی اپنی ماں سے جو کچھ سیکھے یا حاصل کرے اسے نہ تقلید کہہ سکتے ہیں نہ خوشہ چینی بلکہ وہ اس کا جائز حق ہے جس سے اس کو دنیا کا کوئی قانون محروم نہیں کر سکتا۔ اردو شاعری میں جو تشبیہیں، استعارے اور تلمیحیں رائج ہیں وہ مستعار نہیں بلکہ اس کی خاص ملک ہیں۔ اسلوب بیان کو پوپ نے شاہد سخن کا "لباس" قرار دیا تھا لیکن کارلائل اسے "پوست" کہتا ہے۔ اردو شاعری کا مخصوص طرز بیان بھی اس کا کوئی خارجی لباس نہیں بلکہ جزو بدن ہے اگر اسلوب بیان کی حیثیت محض لباس کی ہوتی تو ممکن تھا کہ وہ ایرانی جامہ اتار کر ہندی پوشاک زیب تن کر لیتی۔ اگرچہ یہاں بھی یہ سوال پیدا ہو سکتا تھا کہ وہ اپنی آرام دہ، شاندار اور قیمتی لباس کو موٹے جھوٹے گھٹیا ہندی لباس سے کیوں تبدیل کرے۔ لیکن جب اسلوب بیان و طرز ادا نے پوست کی حیثیت اختیار کر لی ہے تو اس کا جسم شاعری سے جدا ہونا محال ہے۔

ادب و شاعری میں ملکی و غیر ملکی، دیسی و بدیسی کا سوال نہایت غیر دانشمندانہ ہے۔ دنیائے شاعری کو جغرافیائی حدود بندیوں اور سیاسی تنگ نظریوں سے کوئی سروکار نہیں۔ شاعری کا تعلق جذبہ و تخیل سے ہے جن کی وسعت اور ہمہ گیری کی کوئی حد نہیں تخیل

مکان و زمان کی قید سے آزاد ہے۔ اس کی فضائے پرواز مکان و لامکان تک پھیلی ہوئی ہے۔ اس لئے میدانِ سخن کو میدانِ سیاست تصور کر لینا فاحش غلطی ہے۔ سیاسی و معاشرتی معاملات میں مادی مفاد اور مصلحتِ وقت کے پیش نظر انسان رواداری سے کام لیتا ہے۔ اپنے بعض حقوق سے دست بردار ہوتا ہے دوسروں کو راضی رکھنے کے لئے اپنے نفس پر بیجا پابندیاں عائد کرتا ہے لیکن جذبہ و تخیل اور عشق و شاعری کی دنیا میں اس قسم کی مصلحت بینی بادہ کی نیم رسی اور شوق کی نارسائی میں دلالت کرتی ہے۔ اور بعض موقعوں پر تو وہ خودکشی کے مترادف ثابت ہوتی ہے۔ غزل میں تو خاص طور پر دیسی اور بدیسی کا امتیاز لایعنی سی بات ہے۔ یہاں ملکی و غیر ملکی سرمایہ کی بحث کوئی اہمیت نہیں رکھتی۔ البتہ اجنبیت و مانوسیت اور یگانگی و بیگانگی کا مسئلہ قابلِ ذکر ہے۔ اگر کوئی تشبیہ و استعارہ یا تلمیح و کنایہ اجنبی و غیر مانوس ہو تو کلام میں تعقید پیدا ہوتی ہے اور شعر کی ساری خوبی و دلچسپی خاک میں مل جاتی ہے ہر زبان کی ساخت۔ ترکیب۔ نحوی و عروضی اصول۔ طرزِ ادا اور اسلوب بیان میں چند امتیازی خصوصیتیں پائی جاتی ہیں۔ زبان بھی ایک زندہ نامیاتی ہستی (living organic body) کی طرح اپنی مخصوص ہیئت طبیعت اور فطرت رکھتی ہے جو باتیں اس کی ساخت و ہیئت کے مطابق ہوں وہ مفید اور جو چیزیں اس کی فطرت و طبیعت کے مخالف ہوں وہ مضرت رساں ثابت ہوتی ہیں۔ اردو شاعری کی طبیعت نے جن تشبیہوں۔ استعاروں اور تلمیحوں کو ان کی لطافت۔ پاکیزگی۔ شگفتگی اور دلچسپی کی بنا پر قبول کر لیا ہے وہی اب مانوس ہیں مفید ہیں۔ اس کا ذاتی سرمایہ ہیں بلکہ اس کا جزو بدن بن گئے ہیں۔ خواہ جغرافیائی تقسیم کے لحاظ سے ان کا تعلق ہندوستان سے ہو یا ایران سے۔ عرب سے ہو یا چین سے۔ یونان سے ہو یا ترکستان سے اور مذہب و ملت کے لحاظ سے خواہ وہ دیر سے وابستہ ہوں یا حرم سے۔ میخانہ سے تعلق رکھتی ہوں یا آتشکدہ سے۔ مسیحی روایات سے ان کا لگاؤ ہو یا اسرائیلی اساطیر سے۔ مثلاً۔ پان کا بیڑا۔ مہندی زانچہ۔ جوگی۔ دھونی۔ انگیا۔ جھومر۔ گھونگھٹ وغیرہ خالص ہندوستانی چیزیں ہیں۔ گل و بلبل۔ سرو و شمشاد۔ راہ ہفتخواں۔ کوہ الوند جوئے شیر۔ جام جم۔ فر فریدوں۔ رستم و سہراب ایران سے تعلق رکھتے ہیں۔ لیلیٰ مجنوں۔ وامق و عذرا۔ سلمیٰ و رباب خاص عرب نژاد ہیں۔ حکمت چین۔ ارژنگِ مانی وغیرہ مشرقِ اقصیٰ کے تحفے ہیں۔ ارسطو و فلاطوں۔ جالینوس و فیثاغورس وغیرہ کی عقل و تدبیر اور آئینۂ سکندر عظمت یونان کی یادگار ہیں۔ کسی کے خال ہندو پر سمرقند و بخارا کی بخشش۔ ترکوں کی شہسواری۔ کلاہِ ترکی فتور ہلاکو وغیرہ ترکستان سے متعلق ہیں۔ بت۔ صنم۔ برہمن۔ زنار۔ قشقہ کا تماشا دیر میں نظر آتا ہے۔ قربانی اسمٰعیل تعمیر کعبہ۔ گلزار خلیل بوسۂ حجر اسود وغیرہ کا محل وقوع حرم ہے۔ رندی و سرمستی۔ مدہوشی و بیخودی۔ خمار و خمیازہ۔ جام و سبو۔ مینا و صراحی کا نظارہ دیکھنا ہو تو میخانہ کی سیر شرط ہے۔ برسم گذاری۔ زمزم سرائی۔ آتش پرستی۔ پیر مغاں کا راگ۔ رموز مجوس آتشکدہ سے وابستہ ہیں۔ مہر کلیسا۔ خر عیسیٰ لب مسیحا۔ اعجاز مسیحائی نصرانیت سے تعلق رکھتے ہیں۔ دیدۂ یعقوب۔ چاہِ کنعان۔ طوفانِ نوح۔ صبر ایوب۔ تختِ سلیمان۔ شمع طور عصائے موسیٰ۔ ید بیضا وغیرہ کے واقعات یہودیوں کی تاریخ و روایات سے ماخوذ ہیں۔ جب سرزمین سخن کو دنیائے آب و گل کی چیزوں سے سیری نہیں ہوتی تو وہ عالم خیال میں پرواز کر کے عنقا۔ ہما۔ سیمرغ۔ روضۂ جناں۔ شاخ طوبیٰ۔ حور و غلماں کوثر و تسنیم وغیرہ کے نظارے سے لطف اندوز ہوتا ہے۔

ان مثالوں سے ظاہر ہے کہ اردو شاعری جغرافیائی حدود بندیوں اور فرقہ دارانہ تنگ نظریوں سے بالاتر ہے۔
وہ ان تمام باتوں کو اپنے اندر جذب کرلیتی ہے جو اس کی ہئیت۔ ساخت۔ فطرت اور طبیعت سے مناسبت رکھتی ہیں جن اشیا کو
اس کی طبیعت قبول کرچکی ہے وہی اب اس کا اصلی و ذاتی سرمایہ ہیں۔ شاعری اور خصوصاً صنفِ غزل ان چیزوں سے الگ
رہنا چاہتی ہے جو اس کی فطرت کے مخالف ہیں اور جن سے اس کی طبیعت مالش کرتی ہے۔ بھاشا کے ثقیل و کرخت الفاظ
اور ہندی کے غیر مانوس و اجنبی دیو مالائی واقعات سے اگر وہ مصافحہ گیر نہ ہو تو اس پر کوئی الزام عائد نہیں ہوسکتا۔ اگر کسی
شخص کو کوئی غذا بالطبع مرغوب نہ ہو تو کوئی دانشمند اس کو صرف اس بنا پر کہ یہ ملکی پیداوار ہے اس کے کھانے کے لئے مجبور نہیں
کرے گا۔ اردو شاعری کے لئے بھی ایسی ثقیل غذا تجویز کرنا جو سوءِ ہضمی کا باعث ہو کسی طرح مناسب نہیں۔ انگریزی شاعری
کی ابتدا۔ اٹھان اور ارتقا بھی اردو شاعری سے بہت کچھ ملتا جلتا ہے۔ انگلستان میں ابتداءً وہی شخص مہذب اور تعلیم یافتہ
سمجھا جاتا تھا جو یونانی و لاطینی ادبیات میں مہارت تامہ رکھتا تھا۔ بہت دنوں تک انگریزی زبان محض کاروباری ضروریات
پوری کرتی رہی۔ وہ شعر و شاعری یا اعلیٰ ادب کی صلاحیت سے بے بہرہ تھی اس لئے انگلستان کے سخنور صرف لاطینی زبان میں
فکرِ شعر کیا کرتے تھے لیکن جب انہیں اپنی مادری زبان کی ترقی کا خیال پیدا ہوا جو اس وقت تک کس مپرسی کی حالت میں پڑی
ہوئی تھی تو شعرائے انگلستان نے انگریزی زبان میں اسی سُر اسی لے اسی تان کے ساتھ نغمہ سرائی شروع کردی جو یونانی و
لاطینی شاعری کے لئے مختص تھیں رفتہ رفتہ انگریزی شاعری کا دامن یونانی و لاطینی تشبیہات۔ استعارات تلمیحات و تصورات
سے بھر گیا۔ یونانی اور لاطینی خرمنِ ادب کی خوشہ چینی سے انگریزی شاعری نے جو کچھ حاصل کیا وہ اس کے ادبی ذخیرہ کا جزو اعظم
ہے۔ یونانی و لاطینی ادبیات کی پیروی سے انگریزی شاعری کا جو نمونہ قائم ہوا۔ اس کو پوپ نے معراجِ کمال کو پہنچا دیا
اور اس کا نام "کلاسیکل لٹریچر" یعنی ادب العالیہ قرار پایا۔ اور بڑے بڑے جلیل القدر شعرا کے لئے اس نمونہ نے خضرِ
راہ کا کام کیا۔ ملٹن کے شاعرانہ کمال کا کون معترف نہیں ؟ اگرچہ وہ مذہبِ تقشف (پوریٹن ازم) کا زبردست حامی تھا۔
اس کی شاعری میں مذہبی جوش نمایاں ہے تاہم اس کے کلام میں یونانی و لاطینی صنمیات (مائی تھولوجی) کی مشرکانہ تلمیحیں
بکثرت پائی جاتی ہیں۔ کیا کوئی شخص ملٹن کی شاعری پر صرف اس لئے حرف گیری کرسکتا ہے کہ اس کے کلام میں ملکی
خصوصیات کم اور یونانی و لاطینی سرمایہ بہت زیادہ ہے ؟ انگریزی شاعری کو یونانی و لاطینی ادبیات سے جو رابطہ ہے اس
سے کہیں زیادہ گہرا تعلق اردو شاعری کو فارسی شاعری سے ہے۔ یونانی و لاطینی عنصر خارج کردینے سے انگریزی شاعری
بالکل روکھی پھیکی۔ بے مزہ اور بے اثر ہو جائیگی۔ اسی طرح اگر اردو شاعری کو ایرانی وراثت سے محروم کردیا جائے تو اس
کی محفل کی ساری رونق چشم زدن میں کافور ہو جائے اور غزل کا تو نام و نشان ہی مٹ جائے۔ باقی آئندہ

محمد حسین ادیب

رخصت!

کبھی ہیں یاد بھی آؤں تو مت آنسو بہانا تم
یہی بہتر ہے مجھ کو رفتہ رفتہ بھول جانا تم

بھلا کیا فائدہ اک جی جلے پر جان کھونے کا
نہ ہونا سوگ میں شامل نہ تربت ہی پہ آنا تم

نہ کرنا یاد میری دُکھ بھری آنکھوں کی مایُوسی
تصوّر میں بھی یہ کلفت فزا منظر نہ لانا تم

جو یاد آئے کوئی اپنی جفا دل مت بُرا کرنا
غذا ہے دکھ مری ناحق نہ جی اپنا دکھانا تم

مری بربادیوں کی یاد میں رونے سے کیا حاصل
نہ اپنے آنسوؤں کے بے بہا گوہر لٹانا تم

مری ہستی کو اک خواب پریشاں فرض کر لینا
گزشتہ صحبتوں کی یاد بھی دل میں نہ لانا تم

مرے اقرارِ الفت کو سمجھنا قصّۂ باطل
نہ دل کو اب مری حسرت کے افسانے سنانا تم

کوئی اچّھا کہے مجھ کو تو سننا بھی نہ بات اُسکی
بُرا کوئی کہے تو صدقِ دل سے مان جانا تم

جو ناممکن ہو جی سے بھولنا افسانۂ غم کا
جو ناممکن ہے، ناممکن سے ممکن کر دکھانا تم

حامد علی خاں

مجلسِ اقوام کا پیغام

مجلس اقوام نے گذشتہ سال محترمہ بیگم شاہنواز صاحبہ کو خاص طور پر مدعو کیا تھا۔ ذیل میں انہوں نے ہمایوں کے لئے اپنے خیالات کا اظہار کیا ہے۔

خوبصورت جھیل، زمردیں پانی، دخانی جہاز، چھوٹی چھوٹی کشتیاں، جن میں حسین عورتیں سر جھکائے کہنیاں ٹیکے بیٹھیں، کناروں پر سبزہ، سبزے میں پھولوں کی کیاریاں، شاندار عمارتیں، عالیشان ہوٹل، فواروں سے موتیوں کی بارش، پانی کے جھرنے، جابجا چمن میں چھوٹی چھوٹی نہریں، بلوریں جام، رنگ برنگ کے شربت، غرض انواع و اقسام کی نعمتیں، چاروں طرف سرسبز و نیلگوں پہاڑ، برف سے لدی ہوئی چوٹیاں، بادل برف پر محو خواب...... خیالی دنیا نہیں حقیقت، فردوس بر روئے زمین...... شہر جنیوا اور مجلس اقوام!

کس قدر بڑا اور کیسا وسیع ہال!...... ہر ملک و قوم کی مخصوص نشستیں وسط میں، داہنے ہاتھ اخبار نویسوں کی کرسیاں، بائیں ہاتھ سکریٹریوں کی، چاروں طرف عوام الناس کا ہجوم، سامنے اونچی جگہ صدر، سیکرٹری جنرل، نائب صدر اور ترجمانوں کی مخصوص جگہ، سینکڑوں نہیں ہزاروں کا مجمع۔

ہر تقریر کو سبھی سن رہے ہیں بھلا ہو مارکونی کا ہر ملک کے رکن کے پاس وہ چھوٹی سی شے ہے جس کو کان سے لگا دو اور ہر تقریر کو اپنی زبان میں سن لو۔ انسان نے کمال کر دیا۔ ترجمان ایسے کہ ترجمے میں اصل کا پورا زور قائم رہے۔ پریس کو نوٹ لینے کی ضرورت نہیں کیونکہ سب تقریروں کا خلاصہ ختم ہوتے ہی ان کے لئے موجود ہوتا ہے۔ موجودہ دنیا میں سائنس نے جو کمال کر دکھایا ہے جنیوا اور یہ انجمن اس کی زندہ تصویر ہے۔

اٹلی — سینیور گرینڈی اٹھے، روما کی گذشتہ عظمت اور اس کے شاندار مستقبل کا نقشہ آنکھوں کے سامنے کھینچ کر رکھ دیا۔ تجویز کی کہ مجلس تخفیف اسلحہ کے اختتام تک اسلحہ کا بنانا موقوف کر دیا جائے کوئی ملک و قوم بحری یا بری یا ہوائی فوج میں اضافہ نہ کرے۔ کیا یہ ہو سکتا ہے؟...... تالیوں سے ہال گونج اٹھا!

انگلستان — لارڈ رابرٹ سیسل کھڑے ہوئے۔ کہا کیوں نہیں؟ کیوں موجودہ فوجی مصارف میں سے ایک چوتھائی فوراً کم نہ کر دیا جائے؟ وقت آگیا ہے بلکہ ہاتھ سے جا رہا ہے۔ ہر ملک فوجی خرچ کے بار گراں سے دبا جا رہا ہے انسانیت متقاضی ہے کہ اس بوجھ کو کم کرنے کی نہ صرف کوشش کی جائے بلکہ اس سعی کو فوری طور عملی جامہ پہنایا جائے۔ اگر اس قدر تہذیب و تمدن ہمیں اس بار سے سبکدوش ہونے میں مدد نہ دے تو ایسے تمدن کا کیا فائدہ! لازم ہے کہ ہم سب بہت جلد متفق ہو کر بنی نوع انسان کی تکلیفوں کو کم کریں اور تمام وہ روپیہ جو جنگ کی تیاری میں صرف ہو رہا ہے مفید و کارآمد کاموں میں لگایا جائے۔ جنگ و جدل کا ہمیشہ کے لئے قلع و قمع کرنا ہمارا فرض ہے...... ایک ایک لفظ ایسا تھا جیسے موتی پروئے جا رہے ہوں۔ کونسا دل تھا جس پر ان الفاظ کا اثر نہ ہوتا!

سب کے دل مسرت سے لبریز تھے۔ انسانیت کی رہائی کا زمانہ آگیا بین الاقوامی انجمن کی کامیابی یقینی ہے۔ دنیا اب ایک نیا دور دیکھے گی امن و امان اور خوشی و اطمینان کا زمانہ آنے والا ہے۔ خوش ہو جاؤ کہ مشکلات کے حل ہونے کا وقت آگیا۔

فرانس اور جرمنی کیا کہتے ہیں۔ ان دونوں زبردست طاقتوں کے نمائندے ہال میں موجود نہیں معلوم ہوا کہ وہ اپنی اپنی حکومتوں سے ان کی رائے پوچھ رہے ہیں کہ وہ کیا جواب دیں۔ خدا بھلا کرے سائنس کا جس نے صلاح و مشورہ کو ایسا آسان کر دیا۔

فرانس — موسیو بری آں کی باری آئی۔ ایک دھواں دھار تقریر کی۔ ایک گھنٹہ دس منٹ تک ایک زبردست مقرر بن کر انسانی جذبات پر گویا بجلی

مضراب چلائی، ہاتھوں سے آنکھوں سے یہاں تک کہ پاؤں سے بھی کام لیا۔ چاروں طرف نشاط انگیز نغمے بکھرے۔ سامعین محو حیرت تھے معنوں کو سوچنے کا کسے ہوش تھا سب غرق دریائے حیرت الفاظ تھے۔ تقریر ختم ہوئی۔ نشہ تمام ہوا۔ کیا تھا، کیا کہا؟ ایک زبردست مقرر کی تقریر بس اور کچھ نہیں ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ سب نے سر جھکا دئے۔

جرمنی۔ ڈاکٹر کرٹش کو وہی کہنا تھا جو فرانس نے کہا کہ یہ کام آسان نہیں ہوتے، آہستہ آہستہ سرانجام پاتے ہیں، انسانیت کو اس مرض سے رہائی دلانا ہمارا فرض ہے۔ اب اسلحہ کانفرنس ہونے والی ہے اسے کامیاب بنانے کی پوری سعی کرنی چاہیئے وغیرہ وغیرہ۔

سپین۔ یہ سلسلہ دوردراز کا تھا اور دیر سے جاری تھا۔ کہا ہوش میں آؤ، اپنے فرض کو نہ صرف سمجھو بلکہ اسے جلد سرانجام دو۔ وہ مدد دو جو اصلی مدد ہو۔ الفاظ بہت ہو چکے اب کام کا وقت آیا ہے۔ کمر ہمت باندھو اور اسے سرانجام دو۔

یہ تھی بین الاقوامی انجمن کی پہلی نشست۔ تین ہفتے چھ کمیٹیوں نے کام کیا۔ یہ انجمن جو کچھ کام کر رہی ہے کاش اس کے متعلق لوگوں کو پورا علم ہو سکے۔ دنیا کے بہترین دماغوں کو جمع کرنا اور دنیا کی سب قوتوں کو یکجا کرنا آسان کام نہیں۔ مزدوروں کی حالت کیسے بہتر ہو سکتی ہے؟ کس قسم کے "لاعلاج" مرض کی دوا کیسے مل سکتی ہے؟ دنیا کو روپیہ کی کمی سے کیسے نجات حاصل ہو سکتی ہے؟ انسان کو غلامی کی ذلت سے بچانا کیونکر ممکن ہے؟ عورتوں اور بچوں کا بیگار میں پکڑا جانا کیسے روکا جا سکتا ہے؟ افیون اور کوکین وغیرہ نشوں سے انسان کیسے بچایا جا سکتا ہے؟ یہ ان کاموں میں سے چند کام ہیں جو لیگ نے کچھ سرانجام دئے اور کچھ سرانجام دے رہی ہے۔ بین الاقوامی قانون کی بنیاد رکھی جا چکی ہے۔ بین الاقوامی عدالت قائم ہو چکی ہے۔ لیگ ہر دم ہر ملک و قوم کو مدد دینے کے لئے تیار ہے۔ جس کام میں انہیں مشورہ درکار ہو مشورہ مل سکتا ہے اور وہ اصلاح و مدد ایسی ہے جو عموماً بالکل بے غرض ہوتی ہے۔ ہزاروں نہیں لاکھوں برباد شدہ خانماں انسانوں کے لئے لیگ گھر مہیا کر چکی ہے۔ سب سے بڑا کام جو اس وقت تک لیگ نے کیا ہے وہ نشہ آور چیزوں کے ترک کرانے کا کام ہے۔ لیگ کی یہ کوشش ہے کہ یہ چیزیں ہر ملک میں اتنی بنیں جتنی جائز ضرورت کے لئے درکار ہوں تاکہ بیجا استعمال کا موقعہ ہی نہ آسکے۔ بیشک ابھی لیگ سے وہ کام سرانجام نہیں دیا جا سکے۔ لئے اس کی بنیاد رکھی گئی تھی یعنی دنیا کو جنگ و جدل سے رہائی دلانا مگر اس کام کی تکمیل کے لئے وہ ہر دم کوشش کر رہی ہے۔ لیگ نے تمام دنیا کے لئے شہر جنیوا میں ایک ایسی جگہ مہیا کر دی ہے جہاں تبادلۂ خیالات ہو سکے اور ایک دوستانہ نظام میں ہر ملک و قوم کے انسان مل سکیں ان کے دلوں میں یک دل ہونے کی آرزو پیدا ہو۔ نہ اس میں وہ ایک دوسرے سے بازی جیت لینے کی کوشش کریں۔ یہ تبادلۂ خیالات انہیں ایک دوسرے کے مقصد زیست۔ ایک دوسرے کے علم و عمل سے سمجھنے اور اس کی قدر کرنے میں مدد دے۔ کیا یہ سب سے بہتر ذریعہ انسانیت کو ہم خیال بنانے کا نہیں۔

یہ بارہ سال کا کمسن بچہ وہ کام کرنے کی کوشش کر رہا ہے جو صدیوں کے بوڑھوں سے نہ ہو سکا۔ مگر اسکو کامیابی اُسی وقت ہو سکتی ہے جب ہر فرد بشر ہر مرد و عورت اس کی مدد پر کمربستہ ہو جائے جب ہم میں تمام انسانی ہمت و قوت انسانی فہم و فراست اور انسانی کوشش کو یکجا جمع کرنے کی امنگ پیدا ہو۔ آج کل کی دنیا میں جب تک ایسا نہ ہوگا یہ تمدن و سائنس کی دنیا اپنے آپ کو خود تباہ کرنے گی اور یہ ترقی زیست کی موت ثابت ہوگی۔ وہ نسخہ جو نوعِ انسان کو استعمال کرنا ہے جس پر تمام دنیا کے مستقبل کا دارومدار ہے یہ ہے۔ کہ "دنیا ایک اور انسان بھی سب ایک ہیں ہر فرد بشر یکساں حق رکھتا ہے اور کسی کو یہ حق حاصل نہیں کہ وہ دوسرے کا حق چھین لے" اس کا پورا استعمال کرو تاکہ کوئی مرض باقی نہ رہے اور انسانیت تباہ و برباد ہونے سے بچ جائے۔ دوا تلخ ہے مگر اس کے سوا چارہ نہیں۔

یہ پیغام تھا جو لیگ نے مجھے دیا!

جہاں آرا بیگم

جذباتِ تاجور

تمہارے دل سے مٹے دشمنی محبّت کی
سُنو جو درد بھری راگنی محبّت کی

ہم اپنی رام کہانی تمہیں سُنائیں گے
شنیدنی ہے یہ ناگفتنی محبّت کی

مریضِ عشق کا دم توڑنا خدا کی پناہ
ہے دردناک بہت جاں کنی محبّت کی

جمالِ دوست میں پیدا ہو رنگِ جلوۂ عشق
جو دل میں دوست کے ہو چاشنی محبّت کی

متاعِ صبر و سکوں لوٹ لی محبت نے
نصیبِ زیست ہوئی رہزنی محبّت کی

فروغِ مہر کو ہو میرے دل سے کیا نسبت
اِس آئنے میں تو ہے روشنی محبّت کی

تاجور

خود کُشی

خدا کی مملکت کا فرار شدہ قیدی ——— رات کے سناٹے میں پُل کے آہنیں، برف کی طرح سرد کٹہرے پر وہ جُھکا ہُوا کھڑا تھا۔ وہ عالمِ بےاختیاری میں آہستہ سے اُس نے زمین کو اپنے پاؤں سے ٹھکرایا۔ ابھی ابھی وہ قدرت کی اُن پُراسرار زنجیروں کو توڑ کر چلا آرہا تھا جن کی بندش میں مدتوں اُس کے قدم جکڑے رہ چُکے تھے ——— اور آج وہ آزاد تھا۔ صرف ایک ہلکی سی جھنکار کو سن لینے کے بعد جو یک بیک خدا جانے کیوں اُس کی سماعت کے پردوں سے آٹکرائی تھی۔

اُفقِ بعید سے چاند کی لرزتی ہوئی سرخ کرنیں پانی کی سبز سبز موجوں پر تیرتی ہوئی آئیں اور دریا ایک وسیع و بسیط سفید چادر کے مانند اس کی نگاہ کے سامنے پھیلا ہُوا نظر آیا جس طرح مدتوں کا بےخواب، تھکا ماندہ انسان اپنے سامنے گرم بستر کو دیکھ کر ایک سرور آمیز اطمینان محسوس کرتا ہے، وہی روح پرور کیفیت اس چپ چاپ بہتے اور چھلکتے ہوئے دریا کو دیکھ کر اُسے محسوس ہو رہی تھی ——— تمام روحانی درد و کرب، تمام ذہنی کلفتیں، زندگی کے تمام پُرشور ہنگامے ساتھ لئے ہُوئے دریا کی تہہ میں ایک دائمی نیند سو جانا ——— کس قدر لطیف تھی ایک میٹھی نیند ——— ایک آزادی کی نیند ——— اور وہ آگ جو جہنم کی جُھلستی ہوئی آگ کے خیالی تصور سے کہیں زیادہ گرم تھی وہ جس کی لپٹوں میں خاموشی کے ساتھ دن رات وہ جلا کیا تھا ایک ہی لغزشِ قدم سے بجھی ہوئی رکھی تھی ——— اور کون سی شے تھی جو اس وقت صحیح معنوں میں اُسے اذیت پہنچا سکتی ہے؟ ——— پھر اسی ہنگاموں سے معمور اُسی پُرشور بستی میں زندگی کی کٹھن منزل پر پابہ زنجیر عرصۂ روزگار کو طے کئے جانا۔ اس وقت ہلکی سے ہلکی کھڑکھڑاہٹ بھی اُسے چونکا دیتی تھی ——— کہیں پُرفریب زندگی نے اسے ازسرِ نو محسوس کر لینے کے لئے کسی نئے فتنے کو بیدار تو نہیں کر دیا؟ ——— اور پھر وہ ایک لمحے کے لئے دم سادھ کر کھڑا ہو جاتا۔ یہی کیفیت شاید کبھی زندگی کی محبت میں موت کے خوف سے اُس پر طاری ہوئی ہو لیکن آج یہ خوف اُس خوف سے کس قدر مختلف تھا۔

پھر اُس نے نگاہ اوپر اُٹھائی ——— اوپر ہی اوپر ——— اتنی بلندی پر وہ اُسے لے گیا ——— وہ خدا کی مملکت کا فرار شدہ قیدی جہاں آج تک کسی دنیادار آنکھ کی رسائی نہ ہوئی تھی اور دُور بلندیوں پر پہنچ کر اس نے دیکھا کہ مسرت ——— جس کی تلاش میں اُس کے پاؤں کے چھالے ابھی تک خشک نہ ہوئے تھے اپنا کھیل کھیلتی ہوئی صرف ایک بار ہر دل کے قریب ہو کر گذرتی تھی ——— عمر بھر میں صرف ایک لمحہ ——— اور جب تک کوئی اس کے خیر مقدم کے لئے اپنا دروازہ کھولے وہ کوسوں دُور کی منزل پہ ہوتی ہے ——— اور وہ دروازہ ایک مدت تک یونہی بیکار کھلا پڑا رہتا۔ اور وہ جن کے شکوہ و دولت پر دنیا کو رشک تھا بچشمِ ظاہر جن کے قدموں میں خوشبوں کے دریا موجیں مارتے دیکھتی تھی وہ بھی خلوت کے تاریک پردوں کے پیچھے اوندھے گرے ہوئے اس کی فرقت میں بےبسی کے آنسو بہا رہے تھے۔

اور کون تھا جس نے تیرہ و تار رات میں ایک بار یہ آرزو نہ کی کہ یہ وسیع ظلمت اُس کی رُوح اور اس کے جسم کو اپنے اندر ہی اندر تاریکی کے ایک بادل کی طرح جذب کر کے اسے دنیا اور دنیا والوں کی نگاہ سے ہمیشہ کے لئے اوجھل کر دے۔ ہر سینے میں ایک چھپی ہُوئی انگاری سلگ

رہی تھی اور اُس کا دھواں اندر ہی اندر اس کی روح پر کہر بن کر چھا رہا تھا۔ اور نہ جانے کن مصلحتوں کو برقرار رکھنے کے لئے ان میں سے ہر ایک اپنے دل کی آگ کو دوسرے کی نظر سے چھپاتا پھر رہا تھا۔

محبت اور دوستی — یہی تھی زندگی کی سب سے حاصل تلاش جس طرح ہرن اپنے نافے کی خوشبو سے مست ہو کر جا بجا اُس کی تلاش میں آوارہ پھرتا ہے اسی طرح بے چارہ انسان اُس محبت کی تلاش میں تھا جو خالق نے اس کے دل میں صرف اُسی کی ذات کے لئے ودیعت کی تھی۔ وہ صرف اپنی ذات کا دوست تھا۔ اپنا ہی غمخوار، اپنا ہی ہمدرد، اپنی ذرا ذرا سی خوبیوں کو آپ پہچاننے والا اور اپنے بڑے سے بڑے عیوب پر چشم پوشی کے لئے ہر وقت تلا ہوا۔ لیکن آہ وہ نادان ان سب کو کسی اور خانۂ دل میں تلاش کرنے کے لئے دیوانہ وار عرصۂ ہستی میں بھٹکتا پھر رہا تھا۔

اور وہ خود بھی کبھی اس راہ میں بھٹک چکا تھا لیکن پھر اُس نے خیال کیا کہ اگر قانونِ قدرت کچھ اور ہوتا تو کیوں وہی محبوب عکسِ رُخِ افقِ زندگی پر اُسے سب سے زیادہ جاذبِ توجہ نظر آیا تھا —— جس کے قدموں تلے اس کی زندگی کی بہترین ساعتیں مدفون ہو ئی تھیں اُسے تنہا موت کی تاریکیوں کی طرف دھکیل رہا تھا۔

اور کون تھا جس نے اُس کے دل کی شکستگی کے ساتھ ہی ایک عالم کو تماشہ دیکھتے ہوئے پایا کون تھا جو اس کی تباہ شدہ محبت کے مزار پر ایک عرصہ خون کے آنسو رویا کس نے اُس کے چوٹ کھائے ہوئے غرورِ نفس میں ٹھہر ٹھہر کر اٹھنے والی ٹیسوں کو اسی شدت کے ساتھ محسوس کیا؟ وہ خود، اور اس کے سوا کون تھا؟

وہ بہت سے کام ادھورے چھوڑ کر چلا آرہا تھا لیکن ایک لمحے کے لئے بھی ان کی تکمیل کے خیال نے اسے مضطرب نہ کیا۔ سرِ دنیا اسکے سامنے ایک ناکام، تمام جد وجہد میں صرف تھی —— قدرت کے اس کھیل کو تکمیل تک پہنچانے کیلئے جو محض بگڑنے کے لئے بنا تھا —— اس بنیاد کو استوار کرنے کے لئے جو صرف گرا دینے کے خیال سے رکھی گئی ہو! دور بلندیوں پر اس کے تخیل نے زندگی کی تصویر کو اس رنگ میں دیکھا "ایک بھولا بھالا معصوم بچہ کسی بھیانک غار کے پھیلتے ہوئے کنارے پر ہر لحظہ قریب تر پہنچتے ہوئے انجام سے بے خبر اپنے مرغوب کھیلوں میں محو بیٹھا تھا —— ایک زہرخند تبسم اُس کے ہونٹوں پر نمودار ہوا اور پھر اس نے جلدی سے دریا کے چکر کھاتے ہوئے پانی پر نگاہ ڈالی۔ ایک تند و تیز لہر آنکھوں ہی آنکھوں میں اُسے دعوت دیتی ہوئی آگے بڑھی "آؤ میری آغوش دیر سے تمہارے انتظار میں وا ہے اور تمہاری بے خواب آنکھیں نیند کے بوجھ سے جھکی پڑتی ہیں"!

وہ ساتھ والے جنھیں وہ پیچھے چھوڑ کر آیا تھا۔ اُن کی نمناک آنکھوں کا تصور پھر ایک بار سے دنیا کی شورشوں میں کھینچتا ہوا لے گیا — لیکن تصور ہی تصور میں کس قدر سرعت کے ساتھ پھر وہ واپس لوٹ رہا تھا کیونکہ اسی سرعت کے ساتھ ان آنسوؤں کو اس نے پھر انہیں آنکھوں میں جذب ہوتے ہوئے دیکھ پایا تھا اور چشم زدن میں دنیا اپنی رنگینیوں کا ایک نیا پردہ اُس کے اور اُن کے درمیان حائل کر چکی تھی اور اُن میں سے بعض جو بری طرح عقل و دانش کے اسی پیچ پیچ چکر کے درمیان گھرے ہوئے تھے اسے بزدل کہیں گے اور دنیوی فرائض سے منہ موڑ کر ہمت ہار جانے والا لیکن یہ مصنوعی رسوم و قیود، یہ خود عاید کردہ پابندیاں اب اس سے دور کس قدر فاصلے پر پڑی دم توڑ رہی تھیں۔ تقدیر کے اٹل قوانین سے آزاد ہو کر اب وہ ان سے بہت آگے نکل چکا تھا۔

دنیا کی تمام طرب ناک اور الم انگیز نیرنگیوں کو بھول جانے کے لئے اس نے اپنی آنکھیں بند کر لیں اور بازو اٹھتی ہوئی موجوں کی جانب پھیلا دیے —— عین اس وقت زندگی روتی ہوئی آکر اسکے قدموں میں گر پڑی —— دریاؤں کی ایک جنبش ہوئی اسے ٹھکرا کر وہ آگے نکل گیا —— پانی میں صرف ایک دھمک سی اٹھی اور پھر سطحِ آب پر سکون طاری تھا۔ اسی طرح ہوا کے برف بار جھونکے سائیں سائیں کرتے ہوئے دریا کے اس پار جا رہے تھے اور تنہا رات اپنے سیاہ آنچل میں روشنی کو چھپائے ویسے ہی ساکت و صامت کھڑی تھی۔

"راہرو"

غزل

جو حال دیکھتے ہو وہ خود عرضِ حال ہے
درویش ہوں، فقیر ہوں صورت سوال ہے

اب دل ہے اور دل میں تمہارا خیال ہے
اور وہ خیال جس کا بُھلانا محال ہے

یہ کون چاہتا ہے کہ افشائے راز ہو
یہ عرض تھی کہ ضبطِ تمنّا محال ہے

ایسا نہ ہو کہ ضبطِ شکایت نہ ہو سکے
للہ یہ نہ پوچھ کہ جی کیوں نڈھال ہے

اچھا اک آرزو نہ سہی، دل کا کیا علاج
دل بھی تو آرزو کی طرح پائمال ہے

مقدور ہو تو زخمِ جگر سے یہ پوچھئے
ظالم! ترے نصیب میں بھی اندمال ہے؟

اے طاقتِ جواب! یہ بے اعتنائیاں
کمبخت! دیکھ تو کوئی پُرسانِ حال ہے

اے بختِ سازگار! ہمیں یہ خبر نہ تھی
ہم جس کو ڈھونڈتے ہیں وہ ملنا محال ہے

اب دل ہے اور دل میں ہزاروں تفکرات
اور وہ تفکرات کہ جینا وبال ہے

قاضی ہو، شیخِ وقت ہو، زاہد ہو، رند ہو،
ہم دیکھتے ہیں، مفت کی سب کو حلال ہے

آزاد! دل کا درد چھپانے سے فائدہ؟
صورت ہی کہہ رہی ہے طبیعت نڈھال ہے

حکیم آزاد انصاری

ابُوحامد

(۱)

جب غرناطہ کا آفتاب غروب ہوگیا اور وہاں کے آخری تاجدار ابو عبداللہ کو غریب الوطن ہونا پڑا تو اس نے اپنی روانگی سے قبل پاول کی چوٹی پر کھڑے ہو کر پہلے تو سمندر کی طرف نظر کی جدھر سے اُس کے اسلاف اسپین میں آئے تھے اور پھر دریائے وادالکبیر پر ایک نگاہ واپسیں ڈالی جس کے کنارے شاہ فرڈی نینڈ اور ازابیلا کے خیمے ایستادہ تھے، اہلِ سلام کے چند مقابر کا پیشِ نظر ہونا تھا کہ اس کی آنکھیں پُرنم ہوگئیں اور اس وقت سلطانہ عائشہ نے (جو اس جلاوطنی میں اس کے ہمراہ تھی) ان مردانہ صفت الفاظ کا اعادہ کیا جو مغربی یورپ میں ضرب المثل بن گئے ہیں۔

"جس سلطنت کی تو مردوں کی طرح حفاظت نہ کر سکا۔ اب اس پر عورتوں کی طرح رو۔"

ہسپانوی موروں کے مختلف قبیلے افریقہ کی اسلامی ریاستوں میں آباد ہوگئے؛ زنجیری اور گومل جو فیض سے آئے تھے پھر اسی جگہ واپس آگئے، وینگا اور الاب الجیریا کے ساحل پر مقیم ہوئے اور بنو سراج نے طرابلس کے قرب وجوار میں سکونت اختیار کر کے کارتھیج کے منہدم شدہ شہر کے سامنے ایک نوآبادی قائم کی جو آج تک مشہور ہے۔ ان نوآبادیوں میں جنت الغرناطہ کے افسانے رائج تھے اور جب مائیں بچوں کو سُلاتی تھیں تو زنجیری اور بنو سراج کے گیت ان کی لوریاں ہوتے تھے۔ یہ لوگ ہر جمعہ کو غرناطہ کی واپسی کے متعلق دعائیں مانگتے تھے لیکن تاریخ بتاتی ہے کہ ان کی یہ گریہ وزاری اثر سے ہمیشہ عاری رہی۔ غرناطہ کے محلات سے نکلنے کے بعد ان لوگوں کو نہ تو پھل شیریں معلوم ہوتے تھے اور نہ فطری مناظر ہی میں کوئی دلکشی نظر آتی تھی۔ گویا جلاوطن ہوتے وقت ان کا دل وہیں رہ گیا تھا۔

بنو سراج کو تمام قبائل سے زیادہ صدمہ تھا۔ یہ لوگ غرناطہ کی فوج کے مسلمہ جنگ جو تھے، لیکن چونکہ اس آبادی میں جنگ کا ذکر بھی نہ تھا اس لئے انہوں نے شمشیر زنی کو ترک کر کے جڑی بوٹی کی شناخت کو اپنا مشغلہ اور طب کو اپنا پیشہ قرار دے لیا تھا۔ گویا وہ قوم جو کبھی زخم لگانے میں مشہور تھی اب ان کا اندمال کرنے لگی۔

اسی قبیلہ میں وہ خاندان بھی تھا جو محلات میں رہا کرتا تھا؛ انہوں نے عین اس مقام پر ایک چھوٹا سا جھونپڑا بنالیا تھا جہاں سینٹ لوئی نے شہادت پائی تھی۔ اس مکان کی دیواروں پر ان کی گذشتہ عظمت کی یادگار ڈھالیں، تلواریں اور دیگر آلات حرب آویزاں تھے جس کے مقابلہ میں میزوں پر گھاس پھوس اور جڑی بوٹیاں رکھی ہوئی تھیں، جو نہ صرف جسمانی بلکہ روحانی زخموں کو بھی مندمل کر دیتی تھیں۔ لیکن ایک زخم کے واسطے کوئی دوا نہ تھی اور وہ اب تک اسی طرح ہرا تھا۔

غرناطہ کی فتح کو چوبیس سال ہوگئے تھے۔ اس دوران میں بنو سراج کے چودہ نفر موسم کی سختیوں اور آب وہوا کی ناموافقت سے چل بسے، اور اب اس خاندان کا لے دے کر ایک سہارا، ایک رہنما اور ایک سردار ابو حامد تھا۔ جس میں اپنے اجداد کی تمام صفات موجود تھیں، وہ جری ہونے کے علاوہ نیک دل، خوش خلق اور سخی بھی تھا، لیکن ساتھ ہی غریب الوطنی نے اس کے چہرہ پر مایوسی کا پھیکا پن پیدا کر دیا تھا۔

باپ کے انتقال کرتے ہی اس نے غرناطہ جانے اور اپنی دیرینہ آرزو پوری کرنے کا عزم کر لیا تھا لیکن اس خیال سے کہ ماں کی ماتا مانع نہ ہو اس نے اپنے منصوبوں کا کسی سے ذکر نہ کیا اور ایک دن بلا کسی کو اطلاع دیئے جہاز پر سوار ہو کر یورپ کی طرف روانہ ہو گیا۔

جبل الطارق پہنچ کر اس نے یہی ظاہر کیا کہ وہ ایک طبیب ہے اور سیرا نویدا کی وادیوں میں چند بوٹیاں تلاش کرنے آیا ہے لیکن اُس کا دل مرتعش تھا اور جب اس کی نظر ایک اسلامی عمارت پر پڑی جو دست برد زمانہ کے ہاتھوں کھنڈر ہو گئی تھی تو اس کو معاً اپنے خاندان کا خیال آیا اور اس مشابہت نے بنو سراج کے آخری چشم و چراغ کو اندوہگیں کر دیا، سڑک پر تلوار بند مسافر جا رہے تھے اور ہر گذرنے والا ابو حامد کو سلام کرتا تھا لیکن وہ اپنی دھن میں مست تھا اور نہ کچھ سنتا تھا نہ سمجھتا۔

غرناطہ کا پہلا نظارہ بہت صبر آزما تھا، یہ شہر دو پہاڑیوں کے درمیان واقع ہے اور اس کی شکل نیم وا انار کی طرح ہے، اسی وجہ سے اس کو غرناطہ کہتے ہیں۔ اس کے ہر دو جانب دریا ہیں اور قریب ہی ویگا کی وادی ہے جس میں پھل وغیرہ بکثرت پیدا ہوتے ہیں۔ ابو حامد نے اس جنت ارضی کو دیکھ کر اپنا خچر روک لیا اور راہبر سے مختلف عمارات کے متعلق سوال کرنے شروع کئے۔ ہسپانوی اگوا کا ایک ایک لفظ اس کے حق میں تیر و نشتر سے کم نہ تھا، تقدیر کا تمسخر ہی کہنا چاہیئے کہ بنو سراج کا ایک فرد اپنے اجداد کی عمارت کے متعلق اجنبیوں سے سوال کر رہا تھا اور خود محض لاعلم تھا۔

اس نے ایک مسلمان سردار کے مکان پر قیام کیا جو غرناطہ میں ریشمی پارچوں کی تجارت کیا کرتا تھا، لیکن روئیداد قلب نے اس کو اطمینان سے نہ سونے دیا اور وہ آدھی رات کے وقت گھر سے نکل پڑا۔ نوجوان شہزادے نے غرناطہ کے چپہ چپہ کا حال سُنا تھا اور اب تاریک رات میں وہ اپنے اجداد کے محلوں اور کتب خانوں کو ڈھونڈ رہا تھا، ان سڑکوں پر کسی زمانہ میں بنو سراج کے جلوس نکلا کرتے تھے لیکن اس وقت شور و شغب کی جگہ موت کی سی خاموشی طاری تھی، شہر کے باشندے تبدیل ہو گئے تھے اور فاتح سردار مفتوحوں کے محلات میں مست خواب تھے۔ انہیں خیالات کو لئے ہوئے ابو حامد شہر کے کوچہ و بازار میں گشت کر رہا تھا لیکن جب اُس نے واپسی کا ارادہ کیا تو قوت حافظہ جواب دینے لگی، اصل یہ ہے کہ وہ سڑکوں پر بلا کسی اصول کے چل رہا تھا اور راستہ بھول گیا تھا، اس نے دو مرتبہ واپسی کی کوشش کی لیکن بیکار، راہ نہ ملنی تھی نہ ملی۔

ٹھیک اُس وقت قریب سے دروازہ کھلنے کی آواز آئی اور اس نے دیکھا کہ ایک دوشیزہ جو ملکہ گوتھ کا سا لباس پہنے ہوئے اس کی طرف آ رہی ہے۔ اس کے ہمراہ ایک دوسری عورت تھی اور دو خادم، جن میں سے ایک "دعاؤں کی کتاب" لئے ہوئے تھا۔ اس لڑکی کے متعلق اتنا کہہ دینا کافی ہے کہ اس کا حسن ابو حامد کے نزدیک نہ صرف کامل بلکہ مافوق البشر تھا اور ایک مرتبہ تو اس کو گمان ہوا کہ آسمان سے حور اتر آئی ہے۔ اجنبی لڑکی نے بھی جو صبح کی نماز ادا کرنے گرجا جا رہی تھی اس نووارد کو استعجاب کی نظر سے دیکھا، مگر پھر بلا کسی قسم کا جوش ظاہر کئے اشارہ سے ابو حامد کو اپنے پاس بلایا اور کہا "مور صاحب! آپ غالباً آج ہی کل میں تشریف لائے ہیں؟ کیا آپ کو راستہ نہیں ملتا؟"

ابو حامد نے کہا "اے ملکۂ حسن، اے کنیز نصرانی تمہارا خیال درست ہے۔ میں مور سردار کے ہاں ٹھہرا ہوا ہوں، اور راستہ بھول کر نہ معلوم کہاں آ گیا، تم کو ہمارے پیغمبر اس ذرہ نوازی کا اجر دیں۔"

دوشیزہ مسکرائی اور جواب دیا "موروں کا طرزِ کلام مشہور ہے، مگر میں نہ حسن کی ملکہ ہوں نہ کنیز، اور نہ مجھ کو تمہارے پیغمبر کی عنایت درکار ہے۔ البتہ میں تم کو منزلِ مقصود تک پہنچائے دیتی ہوں"۔

چنانچہ اس نے جلد جلد چند سڑکیں طے کیں اور مور تاجر کے دروازہ کی طرف اشارہ کرکے ایک گلی میں غائب ہوگئی۔

اس ذراسے واقعہ نے ابوحامد کی دنیا تبدیل کر دی۔ اس کے تمام منصوبوں پر پانی پھر گیا۔ سب خواہشات ملیامیٹ ہوگئیں اور ان سب کی جگہ اُس برق صفت معشوقہ کا خیال اس کے دل میں جاگزیں رہنے لگا۔ اس میں کلام نہیں کہ اس نے اپنے آباواجداد کی یادگاروں پر آنسو بہائے اور اپنے خاندانی حظیرے کی بھی زیارت کی لیکن اب اس کے دل میں وہ خلوص باقی نہ تھا جس کو وہ افریقہ سے لیکر چلا تھا۔
یہ نامعلوم دوشیزہ کون تھی؟ ابوحامد نے اس سے دوبارہ ملنے کی ہر ممکن کوشش کی مگر بے سود، کوئی کوچہ کوئی بازار، کوئی محل، کوئی گرجا ایسا نہ تھا جہاں وہ اُس کی تلاش میں نہ گیا ہو۔ عشق نے اس کے جذباتِ حمیت کو اس قدر پامال کر دیا تھا کہ وہ فرڈی نینڈ اور ازابیلا کے مقابر پر بھی ہو آیا لیکن فضول۔ گوہرِ مقصود کہیں ہاتھ نہ آیا۔

(۲)

ایک روز شہر سے دُور جنگل اور پہاڑوں میں ابوحامد چند بوٹیاں تلاش کر رہا تھا، یکایک اس کی نظر درختوں کے ایک کنج پر پڑی جس کے درمیان دیہاتی وضع کا ایک مکان بنا تھا اور وہ ابھی محوِ تحیر ہی تھا کہ اس کی کھڑکیوں سے کسی خوش گلو نازنین کے نغموں کی آواز نکلنے لگی، مور کا دل مرتعش ہونے لگا اور اس نے زیرِ لب کہا "بے شک یہ اسی کی آواز ہے" نامعلوم حسینہ ایک قسطلی راگ نکال رہی تھی جس میں بنوسراج اور زنگیریوں کے کارنامے بیان کئے گئے تھے۔ آپ خود اندازہ کر سکتے ہیں کہ بنوسراج کا نام سن کر ابوحامد کی کیا کیفیت ہوئی ہوگی۔ اس سے ضبط نہ ہوسکا اور مکان میں داخل ہوگیا۔ اس دخل در معقولات سے محفل درہم برہم ہوگئی، اور لڑکیاں مور کی صورت سے دہشت کھاکر وحشی ہرنیوں کی طرح بھاگنے لگیں، دوشیزہ ہچکچائی، لیکن ابوحامد کو دیکھ کر بول اٹھی "ارے یہ تو وہی مور ہیں"۔

ابوحامد نے کہا "پری وش خاتون، میں نے آخر تم کو ڈھونڈ نکالا، میں نے آواز ہی سے تم کو پہچان لیا تھا، اور اب اس احسان کا شکریہ ادا کرنے حاضر ہوا ہوں"۔

لڑکی نے مسکرا کر جواب دیا "مجھ کو بھی تمہارا ہی خیال تھا اور اسی وجہ سے میں بنوسراج کی بہادری کا گیت گا رہی تھی۔ میرا خیال ہے کہ وہ موری مبارز بھی تمہاری ہی طرح ہوں گے"۔

اس فقرے کا اعادہ کرتے وقت یلانکا (لڑکی کا نام) کے چہرے پر ایک رنگ دوڑ گیا جس کو مور نے بھی دیکھ لیا۔ اس کو اپنی قوم پر بیجا فخر نہ تھا اور ابوحامد کا دل بے اختیار چاہتا تھا کہ دوشیزہ پر اس حقیقت کا اظہار کر دے کہ وہ خود بنی سراج کا آخری چشم و چراغ ہے لیکن اس امر کا اعادہ اس کو ہمیشہ ہمیشہ کے واسطے اپنی محبوبہ سے جدا کر دیتا، اس لئے اُس نے خاموشی ہی کو مناسب سمجھا۔
یلانکا کا خاندان شرافت و نجابت کے واسطے مشہور تھا اور اس کے دادا کو شاہ فرڈی نینڈ نے حسنِ خدمات کے صلے میں

موروں کی جاگیریں اور ڈیوک کا خطاب بھی عطا کیا تھا۔ دوشیزہ کا ایک بھائی بھی تھا جو تاریخ میں ڈان کارلو کے نام سے مشہور ہے، یہ شخص ایک مشہور نبرد آزما تھا اور اس نے اس وقت تک بہادری میں کافی نام پیدا کر لیا تھا۔ باپ کو بلانکا کے ساتھ ابتدا ہی سے بہت اُنس تھا اور بیوی کے انتقال پر تو گویا اس کی تمام مسرت اس لڑکی کے دم سے وابستہ تھی جو اس وقت اٹھارہویں سال میں قدم رکھ رہی تھی، آج کا جشن اس کی سالگرہ کی تقریب میں تھا۔

بلانکا نے ابوحامد کو باپ سے متعارف کراتے ہوئے کہا "یہی وہ مور صاحب ہیں جن کا ذکر میں نے آپ سے کیا تھا"

ابوحامد کو بھی جشن میں شرکت کی اجازت دے دی گئی اور اس نے مشرقی افسانے سنا کر نہ صرف بلانکا بلکہ اس کے والد اور تمام حاضرین کا دل موہ لیا اور جب جلسہ برخاست ہوا تو اس سے وعدہ لے لیا گیا کہ کل ہے گا ہے ڈیوک کے گھر آیا کرے گا۔ چنانچہ دوسرے دن آفتاب کی ابتدائی کرنوں کے ساتھ ہی وہ اپنی معشوقہ کے مکان پر پہنچ گیا۔ اس کا دل اب دوشیزہ کے عشق کا گنجینہ تھا اور وہ تمام خیالات جو اس کے سفر اسپین کے محرک تھے فراموشی کے غیر متناہی غاروں میں دھکیل دیئے گئے تھے۔ کیونکہ بہت ممکن تھا کہ ان کا اظہار اس طلسم کو توڑ دے جو اس کی نظروں کے سامنے تھا۔ اس نے مشرق و مغرب کے بُعد کا خیال نہ کیا اور نہ اس امر کا کہ دوشیزہ اس قوم سے تعلق رکھتی ہے جس نے اس کے اجداد کو غریب الوطن بنا دیا۔ وہ کہتا تھا "بس بلانکا مسلمان ہو جائے اور میرے ساتھ محبت کرنے لگے تو میں ہمیشہ کے لئے اس کا غلام بن جاؤں گا"

ہسپانوی دوشیزہ کو بھی بہت جلد معلوم ہو گیا کہ اس کے دل پر ابوحامد کی محبت گہرے نقوش ڈال رہی ہے۔ اول اول تو اس کو یہ خیال ہی مضحکہ خیز معلوم ہوا کہ ڈیوک سانتافی کی لڑکی کسی مور کی محبت کو اپنے دل میں جگہ دے سکتی ہے لیکن جب اس پر حقیقت کا اظہار ہوا تو اسپینیوں کی طرح وہ بھی ناگزیر کے واسطے تیار ہو گئی اور کہنے لگی "بس ابوحامد عیسائی ہو جائے اور مجھ سے محبت کرنے لگے تو میں اس کے ساتھ دنیا کے ہر حصہ میں جانے کو تیار ہوں"!

ابوحامد اور بلانکا دونوں اپنے ارادوں میں راسخ اور محبت میں مستقل تھے لیکن ابھی ایک کو دوسرے کی حالت کا اندازہ نہ تھا موسم بہار پوری رعنائی پر تھا اور دونوں اکثر دبنیتہ باغ میں بیٹھے بلبلوں کے نغمے سنا کرتے تھے۔ ایک روز لڑکی نے کہا "تم نے ابھی تک الحمرا کی سیر نہیں کی حالانکہ وہ تمہاری قوم کے بادشاہوں کی زندہ یادگار ہے۔ چلو میں آج تم کو وہاں لے چلوں"۔

مور سردار کو اس سے زیادہ خوشی کس بات میں ہو سکتی تھی کہ وہ الحمرا کو بلانکا کی معیت میں دیکھے، چنانچہ اس نے پہلے تو ڈیوک کی لڑکی کو گھوڑے پر سوار کرایا اور پھر خود ایک اندلسی خچر پر بیٹھ گیا۔ مور کا لباس اور وضع، اس کی جرأت و شہامت اور شہسواری راہگیروں کے واسطے جاذب توجہ تھی اور اس کو دیکھ کر ہر شخص پکار اٹھتا تھا کہ "بلانکا اس کافر شہزادے کو عیسائی بنانے لئے جاتی ہے"۔

الحمرا کی سیر بذات خود ایک رومان تھی، یہ عمارت گویا غرناطہ کے عروج و زوال کی مجسم تاریخ ہے۔ اس کو دیکھ کر ابوحامد کو اپنی بیکسی کا احساس دوچند ہو گیا۔ وہ پکار اٹھا "آہ! بنو سراج کے بادشاہو، تم کس گوشے میں محو خواب ہو"! بلانکا اس کو یکے بعد دیگرے تمام محلات دکھا رہی تھی، آخر وہ ایک کمرے میں پہنچی جس کی چھت سقف آسمان کی طرح نیلی فام اور دیواریں سورج کی کرنوں کے

مانند سنہری تھیں۔ اس کے وسط میں ایک فوارہ تھا جس کا پانی ایک مرمریں پیالہ میں گرتا تھا۔ ڈیوک کی لڑکی نے اس کی طرف اشارہ کر کے کہا۔" اسی پیالہ میں ابوعبداللہ نے بنوسراج کا خون بہایا تھا۔ ان کے خون کی رنگینی اب تک اس ظرف میں موجود ہے، دیکھو تمہارے ملک میں اُن مردوں کا یہ حشر ہوتا ہے جو عورتوں کو جھوٹے وعدے کر کے بہکاتے جاتے ہیں۔"

ابوحامد پر اس نظارے کا بہت زبردست اثر پڑا۔ اس نے پہلے تو دوزانو ہو کر اپنے اجداد کے خون کو بوسہ دیا اور پھر دوشیزہ کے قدموں پر گر کر کہنے لگا۔" میں بنوسراج کے خون کی قسم کھا کر کہتا ہوں کہ تم کو ہمیشہ اپنی جان سے زیادہ عزیز رکھوں گا۔"

بلانکا نے اپنے نازک ہاتھوں کو ایک دوسرے میں حمائل کرتے ہوئے دریافت کیا۔" ہاں، تم مجھ سے محبت کرتے ہو، مگر کیا تم نے یہ بھی سوچ لیا ہے کہ اس کا انجام کیا ہوگا؟ میں ہسپانی عیسائی ہوں اور تم مسلمان مور، پھر تم کو اپنی محبت کے اظہار کی جرأت کیونکر ہوئی۔ بہر حال میں معاملات کو صاف کر لینا ضروری سمجھتی ہوں، سنو! مجھ کو بھی تم سے محبت ہے اور اگر تم عیسائی ہو جاؤ تو ہمیشہ کے واسطے تمہاری ہو جاؤں گی۔ لیکن ساتھ ہی یہ بھی سمجھ لو کہ اگر تم اس سے انکار کرتے ہو تو ڈیوک سانتافی کی لڑکی کسی طرح تمہاری بیوی نہیں بن سکتی۔"

ابوحامد کو یہ بات معلوم کر کے کہ لڑکی کا دل بھی اس کی محبت سے معمور ہے اتنی خوشی ہوئی کہ وہ اُس کی شرط کو مطلق بھول گیا۔ مگر پھر سنبھل کر بولا۔" اللہ اکبر، اے خدا تو ہی اس لڑکی کو سیدھا رستہ دکھا۔"

اب یہ دونوں "دوازدہ شیروں کے کمرے" میں پہنچے اور بلانکا نے اپنے ساتھی سے کہا۔" یہ النعیمہ کا کمرہ ہے۔ ابوحامد جب میں تمہارے عمامہ، عبا اور ہتھیاروں کے ساتھ تمہاری محبت کا خیال کرتی ہوں تو ایسا معلوم ہوتا ہے گویا بنوسراج کا سردار بدنصیب النعیمہ کے ساتھ اس کمرے میں ٹہل رہا ہے۔ ہاں ذرا اس کتبہ کے معنی بتانا۔"۔۔۔۔۔۔

فوارے کے اوپر ایک تحریر تھی جس کا کچھ حصہ دست برد زمانہ سے کالعدم ہو چکا تھا، ابوحامد نے اس پر لکھا ہوا دیکھا۔" حسین شہزادی جو اس جگہ محو خرام ہے اپنے حسن عالمتاب سے کمرے کی خوبصورتی کو دوبالا کرتی ۔۔۔۔۔۔" اور کہنے لگا۔" یہ تحریر دراصل تمہارے ہی واسطے لکھی گئی ہے۔ کاش میں بھی خوش نصیب بنوسراج ہوتا۔"

بلانکا نے ان الفاظ کو بہت غور سے سُنا، پھر بولی۔" لیکن اس وقت مجھ کو اور زیادہ اذیت ہوتی۔ اگر میرا کہنا مانو تو سرداری کے خیال کو چھوڑ دو۔ کیونکہ سردار اکثر شہرت کے پیچھے محبت کو فراموش کر دیتے ہیں۔"

ابوحامد نے کہا۔" اس طرف سے تو مطمئن رہو، کیونکہ میں تم کو شہرت سے بہت زیادہ عزیز رکھتا ہوں۔"

الحمرا کی سیر دونوں کی زندگی میں ایک یادگار واقعہ تھی۔ انہوں نے اپنا پورا دن اس میں صرف کر دیا اور جب جدا ہونے لگے تو بلانکا نے کہا۔" میری قسمت پر ہمیشہ کے واسطے مہر ہو گئی۔ ابوحامد یاد رکھو کہ جب تک تم مسلمان ہو گے بس تمہاری محروم قسمت کنیز ہوں، لیکن عیسائی ہوتے ہی تمہاری خوش نصیب بیوی بن جاؤں گی۔"

ابوحامد کا جواب بھی ایسا ہی پُر اشتیاق و پُر حسرت تھا۔" جب تک تم عیسائی ہو میں تمہارا حسرت نصیب غلام ہوں لیکن اسلام

قبول کرنے کے بعد تمہارا شوہر بننے پر فخر کروں گا۔"
وقت کے ساتھ دونوں کی محبت میں اضافہ ہوتا گیا لیکن ساتھ ہی وہ خلیج جوان کے ازدواج میں حائل تھی وسیع تر ہونے لگی۔ ابوحامد نے کبھی اپنے نام و نسب کا راز بلانکا پر ظاہر نہ کیا اور اس امر سے اس کو اور بھی زیادہ خوشی ہوئی کہ اسپین کی امیرزادی اس کے باوجود بھی اس کو اپنی تمناؤں کا مرکز بنائے ہوئے تھی۔

(۳)

ایک روز مور کو خبر ملی کہ اس کی والدہ لب مرگ ہے اور مرنے سے قبل اپنے اکلوتے بیٹے کو دیکھنا چاہتی ہے، اب وہ مجبور تھا کہ اس جنت ارضی کو چند روز کے واسطے خیرباد کہہ کر افریقہ جائے، چنانچہ اس نے بلانکا سے اپنی مشکلات کا اظہار کر کے کہا "سلطانہ! میں اپنی ماں سے ملنے جا رہا ہوں، کیا تم اپنی محبت میں ثابت قدم رہو گی؟"
لڑکی اس ناگہانی واقعہ سے گھبرا گئی، اس نے سمجھا کہ ابوحامد ہمیشہ کے لئے اس کو خیرباد کہہ رہا ہے۔ لیکن مور سرا معاملات کو اس حالت میں نہ چھوڑ سکتا تھا۔ اس نے بلانکا کو اپنے پیچھے آنے کا اشارہ کیا اور اپنے اجداد کے قبرستان میں پہنچکر کہنے لگا "حسین نازنین، میرے باپ دادا اس قبرستان میں محوِ خواب ہیں اور میں ان کی روح کو گواہ کر کے کہتا ہوں۔ کہ اپنی عمر میں بجز تمہارے کسی دوسری عورت سے محبت نہیں کروں گا، اور جس وقت تم کلمہ پڑھ لوگی تو مدت العمر کے واسطے تمہارا خادم بن جاؤں گا۔ میرا ارادہ ہے کہ ہر سال اسی موسم میں غرناطہ آیا کروں تاکہ یہ معلوم ہو سکے کہ تم اپنی محبت میں ثابت ہو۔ نیز یہ کہ تم نے اپنی ضد کو ترک کیا یا نہیں"
بلانکا کا جواب بھی اسی قدر شریفانہ تھا "اور میں ہر سال تمہارا انتظار کیا کرونگی، تمہاری طرح میں بھی اپنی محبت کو تمہارے اور صرف تمہارے واسطے مخصوص کرتی ہوں، اور جس وقت خدا تمہارے کافر دل میں ایمان کی کرن ڈال دے گا میں نہایت خوشی سے تم کو اپنا شوہر بنالوں گی۔"
ابوحامد چلا گیا اور بلانکا کی نظروں میں دنیا تاریک ہوگئی۔ وہ اسی روز سے سال کے دن گننے لگی اور جب موسم بہار دوبارہ آیا تو اس نے باپ کو مجبور کیا کہ اس کو سمندر کے کنارے لے چلے۔ اس کا معمول تھا کہ روزانہ پہاڑ کی چوٹی پر چڑھ کر افق کی طرف دیکھتی اور اگر افریقہ سے کوئی جہاز آنے والا ہوتا تو اس کا انتظار کرتی۔ ایک مرتبہ اس نے کسی مشرقی جہاز کو طوفانی لہروں میں گھرا ہوا دیکھا اور اس خیال سے اس کا دل سرد ہوگیا کہ کہیں اس کا عاشق صادق اس ورطۂ ہلاکت میں نہ پھنسا ہو۔
مور سردار نے اپنی والدہ کو زندگی کے آخری لمحے گنتے ہوئے پایا اور چند روز کے بعد اس نے داعی اجل کو لبیک کہہ دی گویا وہ کڑی جو اس کو افریقہ سے وابستہ کئے ہوئے تھی ٹوٹ گئی۔ اب اس کی نظروں میں دنیا تاریک تھی اور وہ بھی بلانکا کی طرح موسم بہار کا نہایت بے صبری سے انتظار کر رہا تھا۔ آخر موعودہ دن آگیا اور اس نے جہاز پر قدم رکھتے ہی اپنے خیالات کو بلانکا اور محض بلانکا کے واسطے وقف کر دیا "کیا وہ شیرہ اپنی محبت میں ثابت قدم ہوگی؟ کیا وہ بھی میری طرح اس روز کا انتظار کر رہی ہوگی؟

کیا اس نے ایک غریب عرب کو دل سے فراموش تو نہ کیا ہوگا؟" اس قسم کے سینکڑوں سوال اس کے دل میں آتے اور پریشان کرتے تھے۔ ابوحامد کو علم نہ تھا کہ باوفا معشوقہ اس کے انتظار میں چشم براہ ہے۔

اسپین کی سرزمین پر قدم رکھتے ہی بلانکا نے اپنے عاشق کو پہچان لیا۔ اس کا حرماں نصیب دل بے اختیار چاہتا تھا کہ دوڑ کر ابوحامد کے پاس جائے لیکن پاس وضع مانع تھا۔ آخر اس نے اپنے خادم کو بھیجا کہ مور کو مکان پر لے آئے۔ بنوسراج کا آخری چشم و چراغ بلانکا کے واسطے اپنے ملک کا ایک غزال لایا تھا۔ جس کو اس نے معشوقہ کی خدمت میں پیش کیا اور سب لوگ خوشی خوشی غرناطہ کی طرف روانہ ہوگئے۔

بہار کا موسم گذر گیا۔ اس دوران میں وہ ایک دوسرے کی خوبیوں سے بخوبی آگاہ ہوگئے۔ لیکن وہ خلیج جو دونوں کے درمیان حائل تھی اب بھی اسی طرح موجود تھی اور ان کو حسرت نصیب بنائے ہوئے تھی۔ ایک کہتا تھا "مسلمان ہوجاؤ" اور دوسری کی دھن تھی "عیسائی بن جاؤ"۔ آخر فراق کا زمانہ آگیا اور ابوحامد آئندہ سال ملنے کا وعدہ کرکے رخصت ہوگیا۔

(۴)

اس مرتبہ اس کا استقبال پرجوش نہ تھا۔ سمندر کے کنارے نہ بلانکا ملی اور نہ اس کا خادم لیکن گورنر نے اس کو ایک خط دیا۔ جس میں بلانکا نے اپنی مجبوری کا اظہار کرتے ہوئے لکھا تھا کہ اس کا باپ دارالخلافہ چلا گیا ہے اور بھائی ایک فرانسیسی کے ساتھ وہاں مقیم ہے۔ ان کو چھوڑ کر وہ کسی طرح نہیں آسکتی۔ اس سرد مہری نے مور کو متوحش کردیا۔ اس کا دل بیٹھا جاتا تھا اور وہم طرح طرح کی مہیب اشکال پیش کر رہا تھا۔

بلانکا کا عذر معقول تھا۔ ڈان کارلو سات برس کی مسلسل عدم موجودگی کے بعد گھر واپس آیا تھا اور اس کے ساتھ ایک فرانسیسی امیرزادہ بھی تھا۔ جس کی مہمان داری دونوں پر فرض تھی۔ ڈان کارلو نے مذہبی جنگوں میں شریک ہونے کے بعد تہیہ کرلیا تھا کہ وہ خود کو خدا کی راہ میں وقف کردے گا اور ازدواجی زندگی سے ہمیشہ کے واسطے کنارہ کش ہوجائے گا۔ اس ارادہ کی باپ اور بہن دونوں نے سختی سے مخالفت کی لیکن چونکہ مذہبی معاملہ تھا اس لئے دباؤ سے کام نہ لے سکے اور نوجوان ڈیوک اپنے عزم میں راسخ رہا اب گویا خاندان کی تمام اُمیدیں بلانکا کی ذات سے وابستہ تھیں اور یہی وجہ ہے کہ ڈیوک اور ڈان کارلو دونوں اس سے بے حد محبت کرتے تھے۔

ابوحامد نے ڈیوک کے مکان میں داخل ہوکر دیکھا کہ اس کی معشوقہ ایک اجنبی کے پاس بیٹھی ہوئی ہے، اور ایک دوسرا نوجوان جو قرینہ سے بلانکا کا بھائی معلوم ہوتا ہے قریب کھڑا ہوا دوشیزہ سے باتیں کر رہا ہے۔ مور سردار کو دیکھ کر بلانکا کے مُنہ سے بے اختیاری میں "ابوحامد" نکلا مگر پھر سنبھل کر کہنے لگی "مبارزو! دیکھو یہی وہ کاذمور ہے جس کا میں نے تم سے ذکر کیا تھا، دیکھنا کہیں ایسا نہ ہو کہ وہ تم پر غالب آجائے۔ بنوسراج کا بھی یہی حال تھا اور ہر شخص جانتا ہے کہ وہ بہادری، وفاداری اور عشق میں اپنی نظیر نہ رکھتے تھے"۔

ڈان کارلو نے آگے بڑھ کر کہا "والد صاحب اور بلانکا نے تمہارا ذکر مجھ سے کیا تھا۔ تم کسی اعلیٰ خاندان کے فرد معلوم ہوتے ہو۔ بادشاہ سلامت عنقریب تیونس پر فوج کشی کرنے والے ہیں، اس وقت ہم دونوں کا جنگ میں سامنا ہوگا۔"

ابوحامد نے کوئی جواب نہ دیا، اس کی نظر بلانکا اور فرانسیسی امیرزادے پر تھی جو پہلو بہ پہلو بیٹھے ہوئے تھے۔ امیرزادہ اپنی دوشیزہ کو الفت آمیز نظروں سے دیکھ رہا تھا، لیکن بلانکا کے جذبات عشق اس کی آنکھوں سے ہویدا تھے۔ جن کو نہ صرف لاٹریک بلکہ ڈان کارلو نے بھی دیکھ لیا۔ ابوحامد کچھ دیر کے بعد چلا گیا اور جب بھائی بہن تنہا رہ گئے تو ڈان کارلو نے پوچھا "بلانکا یہ کیا بات ہے کہ تم اس مور کو دیکھ کر پریشان ہوگئی تھیں؟"

بلانکا نے اپنے جذباتِ عشق کو پوشیدہ رکھنے کی مطلق پروا نہ کی اور صاف صاف کہہ دیا کہ مجھ کو ابوحامد کے ساتھ محبت ہے اور اگر وہ عیسائی ہوجائے تو میں بجز اس کے کسی کو اپنا شوہر بنانا پسند نہ کروں گی۔

ڈان کارلو نے کہا: خاندان سناتانی کی لڑکی ایک مور سے محبت کرے جنکو ہم نے اس ملک سے باہر نکال دیا ہے۔ بلانکا بھی آخر اسی بھائی کی بہن تھی اس نے سختی سے کہا "ہاں میں اس سے محبت کرتی ہوں اور اس کو تین سال ہوگئے۔ ہم دونوں اپنے اپنے مذاہب پر قائم ہیں اور یہی امر ہمارے ملاپ میں مزاحم ہے، یہ شخص شرافت مجسم ہے اور میں تا دمِ مرگ اس کی محبت میں ثابت قدم رہوں گی۔"

ڈان کارلو نے دیکھ لیا اور اچھی طرح سمجھ لیا کہ دونوں شرافت کے پتلے اور اپنے مذہب کے پکے ہیں۔ لیکن پھر بھی اس نے بلانکا کو اس ورطۂ ہلاکت سے نکالنے کی کوشش کی اور کہا "مگر اس کا نتیجہ کیا ہوگا؟ میرا خیال تھا کہ لاٹریک میرا بھائی بن جائیگا۔"

بلانکا "تمہارا خیال غلط تھا، میں اس اجنبی سے محبت نہیں کرسکتی۔ تم اپنے ارادوں میں راسخ رہو اور میں اپنے عزم میں، ہاں اس کا اطمینان رکھو کہ میں ایک کافر کی بیوی کبھی بننا پسند نہ کروں گی۔"

کارلو "مگر اس کے تو یہ معنی ہیں کہ ہماری نسل برباد ہوجائے گی۔"

بلانکا "نسل لڑکے سے چلتی ہے یا لڑکی سے؟ مگر اس کا افسوس ہی کیا ہے۔"

یہ دیکھ کر کہ بہن سے پیش جانا مشکل ہے ڈان کارلو ابوحامد کے پاس گیا اور نہایت جوشیلے الفاظ میں کہا "بہتر یہ ہے کہ میری بہن سے دست بردار ہوجاؤ ورنہ پھر ہم میں جنگ چھڑ جائے گی۔"

ابوحامد "کیا تم بلانکا کا پیغام لائے ہو؟"

کارلو "نہیں وہ تم سے اسی طرح محبت کرتی ہے، میں چاہتا ہوں کہ بلانکا میرے فرانسیسی دوست کی زوجیت میں آجائے اور اگر تم راہ میں حائل نہ ہوتے تو اس امر میں کوئی شخص میرا مزاحم نہ ہوسکتا تھا۔"

یہ الفاظ سن کر ابوحامد نے اطمینان کا گہرا سانس لیا اور لڑنے کے واسطے تیار ہوگیا۔ وہ ابھی تک یہی سمجھ رہا تھا کہ بلانکا اپنے وعدوں سے منحرف ہوکر فرانسیسی امیرزادے سے شادی کرنا چاہتی ہے۔ اس بات کا علم کہ اس کی معشوقہ باوفا ہے تقویتِ قلب کے واسطے کافی تھا اور وہ اس کے لئے کیا کچھ نہ کرسکتا تھا۔ اس نے پہلے تو بلطائف الحیل اس جنگ کو ٹالنا چاہا۔ جس کی وجہ یہ نہ

تھی کہ وہ جرأت یا شہامت میں اپنے آپ کو ڈان کارلو سے کم سمجھتا تھا بلکہ وہ اپنی معشوقہ کے عزیز بھائی سے اُسی کے واسطے لڑنا پسند نہ کرتا تھا۔ لیکن بدرجۂ مجبوری اس ناگزیر ڈوئل پر تیار ہوگیا اور دونوں شہر سے باہر جاکر مصروفِ پیکار ہو گئے۔

ڈان کارلو پورا مردِ میدان تھا لیکن اس کے مقابلہ میں ابو حامد کسی جنگ میں شریک نہ ہوا تھا۔ تاہم اس کی ذاتی شجاعت اور نسبی شہامت کافی حد تک ناتجربہ کاری کی بدل ہوگئی تھی۔ ایک طرف اگر احساسِ نسب باعثِ مجادلہ تھا تو دوسری جانب جذباتِ عشق۔ بہرحال دونوں اپنے ارادوں میں پختہ اور دھن کے پکے تھے۔ فرق صرف اتنا تھا کہ ڈان کارلو کو اپنے حریف کے مار ڈالنے میں باک نہ تھا لیکن ابو حامد اس کی جان نہ لینا چاہتا تھا۔

مجادلہ کافی عرصہ تک رہا اور اگر کوئی دیکھنے والا ہوتا تو ضرور کہہ اٹھتا کہ مقابلہ کی جوٹ ہے۔ دونوں کے گھوڑے زخمی ہو گئے۔ تلوار چلاتے چلاتے ہاتھ رہ گئے مگر غلبہ کسی کو حاصل نہ ہوا۔ پھر ڈان کارلو کا راہوار جواب دے گیا اور سوار پیادہ لڑنے لگے۔ اب بھی کوئی ہار ماننے کے واسطے تیار نہ تھا۔ لیکن جب حریف کا آلۂ حرب ابو حامد کی دمشقی تلوار سے ٹکرا کر ٹوٹ گیا تو گویا اس جنگ کا فیصلہ ہوگیا اور مغلوب شخص چلانے لگا "میں اب بھی تمہاری قوم کو لامذہب اور برا سمجھتا ہوں اس لئے تم مجھ کو جلد ہلاک کر دو۔"

مگر ابو حامد نے اپنی تلوار نیام میں کر لی اور کہا "میں صرف اس لئے جنگ کر رہا تھا کہ تم پر اپنی برتری کا اظہار کر کے ثابت کرسکوں کہ بلانکا میری بیوی بن سکتی ہے۔ ورنہ میرا ارادہ تم کو کاری زخم پہنچانے کا نہ تھا۔"

اس وقت شہر کی طرف سے گرد و غبار اٹھتا نظر آیا اور لاٹریک معہ بلانکا کے موقعِ جنگ پر پہنچ گیا۔ بلانکا کو شبہ ہوا تھا کہ دونوں آپس میں لڑ نہ بیٹھیں اور یہی وجہ تھی کہ وہ بھائی کو غیر حاضر پاکر سیدھی میدان مجادلہ کی طرف چلی آئی۔ ان دونوں کو دیکھ کر کارلو نے کہا "میں تو ہار گیا مگر لاٹریک تم غالباً اس عرب سے پیش جا سکو گے۔" مگر فرانسیسی امیرزادے نے لڑنے سے انکار کر دیا۔ وہ حقیقت کو اچھی طرح سمجھ گیا تھا اور اسپین کی دوشیزہ کا عزم راسخ دیکھنے کے بعد اس کو موڑ کے مقابلہ میں کامیابی کی بہت کم امید تھی۔

بلانکا نے ہر ممکن کوشش کی کہ تینوں میں اتفاق ہو جائے۔ لیکن کارلو بول اٹھا "میں ابو حامد سے نفرت کرتا ہوں" لاٹریک نے کہا "اور مجھے اس پر رشک آتا ہے۔" لیکن ابو حامد کا خیال تھا کہ وہ باوجود اس کے کہ ڈان کارلو کی عزت کرتا اور لاٹریک پر رحم، ان سے دوستانہ تعلقات قائم نہیں کرسکتا۔

اس وقت سے بلانکا کی محبت سوگنی بڑھ گئی۔ بہادر اقوام کی عورتیں شوہر کی جرأت وشہامت پر ہمیشہ ناز کرتی ہیں۔ اور بلانکا کو یہ دیکھ کر بے حد خوشی ہوئی کہ اس کا عاشق ڈان کارلو سے بھی زیادہ شجاع ہے۔ حالانکہ وہ تمام مغربی یورپ میں نام پیدا کر چکا تھا۔

(۵)

اس مجبوری کو ایک عرصہ گذر گیا۔ ابو حامد ہر سال آتا اور ناکام واپس جاتا۔ آخر ایک روز اس نے سوچا کہ لائی گرجا میں جاکر

بلانکا کے مسلمان ہونے کی دعا مانگوں۔ چنانچہ وہ ایک ایسی عمارت میں داخل ہوا جو کسی زمانہ میں مسجد تھی، لیکن اب اہل مسیح کی عبادت گاہ کہلاتی تھی۔ اس نے دیکھا کہ قربان گاہ کے سامنے ایک نائٹ جھکا ہوا نہایت خلوص سے دعا مانگ رہا ہے۔ اس کی تلوار قریب ہی رکھی ہوئی ہے۔ اور وہ اپنی عبادت میں اس قدر منہمک ہے کہ کوئی کھٹکا کوئی آواز اس کی توجہ کو اپنی طرف منعطف نہیں کر سکتی۔ یہ نائٹ لاٹریک تھا۔ ابوحامد پر اس کی محویت کا بے حد اثر ہوا۔ اور وہ بھی قربان گاہ کے سامنے جھکنا چاہتا تھا کہ اس کی نظر ایک عربی کتبہ پر پڑی جو در اصل قرآن مجید کی ایک آیت تھی۔ اس کے دیکھتے ہی اس میں مذہبی جوش پیدا ہو گیا اور وہ گرجا سے نکل بھاگا۔ لیکن آج کا دن اس کے واسطے مبارک نہ تھا۔ گرجا کے دروازے پر اس کو ایک نقاب پوش عورت ملی جو بجز بلانکا کے کوئی نہ تھی۔

ابوحامد نے اس کو روک کر پوچھا "کیا تم لاٹریک کو تلاش کرنے آئی ہو؟"

بلانکا نے جواب دیا "بھلا اس رشک و حسد سے فائدہ؟ اگر میری محبت سرد ہو جاتی تو میں بجائے دھوکا دینے کے صاف صاف تم سے کہہ دیتی۔ میں یہاں تمہارے واسطے دعا کرنے آئی ہوں۔ اول تو تمہیں مجھ سے محبت نہ کرنی چاہیئے تھی اور اگر تم نے اس کا دعوے کیا تھا تو عیسائی ہو جاتے، تمہاری وجہ سے ہمارا سارا خاندان رنج و الم میں مبتلا ہے۔ میرا بھائی تم سے متنفر ہے۔ والد اسی غم میں گھلے جاتے ہیں کہ میں شادی نہیں کرتی۔ اور خود میری تندرستی بھی خراب ہو گئی ہے۔ تم دیکھ لینا کہ یہ محبت اور صدمات مجھ کو زیادہ عرصہ تک زندہ نہ رہنے دیں گے۔ کیونکہ مشعل کی آگ اس کو روشن ہی نہیں کرتی بلکہ جلا بھی ڈالتی ہے۔"

یہ الفاظ نہ تھے تیر و نشتر تھے جو ابوحامد کے دل میں پیوست ہو گئے۔ عشق و مذہب میں جنگ شروع ہو گئی اور بہت جلد عشق مذہب پر غالب آ گیا، ابوحامد اپنی معشوقہ کا اس غم میں مرجانا پسند نہ کرتا تھا۔ اس لئے اس نے تہیہ کر لیا کہ وہ عیسائی ہو جائیگا۔

(۶)

آج سب لوگ لاٹریک کے مہمان تھے اور دعوت کا سامان موروں کے محل میں کیا گیا تھا۔ دیواروں پر مسیحی فاتحین کی تصویریں آویزاں تھیں۔ اور ان کے نیچے غرناطہ کے آخری فرمانروا کی تلوار لٹکی ہوئی تھی۔ ابوحامد کا دل اس نظارے سے خون ہو گیا لیکن عشق میں بجز ذلت و رسوائی کے رکھا ہی کیا ہے؟

دعوت شروع ہو گئی۔ پہلے ڈان کارلو نے اپنی بہادری کے افسانے سنائے اور پھر لاٹریک نے ایک نظم گائی جس میں فرانس کے مناظر کی تعریف کی گئی تھی۔ اس کے بعد ابوحامد سے خواہش کی گئی کہ وہ بھی کچھ سنائے۔ مگر بیچارے مور کو اس ماحول میں بجز اپنی قوم کی بربادی اور تباہی کے کیا نظر آسکتا تھا۔ چنانچہ اس نے غرناطہ کی تباہی کے متعلق ایک نوحہ گایا جس کو سن کر سب کے دل بھر آئے۔ پھر ڈان کارلو نے ایک نظم شروع کی جس میں اس کے جد امجد سڈ (مشہور اسپینی ہیرو) کی تعریف کی گئی تھی۔

ابوحامد بول اٹھا۔ "اس شخص کو تم لوگ مردمیدان کہتے ہو اور ہم اسے ظالم کے نام سے یاد کرتے ہیں۔ البتہ اگر اسکی

بہادری فیاضی کے قدم بقدم ـــــ"

ڈان کارلو نے تلخ لہجہ میں جواب دیا "اس کی شجاعت اور فیاضی دونوں ضرب المثل ہیں۔ میرے جدامجد کو صرف مورہی بُرا کہہ سکتے ہیں۔"

اس فقرے کو سن کر ابوحامد اپنی جگہ سے اٹھ کھڑا ہؤا۔ اس کا استعجاب انتہا کی حد کو پہنچ چکا تھا اور الفاظ کی تلخی اس کی دلی کاوش کا ثبوت دیتی تھی "تم سنٹ کو اپنا جدامجد قرار دیتے ہو؟"

"ہاں۔ اس کا خون ہماری رگوں میں موجود ہے اور یہی وجہ ہے کہ مجھ کو کافر مورہل سے سخت نفرت ہے۔"

ابوحامد نے اپنی معشوقہ کی طرف دیکھ کر کہا "تم خاندان بیوار سے تعلق رکھتی ہو جس نے غرناطہ کی فتح کے بعد بنوسراج کے ایک معمر شخص کو اس کے باپ کی قبر کے پاس ہلاک کر دیا تھا۔ افسوس مجھے اس کا علم نہ تھا کہ اس خاندان نے سانتا فی کا نام اختیار کر لیا ہے۔ اور اس ناواقفیت نے مجھ کو ڈبو دیا۔"

کارلو نے فخریہ لہجہ میں کہا "جی ہاں۔ ہمارے دادا ہی نے بنوسراج کو قتل کیا تھا اور انہیں کو فرڈی نینڈ نے ڈیوک سانتا فی کا خطاب مرحمت فرمایا تھا۔"

ابوحامد کی گردن جھکی تھی۔ چہرہ کا رنگ کافور تھا۔ آنکھوں سے آنسو جاری تھے۔ آخر اس نے اپنے دل کو قابو میں کیا اور بولا "معاف کیجئے میں جانتا ہوں کہ رونا کم ہمتی کی نشانی ہے اور آیندہ آپ کبھی میری آنکھوں کو پرنم نہ دیکھیں گے (بلانکا کی طرف خطاب کرکے) بلانکا، میری محبت باد سموم کی طرح ہے۔ اس روز لاٹزیک کو سربسجود دیکھ کر اور تمہارے الفاظ سن کر میں نے تہیہ کر لیا تھا کہ عیسائی ہو جاؤں ـــــ"

ان الفاظ کو سن کر غمزدہ دوشیزہ کا چہرہ خوشی سے چمکنے لگا۔ ڈان کارلو استعجاب سے چونک پڑا اور فرانسیسی نائٹ نے اپنا چہرہ دونوں ہاتھوں سے چھپا لیا کیونکہ اب اس کو دوشیزہ کے حصول کی مطلق امید نہ رہی۔ مور نے اس کے خیالات کو معلوم کر لیا اور ایسی مسکراہٹ کے ساتھ جو انتہائی کرب کا پتا دیتی تھی۔ بولا "نائٹ۔ امید کو ہاتھ سے نہ دو۔ اور بلانکا تم بنی سراج کے آخری چشم وچراغ کا ماتم کرو۔"

بنوسراج کا نام سن کر ہر طرف خاموشی ہو گئی۔ اور دلوں میں خوف، نفرت، الفت، استعجاب اور حسد کے جذبات متلاطم ہو گئے۔ آخر بلانکا نے اس سکوت کو توڑا اور بولی "پاک مریم، تو نے میرے انتخاب کو لاجواب بنا دیا، واقعی میں صرف بہادروں کی اولاد سے محبت کر سکتی ہوں۔"

ابوحامد نے کہا "نازنین ملکہ میں تا دم مرگ تمہارا غلام رہوں گا مگر تم کو میری اصلی حالت کا پتا نہیں۔ میں نے ابھی خاندان بیوار کا ذکر کیا ہے جس نے غرناطہ میں بنوسراج کے ایک معمر شخص کو بیدردی کے ساتھ قتل کر دیا تھا۔ یہ شخص میرا دادا تھا اور میں پہلی مرتبہ غرناطہ صرف اس غرض سے آیا تھا کہ بیوار کے کسی فرد سے اپنے دادا کا بدلہ لوں۔ لیکن میں کس خیال میں تھا اور تقدیر کو کیا منظور تھا۔ اس انکشاف نے دل

کے دلوں کو آلودہ کر دیا اور بلانکا نے بالکل ہی مُردہ آواز میں دریافت کیا" تو اور اب کیا ارادہ ہے؟"

ابوحامد "یہی کہ میں تمہارے سواعید کو واپس کر دوں، خود ہمیشہ کے لئے بادیہ گردی اختیار کر لوں اور آخر اپنی موت سے اس باہمی تنافر کی تلافی کر دوں۔ اگر امتداد زمانہ کے ہاتھوں تمہارے دل سے میری تصویر مٹ جائے تو یہ فرانسیسی نائٹ ـــــ"

مگر لاٹریک نے اس کو آگے بڑھنے نہ دیا اور مور سے بغلگیر ہو کر کہنے لگا "نہیں نہیں، تم یہیں رہو اور میں ڈان کاربوسی التجا کرتا ہوں کہ وہ اپنی بہن کو تمہاری مناکحت میں دیدے، اگر تم چلے بھی جاؤ تو میرے مُنہ سے بلانکا کی محبت کا ایک کلمہ بھی نہ نکلے گا"

ڈان کاربو نے دونوں کے ایثار کی تعریف کی، لیکن اُس کو یقین نہ تھا کہ ابوحامد دراصل بنو سراج کا آخری چشم و چراغ ہے۔ اور جب مور سردار نے اس کو اپنی انگوٹھی بطور نشانی کے دکھائی تو وہ بھی نرم پڑ گیا اور کہنے لگا "ابوحامد، بس عیسائی ہو جاؤ اور میں خود بلانکا کو تمہاری زوجیت میں دے دوں گا"

امتحان سخت تھا مگر نہ اس قدر کہ ابوحامد عزت کو محبت پر قربان کر دے "کیا مقتول کا پوتا قاتل کی پوتی سے شادی کر سکتا تھا؟" پھر بھی اس نے اس امر کا فیصلہ بلانکا کے ہاتھ میں چھوڑ دیا۔

ہمیں کہنا پڑتا ہے کہ اس امتحان میں بلانکا باوجود عورت ہونے کے نہایت کامیاب رہی۔ اس نے ایسی آواز میں جو بمشکل سنی جاتی تھی کہا "جاؤ۔ اپنے وطن کو چلے جاؤ" اور غش کھا کر گر پڑی۔ ابوحامد نے اس فیصلہ کو پھانسی پانے والے مجرم کی طرح سنا اور اپنی تقدیر پر قانع ہو گیا۔

(۷)

دوسرے دن مور سردار جہاز میں سوار ہو کر افریقہ چلا گیا لیکن چونکہ وہاں اب اس کی دلچسپی کا کوئی سامان نہ تھا اس لئے وہ اُس کارواں میں شامل ہو گیا جو ہر تیسرے سال مصر کو جاتا اور وہیں میں مکہ معظمہ کے قافلہ سے مل جاتا ہے۔

بلانکا کچھ عرصہ تک صاحبِ فراش رہی مگر پھر تندرست ہو گئی۔ اس کا معمول تھا کہ ہر سال موسم بہار کی آمد پر سمندر کے کنارے جاتی، کچھ روز افریقہ کی طرف انتظار کی نظریں ڈالتی اور جب ابوحامد کے آنے کا زمانہ گذر جاتا تو غرناطہ واپس آجاتی۔ وہ نہ کسی بات کی شکایت کرتی تھی۔ نہ کبھی ابوحامد کا ذکر اس کے لبوں تک آتا۔ لوگ خیال کرنے لگے تھے کہ بلانکا اپنے حال میں خوش ہے۔ اس کا باپ بیٹی کے غم میں مر گیا اور ڈان کاربو لڑائی میں مارا گیا لیکن ابوحامد کا انجام کسی کو معلوم نہ ہوا۔

ایک مرتبہ تیونس سے کارتھیج کے کھنڈروں کو جاتے ہوئے مجھ کو بنو سراج کے آخری چشم و چراغ کا مقبرہ دکھایا گیا جس پر کھجور کا ایک گھنا درخت سایہ کئے ہوئے تھا۔ قبر میں بجز اس کے کوئی خاص بات نہ تھی کہ بیچ میں ایک پیالہ بنا ہوا تھا جس میں برسات کا پانی جمع ہو جاتا ہے اور موسم گرما میں پرند اس سے پیاس بجھاتے ہیں۔

(مشہور فرانسیسی فسانہ نگار شاتوبریاں کے قلم سے) ـــــ **احمد الدین مارہروی**

ایک خواب

(سیٹھ صاحب کا اصل مضمون جو انہوں نے مجھے عنایت فرمایا انگریزی میں ہے میں نے ناظرین ہمایوں کیلئے اس کا ترجمہ کردیا ہے)

میرے لئے طلوعِ آفتاب کی سرزمین ایشیا کی اٹھتی ہوئی امیدوں کی سرزمین ہے اس کی پھول بھری وادیوں و زمردیں جزیروں کے درمیان میری روح وسعت پکڑتی ہے یہاں تک کہ گذشتہ موجودہ اور آیندہ زمانے سب ایک دوسرے میں گھل مل جاتے ہیں میری روح اُس پردہ تاریکی کے پار کا منظر دیکھ رہی ہے جو اس وقت ایشیا پر پڑا ہوا ہے۔ منظر جس کا حُسن ہر ایسے نظارے سے بدرجہا زیادہ نشاط انگیز ہے۔ جو چشم انسانی نے کبھی دیکھا ہو۔ منظر کہ چاندنی راتوں میں مقدس فوجی یاما شان و شوکت سے بھی زیادہ خوشنما اور تحیر خیز ہے۔

ایک بار جاپان کے ایک جنگل میں گذری ہوئی صدیوں کی یاد سے معمور میرے کانوں میں اکابر ماضی کی روحوں کی آوازیں تیرتی ہوئی آئیں آوازیں جو یوں گویا ہوئیں تیرا آنا سر آنکھوں پر اے ہمارے وطن میں آنے والے اجنبی اپنی روح کو صبر سے معمور کرلے ہمیں اُن عذابوں کا علم ہے جو تو سہہ رہا ہے کہ ہم بھی کچھ ایسے ہی عذاب سہہ چکے ہیں۔ تو یہ فراموش نہ کر کہ صبر مشرق کا سب سے قیمتی ورثہ ہے اور یاد رکھ کہ صرف صبر اور دیانت داری کے کام سے تیری قوم وہ بات پیدا کرسکتی ہے جس کی اُسے تمنا ہے۔ تیرے ہی ہم وطن بُدھ نے ہمیں تمام دنیاوی مصائب کا علاج بتایا۔ یہی جو آج ہم تجھے بتا رہے ہیں۔ اور بتا رہے اس لئے ہیں کہ کچھ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ تیرے ہم وطن اُسے اپنے دل سے قطعاً بھلا چکے ہیں۔

آوازیں خاموش ہوگئیں اور میں نے آنسو بھری آنکھوں سے مغرب کی طرف اپنے ملک کی سمت دیکھا وہاں جہاں سورج چمکتے ہوئے سونے کے کہر میں آہستہ آہستہ ڈوب رہا تھا!

راس مسعود

رباعی

وا خوابِ عدم سے چشمِ مدہوش ہوئی
تاریکیٔ شب ہی سی ہم آغوش ہوئی
جب ظلمتِ غم میں کچھ سجھائی نہ دیا
پھر پردۂ نیستی میں روپوش ہوئی

اثر صہبائی

خاکا آڑانے والے کا خاکا

CALCUTTA ART PG. WORKS, LAHORE

بات کچھ بھی نہیں اور شور مچا رکھا ہے

مہاوٹوں کی ایک رات
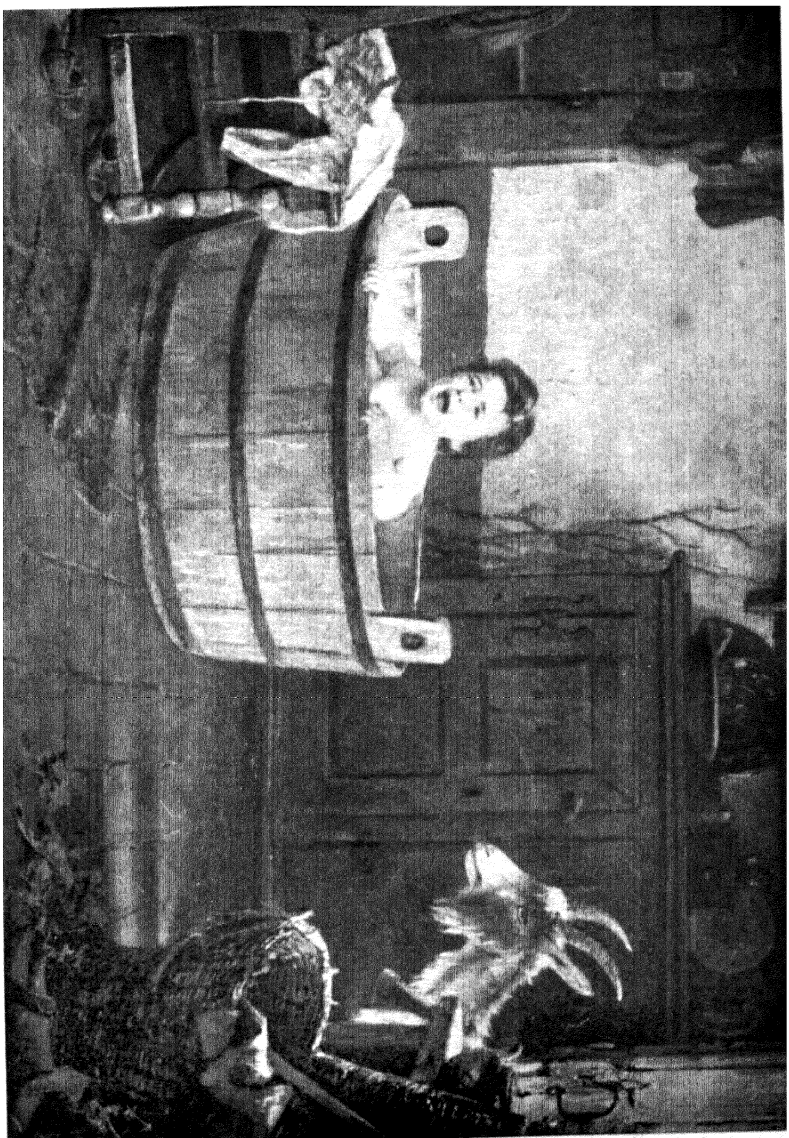
گرڑا! گرڑا! گرڑا! - الٰہی خیر! معلوم ہوتا ہے کہ آسمان ٹوٹ پڑے گا - کہیں چھت تو نہیں گر رہی! گرڑڑڑڑ! اس کے ساتھ ہی ٹوٹے ہوئے کواڑوں کی جھریاں ایک تڑپتی ہوئی روشنی سے چمک اٹھیں - ہوا کے ایک تیز جھونکے نے ساری عمارت کو ہلا ڈالا - شُوشُوشُووووو! کیا سردی ہے! یخ جمی جاتی ہے، برف جمی جاتی ہے کپکپی ہے کہ سارے جسم کو توڑے ڈالتی ہے -

ایک چھوٹا سا مکان ۲۴ سے ۲۴ فٹ یا اس میں بھی آدھے سے زیادہ میں ایک تنگ دالان اور اس کے پیچھے ایک پتلا سا کمرہ، نیچا اور اندھیرا - کوئی فرش تک نہیں - کچھ پھٹے پرانے بوریے اور ٹاٹ زمین پر بچھے ہیں جو گرد اور سیل سے چپ چپ کر رہے ہیں - کونوں میں بقچیوں اور گودڑ کا ڈھیر ہے - ایک اکیلا کاٹ کا ٹوٹا ہوا صندوق، اس پر بھی مٹی کے برتن جو سالہا سال کے استعمال سے کالے ہوگئے ہیں، اور ٹوٹتے ٹوٹتے آدھے پونے رہ گئے ہیں - ان میں ایک تانبے کی پتیلی بھی ہے - کنارے جھڑ چکے ہیں! برسوں سے قلعی تک نہیں ہوئی! گھستے گھستے پیندا جواب دینے کے قریب ہے -

چھت ہے کہ کڑیاں رہ گئی ہیں! اور اس پر بارش! یا اللہ کیا مہاوٹیں اب کے ایسی برسیں گی کہ گویا ان کو پھر برسنا ہی نہیں؛ اب تو روک دو! کہاں جاؤں، کیا کروں؟ اس سے تو موت ہی آجائے - تو نے غریب ہی کیوں بنایا! یا اچھے دن ہی نہ دکھائے ہوتے - یا یہ حالت ہے کہ لیٹنے کو جگہ نہیں - چھت چھلنی کی طرح ٹپکی جاتی ہے - بلی کے بچوں کی طرح سب کونے جھانک لئے - لیکن چین کہاں؟ میرا تو خیر کچھ نہیں، بچوں نگوڑے ماروں کی مصیبت ہے - نہ معلوم سو بھی کیسے گئے ہیں - سردی ہے کہ اُف! بوٹی بوٹی کانپی جاتی ہے! اور اس پر ایک لحاف، اور چار جانیں! اے میرے اللہ ذرا تو رحم کر! یاد ہے زمانہ تھا کہ محل تھے، نوکر تھے، فرش اور پلنگ تھے - آہ وہ میرا کمرہ! ایک چھپر کھٹ سنہری پردوں سے زرق برق، مخمل کی چادریں اور سینبل کے تکیئے - کیا نرم نرم توشک تھی کہ لیٹے سے نیند آجائے - اور لحاف! آہ! ریشمین چھینٹ کا، اور اس پر سچے ٹھپے کی گوٹ - انائیں، مامائیں کھڑی ہیں - بیوی سر دباؤں؟ بیوی پیر دباؤں؟ کوئی تیل ڈال رہی ہے، کوئی ہاتھ مل رہی ہے - گدگدا گدگدا بستر، اوپر سے یہ سب چونچلے، نیند ہے کہ کہکشانی کپڑے پہنے سامنے کھڑی ہے ...... سبز شیشوں پر نیلے اور سُرخ اور نارنجی عکس، بڑے بڑے ہشت پہل جواہرات کے سابوت ڈلے جگمگ جگمگ کر رہے ہیں ...... دسترخوان پر چاندی کی طشتریاں! ایک جھلملاہٹ، قورما، پلاؤ، بریانی، متنجن، باقرخانیاں، میٹھے ٹکڑے ...... ایک باغ درختوں سے گھرا ہُوا - جن کی کاہی پتیوں پر تاروں کی چمک شبنم میں اور تارے چمکا رہی ہے - واہ! واہ! کیا کیا خوش نما پھل ہیں - آم ہیں لال کلیجہ بال ماں کا بغد و بچہ - سیب کیسے خوبصورت ہیں - اندھیرے اندھیرے درختوں میں سُرخ اور گلابی اور بسنتی لٹکے ہوئے ہیں، ڈالیوں سمیت جھکے ہوئے ہیں - ارے

بیر تو دیکھو! کیسے موٹے موٹے اور عنابی ہیں، شیخپورے[۱] کے سے۔ ایک نہر! اندھیری رات میں چاندی کی چادر بچھی ہوئی ہے، شاید دودھ ہے۔ کہیں جنت تو نہیں! ایک کشتی بڑی آہستگی سے، بطوں کی نزاکت سے بہتی ہوئی۔ جلدی آؤ، جلدی بیٹھ جاؤ، بہشت کی سیر کرائیں کیا بیویاں ہیں، پاک صاف، بلور جیسی گوری! اُجلے براق کپڑے، نزاکت ایسی جیسی ہوا کی۔ کشتی بہتے ہوئے چراغ کی طرح پانی پر چلی جا رہی ہے، اُڑی جا رہی ہے۔ دونوں طرف کھلے کھلے میدان جوہری ہری دُوب سے ڈھکے ہوئے ہیں۔ بیچ بیچ میں پھولوں کے رنگین تختے، اور پھلوں کے درخت دکھائی دیتے ہیں۔ جانور چہچہا رہے ہیں، شور مچا رہے ہیں۔ تو کیا یہ جنت ہے؟ کیا ہم جنت میں ہیں؟ ہاں، بہشت، خدا کے نیک اور پیارے بندوں کی جگہ۔ کشتی کچھ چھوٹے چھوٹے سیپ کی طرح چمکدار اور گنبدوں کی طرح گول مکانوں کے سامنے سے گذری۔ کیا خوبصورتی اور کیا چمک ہے! نگاہ تک نہیں ٹھہرتی۔ ٹپکتے تو نہ ہوں گے؟ کیا ان میں مجھ کو بھی جگہ ملے گی؟ خدا کے نیک اور سچے بندوں کے لئے ہیں، پاک بندوں کے لئے — پیٹ میں ایک کھرچن، کلیجہ میں ایک کھچاؤ، انتڑیاں بل کھا رہی ہیں۔ ایسا معلوم ہوا کہ گود میں کسی نے کچھ رکھ دیا۔ یہ ایک موتی کی طرح سفید اور سیب کی طرح بڑا پھل تھا۔ ڈنڈی میں دو ہرے ہرے پتے بھی تھے۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ ابھی ابھی ڈال سے توڑا گیا ہو۔ آہا، کیا مزہ ہے! کاش کہ اور ہوتے۔ گود بھری ہوئی تھی۔ کشتی دو پہاڑوں کے بیچ سے گذر رہی تھی۔ ایک موڑ تھا۔ تھوڑی دیر میں جب موڑ ختم ہوا تو یکایک دور کے ایک اونچے پہاڑ سے بجلی سے زیادہ تیز روشنی کی لپٹیں آگ کی طرح اُٹھتی ہوئی دکھائی دینے لگیں۔ آنکھیں چکا چوند ہو کر بند ہو گئیں۔ اندھیر اگھُپ تھا۔ ایک شور کی آواز گرج سے بھی زیادہ تیز آنے لگی۔ صور پھُنک رہا تھا۔ کان پڑی آواز سنائی نہ دیتی تھی۔ کشتی والی بیویاں اِدھر اُدھر دوڑ رہی تھیں۔ اتنے میں پھر ایک تیز روشنی ہوئی۔ سورج گر رہا تھا۔ یکایک قریب ہی سے ایک ایسی آواز آئی جیسے کوئی آتش فشاں پہاڑ پھٹ رہا ہو۔ ایک زلزلہ آگیا۔ کشتی لوٹ گئی، اور سب دریا کے اندر ڈوب رہے تھے۔ ۔ ۔ ۔

گڑ ڑ ڑ ڑ! ٹپاٹپ کی آواز چاروں طرف سے آ رہی تھی۔ اماں! اماں! ابھی کانوں میں سنسناہٹ باقی تھی۔ دل گردوں اُچھل رہا تھا۔ کیا ہے بیٹا، کیا ہے؟ ڈر لگ رہا ہے۔ یہ آواز کاہے کی تھی؟ کچھ نہیں بیٹا گرج ہے۔ تینوں بچے چمٹے ہوئے ایک کونے میں سکڑے پڑے تھے۔ ٹپکا ان کے لحاف تک پہنچ چکا تھا۔ مریم کی طرف کا کونا خوب بھیگ گیا تھا۔ بیچاری نے اٹھ کر بچوں کو اور پرے سرکایا۔ اب وہ بالکل دیوار کے برابر پہنچ گئے تھے۔ یا اللہ اگر ٹپکا اسی طرح بڑھتا رہا تو اب کے بھیگنا ہی پڑے گا۔ اماں سردی لگ رہی ہے۔ صدیقہ اس کے برابر لیٹی ہوئی تھی۔ اُس نے اس کو چمٹا کے لٹا لیا۔ روئی نہیں تو دوئی ہی سہی۔ اُدھر دونوں لڑکے چمٹے پڑے تھے۔ جیسے سانپ درخت سے لپٹ جاتا ہے۔

یا اللہ رحم کر۔ خدا غریبوں کے ساتھ ہوتا ہے، ان کی مدد کرتا ہے، ان کی آہ سُن لیتا ہے۔ کیا میں غریب بھی نہیں؟ خدا سنتا کیوں نہیں؟ ہے بھی یا نہیں؟ آخر ہے کیا؟ جو کچھ بھی ہے بڑا قاہر ہے۔ کوئی امیر کیوں؟ کوئی غریب کیوں؟ اس کی حکمت ہے۔ اچھی حکمت ہے! ایک طرف وہ لوگ کہ جاڑے میں انیٹھیں، لیٹنے کو پلنگ تک نہ ہوں۔ اوڑھنے کو

[۱] دہلی کے قریب ایک قصبہ ہے۔ جہاں کے بیر مشہور ہیں۔

کپڑے تک نہ ہوں۔ سردی کھائیں، بارشیں سہیں، فاقے کریں، اور موت بھی نہ آئے۔ دوسری طرف وہ لوگ کہ لاکھوں والے ہیں، ہر قسم کا سامان ہے، کسی بات کی تکلیف نہیں۔ اگر وہ تھوڑا سا ہم ہی کو دیدیں تو ان کا کیا جائیگا؟ غریبوں کی جانیں پل جائینگی لیکن ان کو کیا پڑی کس کی بکری اور کون ڈالے گھاس۔ ہم کو بنایا کس نے؟ اللہ نے؛ تو پھر ہماری پروا کیوں نہیں کرتا؟ کس لئے بنایا؟ رنج سہنے اور مصیبت اٹھانے کے لئے؟ ارے کیا انصاف ہے! وہ کیوں امیر ہیں، ہم کیوں نہیں؟ عاقبت میں اس کا بدلہ ملیگا۔ مولوی تو یہ ہی کہتے ہیں، عاقبت کس کی، بھاڑ میں جائے عاقبت، تکلیف ثواب ہے، ضرورت ثواب ہے، بخار تو اس وقت چڑھا ہوا ہو، اور دوا دس برس بعد ملے گی۔ باز آئے ایسی عاقبت سے۔ جب کی جب بھگت لیتے، اب تو کچھ ہو۔ خدا! محض ایک بہانہ، محض ایک دھوکا، پھر غربت میں غریب رہنے کی تسلی، مایوسی میں مایوس امید، مصیبت میں تکلیف سے قانع رہنے کا ذریعہ۔ خدا؟ صرف ایک دھوکے کی ٹٹی۔ اور مذہب ہے کہ وہ بھی یہی سکھاتا ہے، یہ ہی پڑھاتا ہے، پھر کہتے ہیں کہ علم کا خزانہ ہے! وہ پھر افلاس کا بہانہ ہے۔ بیوقوفوں کی عقل ہے، آگے بڑھتے ہوؤں، اوپر چڑھتے ہوؤں کو پیچھے کھینچتا ہے، ترقی کے راستہ میں ایک کاوٹ ہے۔ غریب ہو، غربت ہی میں خدا ملتا ہے۔ ہم نے تو پایا نہیں، امیروں کے کیوں نہیں وہ پیدا ہوا دیتا؛ دولت کا کیا ہوگا، صرف اتنا چاہیے کہ اوقات بسر ہو جائے۔ آخر امیر ہی دولت کا کیا کرتے ہیں؟ خزانوں میں پڑی زنگ کھاتی ہے کسی خرچ کا بھی ٹھیک نہیں، جو ہے بے تکے پن سے اٹھتا ہے، لٹتا ہے۔ سرکار ہی کچھ کیوں نہیں کرتی؟ اور نہیں تو سب کو برابر روپیہ دلوا دے اور اگر اتنا نہیں تو صرف آدھا ہی ہم کو مل جائے۔ لیکن سرکار کی جوتی کو کیا غرض پڑی جو اپنی جان ہلکان کرے۔ اس کے تو خزانے پُر ہیں بیٹھے بٹھلائے روپیہ ملجاتا ہے۔ اس کو کیا، موت تو ہماری ہے جب پڑے تو جانے، اونٹ جب پہاڑ کے نیچے آتا ہے تو بلبلاتا ہے۔ ابھی تو . . . . .

اماں! ہاں بیٹا کیا ہے؟ اماں بھوک لگی ہے۔ بھوک! مریم کے جسم میں سنسنی سی دوڑ گئی، یا الٰہی کیا کروں! ہائے بیچارے بچے! میاں یہ بھی کوئی بھوک کا وقت ہے؛ بھوک نہیں، دیوانی ہوگئی، سو جاؤ، صبح ہوتے کھانا۔ نہیں اماں میں تو ابھی کھاؤنگا بڑے زور کی بھوک لگی ہے۔ نہیں بیٹا یہ کوئی وقت نہیں، لیٹ جاؤ۔ وہ دیکھو کڑاک ہوئی۔ بچہ بیچارا کڑک کی آواز سنتے ہی سہم کر لیٹ گیا۔ کہاں سے لاؤں؟ کیا کروں؟ بارش نے تو دن بھی نکلنے بھی نہ دیا کہ کسی کے ہاں جاتی اور تھوڑا بہت جو کچھ ملسکتا لاکر سیتی۔ بیچاری نیاض بیگم کے ہاں بھی جانا نہ ہوا وہ ہی بیچاری بیچا کھچا جو کچھ ہوتا ہے بھجوا دیتی ہیں اچھے اگر کل بھی کہیں سے کام نہ ملا تو کیا ہوگا؟ آخر کہاں تک مانگ مانگ کے لاؤں؟ دیتے دیتے بھی لوگ اکتا جاتے ہوں گے۔

اماں، بھوک لگی ہے۔ دیکھو تو پیٹ خالی پڑا ہے۔ کل دن سے نہیں کھایا اور نیند بالکل نہیں آتی۔ کلیجہ منہ کو آرہا تھا۔ بیچاری آخر کو اٹھی اور دیئے کی مدہم روشنی میں ٹٹولتی ہوئی صندوق کی طرف گئی کہ اگر کچھ مل جائے تو بچے کو دے۔ آخر تو صرف پانچ برس کی جان ہے! کاش میں نے ان بچوں کو جنا ہی نہ ہوتا، میں تو مرگرکے کاٹ ہی لیتی لیکن انکی تکلیف تو دیکھی نہیں جاتی۔ ایک سوکھی ہوئی روٹی ایک ہنڈیا میں پڑی پاگئی اس کو توڑ کر پانی میں بھگویا اور بچے کے سامنے لا رکھی۔ پیٹ بڑی بُری بلا ہے۔ بیچارا کتے کی طرح جھپٹ گیا، تھوڑی کھانے کے بعد بولا، اماں ذرا سا گڑ ہو تو دیدو۔ مریم پھر کھڑی ہوگئی کہ شاید گڑ کی ڈلی بھی ملجائے۔ اتفاق سے ایک چھوٹی سی ڈلی پاگئی۔ بچے نے جو کچھ ہوسکا کھایا، دو چار نوالے جو بچ رہے تھے مریم اپنے آپ کو ضبط نہ کرسکی اور تھوڑا تھوڑا کرکے کھا گئی . . . .

کڑک اور چمک رُک چکی تھی۔ بارش بھی کم ہوگئی تھی۔ پھر وہ بچہ سے چمٹ کر لیٹ گئی اور اکیلی تھی۔

آہ! کاش کہ وہ ہوتے! آہ وہ ہوتے ۔ وہ، وہ، وہ ۔ رات کو آئے کچھ نہ کچھ لئے چلے آتے ہیں ۔ کیا لائے ہو؟ حلوا سوہن ہے ۔ وہ ہی نگوڑا پڑی کا ہوگا۔ تم جانتے ہو کہ مجھے حبشی پسند ہے ۔ لو! پھر چیخنے لگیں، دیکھا تو ہوتا! آہ! وہ جھگڑے اور وہ ملاپ، ساون اور بھادوں کے ملاپ، کیا دن تھے ۔ اب تو ایک خواب ہیں۔ پھر چاندنی راتوں میں پھولوالوں کی سیر ۔ آہ! وہ سجیں ۔ کیا مہک تھی دماغ پھٹا جاتا تھا، اور اب تو وہ باسی پھول بھی نہیں، مرجھائے ہوئے پھول بھی نہیں لے کاش وہ ہوتے ۔ کیا زندگی تھی! ہم دو تھے لیکن ایک تھے ۔ دو جڑواں درخت، ایک پیپل اور ایک آم، ایک ہی جڑ میں اُگے ہوئے، ایک ہی تنے سے پیدا، ایک ہی زندگی کے ہمراز، تھے کہ اُگ رہے تھے ۔ ایک دوسرے کا سہارا، ایک دوسرے کی تسلی، ایک ہی ہوا میں سانس لیتے ایک ہی سوت کے پانی سے جیتے تھے ۔ آہ! کاش کہ وہ ہوتے ۔ اور اب تو پیپل کو بجلی نے جلا ڈالا، جڑ سے مسل ڈالا! مگر آم ہے کہ قسمت کا مارا ابھی تک کھڑا ہے ۔ کاش کہ اس پر بجلی گری ہوتی ـــ ٹنڈا ۔ اکیلا، مرجھایا ہوا، چھڑی کی جان ابھی تک ٹھوکریں کھانے کو زندہ ہے اگر یہ ہوتے . . . .

لحاف میں ایک حرکت، صدیقہ نے ایک کروٹ لی ۔

آہ! زمانہ کسی کے بہلاوے میں نہیں آتا، کسی کے پھسلاوے میں نہیں آتا! اور میں ایک اکیلی ہوں، آہ! میں اکیلی ہوں ۔ اس تو زندگی کا لطف دیکھا ہی نہ ہوتا جو آج یہ تنہائی محسوس نہ ہوتی ۔ میرے دل میں کوئی جگہ خالی نہ ہوتی، محبت کی جگہ ۔ امید بھی کیا چھپتی جھلاتی ہے ۔ کبھی پاس آتی ہے ۔ کبھی دور جاتی ہے ۔ لیکن امید کاہے کی! اب تو ایک مایوسی ہے کہ سارے میں پھیلی ہوئی ہے، بادلوں کی طرح اُمڈی ہوئی ہے ۔ وہ سوت کی رسی کا جھولا، چار ہم جولیاں، پٹڑے کے ایک ایک کنارے پر دو دو ۔ اور پینگ ہیں کہ درخت کو ہلائے ڈالتے ہیں، گھنگھور گھٹاؤں میں گھسے جاتے ہیں ۔ جھولا کن نے ڈالو رے آموریاں ۔ واہ! انوری اور کشور بس اتنے ہی پینگ لے سکتی ہو؟ دیکھو میں اور کبری کتنا بڑھاتے ہیں ۔ چکر نہ آجائے میں جب ہی کہتا . . . . پھر ایک ہنسی کا غل، اور پھر ایک قہقہوں کا شور . .
. . . آہ! اب تو زندگی ایک ہوا ہے ۔ باغ ارم اور حوروں کی خوش فعلیاں، پھولوں کے ہار اور اوس کا جھومر ۔ نہ وہ بیری کی ڈالی! کہاں میرا آشیانہ! پھر ایک تپتی ہوئی چٹان، بنجر اور سخت! اور اس کے پہلو سے زندگی لیکن پھر ایک نئی ہستی، پھر ایک نئی آن، من و سلوے کے مزے، دودھ کی شیریں نہروں میں نہانا، اور ان میں کھیلنا ۔ پھر دن عید، رات شب برات ۔ لیکن آہ! زمانہ کی ایک کروٹ ـــ ابلیس اور گیہوں اور نیستی ۔ تنہائی، تنہائی، ایک پہاڑ ٹوٹ پڑا کاش کہ وہ ہوتے ـــ اے آدم! ـــ نہ پھر اذیت، مصیبت، ملامت، بلائیں ۔ پھر وہ ہی خوشی اور خرمی ۔ ایک قیامت بپا ہے ۔ نفسی نفسی کا عالم، اسرافیل کا شور، دجال ہے کہ سب کو پھسلا رہا ہے ۔ میں تو اسی کے پاس جاؤں گی، امید تو ہے ۔ آہ! یہ تنہائی ۔ کوئی سر پر ہاتھ رکھنے والا بھی نہیں ۔ نہ تسلی نہ دلاسا ۔ تنہائی، تنہائی ۔ رات اندھیری اور بھیانک رات! ارے لا دو کوئی جنگل مجھے . . . . جنگل . . . . مجھے . . . . بازا . . . . با ـ زار ـ

موُ ـ جھ . . . .

رات ۔

احمد علی

انگلیاں پانچ اِس پاؤں کی بھی
انگلیاں پانچ اُس پاؤں کی بھی
جب میں اندر آتا ہوں
جب میں باہر جاتا ہوں
یہ بھی اندر آتی ہیں!
یہ بھی باہر جاتی ہیں!

آنکھ یہ دائیں جانب کی
آنکھ یہ بائیں جانب کی
جب میں رونے لگتا ہوں
جب میں سونے لگتا ہوں
یہ بھی رونے لگتی ہیں!
یہ بھی سونے لگتی ہیں!

سر یہ میرے کندھوں پر
لیٹنے جب میں لگتا ہوں
یہ بھی لیٹنے آتا ہے
لیکن جب میں اٹھتا ہوں
پہلے یہ اٹھ جاتا ہے!!

(ماخوذ از انگریزی)

ب ا

محفل ادب

روسی گیت

جُدائی

جب جوانی کا سورج نکل رہا تھا
مجھے دل و جان سے پیاری ایک لڑکی سے محبت تھی
اُس کی آنکھوں میں سُورج کی چمک تھی
اُس کے چہرے پر محبت کی آگ جل رہی تھی
اُس کے سامنے تیری کیا ہستی تھی، بہار کی صبح
یا تیری، ہرے بھرے شاہ بلوط کے درخت
یا تیری، ستپ کی گھاس، سبز مخمل کی چادر
یا تیری اے جھٹ پٹے کے وقت، یا تیری اے چاندنی رات!
تم پر تو نظر تب ہی پڑتی ہے جب وہ نہ ہو،
جب تم کو کوئی اپنے درد اور اشتیاق کا حال سنانے،
وہ سامنے ہو۔ تو تم دکھائی بھی نہیں دیتے . . .
وہ ساتھ ہو تو جاڑا بہار ہو جاتا ہے، اندھیری رات اُجالا دن!
وہ گھڑی کیسے بھول جاؤں جب میں نے آخری بار
اُس سے کہا، خدا حافظ میری پیاری!
شاید خدا کی یہی مرضی ہے کہ ہم جُدا ہو جائیں،
مگر پھر کبھی ملیں گے . . ."
اک دم اُس کے چہرے پر آگ سی بھڑک اُٹھی،
پھر وہ برف کی طرح سفید پڑ گیا —
تڑپ کر دیوانوں کی طرح،
وہ میرے سینے سے لپٹ گئی —
"ابھی نہ جا، ذرا ٹھیر، مہلت دے
کہ دل کو سنبھال لوں، اور ماں کے کندھے پر
رو کر اپنے رنج کو بہا دوں . . ."
وہ سسکیاں لینے لگی، بات زبان پر آ کر رہ گئی . . .

پھیری والے

نکراسوف نے اپنی نظم "پھیری والوں" میں روسی دیہاتن کی ذہنیت کا خاکہ کھینچا ہے۔ ایک لڑکی کا دوست کوئی رنگیلا پھیری والا، ایک خاص تہوار کے دن تک واپس آنے کا وعدہ کر کے چلا گیا ہے۔ لڑکی

اکثر اکیلی پڑی ہوتی
ساری رات جاگ کر گذارتی تھی
اور جب اونچے گیہوں کے کھیت کاٹتی
تو آنکھوں سے آنسوؤں کے دریا بہتے تھے
وہ رنج اور مایوسی میں اپنے آپ کو ہلاک کر دیتی
اگر رنج کرنے کی اُسے مہلت ملتی،
لیکن زمانہ کھیتی کاٹنے کا تھا، جلدی جلدی کام کرنے کا —
بیسیوں کام ختم کرنے تھے . . .
درانتی کے نیچے وہ گھاس کے ڈھیر لگا دیتی،
او گیہوں کے انبار،

صبح سویرے کے وقت اپنی پوری طاقت لگاکر
اناج کمند لتی
شام کو دیر تک شبنم سے تر چراگاہوں میں
کٹا ہوا سن پھیلاتی
سن پھیلاتی، اور ایک خیال
کبھی اس کا پیچھا نہ چھوڑتا :
"کیا کوئی دوسری موہنی
ٹونا کرکے اس کے من کو لبھا رہی ہے ؟
کیا وہ بیوفائی کر رہا ہے ؟ پردیس میں
دوسری عورتوں کے پیچھے لگا ہے ؟"
یہ سوچ کر بیچاری کا دل ٹوٹ جاتا . . .
"ارے تو مجھ سے شادی کر، مجھ سے،
میں تجھے یا تیرے باپ کو
کبھی خفا نہ ہونے دوں گی،
تیری ماں کی گالیاں
چپ چاپ سن لوں گی —
میں نہ شریف زادی ہوں نہ سوداگر کی بیٹی،
میری طبیعت مسکین ہے

تیری بیوی بنی تو ہمیشہ
خاموش رہوں گی، محنت کروں گی
تجھے کام کرنے کی زحمت نہ ہوگی
میرے ہاتھ پاؤں کا اور کوئی مصرف نہیں
میں اپنے پیارے کے لئے
خوشی سے کھیت بھی جوتا کروں گی
تو اپنی محنتی بیوی کے بل پر
خوب مزے سے رہنا
بازاروں کی سیر کرنا،
مست ہونا، گیت گانا!
اگر تو اناج کا سوداگر کے مست واپس آئے
تو تجھے کھلا پلا کر پلنگ پر لٹا دوں گی!
"سو میرے پیارے، سو میرے موہن!"
اس کے سوا اور کچھ نہ کہوں گی،
قسم ہے خدا کی ذرا خفا نہ ہوں گی . . .
تیرے گھوڑے کو سواری کے لئے سنواروں گی،
تیرے پیروں پر گر کر کہوں گی :
"میرے دوست! مجھے پیار کرتا جا"

"اردو"

مڈل سکول کی شرارتیں

مندرجہ بالا عنوان سے "نیرنگِ خیال" میں مرزا فرحت اللہ بیگ صاحب دہلوی نے ایک مزاحیہ مضمون لکھا ہے۔ جس میں انہوں نے خاص خاص ماسٹروں کا ذکر کیا ہے اور طالب علموں کی شرارتیں درج کی ہیں۔ ایک طالب علم جو اپنے اثر و رعب یا بالفاظ دیگر شرارت کے لحاظ سے طالب علموں کے بادشاہ سمجھے جاتے تھے۔ ہماری توجہ کو خاص طور پر اپنی طرف منعطف کراتے ہیں۔
ان کے امتحان کا ایک واقعہ ایسا ہے کہ جب کبھی خیال آتا ہے تو ہنستے ہنستے پیٹ میں بل پڑ جاتے ہیں۔ مڈل کا امتحان ہے تاریخ کا پرچہ ہے۔ یہ نہایت اطمینان سے بیٹھے مولوی ذاکر حسین کا خلاصۂ تاریخ ہند سامنے رکھے نقل کر رہے ہیں۔ ہیجڑے مولوی

صاحب اس حصّہ کے گارڈ ہیں انہوں نے دیکھا کہ یہیں یہ کیا ہو رہا ہے۔ امتحان اور یہ دیدہ دلیری۔ بڑے لمبے لمبے ڈگ بھرتے ہوئے ان کے پاس آئے۔ جو گفتگو ان میں ہوئی وہ لفظ بلفظ لکھتا ہوں۔ پڑھنے میں جب مزا آئے گا کہ جہاں میں "تالی" لکھوں وہاں مولوی صاحب کی طرح آپ بھی پنسل یا قلم کے بدل کر تالی بجائیں اور ایک ہاتھ سامنے اور دوسرا پیچھے لے جائیں۔ یہیں نہیں جہاں کہیں مولوی صاحب کی گفتگو آئے وہاں اسی طرح کیجئے اور پھر دیکھئے کہ ہمارے مولوی صاحب طرفہ معجون تھے یا نہیں۔ اچھا اب دونوں میں یوں گفتگو شروع ہوئی:۔

مولوی صاحب۔ ہیں یہ کیا ہو رہا ہے (تالی)

یہ۔ کچھ نہیں نقل ہو رہی ہے۔

مولوی صاحب: نکال دیئے جاؤ گے (تالی)

یہ۔ ہم کو کوئی نہیں نکال سکتا۔

مولوی صاحب۔ نہیں نکال سکتا (تالی) ہم نکال سکتے ہیں (تالی) امتحان ہے (تالی) کوئی مذاق ہے (تالی)

یہ۔ جائیے جائیے اپنا کام کیجئے۔ ہمارے نقل کرنے میں ہرج ہوتا ہے۔ وقت کم رہ گیا ہے۔ پرچہ پڑا ہے۔

مولوی صاحب۔ چلو (تالی) اٹھو (تالی) صاحب کے پاس چلو (تالی)

یہ۔ چلیئے ہم بھی دیکھیں آپ کے صاحب ہمارا کیا کر لیتے ہیں۔ الغرض یہ اٹھے کتاب ہاتھ میں لی آگے آگے مولوی صاحب اور پیچھے پیچھے یہ۔ دوسرے کمرے میں پہنچے۔ صاحب کچھ لکھوا رہے تھے۔ مولوی صاحب نے جاتے ہی تالی بجائی انہوں نے گردن اٹھا کر دیکھا۔

مولوی صاحب۔ غضب ہے (تالی) نقل ہوتی ہے (تالی) بڑے گستاخ ہو گئے ہیں (تالی) ہم سے نہیں ڈرتے (تالی) آپ سے بھی نہیں ڈرتے (تالی) کتاب کھولے بیٹھے ہیں (تالی) نقل کر رہے ہیں (تالی) کہتے ہیں (تالی) صاحب ہمارا کیا کر لیں گے (تالی) بڑی مشکل سے لایا ہوں (تالی) سخت سزا دی جائے (تالی)۔

صاحب نے ان کی طرف دیکھا انہوں نے کہا:۔

"جناب یہ مولوی صاحب میرے دشمن ہیں۔ غدر سے پہلے ان کے اور ہمارے خاندان میں دشمنی چلی آ رہی ہے۔ زبردستی پرچہ لکھتے لکھتے مجھ کو یہاں گھسیٹ لائے کہ چلو میں صاحب سے کہہ کر تم کو نکلوا دیتا ہوں۔ خواہ مخواہ کا الزام ہے آپ میری تلاشی لے لیں کوئی میں دیوانہ تھا جو اس طرح کتاب سامنے رکھ کر نقل کرتا نقل کرتے ہیں تو چھپ چھپا کر نقل کرتے ہیں نہ اس طرح کہ کتاب سامنے کھولے بیٹھے ہیں اور نقل کر رہے ہیں۔"

صاحب کو بھی یہ بات خدا لگتی معلوم ہوئی۔ ان کی خوب اچھی طرح تلاشی لی گئی۔ کتاب تو کتاب ایک کاغذ کا پرزہ بھی نہ نکلا۔ آخر صاحب نے بیچارے مولوی صاحب کو بہت ڈانٹا کہ آپ فضول امیدواروں کا وقت ضائع کرتے ہیں۔ آئندہ ایسا کیا تو کمرے سے نکال دوں گا۔ بہرحال مولوی صاحب شرمندہ شکل وہاں سے واپس آئے آگے آگے مولوی صاحب اور پیچھے پیچھے یہ۔ مولوی صاحب پریشان تھے کہ یا اللہ آتے وقت کتاب اس کے ہاتھ میں تھی۔ ایک کمرے سے دوسرے کمرے میں آتے آتے کہاں غائب ہو گئی۔ آخر نہ رہا گیا اور خود ان سے پوچھا:۔

مولوی صاحب: "کتاب کہاں ہے (تالی) آتے وقت تمہارے ہاتھ میں تھی (تالی) راستہ میں کہاں غائب کر دی" (تالی)۔

یہ۔ کچھ نہیں راستہ میں ایک ایک صفحہ کر کے کھا گیا۔ یہ سننا تھا کہ مولوی صاحب نے وہیں سے دے تالی پہ تالی بجانی شروع کی۔

مولوی صاحب غضب ہے (تالی)، کھا گیا (تالی)، ساری کتاب کھا گیا (تالی)، اُستاد کو جھوٹا بنا دیا (تالی)، نالائق ہے (تالی) شیطان ہے (تالی)، صاحب نے جو تالیوں کی آواز سُنی تو یہ بھی نہ پوچھا کہ کیا معاملہ ہے حُکم دے دیا کہ مولوی صاحب کو کمرے سے باہر کر دیا جائے خیر بیچارے نکال دیئے گئے۔ ہمیشہ اس واقعہ کو بیان کر کے بُرا بھلا کہا کرتے تھے۔

"نیرنگِ خیال"

بھاگ بلائے حُسن سی بھاگ

عشق میں اپنا جی نہ تیاگ عشق نہیں ہے آگ ہے آگ
کس کی لگاوٹ کس کی لاگ بھاگ بلائے حُسن سے بھاگ

حُسن کے کیا گُن گاتا ہے حُسن تباہی لاتا ہے
حُسن گلے کٹواتا ہے بھاگ بلائے حُسن سی بھاگ

حُسن کے ارماں ٹھیک نہیں جی کا نقصاں ٹھیک نہیں
ٹھیک نہیں ہاں ٹھیک نہیں بھاگ بلائے حُسن سی بھاگ

حُسن پہ جی کیوں کھوتا ہے تخمِ غم کیوں بوتا ہے
حُسن کسی کا ہوتا ہے؟ بھاگ بلائے حُسن سی بھاگ

حُسن کا دم کیوں بھرتا ہے خونِ دل کیوں کرتا ہے
جیتے جی کیوں مرتا ہے بھاگ بلائے حُسن سی بھاگ

حُسن پہ ناحق مائل ہے یہ تو دامِ ہمہ دل ہے
پھر چھٹکارا مُشکل ہے بھاگ بلائے حُسن سی بھاگ

حُسن کی ناحق چاہت ہے حُسن نہیں ہے آفت ہے
فتنۂ روزِ قیامت ہے بھاگ بلائے حُسن سی بھاگ

حُسن سے دھوکا کھائے گا رنج و اذیت پائے گا
دیکھ بہت پچھتائے گا بھاگ بلائے حُسن سی بھاگ

حُسن کو پہلے زر دے گا بعد ازاں کل گھر دے گا
آخر آخر سر دے گا بھاگ بلائے حُسن سی بھاگ

عالمِ رُوئے حُسن نہ دیکھ جلوۂ موئے حُسن نہ دیکھ
بھول کے سوئے حُسن نہ دیکھ بھاگ بلائے حُسن سی بھاگ

حُسنِ بُتاں سے بات نہ کر دُشمنِ جاں سے بات نہ کر
خصمِ جہاں سے بات نہ کر بھاگ بلائے حُسن سی بھاگ

دل کو لگا کر کیا لے گا جان کھپا کر کیا لے گا
زیست گنوا کر کیا لے گا بھاگ بلائے حُسن سی بھاگ

لعلِ جادو فن کو نہ چاہ جعدِ کمند افگن کو نہ چاہ
دشمنِ جاں! دشمن کو نہ چاہ بھاگ بلائے حُسن سی بھاگ

چشم نہیں ہے، ڈاین ہے زُلف نہیں ہے ناگن ہے
عشوہ نہیں ہے رہزن ہے بھاگ بلائے حُسن سی بھاگ

اہلِ ادا سے بچ کر چل چشمِ قضا سے بچ کر چل
راہِ خطا سے بچ کر چل بھاگ بلائے حُسن سی بھاگ

حُسن کی چاہت پر بھی نہ جا چشمِ عنایت پر بھی نہ جا
لُطفِ نہایت پر بھی نہ جا بھاگ بلائے حُسن سی بھاگ

اس کی ملاحت پر بھی نہ ریجھ اس کی صباحت پر بھی نہ ریجھ
ناز و نزاکت پر بھی نہ ریجھ بھاگ بلائے حُسن سی بھاگ

ہجر کا غم بھی قاتل ہے وصل کا سم بھی قاتل ہے
کم سے کم بھی قاتل ہے بھاگ بلائے حُسن سی بھاگ

شوقِ وفا بھی مُہلک ہے ذوقِ جفا بھی مُہلک ہے
کم بھی سوا بھی مُہلک ہے بھاگ بلائے حُسن سی بھاگ

جتنے حسیں کہلاتے ہیں دشمنِ دیں کہلاتے ہیں
دوست نہیں کہلاتے ہیں بھاگ بلائے حُسن سی بھاگ

دل کو وفا کا اذن نہ دے ذوقِ جفا کا اذن نہ دے
ایسی خطا کا اذن نہ دے بھاگ بلائے حُسن سے بھاگ
دولتِ دین و دل نہ گنوا بے جا، لاحاصل نہ گنوا
ہوش میں آ۔ غافل! نہ گنوا بھاگ بلائے حُسن سے بھاگ

حُسن کا ہلاکر کیا لے گا سر سے پاتک کھائے گا
بھاگ، نہیں تو آئے گا بھاگ بلائے حُسن سے بھاگ
آزاد، اپنی جان بچا دین بچا، ایمان بچا
ناداں! کہنا مان، بچا بھاگ بلائے حُسن سے بھاگ

"مکتبہ"

دربارِ اموی میں ایک فاطمی لڑکا

حضرت عمر ابن عبدالعزیز کو جب خلافت ملی تو لوگ دُور دُور سے مبارک باد دینے کے لئے دربارِ خلافت میں حاضر ہوئے۔ دربار اپنی پوری شان و شوکت کے ساتھ قائم تھا۔ امیرالمومنین تختِ خلافت پر متمکن تھے۔ اُمرا صف در صف اپنے اپنے مرتبوں کے مطابق مُرصّع کرسیوں پر بیٹھے ہوئے تھے۔ مختلف قبیلوں کے معمر سردار یکے بعد دیگرے مبارکباد عرض کرنے کے لئے دربار میں حاضر ہو رہے تھے کہ ایک بے ریش ورُوت نوعمر حجازی لڑکا اپنے قبیلہ کی طرف سے مبارکباد عرض کرنے کے لئے آگے بڑھا۔ خلیفہ نے کہا اے لڑکے! کسی اپنے سے بڑی عمر والے سردار کو گفتگو کے لئے پیش کر۔

لڑکے نے جواب دیا۔ اے امیرالمومنین جب خُدا اپنے بندے کو اُس کا یاد کرنے والا دل اور بولنے والی زبان عطا کر دے تو وہ گفتگو کا مستحق ہے، اور اے امیرالمومنین اگر فضیلت عمر کے لحاظ سے ہوتی تو اس وقت اُمت میں جو آپ سے بڑی عمر والے ہیں وہ تخت پر بیٹھے ہوتے۔

امیرالمومنین لڑکے کی معقول گفتگو سے مرعُوب ہوگئے اور اُنھوں نے کہا اے لڑکے تو کیا کہنا چاہتا ہے؟

لڑکے نے ادب کے ساتھ جواب دیا۔ حضورِ والا ہم مبارک باد عرض کرنے آئے ہیں۔ خُدا نے آپ جیسا عادل خلیفہ مقرر کرکے ہم پر بڑا احسان کیا ہے۔

امیرالمومنین نے آنکھوں میں بھرے ہوئے آنسو پُونچھتے ہوئے کہا۔ اے لڑکے مجھے کچھ نصیحت کر۔

لڑکے نے جرأت کے ساتھ جواب دیا۔ بہت سے ایسے بادشاہ گذرے ہیں جو خُدا کے حلم پر مغرور ہوگئے اور نہ سمجھے کہ خدا کی لاٹھی میں آواز نہیں ہوتی۔ خوشامدی مصاحبوں نے اُن کو رعایا کے حالات سے غافل کرکے نفس پروری میں پھنسا دیا۔ بے شک ایسے لوگ جلتی آگ کا ایندھن ہیں لے امیرالمومنین ہماری دُعا ہے کہ آپ ایسے لوگوں میں شامل نہ ہوں۔ اور آپ کا حشر اُمت کے نیک لوگوں کے ساتھ ہو۔

حضرت عمر ابن عبدالعزیز لڑکے کی فصاحت، حکمت اور جرأت سے بہت متعجب ہوئے۔ آپ نے اُس کی عُمر اور حسب نسب پوچھا تو معلوم ہُوا کہ وہ خاندانِ نبوت کا ایک گُلِ نودمیدہ ہے اور اُس نے ابھی اپنی عمر کی محض دس بہاریں دیکھی ہیں۔

"ادبی دنیا"

مطبوعات

پُرانا خواب اور دو افسانے۔ سید سجاد حیدر صاحب یلدرم کی یہ دلچسپ کتاب ایک ڈرامے اور دو افسانوں پر مشتمل ہے سید صاحب کو ترکی زبان اور ترکی ادب سے جو لگاؤ ہے یہ کتاب بھی اس کی شاہد ہے۔

پرانا خواب (ڈراما) آسیب الفت (افسانہ) مطلوب حسیناں (افسانہ) تینوں ترکی زبان کے ترجمے ہیں لیکن یہ مسلم ہے کہ سید صاحب کا ترجمہ تصنیف کا ہم پایہ ہوتا ہے اور جب ان کا قلم ترکی خیالات کو اردو قالب میں ڈھالتا ہے تو ہماری زبان میں ایک ایسا لطیف و شگفتہ انداز تحریر ایجاد کرتا ہے جو بلاشبہ فقید النظیر ہے۔ ڈراما اور افسانے یکساں نہایت دلچسپ ہیں حجم تقریباً سوا تین سو صفحات لکھائی چھپائی اور کاغذ عمدہ قیمت عہ مسلم یونیورسٹی بک ڈپو علی گڑھ سے طلب فرمائیے۔

منتخبات ہندی کلام۔ اردو ہندی کے ملاپ کی کوششوں میں غالباً یہ سب سے موثر اور بہترین طریقہ ہے کہ دونوں زبانوں کو ایک دوسری کے ادبی محاسن سے روشناس کیا جائے۔ اس کا بہترین طریقہ ترجمہ وغیرہ ہے متذکرۂ صدر کتاب ڈاکٹر جعفر حسن صاحب پی ایچ ڈی کی تالیف ہے اس میں کئی سو ہندی دوہے اور اقوال وغیرہ نہایت محنت سے جمع کئے گئے ہیں۔ ہندی سے ناواقف اصحاب کے لئے اردو ترجمہ بھی ساتھ دیا گیا ہے کتاب دیدہ زیب اور مجلد ہے قیمت ۸؍ حیدر آباد بک ڈپو۔ چادر گھاٹ حیدر آباد دکن سے طلب کیجئے

دہلی (بارھویں صدی میں) یہ دلچسپ تذکرہ سید مجتبیٰ حسین صاحب نے شائع کیا ہے اور نواب ذوالقدر درگاہ قلیخاں سالار جنگ مرحوم کی تالیف ہے دہلی آج کیسی ہے اور آج سے دو صدی قبل کیسی تھی؟ غزنوی اور غوری تہذیب جو ہندوستان میں آئی اس نے آخر کیا شکل اختیار کر لی تھی؟ اس کی صحیح ترین تاریخ دیکھنی ہو تو یہ کتاب ملاحظہ فرمائیے یہ اس عہد کی چشم دید معاشرتی و تمدنی تصویر ہے اس میں تمام دلکش تاریخی مشاہدات ادبی معلومات، حال و قال کی محفلیں، عیش و عشرت کی محفلیں، احباب کی جلوت و خلوت میں بزم آرائیاں، مشاعرے، میلے، اعراس، ہمعصر مشائخ غرضکہ ہر موضوع کے متعلق دلچسپ حالات لکھے گئے ہیں بلاک کی تو تصاویر بھی شامل کتاب ہیں کاغذ کتابت اور طباعت دیدہ زیب ہے قیمت مجلد ۸؍ غیر مجلد ہے۔ مہتمم صاحب خزینۂ یوسفیہ، ڈیوڑھی نواب مستقیم الدولہ مرحوم چھتہ بازار حیدر آباد دکن سے طلب فرمائیے۔

سید الانبیا۔ یہ کتاب کارلائل کے اُن مشہور لکچروں میں سے ایک کا ترجمہ ہے جو اس نے اکابر اور اکابر پرستی کے زیر عنوان دیئے تھے۔ کارلائل کی تصنیف پر رائے زنی کرنا تحصیل حاصل ہے۔ ترجمہ کے متعلق اتنا کہہ دینا کافی ہے۔ کہ نہایت صاف اور سلیس ہے۔ مترجم نے جگہ جگہ ضروری حواشی درج کرکے کتاب کو اور مفید بنا دیا ہے حجم ۸۰ صفحات کاغذ چھپائی وغیرہ خوب ہے۔ قیمت مجلد عہ غیر مجلد ۱۲؍ محمد اعظم خاں صاحب۔ نفیہ ولا حیدر آباد دکن سے طلب فرمائیے۔

اسلامی دنیا کیلئے ایک اور نایاب تحفہ
صحیح - خوشخط عکسی - رنگین - خوبصورت اور پاکیزہ
قرآن مجید
تینتس ۳۳ روپیہ
ھدیہ کا
صرف ایک روپیہ
ماہوار میں
آج تک ایسی خوبصورت چیز دنیا بھر میں کسی نے پیش نہیں کی
ہر گھر میں کم از کم ایک نسخہ ضرور ہونا چاہیئے
مفصل حالات اور نمونے کے صفحے آج ہی فہرست نمبر ۲۳ مفت منگوا کر ملاحظہ فرمائیں
المشتہر
پیکو آرٹ پریس بیرون موچی دروازہ - لاہور

خلیفہ ہارون رشید عباسی کے پینے کی
نبیذ
حافظہ اور دماغ کی قوت بڑھانے والی
دماغی اور جسمانی تکان دور کرنے والی
عورتوں بچوں اور ہر قسم کے کمزوروں کو مضبوط کرنے والی
نبیذ کے اجزاء
فولاد۔ فاسفورس کشتہ طلاء۔ مشک۔ عنبر۔ عرق گلاب۔ انگور۔ انار۔ بہی۔ پالک۔ لیموں
قیمت ایک بوتل دو روپیہ کلدار۔ طبی کمپنی دہلی

علم و عمل طب

طبی دنیا میں انقلاب عظیم پیدا کرنے والی کتاب

مصنفہ عالیجناب کرنل بھولا ناتھ صاحب بہادر آئی ایم ایس آئی۔ سی ایس ریٹائرڈ انسپکٹر آف ہاسپٹلز الہ آباد

اس کتاب میں سر سے پیر تک تمام امراض کے اسباب و علامات و معالجات ڈاکٹری اصول سے تحریر کئے گئے ہیں اور ضمناً بول و براز و خون و بلغم وغیرہ کے امتحان کے طریقے و نبض دیکھنے کے اصول آلہ سینہ بین۔ تھرما میٹر۔ انیما وغیرہ تمام ضروری آلات کا طریق استعمال علمی مباحث جراثیم کا مفصل بیان ہر ہر عضو کے مخصوص امراض اور متعدی امراض کا تفصیل سے بیان کیا گیا ہے۔

بڑی خوبی یہ ہے کہ اس کتاب کے مطالعہ کے بعد کسی دوسری کتاب کی ضرورت باقی نہیں رہتی۔ اس میں کلیات اور معالجات ڈاکٹری دونوں جمع کر دئے گئے ہیں اور جدید آلات سے کام لینے کے طریقے واضح طور پر بتلائے گئے ہیں ہر مرض کی پوری ماہیت اور علاج کو عمدہ پیرایہ میں لکھا گیا ہے۔ تمام ضروری مسائل پر بحث کی گئی ہے۔ افعال الاعضا بھی ہر مرض سے پہلے تفصیل کے ساتھ قلمبند کئے گئے ہیں غرض جس قدر امور تشخیص مرض و علاج کیلئے ضروری ہیں تمام کمال درج کر دئے گئے ہیں اور ہر پہلو سے کتاب کو مکمل کر دیا گیا ہے کرنل صاحب نے یہ کتاب یونانی حکیموں کے استفادے کیلئے بڑی محنت اور جانفشانی سے لکھی ہے کیونکہ یونانی حکیم عموماً انگریزی سے ناواقف اور جدید معلومات سے نابلد ہوتے ہیں سب اسسٹنٹ سرجن اور اسسٹنٹ سرجن صاحبان یونانی طب سے واقفیت حاصل کرنا اور اسکی روزافزوں مقبولیت کا راز جاننا چاہتے ہوں وہ ضرور اس کتاب کو پڑھیں ہر طبیب وید ڈاکٹر اور شائق طب کے پاس اس کتاب کا ہونا ضروری ہے کتاب کی زبان عام فہم اور ایسی دلاویز ہے کہ معمولی لیاقت رکھنے والا آدمی بھی اس سے فائدہ اٹھا سکے۔ چونکہ افادۂ عام کو مدنظر رکھکر قیمت کم کر دی گئی ہے اسلئے کتاب بہت جلد ختم ہو جائیگی سو جلد حاصل کریں ورنہ مایوسی ہوگی ضخامت ۱۲۱۶ صفحات لکھائی دیدہ زیب چھپائی نظر فریب کاغذ سفید۔ اصلی قیمت پانچروپیہ چار آنے (۵۴؍) رعایتی قیمت فی جلد تین روپے (۳؍) مجلد سنہری ۸؍ محصولڈاک ۱۱؍ بذمہ خریدار۔

رسالہ ہمایوں کا حوالہ ضرور دیں

پتہ:۔ کتب خانہ لطف زندگی موچی دروازہ لاہور

اُٹھو وگرنہ حشر نہیں ہوگا پھر کبھی
دوڑو زمانہ چال قیامت کی چل گیا
(ہمایوں)

بیادگارِ علامہ فضیلت آنریبل جسٹس میاں محمد شاہدین صاحب ہمایوں مرحوم

اُردو کا علمی و ادبی ماہوار رسالہ

ہُمایُوں

ایڈیٹر: بشیر احمد بی۔ اے (آکسن) بیرسٹر ایٹ لا
جائنٹ ایڈیٹر: حامد علی خاں، بی۔ اے

[illegible]

[illegible]

بیادگار عالی قدر آنریبل میاں محمد شاہ دین صاحب ہمایوں مرحوم

اردو کا علمی و ادبی ماہوار رسالہ

ایڈیٹر: بشیر احمد بی اے آکسن بیرسٹر ایٹ لا

جائنٹ ایڈیٹر: حامد علی خاں بی اے

جلد ۲۱ نمبر ۲

فہرستِ مضامینِ "ہمایوں"

بابت ماہِ فروری ۱۹۳۲ء

تصویر:- میاں سر محمد شفیع

میاں محمد شفیع

نیت ایسی نیک کہ زندگی ایک مسلسل مسکراہٹ!

ذکاوت، مشقت، محبت! ان کی فاتحانہ قوت کے ساتھ ہمیشہ خدمت و عزت کی چوٹیوں کی طرف ساعی!

مقتضائے حال کا کارکن — گذشتہ کو بھول کر اپنا مستقبل ہمیشہ اپنے خدا پر چھوڑے ہوئے!

فلسفے کی الجھنوں سے آزاد — بلندیوں اور گہرائیوں کو چلتی پھرتی زندگی کی سطح پر لانے والا، فکر و ندامت کا منہ اعتقاد و محنت کے شگوفوں سے بھرنے والا۔ خدائے رحمن کے لطف و کرم کا دلی معتقد — مسرور مومن!

دوستوں کا شیدائی، دشمنوں کا دوستدار — مخالفت میں مفاہمت کا آرزومند، عناد و فساد میں مصالحت کا نعرہ بلند کرنے والا صلح جُو رضاکار!

انجمنوں کی روح رواں، محفلوں کا چشم و چراغ، بیواؤں بینواؤں کا ماویٰ و ملجا — اُس کے دریائے دولت سے ایک خشک دنیا کی آبیاری۔ اُس کے بحرِ محبت پر ہزاروں دردمندوں کی زندگیاں رواں!

تمدن کا موتی، معاشرت کا چندن ہار — بچوں میں بچہ، جوانوں میں جوان، بوڑھوں میں بوڑھا سب کا ہم عمر، ہر دلعزیز ہمجولی!

خوبی و خوشنمائی کے پھولوں کا بھونرا، دائمی شباب کی ایک ہنستی کھیلتی مورت — چہرے میں دلکشی، چال میں لوچ، قد راست، قامت زیبا، جسم قوی، روح کندن سی!

دریا دل، خوش طبع، شریف دل امیر — صد ہزار آنکھوں کا تارا!

مُقرر، مُدبّر، منتظم — شفیعِ قوم و ملک!

بشیر احمد

سر محمد شفیع کی زندگی پر ایک نظر

میاں سر محمد شفیع ۱۰ مارچ ۱۸۶۹ء کو بمقام باغبانپورہ (متصل بہ لاہور) پیدا ہوئے۔ وہاں انہوں نے پہلے اپنے گاؤں کی مسجد میں پھر سکول میں اور پھر لاہور میں سنٹرل ماڈل سکول، گورنمنٹ کالج اور مشن کالج میں تعلیم پائی۔ ۱۸۸۹ء میں وہ انگلستان کو روانہ ہوئے۔ ۱۸۹۲ء میں وہ بیرسٹر بن کر وطن واپس آئے۔

پہلے انہوں نے ہوشیارپور میں وکالت شروع کی تین سال بعد ۱۸۹۵ء میں وہ لاہور چلے آئے اور کئی سال تک یہیں بیرسٹری کرتے رہے۔ ولایت سے واپس آتے ہی انہوں نے علی گڈھ کی تحریک میں شرکت کی اور برسوں تک وہ سرسیّد کے ساتھ قومی کاموں میں منہمک رہے۔ ۱۹۰۱ء میں انہوں نے مسلم لیگ کی بنیاد میں حصّہ لیا۔ ۱۹۰۷ء میں وہ پنجاب پراونشل مسلم لیگ کے جنرل سکرٹری منتخب ہوئے۔ ۱۹۰۹ء میں وہ پنجاب لیجسلیٹو کونسل کے اور ۱۹۱۲ء میں امپیریل لیجسلیٹو کونسل کے رکن نامزد کئے گئے۔ ۱۹۱۵ء میں انہوں نے کامیابی کے ساتھ امپیریل کانفرنس پر ہندوستان کی نمائندگی کے حق کا اظہار کیا اور ۱۹۳۰ء میں وہی امپیریل کانفرنس میں ہند کے نمائندے مقرر ہوئے۔ ۱۹۰۷ء سے کر وہ پنجاب کے قابل ترین بیرسٹروں میں شمار ہونے لگے اور بہت جلد سب سے مقتدر اور ممتاز بیرسٹر تسلیم کئے گئے۔ ۱۹۱۱ء اور ۱۹۱۸ء میں انہوں نے ہائی کورٹ کی ججی قبول کرنے سے انکار کیا۔ ۱۹۱۹ء میں وہ گورنمنٹ آف انڈیا میں وزیر تعلیم اور ۱۹۲۲ء میں وزیر قانون مقرر ہوئے۔ جہاں تین سال تک وہ کونسل آف سٹیٹ کے لیڈر اور وائسرائے کی کونسل کے نائب صدر بنے رہے۔ ۱۹۲۵ء میں وہ لاہور واپس آئے اور یہاں پانچ سال تک اپنی وکالت کے کام میں انہوں نے عدیم النظیر کامیابی حاصل کی۔ ۱۹۳۰ء اور ۱۹۳۱ء میں وہ گول میز کانفرنس کے رکن مقرر ہوئے اور وہاں انہوں نے انتہائی قابلیت اور خلوص کے ساتھ اپنی قوم اور اپنے ملک کی نمائندگی کا حق ادا کیا۔ دسمبر ۱۹۳۱ء میں وہ دوبارہ وائسرائے کی کونسل میں رکن تعلیم مقرر ہوئے لیکن عمر نے وفا نہ کی اور وہ ۷ جنوری ۱۹۳۲ء کو اس جہان فانی سے رحلت فرما گئے۔

مسلمانوں میں سر محمد شفیع تنہا وہ فرد تھے جو آل انڈیا ایجوکیشنل کانفرنس، آل انڈیا اردو کانفرنس اور آل انڈیا مسلم لیگ ان تینوں آل انڈیا مجمعوں کے صدر منتخب ہوئے۔ اسی طرح ہندوستانیوں میں تنہا وہی ایک مدبّر تھے جو گورنمنٹ آف انڈیا میں تین مختلف شعبوں کے ممبر اور دوبارہ وزیر تعلیم مقرر ہوئے۔ اس کے علاوہ وہ بیسیوں اور ملکی و قومی انجمنوں کے صدر اور ہزاروں اہم جلسوں جلوسوں کے سرکردہ تھے۔ اور اسی پر بس نہیں۔ طول و عرض ہند میں ایسے بہت کم شخص گذرے ہیں

جو اُن کی مانند بیک وقت بیرسٹر، مقنن، سیاست دان، مدبر، مقرر، ماہرِ تعلیم اور مُصلحِ قومی ہوں +

شبانہ روز محنت سے، انہماک و یکسوئی سے، ہمت و استقلال سے اور حیرت انگیز ایمان و امید پسندی سے اُنہوں نے وہ اقتدار و کمال حاصل کیا جو قوم و ملک کے نوجوانوں کے لئے ہمیشہ ایک مشعلِ ہدایت بنا رہے گا +

وکالت میں اُن کی محنت کا یہ حال تھا کہ رات کے دو دو بجے تک کام میں منہمک رہے اور بعض اوقات ایک سو دو درجے کے بخار میں بھی انہوں نے عدالت میں جا کر تقریریں کیں۔ موکل کے کام کو وہ اپنا کام سمجھتے۔ وکیلی تقریروں میں ان کی پرزور آواز، اُن کا جوش و انہماک، اُن کے قاطع دلائل خاص و عام میں مشہور تھے۔ پنجاب میں کسی شخص کی وکالت کبھی اس قدر وسیع و پراثر نہیں ہوئی + سیاست و تدبر میں وہ اعتدال کے حامی اور مفاہمت کے علمبردار تھے۔ اگر ایک طرف وہ انقلابی تحریکوں سے منحرف تھے تو دوسری طرف وہ اپنی قوم اور اپنے ملک کے لئے خود اختیاری حکومت اور تدریجی آزادی کے سب سے زبردست مؤید تھے۔ جیسا کہ تمام ایسے نیک اعتدال پسندوں کا حال ہوتا ہے، ایک مدت تک بعض افراد اُن سے بدظن رہے لیکن جب زمانے کا آفتاب بالآخر اُن کے نیک دل وجود پر چمکا تو اُس کے جوہر دوست دشمن دونوں پر صاف ظاہر ہو گئے + دوسری گول میز کانفرنس کی آخری نشست میں مسلمانوں کے مخصوص حقوق کی صحیح ترجمانی کرنے کے بعد انہوں نے انگلستان کی قدامت پسند حکومت پر صریح لفظوں میں یہ امر واضح کر دیا کہ مسلمان اس بات پر مصر ہیں کہ ہندوستان کو فی الفور مرکز میں ذمہ داری دی جائے یعنی دنیا کو بتا دیا کہ ہندوستان کے مسلمان دار نہیں ہیں بلکہ وہ اپنے وطن کے ایسے ہی سچے خادم ہیں جیسے ہندو یا کوئی اور گروہ +

تعلیم میں اُن کا ایک یہی کارنامہ کافی ہے کہ اپنی وزارت کے دوران میں انہوں نے ملک میں پانچ بڑی یونیورسٹیاں قائم کیں +

اصلاحِ معاشرت کے سلسلے میں شمالی ہند میں وہ پہلے مسلمان تھے جنہوں نے باوجود شدید مخالفت کے پردے کی مذموم رسم کو علانیہ ترک کیا۔ اور ایک ایسا نیا مخلوط دائرۂ معاشرت قائم کیا جس کے آداب و اطوار پر اُن کا سخت سے سخت مخالف بھی حرف گیر نہ ہو سکا +

لیکن شاید وہ بات جو اُن کے عزیز اور اُن کے احباب بلکہ اور اصحاب بھی جنہوں نے کبھی چند لمحوں کے لئے اُن سے ملاقات کی یا اُن کو محض دیکھا بھی وہ بات جو لوگ کبھی نہیں بھول سکتے اُن کی امید بھری مسکراہٹ اور اُن کی اک دنیا کا دل موہ لینے والی دریا دل محبت تھی +

اگر پوچھا جائے کہ وہ کس خاندان سے تھے تو دماغ کچھ کہے لیکن دل یہی گواہی دیگا کہ وہ خاندانِ برمک سے تھے۔ اور وہ شعر جو کسی عربی شاعر نے برامکہ پر لکھا تھا اُن پر خوب صادق آتا ہے کہ "غم اس کا نہیں کہ کوئی گھوڑا یا ہاتھی مر جائے یا بہت سا مال گم ہو جائے بلکہ غم اس کا ہے کہ ایک ایسا شخص مر جائے جس کے مرنے سے ایک عالم مر جائے"+

آج کروڑوں ہیں جو اُن کی وفات کو ایک قومی نقصان تصور کر رہے ہیں اور سینکڑوں ہزاروں ہیں جن کے لئے اُن کا انتقال ذاتی اور دلی رنج کا موجب + خسر میں والد کا عکس نظر آتا ہے۔ والد نے انتقال فرمایا تو میرے لئے خسر موجود تھے۔ آفتاب میری آنکھوں سے اوجھل ہوا تو ماہتاب جلوہ گر ہو گیا۔ **شاہِ دین شفیع** قوم میں منعکس تھے۔ آج جہاں وہ ہیں وہیں یہ بھی اُن کے ساتھ ہیں۔ ہاں میرے دل میں اک یہ آواز صاف سنائی دیتی ہے کہ ان کے جسم تہِ خاک ہوں لیکن اُن کی روحیں روز و شب ہم سب پر اپنے نور کی بارش کرتی ہیں اور سننے والوں کو ہر لحظہ ہمت و شجاعت کا سبق دے رہی ہیں"+

بشیر احمد

قطعاتِ تاریخِ رحلت میاں سر محمد شفیع رحمۃ اللہ علیہ

ببیں بسوئے فلک دِل زارا ایں چہ بارانِ ابرِ نُور است
کہ از زمیں تا بہ ماہ و خورشید سر بسر جلوہ ہائے طُور است
شفیعِ قومِ محمدی از زمیں بہ عرشِ بریں بیاید
زمیں بنالد فلک بخندد یگانہ باغبان پور است ۱۳۵۰ھ

صد حیف دوستاں! کہ محمد شفیع مُرد
واحسرتا کہ ہمرہ خود زندگی ببرد
نالند بر مزارِ منوّر بزرگ و خورد
تلخ است آہ زیست کہ شکر فروش مُرد ۱۳۵۰ھ

رُوح میں عزم، دل میں درد، آنکھ میں لُطف، رُخ پہ نُور
رہبرِ قوم سر شفیع حسرتِ باغبان پُور ۱۹۳۲ء

بشیر احمد

نوائے غم

بروفات آنریبل خان بہادر ڈاکٹر میاں سر محمد شفیع کے سی۔ ایس۔ آئی + سی۔ آئی۔ ای + ایل ایل۔ ڈی + ڈی لٹ۔ بیرسٹرایٹ لا۔ ممبر اگزیکٹو کونسل وائسرائے ہند

فسردہ ہو گئی شمعِ وطن کیوں نظر آتی ہے برہم انجمن کیوں
پیامِ یاس دیتا ہے چمن کیوں لہو روتا ہے گردونِ کہن کیوں

کوئی رہبر جہاں سے چل دیا ہے
مکیں ہے ہے مکاں سے چل دیا ہے!

پڑا ہے قوم کو سردار کا غم تجھ ایسے بے ریا غمخوار کا غم
ہوا جسموں کو جانِ زار کا غم نہ دکھلائے خدا ابرار کا غم

ہے منصب نوحہ گر کس کو ملوں میں
ترقی رنج میں ہے کیا کروں میں؟

کرے مہر و وفا اپنوں سے کون اب کرے اپنائیاں غیروں سے کون اب
رکھے ہمدردیاں خویشوں سے کون اب دعائیں لے تو بیگانوں سے کون اب؟

"غریباں را دل از بہرِ تو خون است
دلِ خویشاں نمے دانم کہ چون است"

ہوا ہی جانِ جسمِ عارضی تھی ہوا سے اِس جہاں کی زندگی تھی
یہ کب کی اِس ہوا کو دشمنی تھی ہوا تجھ کو یہ کیا ہو کر لگی تھی

رفاقت عمر بھر کی چھوڑ دی کیوں؟
عدو ہو کر ہوا تجھ کو لگی کیوں؟

بھنور میں قوم کی کشتی پھنسی ہے اندھیری رات سر پر چھا رہی ہے
نہیں منہ موڑنے کی یہ گھڑی ہے تجھے کیوں ناخدا نیند آ گئی ہے

بھنور میں ناخدائی اب کرے کون
ہزاروں کی بھلائی اب کرے کون؟

ہمیشہ نیکیاں کرتا رہا تو جہاں میں نام اپنا کر گیا تو
یہاں بھی قوم کا سردار تھا تو وہاں بھی عرش کا تارا بنا تو

سفارش تو رہا لوگوں کی کرتا
شفیعِ دو جہاں کا اُمتی تھا

بکھیرے نیکیوں کے پھول تو نے لٹائے حکمتوں کے پھول تو نے
کھلائے خوبیوں کے پھول تو نے سمیٹے رحمتوں کے پھول تو نے

وطن کا مہرِ فیض آثار تھا تو
کہ رفعت کا علمبردار تھا تو

چمن کا بوٹا بوٹا نوحہ خواں ہے زمیں ساکت پریشاں آسماں ہے
فسردہ صبحِ حیراں کا سماں ہے ہوا کیسا یہ صدمہ ناگہاں ہے

"برفت آں گلبنِ خرم بباد ے
دریغا ماند و فریاد و داد ے"

ح - ب

سر محمد شفیع

کارزارِ زیست میں اک قلعہ تھا تیرا وجود
موت نے یہ قلعۂ مضبوط بھی سر کر لیا
خیر و خوبی۔ علم و فن۔ عقل و خرد۔ الطاف و جود
یہ خزانہ خاک نے دامن میں کیونکر بھر لیا

اے یتیموں کے ولی۔ بیواؤں کے درد آشنا
ننھے بچّے اور مائیں یاد کرتی ہیں تجھے
زندگی بھر جن کی غربت کا تجھے احساس تھا
اُن غریبوں کی دعائیں یاد کرتی ہیں تجھے

دل کسی کا بھی نہیں تُو نے دُکھایا عمر بھر
اس لئے مرنے سے تیرے دُکھ گیا ہر ایک دل
لے کے تیرا نام کہتا ہے یہ ہر فردِ بشر
نیک سیرت نیک طینت نیک خصلت نیک دل

زندگی تیری نمونہ تھی زمانے کے لئے
جب تلک زندہ رہا۔ زندہ رہا عزّت کے ساتھ
اور جب راہی ہوا جنّت بسانے کے لئے
ہم سفر ہے روح تیری سرمدی راحت کے ساتھ

تھا ہمیشہ امن و صلح و آشتی تیرا چلن
تیری کوشش تھی کہ مٹ جائیں یہ سب جنگ و جدل
اب تجھے کھو کر بہت پچھتائے گی خاکِ وطن
اب بڑی مشکل سے پائے گی تیرا نعم البدل

اے تیری اولاد ہو دنیا میں شاد و بامراد!
تیری ہی رفعت کو پہنچیں تیرے اقبال و رفیع!
اے تیرا رتبہ ہو دنیا سے بھی عقبیٰ میں زیاد!
تیرا حامی ہو خدا، تیرا محمّد ہو شفیع

حفیظ

صدائے ماتم

پلٹا لیا جو چرخِ ستمگر نے ناگہاں — پھولے پھلے چمن پہ مسلط ہوئی خزاں
منہ کو کلیجے آتے ہیں آنکھیں ہیں خوں فشاں — وہ زخم چشمِ قوم کو پہنچا کہ الاماں
تا حشر جس کے درد سے راحت نہ پائینگے — ہم سینہ چاک خون کے آنسو بہائیں گے

ہیہات سر شفیع کا ہونا تھا انتقال — اس وقت جب کہ قوم ہے بے حد شکستہ حال
لایا ہے رنگ ملک میں تفریق کا سوال — ہوتے نہیں ہیں منتشر افراد ہم خیال
زوری دکھا رہی ہیں بہت خود پسندیاں — پھیلی ہوئی ہیں چاروں طرف فرقہ بندیاں

وابستہ ایک شخص سے تھی سب کی آرزو — تھا جو کہ قوم پرور و ہمدرد و نیک خو
رہتا تھا بہرِ صلح جو سرگرمِ جستجو — کرتا تھا اتحاد کی ہر وقت گفتگو
افسوس ہے وہ انجمن آرا نہیں رہا — ٹوٹے ہوئے دلوں کا سہارا نہیں رہا

دار العلوم جس نے ہر اک جا بنا دیئے — پردے جہالتوں کے دلوں سے اٹھا دیئے
اُجڑے ہوئے دیار میں گلشن کھلا دیئے — دستِ کرم سے فیض کے دریا بہا دیئے
جس پر نگاہ ڈال دی خوش حال کر دیا — بدقسمتوں کو صاحبِ اقبال کر دیا

گو اُٹھ گیا جہان سے وہ مردِ نیک نام — باقی رہے گی اُس کی مگر شہرتِ دوام
احسان اُس کا بھول نہ جائینگے خاص و عام — تا دیر ذکرِ خیر رہے گا بہ احترام
تاریخ لکھی جائے گی ہر اک زبان میں — ہاں کوئی شخص گزرا ہے ہندوستان میں

صد حیف حال قوم کا اس وقت ہے سقیم — اس سانحے نے کر دیئے لوگوں کے دل دو نیم
اور روتے دھوتے رہ گئے اسلام کے یتیم — لیکن رہا وہ ہو کے جو ہونا تھا اے فہیم
ملتی ہے کس کو موت کے ہاتھوں رہِ مفر — دامن سے اشک پونچھ کے بس تھام لے جگر

بے سود ہے یہ آہ و فغاں گریہ و بکا — وہ راہیٔ عدم کبھی واپس نہ آئے گا
رہنا نہیں کسی کو بھی اس بزم میں سدا — بس اب حضورِ قلب سے لازم ہے یہ دعا
پس ماندگاں کو صبر و تحمل عطا کرے
مرحوم سر شفیع پہ رحمت خدا کرے

فہیم بیگ چغتائی

اُردو شاعری اور مُلکی سرمایہ

شاعری میں ملکی وغیر ملکی خصوصیات کی کاوا کی ظاہر ہو جانے کے بعد ہمیں غور کرنا چاہئے کہ کیا فی الحقیقت تشبیہ اور استعارے کے لئے جو چیزیں استعمال ہوتی ہیں اُن کا مرئی، مقرون و محسوس ہونا بھی ضروری ہے؟ کیا اَن دیکھی چیزوں کی تشبیہ لطیف و موثر نہیں ہو سکتی؟ کیا قریب کی اشیاء دور کی چیزوں سے زیادہ تعجب خیز و مسرت بخش ہوتی ہیں؟ کیا مستحضرات کا بیان ماضیات کے حوالہ سے زیادہ دلپذیر و انبساط انگیز ہوتا ہے؟ جہاں تک تاریخی واقعات و روایات سے ثابت ہے۔ حال کے مقابلہ میں ماضی زیادہ حیرت انگیز و پُر لطف ہوتا ہے۔ امتدادِ زمانہ کی رنگ آمیزی گذشتہ واقعات کو نہایت شاندار بنا دیتی ہے۔ بسا اوقات قدامت کے ساتھ تقدس بھی وابستہ ہو جاتا ہے۔ اساطیر الاولین کی طرح حالیہ واقعات دلکش نہیں ہوتے۔ اخبارات میں جو واقعات درج ہوتے ہیں اُن کی دلچسپی عارضی و ہنگامی ہوتی ہے عجیب سے عجیب باتوں کا چرچا بھی دو چار روز سے زیادہ قائم نہیں رہتا۔ لیکن قدیم واقعات و روایات کے ساتھ سرمدی دلچسپیاں وابستہ ہوتی ہیں۔ ادبی روایات ملکی۔ قومی اور مذہبی بندشوں سے آزاد ہوتی ہیں۔ اور اُن کی دلکشی تاریخی تحقیق کی رہینِ منت نہیں۔ جامِ جم۔ آئینہ سکندر۔ مارِ ضحاک۔ ارژنگِ مانی کو تاریخی تحقیقات بے بنیاد قرار دیتی ہے لیکن ادب و شاعری کو اس فیصلہ کی مطلق پروا نہیں۔ شاعری میں یہ چیزیں ہمیشہ سے استعمال ہوتی آئی ہیں۔ بچپن ہی سے ہمارے کان اِن سے آشنا ہیں۔ ان کا تصوّر ہمارے ذہن میں حقیقی واقعات کے تصوّر سے کہیں زیادہ واضح و روشن ہے۔ یہ باتیں ہمارے ادب و شاعری کا جزوِ لاینفک بن گئی ہیں۔ اگر کوئی وطن پرست طبقہ اُن کے بجائے نئی ملکی اشیا کی تلمیحیں تجویز کرے تو وہ نامرغوب۔ اجنبی اور غیر مانوس ثابت ہونگی۔ اسی طرح تشبیہ و استعارہ کے لئے بھی ملکی و مقامی اشیا کی شرط بالکل غیر ضروری ہے۔ اُن کے انتخاب و استعمال کا انحصار اہلِ زبان کے مذاق و میلانِ طبعی پر ہے۔ ہندی کے کوی (شاعر) کو ہاتھی کی چال اس قدر پسند ہے کہ وہ اس سے معشوق کی رفتار کی تشبیہ دیتا ہے۔ لیکن اس بھدی اور بھونڈی چال پر اردو شاعری کی بھویں تن جاتی ہیں۔ اس کے نزدیک وہ رفتار ہی کیا جو ہنگامۂ محشر اور فتنۂ قیامت نہ برپا کر دے۔ اسی طرح مہاراج تلسی داس کو برسات کے موسم میں تالاب کے مینڈکوں کی ٹرٹر ایسی بھلی معلوم ہوتی ہے کہ وہ اسے پاٹھ شالا میں لڑکوں کی وید خوانی سے تشبیہ دیتے ہیں لیکن ایرانی شاعر کا ذوق سماعت ذرا سی بے ترتیل قرأت سے اپنی بیزاری اس طرح ظاہر کرتا ہے کہ:-

"گر تو قرآں بدیں نمط خوانی ―――― ببری رونقِ مسلمانی"

انگریزی مذاق بھورے بالوں اور نیلی آنکھوں کا گرویدہ ہے لیکن ہمارے مذاق میں وہ خوش آئند نہیں چینی طبائع کو چشم محبوب کی تشبیہ ایک گول آنکھ کی مچھلی سے دینا پسند ہے۔ مگر اردو کے شاعر اس لسانہ تشبیہ سے سخت بیزاری محسوس کریں گے۔ عرب کے لئے اونٹنی عجیب معشوقہ ہے لیکن اردو کا شاعر غزال کے بدلے اونٹنی لینا پسند نہ کرے گا۔ غرض کہ ہر قوم کا مذاق و پسند جداگانہ ہوتا ہے جس زبان کی جو خصوصیات مقرر ہو چکی ہیں اور جو ادبی روایات مدت سے رائج چلی آرہی ہیں وہی اس کی شاعری کے لئے باعثِ زینت ہیں۔ زبانوں کا باہمی رشتہ و تعلق اُن کی خصوصیات کی ہم رنگی۔ یکسانی و ہم آہنگی پر قائم ہے نہ کہ قربِ مکانی و زمانی پر۔ اردو کو فارسی سے گہرا لگاؤ ہے ویسا اس کو کسی ہندوستانی زبان سے نہیں ہے۔ بھاشا کی اکثر و بیشتر تشبیہیں۔ استعارے اور تلمیحیں اردو شاعری کے لئے بالکل اجنبی و غیر مانوس ہیں۔

یونانی و رومی صنمیات اور مسیحی روایات و مقامات تاریخی و جغرافیائی لحاظ سے اہلِ انگلستان کے لئے بالکل اجنبی و غیر ملکی ہیں۔ لیکن ادبی لحاظ سے وہ ملکی واقعات و مقامات سے زیادہ مانوس۔ مشہور اور دلچسپ ہیں۔ انہیں سے انگریزی شاعری کی زینت ہے۔ اور شاعری ہی کی بدولت انگلستان کا بچہ بچہ ان سے پوری پوری واقفیت اور دلچسپی رکھتا ہے۔ اسی طرح اردو شاعری کی بعض تشبیہیں اور تلمیحی واقعات جغرافیائی اور تاریخی لحاظ سے غیر ملکی سہی لیکن بچپن سے انہیں سنتے سنتے ہمارے کان اُن سے اس قدر آشنا ہو گئے ہیں اور اُن کی ایسی واضح و روشن تصویریں ہماری لوحِ ذہن پر مرتسم ہو گئی ہیں کہ اُن میں اور مرئی و محسوس اشیا میں مطلق فرق باقی نہیں رہا ہے۔ اگر کسی نے سنبل و ریحان۔ جیحون و سیحون۔ بحرِ ظلمات۔ آئینۂ سکندر۔ ہما و عنقا اور کوہ قاف کی پریوں کو اپنی جسمانی آنکھ سے نہیں دیکھا ہے تو کیا مضائقہ؟ اپولو۔ منروا۔ اڈونس۔ پروسپرین۔ آرگس۔ پیکس۔ ہڈرا۔ ہارپیز۔ لیتھ (دریائے فراموشی) وغیرہ کو یا کلپ برکش (نخلِ مراد) اندراسن۔ اپسرا۔ گج مکتا پھل۔ سومیرو پربت۔ مدرنچھن۔ سمدر پرشن۔ وغیرہ کو کس نے دیکھا ہے؟ لیکن شاعروں نے ان تمام چیزوں کی نہایت صاف اور روشن تصویریں ہماری چشمِ تخیل کے آگے پیش کی ہیں۔ دنیا کے دو جلیل القدر شاعر ہومر اور رودکی نابینا تھے۔ ملٹن بھی اخیر عمر میں بصارت سے محروم ہو گیا تھا۔ اگر انہوں نے تشبیہ و استعارہ کی چیزوں کو جسمانی و ظاہری آنکھوں سے نہ دیکھا تو کیا ہرج ہوا۔ اُن کی باطنی آنکھوں نے عالمِ کائنات کے ایسے ایسے پراسرار منظر دیکھے جن کے مشاہدے کی بڑے بڑے دیدہ وروں اور صاحب نظروں کو بھی حسرت ہی رہ گئی۔ بات یہ ہے کہ شاعری کی تخئیلی و مثالی دنیا عالمِ آب و گل سے زیادہ دلکش ہوتی ہے تشبیہ و استعارہ اور تلمیح کے لئے لطافت و شگفتگی۔ مانوسیت اور واقفیت شرط ہے۔ دیکھی یا ان دیکھی اور ملکی یا غیر ملکی چیزیں کوئی اہمیت نہیں رکھتیں۔

بسا اوقات ان دیکھی چیزیں بہت زیادہ مرغوب و دل پسند ہوتی ہیں جب تک ہم اُن سے صورت آشنا نہیں ہوتے

ہمارے ذہن میں اُن کا نہایت وفیع وشاندار تصور قائم رہتا ہے لیکن اُنہیں دیکھ لینے پر اگر ہم اُن کو جیسا سمجھتے تھے ویسا نہیں پاتے تو ہمیں ایک گونہ مایوسی ہوتی ہے۔ نرگس کو چشم جاناں سے تشبیہہ دی جاتی ہے جنہوں نے نرگس نہیں دیکھی ہے وہ نہ معلوم اُسے کتنا خوبصورت۔ رسیلا۔ مستانہ مخمور۔ نورانی اور دلفریب تصور کرتے ہونگے لیکن نرگس کو جسمانی آنکھوں سے دیکھ لینے پر پہلا سا لطف باقی نہیں رہتا۔ لہذا یہ کتنا سراسر غلط ہے کہ "جن چیزوں کو کبھی دیکھا ہی نہیں۔ ان کی مختلف حالتوں اور کیفیتوں کو سمجھنا اور اُن سے لطف اٹھانا ممکن نہیں"۔ شاعری سے لطف اندوز ہونے کے لئے کسی چیز کی مختلف کیفیتوں اور حالتوں کو سمجھنے کی کیا ضرورت ہے؟ یہ کام تو حکمت اور سائنس کا ہے۔ شاعر کو ان تمام باتوں سے کوئی غرض نہیں کہ نرگس کا پودا کتنا بلند ہوتا ہے۔ اس کی عمر کیا ہوتی ہے؟ وہ کس جنس سے تعلق رکھتا ہے؟ اس جنس کے اور کون کون سے انواع ہیں۔ اس کا پھول کب تک تروتازہ رہتا ہے؟ اس کی نشو ونما کے لئے کس قسم کی زمین اور کتنی رطوبت درکار ہے؟ اس میں کتنے برگ ہوتے ہیں؟ اس کے خول اور ریزے کیسے ہوتے ہیں؟ اس کے حقہ۔ سر بقچہ اور زر برکہاں واقع ہیں؟ اس قسم کی تفصیلی معلومات کی ضرورت صرف علم نباتات کے طالب علموں کو ہوگی۔ شاعری سے لطف گیر ہونے کے لئے صرف یہ جان لینا کافی ہے کہ نرگس ایک خوشنما پھول ہے جو آنکھ کے مشابہ ہوتا ہے۔ اسی طرح سکندر کے سوانح حیات۔ اس کی تمام فتوحات۔ اس کے فوجی انتظامات وملکی اصلاحات اس کی کشورکشائیوں اور ملک گیریوں کے واقعات سے شاعر کو کوئی سروکار نہیں۔ البتہ مورخ کو ان باتوں کے جاننے اور تحقیق کرنے کی ضرورت ہے لیکن شاعر تو صرف یہ جانتا ہے کہ سکندر ہفت اقلیم کا بادشاہ تھا خضر کی رہبری میں آبحیات کی تلاش کو نکلا اور بحر ظلمات تک پہنچ کر ناکام ونامراد واپس ہوا۔ سب سے پہلے اسی نے لوہے کو جلا دے کر آئینہ تیار کیا۔ اور دنیا کو یاجوج ماجوج کی غارت گری اور ہلاکت باری سے بچانے کے لئے سدِّ سکندری تعمیر کرائی۔ بھلا ان فرضی باتوں کو تاریخ سے کیا تعلق؟ الغرض شاعری سے مسرت اندوز ہونے کے لئے کسی شے کو دیکھنے اور اُس سے متعلق علمی تحقیق وتفتیش کی مطلق ضرورت نہیں۔ شاعری کسی چیز کے جس پہلو کو پیش کرتی ہے فقط اسی کا چشم تخیل سے مطالعہ کافی ہے۔ شمشاد کو اگر کسی ہندوستانی طالب علم نے نہ دیکھا ہو تو مضائقہ نہیں۔ شاعری نے بچپن ہی سے ہمیں اس سے روشناس کرا دیا ہے۔ ذہن نے اس کا جو تصور قائم کرلیا ہے وہ لطف اندوزی کے لئے کافی ہے۔ علاوہ بریں تخیلی شمشاد قد یار سے جو مناسبت رکھتا ہے وہ غالباً حقیقی شمشاد نہیں رکھتا۔ شمشاد کو دیکھ لینے پر اغلب ہے کہ ہماری دلچسپی میں قدرے کمی واقع ہو جائے۔

ایک قابل ذکر امر یہ ہے کہ تشبیہ واستعارہ کے سامان غیر ملکی ہی کیوں نہ ہوں لیکن اُن کی کثرتِ استعمال نے انہیں مشبہ ومستعار کا ہم معنی بنا دیا ہے۔ مثلاً نرگس کے معنی صرف ایک پھول ہی کے نہیں ہیں جس سے آنکھ کی تشبیہ دی جاتی ہے بلکہ خود لفظ نرگس کے اصطلاحی معنی چشم یار کے ہوگئے ہیں۔ نرگس کا لفظ سنتے ہی ہمارا ذہن چشم محبوب کی جانب منتقل ہو جاتا ہے شمشاد کا لفظ کان میں پڑتے ہی قامت یار کی تصویر آنکھوں کے سامنے پھرنے لگتی ہے۔ اسی طرح تیر اور نظر۔ کمان اور ابرو۔ آتش

اور رخسار، سرو اور قامت - عارض اور گل میں صرف مشبہ اور مشبہ بہ کا تعلق نہیں ہے بلکہ وہ ایک دوسرے کے مترادف الفاظ کی طرح استعمال ہونے لگے ہیں - وہ ادب و شاعری کا جزو بدن اور فرہنگ مترادفات کا سرمایہ بن چکے ہیں - ان کا اخراج در اصل الفاظ و معنی کا اخراج بلکہ اعضا و جوارح کی قطع و برید کے مماثل ہے اردو شاعری سے انہیں خارج کرکے اُن کے بدلے دیسی یا ملکی تشبیہیں اور استعارے اختیار کرنا ٹھیک ویسا ہی ہوگا جیسے کوئی وطن پرستی کے جنون میں اپنے پاؤں کٹوا کر کاٹھ کے پاؤں یا اپنی آنکھیں نکلوا کر پتھر کی آنکھیں لگائے اور لوگوں سے فخریہ کہتا پھرے کہ میرے پاؤں دیسی بڑھئی کے اور میری آنکھیں ملکی چشم ساز کی بنی ہوئی ہیں -

ہمارے قدما تمام گروں سے اچھی طرح واقف تھے - ان میں ہندو بھی تھے اور مسلمان بھی لیکن وہ فرقہ دار جھگڑوں اور مذہبی تنگ نظریوں کا زمانہ نہ تھا - سب مل کر شیر و شکر کی طرح رہتے تھے - اردو کو اپنی مشترکہ زبان سمجھتے تھے - شاہد سخن پر دونوں یکساں طور پر فریفتہ تھے - اردو شاعری پر دونوں کی سرپرستانہ نگاہ تھی - وہ اس کی تمام خصوصیات اور فطرت و طبیعت سے واقف تھے - وہ اسے تمام ملکی و سیاسی ہنگامہ آرائیوں اور مقامی و جغرافیائی حدود بندیوں سے بالاتر خیال کرتے تھے - شاہد اردو کو انہوں نے وہی لباس پہنایا جو اس کے لئے موزوں تھا - اسے انہیں زیوروں سے مزین کیا جن کا بار اُس کی نزاکت برداشت کرسکتی تھی - اُسے وہی غذا دی جو اس کے مرغوب خاطر تھی اور اس کو اسی راستہ پر چلایا جو صاف ستھرا تھا - ہندو شعرا بھی وضع کے بڑے پابند تھے - وہ بھی اپنی تصنیفات کی ابتدا حمد و نعت اور منقبت سے کرتے تھے - زبان کے جو اصول - صرف و نحو کے جو قاعدے - الفاظ و محاورات کے جو نمونے - فصاحت و بلاغت کے جو معیار - تشبیہات و تلمیحات کے جو ضابطے مقرر تھے ان کی وہ سختی سے پابندی کرتے تھے - ادب و شاعری میں ملکی و غیر ملکی سرمایہ کا انتزاعی مسئلہ کبھی ان کے خواب و خیال میں بھی نہیں گذرا ہوگا - وہ اتحاد و اتفاق کا زمانہ تھا - خیر و برکت کا دور تھا - ملک میں شیر و شہد کی ندیاں بہتی تھیں - زمین نمونۂ بہشت بنی ہوئی تھی - ہندوستان بجا طور پر جنت نشان کہلاتا تھا - اب آنکھیں اُس دن کے لئے ترستی ہیں - نگاہیں اُن مقدس ہستیوں کو ڈھونڈتی ہیں لیکن مایوس ہوکر خانۂ چشم میں پلٹ آتی ہیں - آج وہی خوش نصیب ملک تمام بلاؤں کا نزول گاہ بنا ہوا ہے - ہر جگہ نفاق اور پھوٹ کا خوفناک منظر دکھائی دیتا ہے کہیں سیاسی جماعت بندیاں ہیں کہیں معاشری انجمن آرائیاں - کہیں مذہبی تفرقہ اندازیاں ہیں کہیں قومی ہنگامہ آرائیاں - کہیں انفرادی فتنہ خیزیاں ہیں - کہیں سماجی شر انگیزیاں - ایک ادب و شاعری کا میدان بچا ہوا تھا وہاں بھی اب لسانی فرقہ بندیاں شروع ہوگئی ہیں اور کئی حریفانہ اکھاڑے قائم ہوچکے ہیں - بیچاری اردو کی جان ہر طرف سے دشمنوں کے نرغے میں ہے - کوئی اس کو اس کے مادری ترکہ سے محروم کردینا چاہتا ہے - کوئی اسے ہندی لباس میں جلوہ گر ہونے کی صلاح دیتا ہے - کوئی اس کے اعضا و جوارح کی قطع و برید کی فکر میں ہے - کوئی اسے بھاشا کے آگے دست سوال دراز کرنے کی رائے دیتا ہے - لیکن ابھی تک اس کی غیرت و خودداری نے اس کو بھاشا کی گدایانہ خوشہ چینی سے اور اُس کی ہمت و پامردی

نے اسے ہندی کے آگے سپرانگن ہونے سے باز رکھا ہے۔

کچھ اُردو ہی پر موقوف نہیں بلکہ دنیا کی کوئی مہذب زبان کسی مصلحت کی بنا پر اپنی لسانی خصوصیات اور قدیم روایات سے دستبردار ہوکر اپنی مستقل ہیئت و صورت بگاڑنا گوارا نہیں کرسکتی۔ اگر انگریزی شعرا کو کوئی شخص یہ صلاح دے کہ وہ انگریزی ادبیات سے تمام صنمیاتی واقعات کو خارج کردیں کیونکہ ان کا تعلق قدیم یونان اور روما سے ہے یا کل مسیحی روایات ومقامات کو ترک کردیں کیونکہ وہ فلسطین اور شام کے ملکوں سے وابستہ ہیں تو کیا انگلستان کے شاعر اس مشورہ کو قبول کریں گے؟ ہرگز نہیں۔ بلکہ وہ جواب دیں گے کہ یہی غیر ملکی عناصر تو انگریزی ادب و شاعری کا سنگِ بنیاد ہیں۔ ان کو ہٹاتے ہی ساری ادبی عمارت آن کی آن میں منہدم و مسمار ہوجائے گی۔ یہ عناصر غیر ملکی سہی لیکن اب وہ انگریزی شاعری کے اب خمیر میں داخل ہوچکے ہیں۔ ان سے کسی قسم کی غیریت و اجنبیت باقی نہیں رہی۔ انگلستان کے بچّہ بچّہ کو اُن سے یگانگت اور مانوسیت ہوگئی ہے۔ وہ اب انگریزی ادب کا ذاتی سرمایہ ہیں۔ آج ہندوستان میں انگریزی زبان کا دور دورہ ہے۔ جو شخص انگریزی نہیں جانتا اُس کو مہذب سوسائٹی میں کوئی وقیع جگہ نہیں ملتی۔ ملک کے مختلف حصوں میں بیسیوں یونیورسٹیاں قائم ہیں۔ اگرچہ عام طور پر وہ محض "منشی گر" مشین سمجھی جاتی ہیں تاہم اُن میں سے بعض ایسے دل و دماغ والے انسان بھی نکلے ہیں جو انگریزی زبان میں شعر گوئی کی اہلیت رکھتے ہیں۔ اگر کوئی سرمایۂ ملکی کا حامی انگریزی شاعری کی لسانی خصوصیات اور مقررہ اصول سے منحرف ہوکر معشوقۂ مغرب کے سنہری بالوں کو کتر ڈالے اور اُس کے سر پر کالے ناگ لہرانے دے۔ اس کے سیمیں بدن کو سیاہ رنگ کر شیام برن یا میگھ برن بنا دے اور اُس کی چشم نیلگوں کو کاجل لگا کر بھنورے جیسا کالا کردے۔ اور اظہار شوخی کے لئے اس کی چتون میں مولے کی اچپلاہٹ بھی بھر دے تو کوئی انگریز عاشق خواہ وہ کتنا ہی دل پھینک کیوں نہ واقع ہوا ہو ایسی بھیانک محبوبہ کی طرف شاید نظر اٹھا کر بھی نہیں دیکھے گا بلکہ عجب نہیں کہ اسے دیونی یا بھتنی سمجھ کر دور بھاگے۔ اسی طرح اگر آپ کے اردو کے شاعر کے سامنے ایک ایسا ملکی محبوب پیش کریں جو چنچل ہرنی ہو۔ ہتھنی کی چال چلتا ہو جس کی آنکھیں آم کی پھانک اور ناک طوطے کی چونچ جیسی ہو اور گردن صراحی دار ہو تو وہ شاید ہی ایسے معشوق کے لئے آغوش محبت وا کرے۔ اب اسی اردو شاعر کو ایک ایسا معشوق دکھا دیجئے جو برقِ تبسم۔ تیر نظر۔ کمان ابرو۔ دشنۂ ناز اور خنجرِ غمزہ سے مسلح ہو جس کی ہر ادا محشر در آغوش ہو جس کی رفتار قدم قدم پر قیامت برپا کرتی ہو۔ ممکن ہے کہ ہندی کا کوی اور انگریزی کا شاعر اس سپاہی منش محبوب سے خوفزدہ ہوکر بھاگ کھڑا ہو لیکن اردو کا شاعر ان تمام ستم نمائیوں اور ظلم آرائیوں کے باوجود اس کی طرف نہایت گرمجوشی کے ساتھ بڑھتا ہے۔ دستِ تمنا دراز کرتا ہے اور وفورِ شوق سے کہتا ہے ؎

قہر ہو یا بلا ہو جو کچھ ہو ۔۔۔ کاشکے تم میرے لئے ہوتے (غالب)

صاف ظاہر ہے کہ ہر زبان کی شاعری کو اپنی ہی خصوصیات پسند ہیں خواہ وہ اوروں کی نگاہ میں کھلی معلوم ہوں یا

بُری - وہ اپنے حدود میں اغیار کی مداخلت گوارا نہیں کرسکتی - کہا جاتا ہے کہ اُردو شاعری کی سرحد سے بھاشا کے ڈانڈے ملے ہوئے ہیں لیکن اردو شاعری کی غیور طبیعت ایسی رواداری کی سخت مخالف ہے جس سے اس کے ہمسایہ کو اس کے چمنستان میں آزادی کے ساتھ گلگشت کرنے اور اس کے بعض تختوں اور روشوں میں اپنے پودے لگانے کا موقع ملے جس سے اُس کے فطری حسن و لطافت میں فرق آجائے - تاہم "ہماری شاعری" کے مولف صاحب سیاسی و معاشری معاملات کی طرح ادبی معاملات میں بھی مصلحت آمیز دلی کا اظہار اس طرح فرماتے ہیں کہ "میرے نزدیک یہ نہایت ضروری ہے کہ اردو ادب کی محفل آرائش میں خالص دیسی چیزیں بھی استعمال کی جائیں - ہندوستانی رسموں - ہندوستانی روائتوں - ہندوستانی حکایتوں سے بھی کام لیا جائے - رستم و سہراب کی صف میں بھیم وارجن کو بھی جگہ دی جائے - شیریں و فرہاد اور لیلیٰ و مجنوں کے پہلو میں نل اور دمن - دشینت اور شکنتلا بھی بٹھائے جائیں - بلبل کے نغموں اور قمری کے نالوں کے ساتھ کوئل کی کوک اور پپیہے کی ہوک بھی سنائی جائے - کوہِ طور اور کوہِ قاف کے ساتھ ہمالیہ پہاڑ اور سمیرو پربت کی بھی سیر کی جائے - سرو و شمشاد کے ساتھ کلپ برکش اور اکشے بٹ کی بھی ہوا کھائی جائے گل و یاسمن کے ساتھ کنول اور کوکابیلی کی بہار بھی دیکھی جائے - جہاں چمن میں آتشِ گل سے شعلے اٹھاتے ہیں - وہاں جنگل میں ٹیسو ڈھاک کے پھولوں سے بھی آگ لگائیں - جہاں دیدہ دلبر نرگس سے نگاہ بازیاں کرتے ہیں وہاں شرمیلی لاجونتی کی ادائیں بھی دیکھیں"۔ لیکن ادب و شاعری کی محفل کوئی تنقیدی مجلس یا تشریعی ایوان نہیں ہے جہاں ہر فرقہ اور ہر جماعت کے نمائندوں کے لئے آبادی کے تناسب سے نشستیں محفوظ کرنے کی ضرورت ہو اگر بزمِ ادب کوئی سیاسی مجلس ہوتی تو البتہ رستم و سہراب کی صف میں بھیم وارجن کو جگہ دی جاتی اور شیریں و فرہاد اور لیلیٰ و مجنوں کے پہلو میں نل و دمن اور دشینت و شکنتلا بھی بٹھائے جاتے - اقلیمِ سخن میں ہمیشہ حریت و آزادی کا پرچم لہراتا رہتا ہے قلمروِ سخن اپنے آزادانہ قواعد و ضوابط رکھتی ہے - کسی قوم کی سلطنت تباہ ہوسکتی ہے - اُس کی حکومت مٹ سکتی ہے - اُس کے کندھے پر غیر ملکی جوا رکھا جاسکتا ہے - وہ کسی فاتح قوم کی حلقہ بگوشی پر مجبور ہوسکتی ہے - لیکن اس کے ادب و شاعری کی اقلیم اغیار کی مداخلت سے بری رہتی ہے قلمرو سخن کی آزادی سلب نہیں ہوسکتی - اس اقلیم میں کوئی شے راہ نہیں پاسکتی جب تک وہ اس کے معیار مقررہ پر پوری نہ اترے - وہاں انہی چیزوں کی درآمد ہوسکتی ہے جن کا داخلہ اس کے مخصوص آئین و قانون کی رو سے ممنوع نہ ہو - اس کے حدود میں وہی اجانب داخل ہو سکتے ہیں جن کو تاجدارانِ سخن نے پروانہ راہ داری عطا کیا ہو -

"ہماری شاعری" کے فاضل مؤلف اردو ادب کی محفل میں خالص ہندی عناصر کو جگہ دینے کی پرزور سفارش کرتے ہیں لیکن ادب کی محفل بہت وسیع ہے - اس میں نظم، نثر، تاریخ، افسانہ، تمثیل، شاعری سب کچھ شامل ہے - بحیثیتِ مجموعی اردو ادب میں ہندی قصص، ہندی روایتوں، ہندی رسم و رواج، ہندی پیداوار، ہندی ابطال، ہندی تقاریب، ہندی مناظر و مرایا، وغیرہ ضرورت سے زیادہ جگہ پاچکے ہیں - ابتدا ہی سے محفل ادب کی آرائش کے لئے ہندوستانی ساز و سامان

بھی استعمال ہوتے آئے ہیں۔ شاعری میں بھی جہاں تک سماں بندی۔ وصف نگاری اور واقعہ گوئی وغیرہ کا تعلق ہے ہندی عناصر کی کمی نہیں۔ خارجی شاعری نے بڑی کشادہ پیشانی کے ساتھ ہندی چیزوں سے اپنی محفل کو آراستہ کیا ہے۔ شاعری کے دو اہم اجزا مادہ اور صورت یا مضمون اور اسلوب ہیں۔ مادہ و مضمون کے لحاظ سے ہندی قصوں۔ روایتوں جانوروں، پرندوں، دریاؤں، پہاڑوں، موسموں اور نباتاتی پیداواروں کو اردو شاعری میں کافی جگہ مل چکی ہے۔ رامائن اور مہابھارت کے منثور و منظوم ترجمے ہو چکے ہیں۔ نل اور دمن۔ دشینت اور شکنتلا۔ وکرم اروسی کے علاوہ اور بہت سے قصّے بھی بیان کئے گئے ہیں۔ کوئل۔ پپیہا۔ گنگا۔ جمنا۔ ہمالیہ۔ بندھیاچل وغیرہ پر نظمیں لکھی جا چکی ہیں۔ صبح بنارس، شام اودھ۔ برسات، بسنت، ہولی، دیوالی کی دلکش تصویریں کھینچی جا چکی ہیں۔ اب زیادہ حرص بڑھانا بے کار ہے کیونکہ ہر شے کی زیادتی بیزار کن ہوتی ہے۔

اب ہمیں داخلی شاعری پر غور کرنا چاہئے۔ فی الحقیقت داخلی شاعری ہی اصل شاعری ہے جس میں امورِ ذہنیہ، وارداتِ قلبیہ، احساساتِ لطیفہ، جذباتِ عالیہ اور خیالاتِ پاکیزہ کی ترجمانی ہوتی ہے۔ اکثر نقادانِ فن تو خارجی شاعری کو محض نظم نگاری کے مترادف خیال کرتے ہیں جو گرمی، تڑپ اور تاثیر سے معرا ہوتی ہے۔ داخلی شاعری کی مشہور و اہم صنف غزل ہے۔ اردو شاعری میں غزل ہی کا سرمایہ سب سے زیادہ ہے اور آج بھی اسی صنف پر بکثرت طبع آزمائیاں کی جاتی ہیں۔ یہی صنفِ سخن یعنی غزل اصل شعریت کی حامل ہے۔ غزل میں ہندی عناصر کے جگہ پانے کا بہت کم موقع ہے اس کی محفل کی زینت ہندی ساز و سامان سے بجائے بڑھنے کے اور گھٹ جائے گی۔ یہاں فارسی الفاظ کی شیرینی و شگفتگی اور فارسی کی دلآویز و لطیف ترکیبوں کے بغیر کام ہی نہیں چل سکتا۔ غزل کی لطافت و نزاکت۔ دشینت، کلپ برکش، اکشے بٹ، کوتابیلی، ڈھاک وغیرہ کی کرختگی۔ ثقالت اور غرابت کو برداشت نہیں کر سکتی۔ ان میں سب سے سہل التلفظ غالباً ڈھاک کا لفظ ہے تاہم اُس کی ثقالت کا یہ حال ہے کہ اگر اسے کسی شعر میں باندھنے کی کوشش کی جائے تو معلوم ہوگا کہ بم کا گولہ رکھا ہوا ہے جس کے دھماکے کے ڈر سے شاید ہی دوسرے نازک طبع الفاظ اس کے پہلو میں بیٹھنا پسند کریں۔ جب غزل میں خود فارسی و عربی کے غیر مطبوع و دقیق الفاظ کو جگہ نہیں ملتی تو اس میں ہندی کے ثقیل و اجنبی الفاظ کی گنجائش کہاں؟ غزل کا ہر شعر ایک مکمل واقعہ۔ جذبہ یا خیال کی تصویر ہوتا ہے۔ وسیع سے وسیع اور نازک سے نازک خیال کو صرف دو مصرعوں میں ادا کرنا آسان کام نہیں ہے۔ اسی لئے غزل کا اختصار دراصل اعجاز کہلاتا ہے۔ فارسی اضافت فارسی حروفِ عطف اور فارسی نازک و لطیف ترکیبوں کے ذریعہ سے شاعر کو اختصار پیدا کرنے میں بڑی سہولت واقع ہوتی ہے۔ مثلاً

لٹا دے دولتِ کونین اور میرے لئے ۔۔۔ بس اک تبسّمِ عاجز نواز رہنے دے

یہاں "تبسّمِ عاجز نواز" کی دلآویز و لطیف ترکیب نے شعر میں جان ڈال دی ہے۔ اس اعجاز نما اختصار کی نظیر ہندی

میں کہاں مل سکتی ہے۔ ہندی الفاظ کے ذریعہ اگر ہم "تبسم عاجز نواز" کا مفہوم ادا کرنا چاہیں تو اس کے لئے کئی جملے درکار ہونگے۔ پھر بھی وہ کیف، وہ دل کشی، وہ اثر پیدا نہ ہوگا جو اس لطیف فارسی ترکیب کا منت پذیر ہے۔ فارسی کی خوشنما ترکیبیں آواز میں شیرینی اور ترنم پیدا کرنے کے علاوہ ایک ادنیٰ خیال کو نہایت رفیع الشان بنادیتی ہیں۔ برعکس اس کے ہندی کے الفاظ اعلیٰ اور بلند خیال کو پست سطح پر کھینچ لاتے ہیں۔ ہندی الفاظ کے ساتھ خواہ مخواہ کا، کی، کے اور ایسا جیسا وغیرہ کا اضافہ کرنا پڑتا ہے۔ جس سے کلام میں طوالت اور اُس کی روانی میں رکاوٹ پیدا ہوتی ہے۔ مثلاً "سرو قامت"، کیسا مختصر، خوشنما، اور دلپذیر ترکیب ہے۔ اب اگر سرو کے بجائے اکشے بٹ کی تشبیہ لائی جائے تو کہنا پڑے گا "اکشے بٹ جیسا قامت" کیا اس تشبیہ سے کلام کی نزاکت، صفائی، اختصار اور اثر خاک میں نہیں مل جائے گا؟ اسی پر سے اور ہندی تشبیہوں کا اندازہ کرلیا جائے۔

علاوہ بریں فارسی ذرائع سے حاصل شدہ تشبیہات و تلمیحات کے جو ہندی بدل یا مترادفات یا مساوات تجویز کئے گئے ہیں وہ صوتی، ترنمی، صوری، معنوی ہر اعتبار سے کمتر درجہ کے ہیں۔ اس لئے شیریں فرہاد اور لیلیٰ ومجنوں کے پہلو بہ پہلو نل ودمن اور دشینت وشکنتلا ہرگز نہیں بٹھائے جاسکتے۔ اگر سوانح حیات یا ڈراما یا قصہ لکھنا ہو تو یہ چاروں جوڑے مساویانہ حیثیت کے ہیں لیکن داخلی شاعری اور خصوصاً غزلیات کو اُن کے واقعاتِ زندگی یا عاشقی ومعشوقی کے قصے سے کوئی سروکار نہیں۔ غزل میں بسا اوقات لیلیٰ ومجنوں یا شیریں وفرہاد سے مخصوص شخصیتیں مراد نہیں ہوتیں۔ بلکہ کثرتِ استعمال سے وہ مجرد عشق و عاشقی کا مجسمہ بن گئے ہیں۔ ان کے ذریعہ سے مجازی وحقیقی عشق کی لاتعد نیرنگ کاریوں، محبوبیت کے ہزاروں غمزوں اور کرشموں، عاشقی کی لاکھوں دردمندیوں اور نیاز آگینیوں کا اظہار کیا جاتا ہے۔ لیکن نل ودمن یا دشینت وشکنتلا کے واقعات مخصوص معین۔ محدود اور مقرر ہیں جو عشق وعاشقی کی تمام حالتوں اور کیفیتوں پر حاوی نہیں ہوسکتے۔ اردو شاعری اور ہندی شاعری کے تصورِ عشق میں قطبین کا فرق پایا جاتا ہے۔ اردو شاعری میں عشق ومحبت کا اظہار مرد کی جانب سے ہوتا ہے۔ عاشق اپنے محبوب کی خاطر ہزاروں سختیاں اور مصیبتیں جھیلتا ہے لیکن اُف نہیں کرتا بلکہ درد وتکلیف ہی میں لذت محسوس کرتا ہے۔ لیکن تمام ممالکِ متمدنہ کی شاعری کے خلاف ہندی شاعری میں جذبات عشق کا اظہار صنفِ نازک کی طرف سے ہوتا ہے حالانکہ یہ طریقہ اس کی فطرت وطبیعت کے منافی ہے۔ بھاشا کی شاعری میں مرد کرمئے مردافگنِ عشق" کا حریف بننے کی جرأت نہیں ہوتی۔ وہ بالعموم سخت تغافل شعار۔ آرام طلب اور بےحس نظر آتا ہے۔ لیکن عورت اپنی فطری کمزوریوں اور نزاکتوں کے باوجود طرح طرح کے مصائب برداشت کرتی ہے۔ تڑپتی ہے۔ لوٹتی ہے۔ جوگن کا بھیس بدلتی ہے۔ بن بن ماری پھرتی ہے۔ اپنے نالہ و شیون سے دنیا سر پر اٹھالیتی ہے۔ عشق ومحبت کے اظہار کا یہ طریقہ غیر فطری ہے۔ صانعِ مطلق نے عورت کو مرد سے کہیں زیادہ شرم وحیا کا مادہ عطا کیا ہے۔ اس کی غیرت نسائی اس کو اپنے جذباتِ عشق کا ڈھنڈورا پیٹنے اور بیتابی

دبیقراری ظاہر کرنے کی ہرگز اجازت نہیں دیتی۔ بعض جدت پسند طبائع اردو شعرا کو بھاشا کی شاعری سے استفادہ کرنے کا مشورہ دیتے ہیں۔ لیکن کیا عشق و محبت کے غیر فطری طریقۂ اظہار کی پیروی اردو شاعری کو کچھ فائدہ پہنچا سکتی ہے؟ بھاشا کی عشقیہ شاعری کبھی الہامی نہیں ہو سکتی کیونکہ اس میں شاعر کے دل کی سچی پکار نہیں پائی جاتی۔ الہامی کیفیت طاری ہونے پر جو شعر کہے جاتے ہیں وہ دوسرے وقت کے اشعار سے کہیں زیادہ پرکیف و پراثر ہوتے ہیں۔ الہامی کیفیت طاری ہونے سے مراد یہ ہے کہ شاعر پر ایک گونہ بے خودی کی حالت چھائی ہو اور وہ اپنے ماحول کو بھول کر جس زمانہ جس مقام جس منظر کی تصویر پیش کرتا ہو وہیں منتقل ہو جائے۔ غالباً یہ بتانے کی ضرورت نہیں کہ یہ انتقال جسمانی نہیں بلکہ ذہنی ہوتا ہے۔ اگر وہ کسی دوسرے شخص کے جذبات و احساسات کی ترجمانی کرنا چاہتا ہے تو اس وقت تک اس کے اشعار سچے اور صحیح جذبات کے حامل نہیں بن سکتے جب تک وہ خود کو اس کی شخصیت میں محو نہ کردے اور اپنے دل و دماغ پر اُس شخص کی تمام کیفیتیں نہ طاری کرلے۔ مثلاً اگر کوئی شاعر میدان جنگ میں کسی جنرل کے جذبات کی ترجمانی کرنا چاہے تو وہ اپنا ماحول بھول کر خود کو میدانِ حرب میں منتقل کر سکتا ہے۔ تمام جنگی نقشے اُس کے پیش نظر ہو سکتے ہیں اور وہ تھوڑی دیر کے لئے خود کو جنرل کی شخصیت میں تحویل کر سکتا ہے۔ اور اپنے دل و دماغ پر وہ تمام کیفیتیں طاری کر سکتا ہے جو اس موقعہ پر ایک جنرل کے دل و دماغ میں ہوتی ہیں۔ ایسی حالت میں وہ جو اشعار کہے گا اُن میں جنرل کے جذبات و احساسات کی صحیح اور سچی ترجمانی ہوگی۔ عورت اور مرد کے خوشی، غم، نفرت، رغبت، حسد وغیرہ کے جذبات قریب قریب یکساں ہوتے ہیں اس لئے عورت کے کسی جذبہ کی تصویرکشی کے وقت شاعر مرد کی حیثیت سے اپنے اوپر وہ تمام حالتیں اور کیفیتیں طاری کر سکتا ہے جن میں عورت گھری ہوتی ہو۔ اور خود کو عورت فرض کئے بغیر بھی وہ مختلف نسائی جذبات کی صحیح ترجمانی کرنے میں کامیاب ہو سکتا ہے۔ لیکن مرد اور عورت کے عشقیہ جذبات میں بہت تفاوت پایا جاتا ہے۔ فرق نہ صرف جذبہ کی نوعیت و ماہیت ہی میں ہے۔ بلکہ دونوں کے طریق اظہار تو بالکل جداگانہ ہوتے ہیں۔ عورت کو مرد جیسی آزادی حاصل نہیں ہے۔ لڑکی کی جانب سے جذباتِ عشق کا کھلم کھلا اظہار اُس کے خاندان کی شرافت کے ماتھے پر کلنک کا ٹیکہ ہوگا۔ علاوہ بریں صنفِ نازک کی شرم و حیا اسے حالِ دل کے اخفا پر مجبور کرتی ہے۔ چونکہ عورت اور مرد کے عشقیہ جذبات میں فرق پایا جاتا ہے اس لئے شاعر عورت کے صحیح عشقیہ جذبات کی ہو بہو تصویر نہیں کھینچ سکتا۔ کوئی بھاشا کا شاعر کتنا ہی زن خصلت کیوں نہ ہو لیکن وہ خود پر ایسی مدہوشانہ کیفیت طاری نہیں کر سکتا کہ تھوڑی دیر کے لئے بھی اس کی شخصیت عورت کی شخصیت میں گم ہو جائے اور اس کے دل میں وہی عشقیہ جذبات اپنی تمام لذتوں اور دردمندیوں کے ساتھ رونما ہونے لگیں جو عورتوں سے مخصوص ہیں۔ الغرض بھاشا کی شاعری میں عورتوں کے جتنے جذبات بیان ہوتے ہیں وہ محض فرضی اور خیالی ہوتے ہیں خود شاعر کے قلبی احساسات نہیں ہوتے۔ اس لئے بھاشا کا عشقیہ کلام الہامی نہیں ہو سکتا۔ اردو شعرا کو بھاشا کی شاعری کی تقلید کرنے کے لئے

جو مشورہ دیا جاتا ہے وہ بالکل مہمل و بے کار ہے۔

اردو شاعری کی بزم عشق اور بھاشا کے عشقیہ اکھاڑے میں زمین آسمان کا فرق ہے۔ ایک میں معشوق کے خالِ سیاہ کے آگے سمرقند و بخارا کی سلطنتیں کوئی حقیقت نہیں رکھتیں۔ دوسرے میں خود محبوبہ جس کے لئے آہ و زاری کرتی ہے اس کے بے حس دل میں اس کی کوئی قدر نہیں۔ ایک میں معشوق کی ایک ایک ادا پر عاشق جان و تن قربان کرنے کے لئے تیار نظر آتا ہے۔ دوسرے میں عاشق کا کم ہمت دل بادیہ پیمائی کے تصوّر ہی سے کانپ اٹھتا ہے۔ کجا آن شور اشوری کجا ایں بے نمکی۔ کہاں مجنوں کہاں نل۔ کہاں فرہاد کہاں دشینت۔ مجنوں اور فرہاد کے عاشقانہ جذبات نفسانیت کے لوث سے پاک ہیں۔ دونوں میدانِ عشق کے جانباز شہسوار ہیں۔ آستانۂ یار پر جان قربان کر دینا اُن کے لئے کوئی بات ہی نہیں۔ ایک تیشہ و سنگ گراں کا حریف ہے دوسرا زنجیر و سلاسل کا مدمقابل۔ ایک کی گرمیٔ عشق پتھر کو موم بنا دیتی ہے۔ اُس کی ہمتِ مردانہ اور سعیِ پیہم پہاڑ کا سینہ چیر کر جوئے شیر کے لئے راستہ صاف کر دیتی ہے۔ دوسرے کے شوقِ دشت پیمائی کے آگے نجد کا لق و دق صحرا چشم حسود کی طرح تنگ ثابت ہوتا ہے۔ اور اُس کی آبلہ پائی سے ریگستان کا ذرہ ذرہ گل بداماں نظر آتا ہے۔ اب ذرا ہندی عشاق پر نظر ڈالئے نل اور دشینت دونوں عیش پرست۔ آرام طلب اور سہل انگار رہے ہیں۔ ان کو نہ امتحان گاہ عشق کی سختیاں جھیلنی پڑتی ہیں نہ رنج و مصیبت کا سامنا ہوتا ہے۔ عشق کی خوفناک قربان گاہ پر انکو دمڑی کی سوئی بھی بھینٹ چڑھانی نہیں پڑتی۔ انہیں نہ محتسب کا خوف ہے نہ رسوائی کا ڈر پہلے سے اُن کے دلوں میں عشق و محبت کی ایک چنگاری بھی موجود نہ تھی۔ پہلی ہی نظر میں اُن کا محض حسنِ صورت اور شاہی طمطراق دو بھولی بھالی پری رویوں پر قبضہ جما لیتا ہے۔ اور بات کی بات میں بغیر کسی دقت و دشواری کے دونوں جوڑے شربتِ وصال سے بھی لذت آشنا ہو جاتے ہیں۔ تمام ممالکِ متمدنہ کے لٹریچر میں عشق و عاشقی کا کارنامہ یہیں ختم ہو جاتا ہے۔ مغربی دنیا کی شاعری افسانہ، ڈراما، سینما پر نظر ڈالئے تو معلوم ہوگا کہ دنیائے عشق کی ساری ہنگامہ آرائیاں، سرگردانیاں اور دھمیں اسی زمانہ سے تعلق رکھتی ہیں۔ جب کہ عاشق و معشوق مستقل طور پر ملے نہ ہوں۔ جہاں معشوق قبضہ میں آیا عشق کی ساری سرگرمیوں اور بیتابیوں کا خاتمہ ہوا۔

لفکاڈیو ہرن کا بیان ہے کہ "عاشق کی تمام جانبازیوں اور فداکاریوں کی غرض یہی ہے کہ معشوقہ پر کسی طرح قبضہ و تصرف حاصل ہو جائے۔ آغازِ عشق سے دمِ تسخیر و حصولِ قبضہ تک کا زمانہ نہایت پر اسرار، حیرت انگیز اور اعلیٰ شاعری کا موضوع بننے کے ملائق ہوتا ہے لیکن جب محبوبہ عاشق کے ہاتھ آ کر اُس کی رفیقۂ حیات بن جاتی ہے تو گرمیٔ عشق اور ولولہ خیزی کا دور ختم ہو جاتا ہے۔ اس کے بعد دونوں میں جو گہرا تعلق قائم رہتا ہے اسے ہم عشق سے تعبیر نہیں کر سکتے۔ بلکہ وہ ایک قسم کی دوستی۔ ہمدردی اور محبت ہے جو ایک ساتھ رہنے سہنے سے پیدا ہوتی ہے۔ اس محبت میں نہ تپش پائی جاتی ہے نہ تڑپ۔ نہ گرمی نہ بے تابی بلکہ یہ اسی قسم کی محبت ہے جیسی انسان کو دوسرے اعزہ و اقارب کے ساتھ ہوتی ہے۔ بسا

اوقات اولاد کی محبت زن وشوہر کی درمیانی محبت پر غالب آجاتی ہے۔ اردو شاعر کا نصب العین نہایت اعلیٰ وارفع ہے اُس کے نزدیک محبوب کو قبضہ میں لانا اور شریکِ زندگی بنالینا عشق کی غایت نہیں ہے۔ باوجود تمام ظاہری تلخ کامیوں اور دردآفرینیوں کے عشق کے اندر ایک ایسی لذت پنہاں ہے جس سے وہ محروم ہونا نہیں چاہتا۔ وہ مدت العمر عشق کی جنوں پروری کا شکار بنا رہتا ہے۔ عشق کو وہ ہر درد کا مداوا خیال کرتا ہے۔ اُس کے نزدیک زندگی کا لطف عشق ہی کی بدولت ہے چنانچہ غالب کا شعر ہے کہ

عشق سے طبیعت نے زیست کا مزا پایا ۔۔۔ درد کی دوا پائی درد بے دوا پایا

بلکہ عشق خود زندگی ہے عشق نہ رہے تو زندگی بے لطف و بے مزہ بن جاتے۔ ایسی بے لطف زندگی موت سے بدتر ہے اردو کا شاعر مرض کی چارہ جوئی سے گھبراتا ہے اور کہتا ہے۔

دردِ ہے جاں کے عوض ہر رگ و پے میں جاری ۔۔۔ چارہ گر ہم نہیں ہونے کے جو درماں ہوگا

جہاں شاہدِ حقیقی کے ساتھ عشق کا اظہار ہوتا ہے وہاں طالب کو دیدار کی تمنا ہوتی ہے لیکن اردو کا بلند فکر شاعر عشقِ مجازی کے معاملہ میں بھی وصال یار کا متمنی نہیں ہوتا۔ دیدارِ دوست عام طور پر مریضِ عشق کے لئے دارو سمجھا جاتا ہے لیکن مرضِ عشق سے شفا پانی مذہب عشق میں موت کے مترادف ہے کیونکہ زندگی اور دردِ عشق دونوں لازم و ملزوم ہیں وہ زندگی ہی کیا جو لذتِ عشق سے بے بہرہ ہو۔ ایسی زندگی سے تو موت ہی بہتر ہے لہذا اردو کا بلند حوصلہ شاعر دیدار کی خواہش سے پناہ مانگتا ہے اور دعا کرتا ہے کہ اسے وصال نصیب نہ ہو ورنہ اسے تمام لذّتِ عشق سے محروم ہونا پڑے گا۔

یارب دعائے وصل نہ ہرگز قبول ہو ۔۔۔ پھر دل میں کیا رہے گا جو حسرت نکل گئی

اسے عشقِ سرمدی و دردِ جاوداں کی تمنا رہتی ہے۔ وہ عشقِ حقیقی سے بھی اس لئے بیزار نظر آتا ہے کہ وہاں طلب دید ہے۔ اگر یہ طلب پوری ہو جائے اور مدعا بر آئے تو پھر عشق کا خاتمہ ہی ہو جائے مصائبِ عشق کے مادی معاوضے سے تو اسے دلی نفرت ہوتی ہے خواہ یہ معاوضہ حور و قصور ہی کی شکل میں کیوں نہ ہو۔ اس خیال کو مومن اس طرح ظاہر کرتے ہیں سے

مومن بہشت و عشقِ حقیقی نہیں نصیب ۔۔۔ ہم کو تو رنج ہو جو غمِ جاوداں نہ ہو

مجنوں اور فرہاد مدت العمر لذتِ عشق سے ذوق آشنا رہے۔ تا زیست اُن کے عشق و محبت کی ہنگامہ آرائیاں قائم رہیں۔ وہ آغوشِ لحد میں بھی داغِ حسرت لے گئے۔ مغربی لٹریچر میں جدائی و مفارقت کا زمانہ نہایت شاندار۔ حیرت خیز۔ پر اسرار و پرعظمت ہوتا ہے۔ اور جب عاشق و معشوق باہم مل جاتے ہیں تو ساری ولولہ خیزیوں اور بیتابیوں کا خاتمہ ہو جاتا ہے۔ لیکن نل اور دمینت کو کبھی مفارقت کا رنج اور جدائی کا صدمہ اٹھانے کا موقعہ ہی نہیں ملا۔ وہ ایک نظر ڈالتے ہی عاشق ہوئے اور بات کی بات میں اپنی اپنی محبوبہ کے وصال سے لذت گیر ہو گئے۔ اُن کی زندگی میں عشق کا کارنامہ

مفقود ہے۔ دونوں جوڑوں میں اگر محبت باقی رہی تو وہ محض زن وشوہر کی معمولی الفت تھی۔ الغرض دنیا کے لٹریچر میں جہاں عشق کی ہنگامہ آرائیوں پر تماشے کا آخری پردہ گرتا ہے وہاں سے نل ودمن اور دشینت وشکنتلا کی زندگی کا ڈراما شروع ہوتا ہے نل قماربازی میں اپنی ساری حکومت، دولت، ثروت ہار جاتا ہے۔ کاش وہ ان چیزوں کو عشق کی مقدس قربان گاہ پر بھینٹ چڑھا دیتا تو دنیائے عاشقی میں کچھ نام بھی کر جاتا۔ اس کی انتہائی مصیبت وجلاوطنی کی حالت میں بھی وفادار و باعصمت دمن اس کا ساتھ دیتی ہے لیکن بے وفا نام نہاد عاشق اسے خوفناک جنگل میں درندوں کے رحم وکرم پر سوتا چھوڑ کر چل دیتا ہے۔ دشینت کا بھی تقریباً یہی حال ہے۔ وہ اپنی محبوبہ کو حاملہ چھوڑ کر سلطنت کا کاروبار سنبھالنے کے لئے چلا جاتا ہے۔ اور کبھی بھول کر بھی اپنی معشوقہ کو یاد نہیں کرتا۔ یاد کرتا بھی تو کیونکر اس کے دل میں سچے عشق کی گرمی تو تھی نہیں اُس نے محض خواہشِ نفسانی سے مغلوب ہو کر دور دراز نخچیر گاہ میں چند روزہ صحبت کے لئے اس دوشیزہ کو گندھروا طریقہ پر اپنے حبالۂ عقد میں لے لیا تھا اس کی بیسیوں ازواج میں سے ایک وہ بھی تھی۔ اس پر طرہ یہ کہ جوگی کے سراپ نے دشینت کے دل سے شکنتلا کا نقشِ محبت نہیں (جو پہلے ہی سے معدوم تھا) بلکہ اس محبوبہ کا خیال بھی حرفِ غلط کی طرح مٹا دیا۔ شکنتلا طرح طرح کی صعوبتیں اور عقوبتیں جھیلتی ہے سخت ذلت ورسوائی برداشت کرتی ہے لیکن دشینت کا دل نہیں پسیجتا۔ معشوقہ کا رخِ زیبا اُس کے قلبِ سنگیں میں دبے ہوئے شررِ محبت کو اجاگر کرنے میں ایک حقیر انگشتری سے بھی کم اثر ثابت ہوتا ہے۔ سچے عشق کی گرمی پہاڑ کو جلا کر خاکستر کر سکتی ہے۔ اس کے آہن گداز شعلے کے آگے جوگی کی کٹیا اور رشی کے سراپ کی کوئی حقیقت نہیں۔ عاشق کو دن رات معشوق کی دھن لگی رہتی ہے۔ اس کے صنمخانۂ دل میں صرف ایک ہی بت نصب رہتا ہے جس کی وہ پرستش کرتا ہے۔ لیکن دشینت کو گرمیٔ عشق سے کیا تعلق؟ بالآخر طلسمی انگشتری کے اثر سے دشینت کو شکنتلا کا خیال آتا ہے۔ وہ اپنی تغافل شعاریوں پر بظاہر نادم ہوتا ہے اور چند معذرت خواہیوں کے ذریعہ سے شکنتلا کی اشک شوئی کر دیتا ہے۔ نل اور دشینت کی ساری حیاتِ معاشقہ کی یہی پونجی ہے مجنوں وفرہاد کے درخشاں کارناموں کے آگے اس جنسِ کم ارز کی کیا حقیقت؟ اپنی کم بضاعتی کو محسوس کرتے ہوئے کیا خود نل اور دشینت مجنوں جیسے سیّد العاشقین کے پہلو میں جگہ پانا تو درکنار اس کی حاشیہ نشینی کی بھی جرأت کر سکتے ہیں؟

حقیقت الامر یہ ہے کہ اگرچہ نل اور دشینت کا عاشقانہ کارنامہ قابلِ لحاظ نہیں لیکن اُن کے قصے دلچسپ ضرور ہیں محض لطف ودلچسپی کی خاطر اُن کا اُردو میں ترجمہ کیا جا سکتا ہے لیکن اُن کا عشقیہ کارنامہ نہایت بودا اور پست ہے۔ ہندی کے عشقیہ معاملات اور اُن کے اسالیبِ بیان اردو شاعری کی فطرت وطبیعت اور مذاق وپسند کے بالکل منافی ہیں۔ نہ ہندی عاشقوں کو صحرانوردی و پابجولانی کی ہمت ہے اور نہ ہندی معشوق میں وہ ناز و انداز اور شوخی و طنازی پائی جاتی ہے جو اردو شاعری کے معشوق کا طرۂ امتیاز ہے۔ ہندی اور اردو شاعری میں عاشق و معشوق کا تصور ایک دوسرے کی ضد ہے اور اجتماعِ ضدین کا محال ہونا ایک مسلّمہ امر ہے۔ لیلیٰ ومجنوں، شیریں وفرہاد، وامق وعذرا، سلمیٰ و رباب آسمانِ عشق کے

آفتاب و ماہتاب ہیں لیکن نل اور دمینتی - دشینت اور شکنتلا، وکرم اور اروسی، اگنی متر اور مالویکا، مالتی اور مادھو وغیرہ محض ڈراموں اور افسانوں کے کردار ہیں - ان ڈراموں اور قصوں کے ترجمہ سے ادب اردو میں چند کتابوں کا اضافہ ہو سکتا ہے لیکن چونکہ اُن کے عشقیہ کارناموں میں کوئی قوت وگیرائی نہیں ہے اس لئے عشق کی گوناگوں نیرنگ کاریوں، اور اُس کے بوقلموں راز و نیاز کی تشریح میں اُن سے بہت کم مدد مل سکتی ہے -

جہاں تک نغمہ سرائی و درد نوائی کا تعلق ہے کوئل اور پپیہے کو اردو شاعری میں کافی جگہ مل چکی ہے - رندؔ نے برسات پر جو اشعار کہے ہیں اُن میں ہم کوئل اور پپیہے کے چہچہے سنتے ہیں -

کوکے اک سمت پپیہا کہیں کوئل کریں شور ‏ مور چلاتے ہیں رات آئی ہے کیا ساون کی

سر اقبال سے بڑھ کر بادۂ شیرازی کا سرشار کون ہوگا - لیکن وہ بھی گولکنڈہ کے سکوت پرور باغ میں جہاں سلاطین قطب شاہیہ محو استراحت ہیں بلبل کا نغمہ نہیں بلکہ ہندی کوئل کے نعرے سنتے ہیں اور ہمیں بھی سناتے ہیں ؎

نعرہ زن رہتی ہے کوئل باغ کے کاشانہ میں ‏ چشم انساں سے نہاں پتوں کے عزلت خانہ میں

با ایں ہمہ کوئل اور پپیہے کا کارنامہ صرف کوک ہوک اور نعرہ زنی ہی تک محدود ہے - لیکن گل و بلبل اور سرو و قمری کے ساتھ حسن کے ہزاروں ناز و انداز اور عشق کے لاکھوں راز و نیاز اور شور و ہنگامہ وابستہ ہیں - ان کا ذکر جن دلکش خوابیدہ افسانوں کو بیدار کرتا ہے - اُن کے نام میں جو شعریت کیفیت، دلچسپی اور رنگینی مضمر ہے - ان کا حوالہ جن خوش آئند یادوں کو تازہ اور لطیف خیالات و تصورات کو متحرک کرتا ہے وہ کوئل اور پپیہے کو کہاں نصیب - کوئل اور پپیہے کی طرح بلبل محض ایک گانے والا پرندہ ہی نہیں ہے بلکہ سر اقبال کی زبانی سنئے کہ وہ اور کیا ہے ؎

اور بلبل مطرب رنگیں نوائے گلستاں ‏ جس کے دم سے زندہ ہے گویا ہوائے گلستاں

عشق کے ہنگاموں کی اڑتی ہوئی تصویر ہے ‏ خامۂ قدرت کی کیسی شوخ یہ تحریر ہے

مسز سروجنی نائیڈو کو اُن کی شیریں کلامی و خوش نوائی کی بنا پر بلبلِ ہند کا لقب دیا گیا ہے - مذاق سلیم اس حسن انتخاب کی داد دیتا ہے اور مسز موصوفہ بھی اسے اپنے لئے باعثِ فخر سمجھتی ہیں لیکن آپ کسی شکر ریز و سحر مقال خاتون کو "ہندوستان کی کوئل" کہئے - پھر دیکھئے کیا ہوتا ہے - آپ ہزار عذر پیش کریں کہ کوئل دیسی پرندہ ہے اور بلبل اجنبی و غیر ملکی ہے لیکن کوئی شخص آپ کے مذاق و پسند کی تعریف نہیں کریگا کیونکہ کوئل کا لفظ سنتے ہی ذہن کسی کالی کلوٹی چیز کی طرف منتقل ہو جاتا ہے - کوئل کا خطاب باعثِ توہین خیال کیا جاتا ہے - عجب نہیں کہ وہ خاتون جسے آپ کوئل کہیں آپ پر ازالۂ حیثیت عرفی کا دعوے کر بیٹھے - اندھا دیس کا قانون بھی جہاں کا مذاق "حسن سیہ فام" کا گرویدہ ہے شاید آپ کی حمایت نہیں کرے گا اور آپ بیٹھے بٹھائے قانونی شکنجہ میں پھنس جائیں گے - کہاں بلبلِ ہزار داستاں

اور کہاں نعرہ زن کوئل۔ دونوں کو ایک صف میں جگہ دینا مذاقِ سلیم کا خون کرنا ہے۔

اسی طرح اگر کسی کی سیر و سیاحت کا مقصد محض پتھر کے تودے یا بڑے بڑے چٹان دیکھنا ہو تو اُس کے لئے کوہِ طور اور ہمالیہ پہاڑ دونوں یکساں ہیں بلکہ دور دراز کا سفر کر کے کوہِ طور یا ہمالیہ پہاڑ تک جانے کی زحمت گوارا کرنے سے بہتر یہ ہے کہ وہ آس پاس کی کسی پہاڑی کی سیر کرے۔ لیکن اردو شاعری کوئی کور مذاق سیاح نہیں ہے۔ اس کی آنکھیں جلوۂ یار کی متلاشی ہیں وہ برقِ تجلی کی متمنی ہے وہ شمعِ ایمن سے فروغِ نور حاصل کرنا چاہتی ہے۔ وہ انوار کی بارش اور تجلیوں کی ریزش کا سماں دیکھنے کے لئے بیتاب ہے۔ اب آپ ہی بتائیے کہ وہ کدھر کا رُخ کرے کوہِ طور کا یا ہمالیہ پہاڑ کا؟ ہمالیہ پہاڑ باوجود اپنی فلک بوس نورانی چوٹیوں کے برقِ تجلی سے محروم ہے۔ اس کا سینہ سوز و گداز سے خالی ہے اُسے کبھی جلوہ گاہِ ناز بننے کا شرف حاصل نہیں ہوا۔ وہ ہندوستان کا سنتری یا پاسبان ضرور ہے لیکن رموزِ سراپردہ کا رازدار یا حریمِ ناز کا محرم نہیں۔ اب ذرا کوہِ قاف کی سیر کیجئے۔ وہاں پری جمالوں کا نظارہ آنکھوں کو نور اور دل کو سوز بخشتا ہے۔ اس باصرہ نواز منظر سے اردو شاعری کو محروم کر کے آپ اُسے سمیرو پربت کی طرف گھسیٹتے ہیں جہاں چھوٹے بڑے دیوتاؤں کے ٹھٹ کے ٹھٹ لگے ہوئے ہیں۔ اردو شاعری اور خصوصاً شاہدِ غزل پریوں کے جھرمٹ سے علیحدہ ہو کر دیوتاؤں کے جگمگھٹ میں قدم رکھنے سے گھبراتی ہے۔ وجہ یہ ہے کہ وہ فطرتاً شوخ و بیباک واقع ہوئی ہے وہ کسی کی مدح سرائی اپنے لئے کسرِ شان سمجھتی ہے۔ اور صاف کہتی ہے کہ

مجھ کو دماغِ وصفِ گل و یاسمن نہیں	میں حوبل نسیم بادفروشِ چمن نہیں

اس کی رند مشربی و آزادہ روی سے ہر شخص واقف ہے۔ اس کی طنازی و گستاخی بڑے بڑے جلیل القدر پیغمبروں مثلاً موسٰی، عیسٰی، خضر و سلیمان وغیرہ کو بھی بے تکی سنانے سے باز نہیں رہتی اور آزادی سے کہتی ہے کہ ؎

کیا فرض ہے کہ سب کو ملے ایک سا جواب	آؤ نہ ہم بھی سیر کریں کوہِ طور کی
اک کھیل ہے اورنگِ سلیماں میرے نزدیک	اک بات ہے اعجازِ مسیحا میرے آگے
وہ زندہ ہم ہیں کہ ہیں روشناسِ خلق اے خضر	نہ تم کے چور بنے عمرِ جاوداں کے لئے

جب اُس کی شوخی و بیباکی حد سے زیادہ بڑھتی ہے تو وہ "خاکم بدہن" کہہ کے شریعت کی گریباں گیری سے بچنے کا بہانہ ڈھونڈ کر خود خدا کو بھی کھری کھری سنا دیتی ہے اور لغوی معنی کی آڑ لیتے ہوئے شکوہ سنج ہوتی ہے کہ ؎

کبھی ہم سے کبھی غیروں سے شناسائی ہے
بات کہنے کی نہیں تو بھی تو ہرجائی ہے

باقی   محمد حسین ادیب

عقدۂ مشکل

میں جانتا ہوں کہ اُن کا کچھ اعتبار نہیں
میں جانتا ہوں کہ اُن کو کسی سے پیار نہیں

اُنہیں خبر ہی نہیں ہے رہِ وفا کیا ہے
وہ جانتے نہیں الفت کا ماجرا کیا ہے

عبث ہیں اُن کیلئے بیقراریاں میری
عبث ہیں اُن کے لئے آہ و زاریاں میری

ہزار حالِ دل اُن سے کہو اثر ہی نہیں
مجھے یقیں ہے مری کچھ انہیں خبر ہی نہیں

کسی کی بھی ہے جو اُن کو تو اپنی پروا ہے
خدا ہی جانے مجھے اُن کی کیوں تمنا ہے

میں جانتا ہوں کہ ایسے وہ کچھ حسیں بھی نہیں
دل آئے ٹوٹ کے ان پر وہ مہ جبیں بھی نہیں

نہیں ہے مجھ کو عقیدت بھی حسن والوں سے
بھرا پڑا ہے جہاں ورنہ مہ جمالوں سے

خدا نے حسن دیا ہے بہت حسینوں کو
ہزاروں ناز سکھائے ہیں نازنینوں کو

ملا نہیں ہے مجھے دل ہی چاہنے کیلئے
بنا نہیں ہوں میں الفت نباہنے کیلئے

نہیں یہ بات کہ میری کچھ اُن کو پروا ہو
نہیں یہ بات کہ مجھ کو جنوں ہو سودا ہو

نہ اُن کو مجھ سے نہ مجھ کو کچھ اُن سے نسبت ہے
کوئی بتائے کہ کیوں اُن سے مجھ کو الفت ہے

ممتاز حسن

اجتماعی زندگی کا بنیادی اصول

ذاتی مہارت، امانت داری، علمی تنظیم! ہم اِن تینوں کی جزئیات سے واقف ہو چکے ہیں اور یہ جان چکے ہیں کہ اِن تینوں کا ایک دوسرے کے ساتھ نہایت قریب کا تعلق ہے۔ اب ان کی روشنی میں ہم دیکھ سکتے ہیں کہ وہ کون شان دار کام ہے جو تعمیری شہریت کے پیشِ نظر ہے۔ اور وہ کام ہے صنعتی تمدّن کا استحالۂ کم سے کیف میں، دوسرے لفظوں میں یوں کہئے کہ تہذیب کو بسیار پسندی کے پنجے سے چھڑا کر اُس کے سامنے بلند معیاری کا نصب العین قائم کرنا، اُسے ڈھیر سے گن کی طرف، بیشتر سے بہتر کی طرف لے چلنا۔ یہ کوئی آسان کام نہیں۔ اکثر لوگ کہہ اُٹھیں گے کہ یہ ایک ناممکن کام ہے۔ ہاں ناممکن سہی لیکن جب خدائے عزیز و حکیم نے انسان کے جسم میں روح پھونکی تو اُس نے "ناممکن" ہی کو انسان کا نصب العین بنایا اور تمدّن کی ساری تاریخ سے جو ایک زبردست معجزہ ہے۔ ظاہر ہے کہ انسان یقیناً اس بلند منتہائے کمال کے ہر طرح قابل ہے۔ اس وقت دنیا کے طول و عرض میں کافی سماجی جرأت ہے جو اس غایت درجہ دشوار لیکن شاندار کام کو سرانجام دے سکے۔ اگر نوعِ انسان اس قدر ذلیل اور ناکارہ ہوتی جتنا غم پسند سمجھے ہوئے ہیں تو اُسے کبھی اس بات کا علم و شعور نہ ہو سکتا کہ وہ ذلیل و ناکارہ ہے۔ انسان کو اس بات کا شعور ہونا ہی اس بات کی بیّن دلیل ہے کہ وہ ابھی قعرِ ذلت میں نہیں گرا۔ اس وقت صنعت و حرفت، قانون، طبیعیات اور کئی اور شعبوں میں اچھے اور عمدہ کارکنوں کی ایک خاصی تعداد موجود ہے۔ گاڑیاں اور انجن چلانے والے، کشتیاں اور جہاز چلانے والے، انجنیر، مستری، معمار، باغبان، کاشتکار ان میں لاکھوں اپنا اپنا کام تن دہی اور جانفشانی سے کر رہے ہیں۔ آج نوجوانوں کے لئے ہزاروں موقع ہیں جن سے فائدہ اٹھا کر وہ اپنے اور دوسرے کے لئے مفید ثابت ہو سکتے ہیں۔ وہ جائیں اور ان محنتی لوگوں کا ہاتھ بٹائیں ان کی مشکلوں میں ان کے کام آئیں۔ ایک نوجوان کو چاہئے کہ وہ گھر میں نہ بیٹھا رہے بلکہ باہر کی دنیا میں جا نکلے اور جو کچھ بھی مضبوط و توانا کے مقابل میں کمزور و ناکارہ ہے اُسے تقویت دے۔ "مکان اندیشی" مضبوط ہے مقدار کا بول بالا ہے اُن کے مقابل ہیں "زمان اندیشی" ہے اور عمدگی۔ اِن کو سب کی مدد درکار ہے اور اِن کی مدد سے بڑھ کر دوسروں کی کیا خدمت ہو سکتی ہے؟ اس سے یہ مراد نہیں کہ عمدگی ہی اچھی ہے اور مقدار محض بُری ہے۔ ہر شے اپنی جگہ اچھی ہے۔ مقدار عمدگی کی دشمن نہیں۔ مقدار بھی بیش قیمت ہے۔ جب تک وہ اپنی جگہ پر قائم رہ کر نوعِ انسان

کی خدمت کو تیار رہے اور اس پر سوار نہ ہو جانا چاہیے + پہاڑ سے مفید ہیں لیکن اگر وہ ریاضی میں بجائے کام دینے کے کام لینے پر اصرار شروع کر دیں تو ظاہر ہے کہ نتیجہ اچھا نہ ہو + "تم بلند معیاری کی تلاش کرو۔ مقدار خود بخود تمہارے پیچھے چلی آئے گی"۔ "تم پہلے "بہتر" کو ڈھونڈو۔ "بیشتر" خود بخود تمہارے قدم لے گا"۔ سچائی، خوبصورتی، اچھائی خود بخود بڑھتی اور چمکتی ہیں!

ممکن ہے اُسے محض خوش اعتقادی کہا جائے لیکن سچ یہ ہے کہ ایک ایسے ہی اعتقاد کی آج ہمارے صنعتی تمدن کو سخت ضرورت ہے اور بلند معیاری کا صحیح مقصد دستکاری کے معیار کو بڑھانا نہیں بلکہ اُن انسانوں کے معیار کو بلند تر کرنا ہے جو اس میں مصروف ہوں + سوال یہ ہے کہ کیا اُس کام نے جو کسی کارکن یا دستکار نے کیا ہے اُسے ایک زیادہ قابلِ قدر انسان بنا دیا ہے یا نہیں؟ کیا اُس شخص کے ساتھ مل جل کر رہنا سہنا زیادہ آسان اور باعثِ مسرت ہو گیا ہے؟ کیا اب وہ پہلے سے زیادہ عقلمند زیادہ پُرصحت زیادہ ہمدرد ہے، کیا اس کام کے کرنے کے بعد اور اس کی وجہ سے یہ کہہ سکتے ہیں کہ وہ اب ایک زیادہ انصاف پسند آقا ہے زیادہ دیانت دار خادم ہے؟ زیادہ اچھا ہمسایہ، زیادہ وفادار دوست، زیادہ سچّا محبت کرنے والا ہے؟ یعنی کیا اچھے کام سے کام کرنے والا خود ایک بہتر آدمی بن گیا ہے یا نہیں!

آبادی کے بڑھنے میں زیادہ اندیشہ یہ نہیں کہ دنیا میں آدمی یا کاریگر زیادہ ہو جائیں گے بلکہ یہ ڈر ہے کہ اس سے کہیں نکمے آدمیوں اور نکمے کاریگروں میں اور اضافہ نہ ہو جائے + اچھے کاموں ہی سے اچھے انسان بنائے جا سکتے ہیں۔ یہ ہے صحیح طریقہ بہتری و ترقی کا۔ براہِ راست بہتری و ترقی پر تقریر و وعظ کرنے سے مدعا حاصل نہیں ہو سکتا + ایک تجربہ کار مدرّس نے ایک دفعہ خوب کہا کہ "اگر تم چاہتے ہو کہ انسانی نفس کی تربیت کرو تو نفس کی تربیت نہ کرو بلکہ کسی اور شے کی تربیت کرو"۔ اور جب اُس سے پوچھا گیا کہ وہ "اور شے" کیا ہو سکتی ہے تو اُس نے جواب دیا کہ "جسم" اور پھر اس کی تشریح یوں کی کہ جسم ہر قسم کی تخلیقی مہارت کا ذریعہ ہے وہ محض ایک میکانی لاش نہیں جیسے مادیتین کا خیال ہے۔ اسی طرح اگر تم ضمیر کی تربیت کرنا چاہو تو بجائے ضمیر سے شروع کرنے کے اُن آلات کو جلا دو جنہیں ضمیر استعمال کرتا ہے بالخصوص ہوا کو اور دست و پا کو ضمیر ان اعضا کے بغیر ایسا ہی ہے جیسا نقشے پر خطِ استوا ایک فرضی اور موہوم شے لیکن ان کے ساتھ اور ان کے ذریعے سے وہ ایک اصلی وجود بن جاتا ہے + تم ایک شخص کو کسی ساز پر لمبے چوڑے لیکچر دینے سے ایک سازندہ نہیں بنا سکتے۔ بہتر ہے کہ تم اسے کوئی ساز دو جسے وہ بجائے اور جس کی آوازوں کو وہ سنے اور جس کے سروں کو سمجھے + زندگی میں صحیح تعلیم صرف ذاتی تجربے سے حاصل ہوتی ہے اور اس کے بغیر ناممکن ہے + علمِ اصلاحِ پیدائش سے تم شوق سے نوعِ انسان کی نسل کو زیادہ پرصحت اور زیادہ تنومند بناؤ لیکن یہ یاد رکھو کہ جب تک اس بہتر و قوی تر آنے والی نسل کے لئے بہتر کام موجود نہ ہو گا۔ ایسا کام جو ان بہتر انسانوں کے شایانِ شان ہو اُس وقت تک یہ بہتری و قوت بے کار ہو کر رہ جائیں گی +

ہم چاہتے ہیں انسان کو بہتر انسان بنانا اور یہ کام بہتر کام کی انجام دہی سے ہی ہو سکتا ہے + بلاشبہ حالات اور ماحول انسانی فطرت پر بہت حد تک اثر انداز ہوتے ہیں ۔ لیکن یہ یاد رکھنا کہ انسان کا ماحول محض اس کی ظاہری فضا نہیں بلکہ اس کے علاوہ وہ زمانہ ہے گذرا ہوا اور گذرتا ہوا جس کے اندر سے انسان ظاہر ہوا اور جس کے اندر اس کا وجود ہے، عادات، رسوم، عقاید اور سب سے زیادہ اُس کے ہم جنسوں کا دائرہ جن کے ساتھ وہ زندگی بسر کرتا ہے + دوسرے شخص ہمارا ماحول ہیں اور ہم میں سے ہر ایک اُن کا ماحول ۔ "دوسروں" کی خدمت اچھی شے ہے مگر یہ بھی نظر انداز نہ کرنا چاہیئے کہ ہم بھی دوسروں کے لئے یہی "دوسرے" ہیں + اور حالات بھی انسانی محنت ہی کا ثمرہ ہیں اور اس کا مظہر۔ پس اِن کے بہتر کرنے کا بہترین ذریعہ انسانی محنت کو بہتر بنانا ہے + آج کل کی تعمیرات بڑی بڑی اور چھوٹی چھوٹی اور معمولی سی بھی اِن سب کو کس بے پروائی اور بے دردی اور تیزی سی بنایا جاتا ہے اس بُرے کام کا بُرا اثر بنانے والوں پر بنوانے والوں پر اور ساری معاشرت پر ہونا لازم ہے + بُرے کام میں مصروف رہنے والے اور مصروف رکھنے والے سب کے سب دنی النفس اور خبیث ہو جاتے ہیں ۔ ایسے لوگ ذرا ذرا سے بہانے سے ایک دوسرے سے لڑنے جھگڑنے لگ جاتے ہیں + اگر ہم چاہیں کہ لوگوں کے باہمی معاشری تعلقات بہتر و خوشتر ہوں تو اس کا بہترین و آسان ترین ذریعہ اس کام کو بہتر و خوب تر بنانا ہے جو اُن کے ہاتھوں سرانجام ہو + عمدہ، نفیس، صاف ستھرے، مکانوں اور اچھے بازاروں اچھی گلیوں والے شہر میں رہنا کس قدر دل خوش کن ہے ۔ یہ باشندوں کے لئے بجائے خود ایک تعلیم ہے ۔ اس سے انسان میں خودداری کا خیال پیدا ہوتا ہے اور ہر شخص میں خود بخود یہ خواہش پیدا ہوتی ہے کہ وہ بھی ماہروں اور چابک دستوں اور معتمدوں کے زمرے میں جا شامل ہو ۔ اس کے برعکس دوسری نوع کے مقامات میں رہنا روح و نفس کے لئے ایک عذاب ہے اور ہلاکت +

لہٰذا "تعمیری شہریت" کا اصلی مقصد ہر انسان کی ذات کو بلند تر کرنا ہے + یہ دشوار و شاندار کام کہاں سے شروع کیا جائے؟ جیسا کہ اوپر بار ہا کہا جا چکا ہے اس کا صحیح ذریعہ انسانی کارگزاری کو زیادہ بلند معیار بنانا ہے، ذاتی مہارت اور صلاحیت اور امانت داری کی اعانت سے + محض پند و وعظ سے انسان بہتر انسان نہیں بنتا ۔ اس کی ایک نہایت عمدہ مثال صنعتی دنیا سے لی جا سکتی ہے ۔ اگر تم چاہو کہ لوہے یا تانبے کی ایک چادر میں جو ابھار یا بل سا پڑ گیا ہے اُسے مٹا دو تو اس کا طریقہ عین ابھری جگہ پر ہتوڑے مارنا نہیں بلکہ یہ ہے کہ تم اس کے اردگرد سب طرف ہتوڑا مارو اس طرح ابھار جاتا رہے گا اور چادر خود بخود ہموار ہو جائے گی + یہی قاعدہ انسانی معاشرت کے لئے مفید ہے ۔ جہاں تم خرابیاں دیکھو اُن کے براہ راست دور کرنے میں زیادہ وقت نہ کھوؤ بلکہ کوئی دوسرا طریقہ اختیار کرو کہ اس سے وہ زیادہ جلدی دور ہو سکیں گی +

آج کل کے تمدن پر اعتراضات کی جو بوچھاڑ کی جاتی ہے اُن میں سب سے بڑا اور عام اعتراض یہ ہے کہ یہ تمدن مادی ہے اور مادیت پرست ہے + یہ ایک مرض خیال کیا جاتا ہے اور مختلف فلسفی معالج اس کا مختلف علاج تجویز

کرتے ہیں، کوئی کہتا ہے اس درد کی دوا مذہب کی پڑیا ہے۔ کوئی کہتا ہے قوانین کا منتر اسے اڑان چھو کر سکتا ہے
اِن علاجوں میں اکثر علاج خود مادی ہیں اور روحانی معالجوں سے بھی پوچھ دیکھو تو تم پاؤ گے کہ ان کی روحانیت بھی آخر
کسی نہ کسی قسم کی مادیت پر آکر ٹھہرتی ہے۔ کوئی جلسہ کرنا، کوئی مجلس قائم کرنی، کوئی مضمون لکھنا وغیرہ وغیرہ + اصل
یہ ہے کہ جب تک انسان کی روح اُس کے جسم سے وابستہ ہے یا جب تک اس کا نفس اُس کے دماغ سے متعلق ہے
"مادیت" پر سب اعتراض لاحاصل ہیں بلکہ قطعی ضرر رساں + مسئلہ جو درپیش ہے وہ یہ نہیں کہ مادے کو "موقوف" کر
دیا جائے بلکہ یہ کہ اُسے اپنے صحیح محل اور موقع پر قائم رکھا جائے + مادہ کیا ہے؟ اس کی تعریف میں بہت اختلاف ہے مگر
غالباً اس کا مفہوم اِس طرح بخوبی ذہن نشین کیا جا سکتا ہے کہ وہ ایک ایسی شے ہے جس کے بغیر ہمارا گذارہ نہیں اُس
بیوی کی طرح جس کے متعلق اُس کی لحد کے کتبے پر مرقوم تھا کہ "اُس کے ساتھ رہنا مشکل، اُس کے بغیر رہنا اور بھی
مشکل"+

مادہ روح کی منزل کا پہلا مرحلہ ہے۔ روحانی قدور تک ہم صرف مادی اشیاء کے ذریعہ سے پہنچ سکتے ہیں۔
روح مادہ ہے جب ہم مادہ کو غور سے دیکھیں اُس کا صحیح استعمال کریں اور اُس سے گہرا تجربہ حاصل کریں جب مادی
اشیاء ہنرمندی کے ساتھ کام میں لائی جائیں اور وہ گویا ہمیشہ کے لئے حُسن و مسرت سے معمور ہو جائیں تو روحانی اشیاء
خود بخود وجود میں آجاتی ہیں اور جب تم اُن کا حسن دیکھو اور اس سے لطف اٹھاؤ تو تم خود بھی روحانی ہو جاتے ہو + اس
قسم کی شاندار تبدیلیوں سے وہ خوراک بھی جس سے ہمارے جسم پرورش پاتے ہیں ایسی قوتِ لاہوت بن سکتی ہے
جس سے ہماری روحیں نشو و نما پائیں اور وہ محنت جس سے ہم اپنی روزی کماتے ہیں ایسی دولت بن سکتی ہے
جس سے ہماری روح ہمیشہ کے لئے مالامال ہو جائے + کارلائل کا قول ہے کہ دو آدمیوں کی میں عزت کرتا ہوں اور کسی تیسرے
کی نہیں ایک تو محنتی دستکار کی جو دنیاوی آلات سے دنیا کو انسان کے لئے مسخر کرتا ہے۔ دوسرے اور اس سے بھی زیادہ
روحانی ضروریات کے لئے کام کرنے والے کی۔ یہ دونوں قابلِ احترام ہیں باقی سب خس و خاشاک ہیں"+ لیکن کیا یہ دونوں
قسم کے آدمی ایک دوسرے سے علیحدہ ہیں؟ غور کرو تو تم دیکھو گے کہ فی الحقیقت وہ ایک ہی ہیں۔ وہ متحد ہوتے ہیں
اُس چیز کے لابدی ہونے میں جسے وہ الگ الگ تیار کرتے ہیں اور اس شعور میں کہ وہ لابدی ہے +

مادہ کے بغیر ہمارا گذارہ نہیں لیکن یہ بھی نظر انداز نہ کرنا چاہئے کہ اگر اُس سے اچھا سلوک کیا جائے تو وہ اچھائی کا
جواب اچھائی دیتا ہے + بدسلوکی سے مادہ ہمارا دشمن اور خوش سلوکی سے وہ ہمارا بہترین دوست بن جاتا ہے، مادہ
سے زیادہ مددگار کون ہوگا؟ ذرا ذرا سی معمولی بلکہ بھونڈی چیزوں سے بھی کیسی کیسی خوبصورت چیزیں بنتی ہیں، کیسے
کیسے دل خوش کن لمحے روح کو نصیب ہوتے ہیں! موسیقی کیا ہے؟ محض ایک نوع کی سازش دھات کے تاروں اور
اردگرد کی ہوا کے درمیان، اور کچھ بھی نہیں، لیکن ان سے خاص طریقے سے کام لینے والا مطرب اُن کے راگ رنگ سے

خاکی زمین کو کیونکر ایک آسمانی عالم میں تبدیل کر دیتا ہے + یہ ہے مادے کی خدمت انسان کے لئے یہ ہیں مادے کی روحانی نعمتیں اُن کے لئے جو انہیں حاصل کرنا سیکھیں + اس کے برخلاف مادہ اُن پر اپنے ستم ڈھانے سے نہیں چوکتا جو اس کا غلط استعمال کریں + ہمیں خدا کا شکر بجا لانا چاہیئے کہ اُس نے ہمیں اِس مادی دنیا میں پیدا کیا جس میں آزاد روح کے لئے ایسی شاندار ممکنات موجود ہیں + تو مادے سے "خوش سلوکی" کے کیا معنی ہیں ؟ اس کے محض یہی معنی ہیں کہ مادی اشیا سے جب تم کام لو تو اپنی ذاتی مہارت سے اپنی امانت داری سے اور اپنی علمی قابلیت کے ساتھ کام لو + یہ ہیں ہمارے فرائض اس مادی دنیا میں لیکن ہمارے حقوق و فرائض کا تعلق محض اس مادی دنیا سے نہیں بلکہ ساری کائنات سے ہے اور ساری کائنات کی آنکھیں ہر انسان کے روزانہ کام پر لگی ہیں۔ وہ کام جس میں وہ مادہ کا امانتدار ہے جسین علی کے لفظوں کو یاد کرو "دستکار اور ریاضی دان اور رفدلئے بزرگوار کا بندہ" + تمام معاشری "بیماریوں" کی جڑ مادے کا غلط استعمال ہے "مادیت" "حصول" "مقابلہ" موجودہ تمدن پر جو یہ الزامات دھرے جاتے ہیں تو یہ سب موجودہ نفسِ انسانی کے اس میلان کا نتیجہ ہیں جو اسے مقدار اور مکانیت کی طرف لے جاتا ہے۔ "حصول" محض ہل من مزید کا نعرہ مارے جاتا ہے "مقابلہ" اس پر تلا ہوا ہے کہ کون بہت کچھ سمیٹ سکتا ہے + "حصول" کی تمنا بے شک ہو لیکن حقیقی قدور کے "حصول" کی "مقابلہ" شوق سے ہو لیکن اس لئے کہ کون سب سے اچھا کام کرتا ہے۔ اس طرح ہم اپنے لئے ہمیشہ ہمیشہ قائم رہنے والے عالی شان قصر بنا سکیں اور زمانہ خود اُن کا محافظ ہو!

غرض اس بات پر کتنا زور بھی دیا جائے کم ہے کہ انسانی شائستگی کا اصلی منبع انسان کا روزانہ کام ہے اور انسان کی کتنی بدقسمتی ہے جب معاشرت کی روحانی شائستگی یعنی فنون اور علم ادب اور مذہب اس عام کام سے علیحدہ ہو جائیں اور مل جل کر مصروف کار نہ ہوں + تمدن کا پہلا فرض ہے کہ اِن مادی اور اِن روحانی اشیا کو ان بچھڑے ہوؤں کو باہمی اتحاد و محبت کے اندر ملا دے ، صداقت حسن نیکی جب تک یہ محض فلسفی یا مذہبی مجردات ہیں تب تک گویا "فرضی فرشتے" ہیں۔ ہم اُن کی حقیقت کو ٹھیک ٹھیک اسی وقت سمجھنے لگتے ہیں جب اُن میں سے ہم کسی کسی کو خود پیدا کرنے لگیں + جب کوئی آدمی دیانت داری کے ساتھ کوئی خوبصورت چیز بنانے لگتا ہے جو بصورتِ دیگر بدصورت بنائی جاتی ، جب کوئی آدمی توجہ کے ساتھ کوئی اچھا کام کرنے لگتا ہے تو گویا سرمدی قدور اور ازلی خوبیاں اُس پر اپنی نعمتوں کی بارش کرنے لگتی ہیں + کوئی سیاست دان بنے یا ایک نظم لکھ دے یا اینٹیں جوڑ کر دیوار بنانے لگے معاملہ ہر حالت میں یکساں ہے + ازلی خوبیاں کوئی غیر مرئی بھوت پریت نہیں ، وہ انسانی محنت کے جیتے جاگتے اصول ہیں ، تم اپنی ذاتی مہارت سے اُن کو مرئی اور مقبول اور سودمند بنا سکتے ہو +

اور یہ سب کچھ محض اشیاء کے ذریعے سے ہو سکتا ہے۔ مادی اشیاء کے ذریعے سے + ہاں اشیاء ! ایمرسن کا قول ہے کہ اشیا پا در رکاب ہیں اور نوعِ انسان پر سوار" وہ نوعِ انسان کو اپنی سواری کے کام میں لاتی ہیں بلکہ وہ

انسانوں کو اپنے گدھے بنا کر، اور انسانوں کا گدھے بن جانا کچھ مشکل نہیں، اُن کو خوب بھگاتی دوڑاتی اور ذلیل کرتی ہیں اِس کا علاج اُنہیں کوسنا اور غم و غصہ سے بے تاب ہو جانا نہیں بلکہ اس حقیقت کے مفہوم کو سمجھنا ہے کہ انسان کائنات کا باشندہ ہے، دوسرے لفظوں میں وہ مادہ کا امانت دار اور اسی لئے ایک روحانی ہستی ہے +

انسان جو کچھ بناتا ہے اُس میں اُس کے نفس کا پرتو صاف نظر آتا ہے بلکہ جو کچھ وہ کھاتا پیتا ہے جو کچھ وہ پہنتا ہے جہاں بھی وہ رہتا ہے اِن سب میں اُس کی جیتی جاگتی تصویریں ہم کو نظر آتی ہیں + ہر بنی ہوئی شئے پر انسان کی شخصیت نقش ہوتی ہے لیکن اسی طرح ہر ایسی شئے انسان کی شخصیت پر بھی اپنا نقش چھوڑ جاتی ہے + انسان ہی چیزوں کو نہیں بناتا چیزیں بھی انسان کو بناتی ہیں۔ پس ہمیں چیزوں کے بنانے اور کاموں کے کرنے میں تن دہی سے کام کرنا چاہیئے۔ کیونکہ ہر شئے جو ہم بنائیں ہر کام جو ہم کریں ہر بات جو ہم کہیں اِن سب کی مہر ہمارے نفس پر ہمیشہ کے لئے ثبت ہو جاتی ہے۔

تمدّن کی ترقی کے لئے مادے کے صحیح مصرف کے علاوہ اشتراکِ عمل یا امدادِ باہمی کی سخت ضرورت ہے + ہر معاشری معاہدے میں خواہ وہ شادی کی صورت اختیار کرے یا مجلسِ اقوام کی متحد ارادوں کا مسلسل طور پر اپنے اتحاد کے ارادے کی تجدید کرتے رہنا اور یوں اُسے استوار بناتے رہنا لازم ہے + عہد نامے اور اقرار نامے محض جب وہ قسما قسمی اور اقرار اور عہد اور دستخط تک محدود ہو کر رہ جائیں محض کاغذ کے ٹکڑے ہوتے ہیں اور قوت و زندگی سے خالی + معاشری زندگی ہے تعاونِ خود افزا، ایک نہایت دشوار مہم! زمانہ معاہدوں کا دشمن ہے + زن و شوہر کے درمیان محبت محض عقد ہو جانے سے قائم نہیں رہ سکتی۔ جب تک وہ روز بروز اسے اپنی مساعی سے زندہ نہ رکھتے رہیں + قوموں کے معاہدوں کا اور بھی بُرا حال ہے۔ موسیو شر لو لیئے کے اندازے کے مطابق ۱۵۰۰ ق م سے لیکر ۱۸۶۰ء تک آٹھ ہزار معاہدے قوموں کے مابین کئے گئے۔ اِن کا اوسط دوران دو سال تھا + شادی سے لے کر صلح ناموں تک شکستہ معاہدوں کے ہزاروں لاکھوں ٹکڑے تاریخ کے ساحلوں پر جا بجا بکھرے پڑے ہیں +

تعاون یا امدادِ باہمی کے معنی ہیں انسانی ارادوں کی مختلف طاقتوں کا مل جل کر ایک مشترک مدعا کی طرف چل نکلنا + تعمیر و تخریب کی کیا کیا صورتیں نظر کے سامنے آجاتی ہیں! ایک طرف ہے انسانی ارادوں کی موجودہ دنیا جس میں یہ ارادے عموماً متناقض کوششوں اور باہمی ہلاکتوں میں صرف و تباہ ہوتے ہیں۔ دوسری طرف تخیل ایک نئی دنیا دکھاتا ہے جس میں یہ متحدہ مساعی بغیر اپنی قوت کو ضائع کئے مشترک مقاصد کے حصول کے لئے کامرانی کے ساتھ یلغار کرتی ہوئی بڑھی چلی جاتی ہیں۔ یہ ہے امدادِ باہمی کی وہ دنیا جس کی تخلیق ہمارا مطمعِ نظر ہے +

"تعاون" ایک دوسرے کی مدد، ہم کاری، ارادوں کا اتحاد یہی ہے وہ مضبوط بنیاد جس پر مختلف معاشری منصوبوں کی تعمیرات کھڑی کی جاسکتی ہیں۔ مثلاً مجلسِ اقوام کا قصر، اشتراکیت کا مکان، مزدوری انجمنوں کی عمارتیں + اور وہی اتحاد

دیرپا ہوتے ہیں جن کے مقاصد زیادہ بلند ہوں مثلاً تعلیمی ادارے، یونیورسٹیاں، معابد لیکن وہ جن کا مطلب محض ادنٰی قسم کی مطلب برآری ہو مثلاً شہوت رانی، زرگری وغیرہ ایسے اتحادوں کی مدت نہایت مختصر ہوتی ہے اور وہ جلد انجام پذیر ہوجاتے ہیں۔ بے شک بقول شخصے محبت نہ کرنے سے محبت کرنا بہتر ہے گو محبت کھوئی کیوں نہ جائے" لیکن اس کا یہ مفہوم بھی نہیں کہ شادی نہ کرنے سے شادی کرنا اور پھر طلاق دے دینا بہتر ہے۔ یعنی انسانوں میں جو اتحاد بھی ہو وہ صحیح معنی میں اتحاد اسی وقت کہلا سکتا ہے جب وہ مسلسل خواہش سے تقویت پاتا رہے اور ایک خاص سمت میں رواں ہو، نہ صرف یہ کہ سکون کی ایک منجمد حالت میں رہے، نری اک دوسرے کے پاس پاس کی زندگی، بغیر توانائی کے، بغیر جوش کے، صرف اک یہ احساس لئے ہوئے کہ ہم اک دوسرے کے عاشق زار ہیں۔ انسان ایک دوسرے کے سچے "رفیق" اگر ہوسکتے ہیں تو صرف مشترک محنت اور ہم کاری کے اک ماحول میں۔ اور انسانی محبت کی بہترین نشوونما اگر ہوسکتی ہے تو صرف سودمند کاموں میں مل جل کر حصہ لینے سے۔ انجیل میں آیا ہے کہ "ایک دوسرے سے محبت کرو اپنے کاموں میں" بیشک اس کرمگ میں وہی محبت پائدار و شیریں ہوتی ہے جو مصروفیت کی فضا میں پھولے پھلے۔ مرد عورت کی باہمی محبت بھی ایک مدعا کے حصول کے لئے ہے اور بغیر مسلسل تعاون کے مرجھا جاتی ہے۔ امدادِ باہمی کے یہ معنی نہیں کہ ایک دفعہ مل کر باہمی مدد کا وعدہ کرلیا اور انسانی ارادے کو گویا چھٹی مل گئی۔ نہیں بلکہ یوں اس ارادے کے لئے ایک نیا اور زیادہ دشوار کام پیدا ہوجاتا ہے جس کی مناسب انجام دہی صحیح ترقی کا باعث ہے۔ ایک متحد تمدن میں اس کی ساری توانائی مصروفِ کار ہوتی ہے۔ وہ ایک ہوائی جہاز کی مانند ہے جسے برابر چلتے رہنے کی ضرورت لاحق ہے۔ جہاں وہ رکا وہ گرا، غرض امدادِ باہمی کوئی آسان کام نہیں۔ یہ بھی ایک اعلیٰ درجے کا مشکل کھیل ہے جس میں ہر کھلاڑی اپنی جماعت کے جیتنے کا خواہاں ہے لیکن اگر وہ ہار جائے تو نہ وہ اپنے ساتھیوں سے دست و گریباں ہوتا ہے نہ خود ہمت ہار دیتا ہے بلکہ شکست میں بھی اسی طرح سرفراز رہتا ہے جیسے فتح میں۔ امدادِ باہمی بہادروں کا کام ہے یہ بزدلوں کا پیشہ نہیں ہوسکتا۔

امدادِ باہمی کی بہترین مثالوں میں آج کل کی بوائے سکاؤٹس کی تحریک ہے جس کے اندر ایک کھلاڑی کی شرافت ایک کاروباری آدمی کا ربط و ضبط اور ایک نوجوان کی ہمت و مردانگی سب ملی جلی کام کرتی ہیں۔ اس میں شبہ نہیں کہ ہماری تعمیری شہریت ایسے ہی نظامات کی گود میں پل رہی ہے۔

مادہ کا صحیح استعمال، انسانوں کی باہمی اعانت کیا اس سے تمدن اور ترقی کے مسائل حل ہوگئے؟ ہم شروع میں دیکھ چکے ہیں کہ ہمیں اپنی زندگی کے مقاصد کو "مسائل" نہ سمجھنا چاہئے۔ زندگی ہمارے لئے ایک مسئلہ نہ ہو جس کے مکمل حل اور صحیح جواب ہی سے ہماری تسلی ہوسکے بلکہ وہ اک معرکہ ہو مسلسل اور ہمیں یہ کاوش نہ رہے کہ ہم اس کی کشمکش سے نجات پائیں۔

زندگی کی کشمکش! "کش" اور "مکش"۔ "تم کش" میں مصروف رہو "مکش" خود بخود آکر تمہارا دامن پکڑ لے گی۔ معاشری

کشاکشیں ایسی متمدن زندگی ہے، ایک اینچا تانی ایک کھینچ ایک تناؤ + بلکہ ساری کی ساری کائنات ایک عظیم الشان کل ہے جس میں اینچا تانی کا ایک وسیع سلسلہ جاری ہے۔ جس کے اندر پرزوں کی ایک دوسرے سے رگڑ گویا اُن کی مخاصمت کا آخری نتیجہ ساری کل کے مجموعی تعاون وتعامل میں ظہور پذیر ہوتا ہے۔ یہاں کوئی ایک تاگا بھی نہیں کہ ڈھیلا ہو یا بے مصرف بلکہ تمام تنے ہوئے ہیں اور مضبوط، اسی تناؤ سے باہم وابستہ و زندہ جو بظاہر انہیں توڑنے اور فنا کر دینے پر تلی ہوئی ہے + کسی زندہ نظام کی کشاکش کو ڈھیل دے دو اور بس۔ تم نے اس اصول کا جو اُسے قائم رکھے ہوئے ہے یوں استیصال کر دیا گویا تم نے خود اس نظام کو توڑ مروڑ دیا۔ ہر دو حالتوں میں نظام تباہ ہو جاتا ہے کیونکہ اس کی روح و رواں اُسی کشاکش میں ہے +

ہمارا شعور بھی ایک نوع کی کشاکش ہے جو ہماری توجہ کو کسی خاص موضوع یا مقصد پر مبذول رکھتا ہے + ہمارے کسی مقصد کا حصول کبھی اک نری سیر نہیں ہو سکتا بلکہ وہ ہوتا ہے ہمیشہ مدِ مقابل کا مقابلہ اور اسی کا شعور ہے جو ہمیں زندہ چست وچاق اور قابل بنائے رکھتا ہے۔ ہمیں اپنے پاؤں پر کھڑا ہو سکنا سکھا دیتا ہے +

کشاکش کا یہ شعور عموماً لوگوں کو ایک مصیبت اور آفت بن کر نظر آتا ہے۔ بلا شبہ کشاکش درد خیز ہے اور اس کا حد سے بڑھ جانا غم انگیزی کا باعث ہو جاتا ہے بالخصوص اگر ہم یقین کرنے لگیں کہ زندگی کو صرف پسندیدہ احساسات ہی کی خواہش رکھنی چاہئے لیکن جیسا کہ ظاہر کیا جا چکا ہے انسان کی فطرت اگر خوشیوں سے لطف اندوز ہونے کے لئے ہے تو ساتھ ہی تکلیفوں کے برداشت کرنے کے لئے بھی ہے + حقیقت یہ ہے کہ زندگی کا "امرِ واقع" نہ لذت و انبساط ہے نہ درد والم بلکہ اِن دونوں کی بیک وقت موجودگی کی کشاکش کا شعور + جو انسان پورا شعور حاصل کر لیتے ہیں اُن کی خوشیوں میں درد کا اور اُن کے درد میں بھی خوشی کا ایک عنصر برابر موجود ہوتا ہے + ڈکٹر ہیوگو کا قول ہے کہ "پورا خوش ہونا بھی ایک آفت ہے" آفت اس لئے کہ ہم جانتے ہیں کہ یہ خوشی دیرپا نہیں۔ وقت کا گھُن اُس کو لگا ہوا ہے + اُدھر پاسکل کا قول ہے کہ جب مصیبت کی حد ہو جائے تو انسانی شعور کو نجات کی امید ہونے لگتی ہے + زندگی نہ محض خوشی ہے نہ محض درد بلکہ خوشی اور درد دونوں زندگی کے مرکب کے لئے ضروری ہیں۔ جیسے آکسیجن اور ہیڈروجن پانی کے لئے + زندگی محض درد نہیں لیکن اس میں کچھ شبہ نہیں کہ درد زندگی کا لازمی جزو ہے۔ زندگی ہمیشہ درد آفریدہ اور ایک حد تک درد پروردہ ہے ڈاکٹر ایڈلر کا قول ہے کہ "نوع انسان کے تمام بڑے نصب العین درد آفریدہ ہیں" + وہ ہیں جوابات جو انسان کی دلیر روح نے قسمت کے درد والم کی دھمکیوں کو دیئے۔ شکست، عزیزوں کی موت، اپنی موت کی اصلی اور نقلی دھمکیاں اور درد والم کی اور ہزاروں صورتیں جو انسان کے گرد و پیش منڈلاتی رہتی ہیں + معاشری خدمت کے نصب العین کی بھی یہی نوعیت ہے معاشری زندگی کی جو اونچ نیچ نیک مردوں عورتوں کی آنکھ میں کھٹکتی ہے اُسی سے معاشری خدمت کا احساس پیدا ہوتا ہے + پس معاشری خدمت کی روح بھی کشاکش کی روح ہے۔ اُس میں معاشری ارادہ ایک مخالف طاقت کا مقابلہ کرتا نظر آتا ہے +

غرض گو یہ درست ہے کہ بغیر گاہے گاہے کے غیر ذمہ دار ساکن اوقات کے زندگی ہم سب کے لئے ایک مسلسل عذاب ہو جائے تاہم اس امر سے انکار نہیں ہو سکتا کہ جُوں جُوں تمدن کی سطح بلند تر ہوتی ہے زندگی کی کشاکشیں بجائے کم ہونے کے زیادہ ہو جاتی ہیں۔ جوں جوں زندگی کی قدور بڑھتی ہیں اُن کے ضائع ہو جانے کا خطرہ بھی بڑھ جاتا ہے اور اسی لئے اُن کے بچانے کا فرض بھی روز بروز زیادہ اہم ہو جاتا ہے + معاشرت اپنے ارکان کی ذمہ داری کے کم کرنے سے نہیں بلکہ ہمیشہ اُس کے زیادہ کرنے سے ترقی پاتی ہے +

یہ معاشری کشاکشیں کیوں پیدا ہوتی ہیں؟ شاید ان کا وجود اور مقصد مسٹر چسٹرٹن کی اس مثال سے واضح ہو جائے کہ محراب کے اطراف میں گرنے کا میلان ہی محراب کو استوار کئے رکھتا ہے۔

"محبت کی عالمگیری" پر بہت تقریریں کی گئی ہیں کہ محبت ہی "معاشری مسائل" کا یقینی اور بہترین علاج ہے + لیکن واقعہ یہ ہے کہ محبت کی راہ کبھی پوری صاف نہیں ہوتی۔ پائدار محبت وہ نہیں ہوتی جس کی راہ میں رکاوٹیں نہ ہوں بلکہ وہی جوان تمام رکاوٹوں کو توڑ کر اُن سے عبور کر جائے + سچی محبت مخالفت کی متوقع ہوتی ہے اور اُس سے بے نیاز ہو کر اُس کا مردانہ وار مقابلہ کرتی ہے + بدھ لوگ کہتے ہیں کہ محبت نفرت کا اخراج کرتی ہے۔ ہاں اخراج ضرور کرتی ہے لیکن یہ خارج شدہ نفرت باہر محبت کے گھر کے دروازے پر ہی کھڑی رہتی ہے کہ موقع ملے اور یہ پھر اندر آگھسے + محبت جہاں وہ محض ایک شہوانی یا خیالی جذبہ ہو ہمیشہ ناقابل اعتبار اور کمزور ہوتی ہے۔ محبت کا قیام و استحکام اس امر کا متقاضی ہے کہ دو محبت کرنے والوں کے درمیان اور اُن کے سامنے کوئی نہ کوئی تیسری شئے ہو جن پر اُن کی باہمی محبت مشترکہ طور پر اپنی مساعی کو صرف کر سکے اور اس صورت میں اپنی زندگی کو قوی تر اور زندہ تر بنا کر قائم رکھے اور دائم بنائے + یہ تیسری شئے اُن دونوں کی نگاہ میں ایک مشترک مقصد ہو ایک منتہائے کمال۔ خواہ وہ بچّے ہوں یا کوئی معاشری تحریک یا اُن کا شہر یا مملکت یا نوعِ انسان ہی یا کوئی مذہبی نصب العین غرض کچھ ہو لیکن کچھ نہ کچھ ہو ضرور کہ محبت اگر تعاون کی کوئی نہ کوئی شکل اختیار نہ کرے گی تو ایک شعلہ کی طرح آہستہ آہستہ بجھ کر رہ جائے گی +

پروفیسر رائس نے محبت کی اس خاصیت کی طرف خاص طور پر توجہ دلائی ہے اس ضمن میں اُسکی ایک تمثیل بہت دلچسپ ہے وہ کہتا ہے کہ چونکہ مجھے اپنے دوست سے محبت ہے میں چاہتا ہوں کہ جب مجھے کوئی کام کی بات کہنا ہو وہ اسے سن لے۔ اسی طرح میرا دوست چاہتا ہے کہ جب اُسے کوئی ایسی ہی بات کہنا ہو میں اُس کی سن لوں + طرفین کی اس مماثل خواہش کا نتیجہ جلد یا بدیر لازم طور پر یہ ہوگا کہ ہم دونوں بیک وقت اپنی اپنی کہنا چاہیں گے اور اس کا لازمی نتیجہ کسی نہ کسی قسم کے تنازعہ کی صورت میں نکلے گا + یہ ایک عجیب بات ہے کہ جتنا زیادہ اقوام اور افراد کو ایک دوسرے سے قریب کا تعلق ہوگا اتنی ہی جلد وہ ایک دوسرے کے گلے کا ہار ہو جائیں گے + جب دو آدمی ساتھ ساتھ چل رہے ہوں تو اُن کا ایک دوسرے کی راہ میں مزاحم ہونا زیادہ ممکن ہے بہ نسبت اس حالت کے جب وہ ایک دوسرے سے کوسوں دور ہوں +

محبت و منافرت کے بارے میں انسان کے فطری میلانات کیا ہیں؟ کیا انسان فطرتاً اپنے ہم جنسوں سے محبت رکھتا ہے یا نفرت؟ کیا وہ دوسروں کی اعانت کرنا چاہتا ہے یا مخالفت؟ ٹامس ہابز ایک سترھویں صدی کا انگریز فلسفی کہتا ہے کہ انسان فطرتاً جھگڑالو ہے اور فساد کو پسند کرتا ہے اور دشمنی زندگی کا تین چوتھائی حصہ ہے۔ انسان کو صلح پسند بنانے کے لئے تلوار کی ضرورت پڑتی ہے اور یوں مملکت ظہور میں آتی ہے۔

اٹھارھویں صدی کے مشہور فرانسیسی مفکر روسو نے انسانی فطرت کے متعلق اس کے عین برعکس نظریہ قائم کیا۔ روسو کا خیال ہے کہ انسان فطری طور پر اپنے ہم جنسوں سے محبت رکھتا ہے اور یہ محبت برابر قائم رہتی اگر "قانون سازی کی شیطنت" بیچ میں مخل نہ ہو جاتی۔ مملکت کے قیام نے نوعِ انسان کو تباہ کر دیا ہے۔ حال کے بعض مشہور ماہرینِ علم الانسان کا بھی یہی خیال ہے کہ انسان فطرتاً ایک خونخوار جانور نہیں ہے۔

ان دو متضاد و متناقض خیالات کے تطابق اور اس مسئلے کے حل کی کوشش اور نہایت کامیاب کوشش شہرۂ آفاق جرمن فلسفی کانٹ نے کی ہے۔ وہ کہتا ہے کہ انسان فطرتاً اپنے ہم جنسوں سے محبت بھی رکھتا ہے اور نفرت بھی۔ اس کا نہ اپنے ہمسایوں کے ساتھ گذارہ ہے اور نہ اس کے بغیر۔ انسان کے سب ساتھی چھین لو اور وہ دنیا کی تنہائی کو سخت محسوس کریگا۔ اُسے ایک ساتھی دے دو تو جلد ہی یا دیر میں وہ اس سے لڑنے جھگڑنے لگ جائیگا۔ اس کی کیا وجہ ہے؟ کانٹ کہتا ہے کہ اس کی وجہ انسان کی ان مل ملنساری میں مضمر ہے جس کا نتیجہ ہے معاشرتی کشاکش۔ ایک طرف تو یہ حالت ہے کہ ہم نے ایک نہایت منتظم معاشرتی نظام وضع کیا ہے جس میں فرد پر روز بروز زیادہ معاشرتی قیود عاید ہوتی جاتی ہیں اور دوسری طرف معاشرت اپنی شائستگی اور اپنی تعلیم کے ذریعے سے افراد کی شخصیت کو ترقی دے رہی ہے جس کا لازم نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ وہ بات بات میں اپنی ذاتی آزادی پر زور دیتے ہیں۔ اس تضاد سے وہ کشاکش پیدا ہوتی ہے جو زندگی اور بالخصوص آج کل کی متمدن زندگی کی امتیازی خصوصیت ہے۔ کانٹ نے اس الجھن کو خوب سلجھایا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ یہ کشاکشیں وہ ذرائع ہیں جو قدرت نے انسان کی بہترین قوتوں کو ابھارنے کے لئے وضع کی ہیں۔ "انسان آرام سے زندگی گذارنا چاہتا ہے لیکن قدرت جو اُس سے بہتر جانتی ہے کہ وہ کیوں بنایا گیا تھا" (گویا اِنّی اَعلَمُ مَا لا تَعلَمُون کہہ کر) اُسے مشکل کام کرنے کو دیتی ہے اور اُسے تکلیفوں میں ڈال دیتی ہے تاکہ وہ اپنے غموں کے حلقے سے بالاتر و بلند تر ہو کر ایک بہتر انسان بن جائے۔

انسانی برادری کو عموماً ایک ایسی جماعت سمجھا گیا ہے جس کا مقصد مل جل کر خوشیوں سے لطف اُٹھانا ہے۔ بیشک یہ بات بھی اُس کے مقاصد میں شامل ہے لیکن اس پر بس نہیں۔ انسانوں کا کام نہ صرف مل کر خوشی میں حصہ لینا ہے بلکہ مل کر ایک دوسرے کے غموں میں بھی شریک ہونا ہے۔ اسی لئے معاشرتی جرات اس قدر اہم اور کارآمد شے ہے اور اسی لئے اگر عوام کے سامنے "خوشی" کو منتہائے زندگی قرار دیا جائیگا تو نتیجہ معاشرت کی کمزوری اور بزدلی ہوگا۔ آخری سانسوں تک درد کی چوٹیں ہر ایک کو سہنی پڑیں گی۔ یہی ایک راہ ہے جس سے انسان "غموں کے حلقے" سے بلند تر ہو سکتا ہے۔

آج کل ہم اخلاقی نقاہت کا شکار ہو رہے ہیں جو زندگی کو خوشی کی ترازو میں تولنے کا لازمی نتیجہ ہے اور جس کا اثر کم و بیش تمام طبقوں پر پڑ رہا ہے + اس قسم کے زمانے میں لوگوں کی قوتِ ارادی کو مضبوط کرنے کی اشد ضرورت ہے تاکہ وہ کشمکش کی زندگی کو پیٹھ دکھا کر پیچھے کو نہ بھاگ نکلیں بلکہ آگے بڑھ کر اُسے لبیک کہیں + جہاں تک اس نوع کی تبدیلی محض پند و وعظ یا تقریر و تحریر سے پیدا کی جاسکتی ہے ہمیں چاہیئے کہ ہم اس بات کی تعلیم دیں کہ انسانی تمدن کا منتہائے کمال خوشی نہیں بلکہ خوبی ہے تاکہ اخلاقی توانائی کی ندی کا پانی دنیا کے روزانہ کام کی چکّی کو چلائے جس سے اِدھر ہم قوی ہوں، اُدھر نوعِ انسان کے روح و رواں میں صحیح تمدن کا خون دوڑے +

اگر ان اصولوں کو مان لیا جائے تو ہمیں معاشری خدمت کے اصول کے لئے ایک مضبوط بنیاد مل جائے + معاشری خدمت کی اہمیت کا آج کل ہر کسی کو اقرار ہے۔ لیکن معاشری خدمت صرف ہماری فرصت کے اوقات میں اور ہمارے فالتو روپے سے سرانجام نہیں ہوتی بلکہ اس کی اصلی بنیاد ہمارے روزانہ کام کی نیت میں مضمر ہے۔ سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ کیا یہ کام خوش اسلوبی سے سرانجام دیا گیا ہے؟ کیا ہم نے حتی الامکان اپنی پوری کوشش اس کی عمدگی میں صرف کی ہے؟ کیا ہم نے اپنے شہروں کو اُن کی دی ہوئی قیمت کا پورا نعم البدل دیا ہے یا کیا ہم نے اُن کی آنکھوں میں خاک جھونک کر فقط اپنا اُلّو سیدھا کیا ہے؟ یہ ہے معاشری خدمت اور صنعتی اخلاق کا مسئلہ + کون انکار کرسکتا ہے کہ معاشری اور انسانی خدمت کی دوسری صورت یعنی برضائے خود اپنا مال اور وقت لوگوں کی بہبود اور بہی خواہی میں صرف کرنا لائق صد تحسین ہے، مقامی حکومت کے مختلف شعبوں میں، ہسپتالوں کے انتظامات میں، تنگ و تار اور غلیظ گلی کوچوں کی کشادگی اور صفائی میں، غریب بچوں کی نگہداشت میں، طرح طرح کے امراض کے سدباب میں، شراب خواروں، مجرموں اور فاحشہ عورتوں کی اصلاح میں ہزاروں شخص سینکڑوں مفید کام کر رہے ہیں جن سے نوعِ انسان کو معتدبہ فوائد حاصل ہوتے ہیں اور موجودہ تمدن کی اکثر گذرے ہوئے تمدنوں پر فوقیت صریح طور پر ثابت ہو جاتی ہے + یورپ یا امریکہ کے کسی بڑے شہر کو اگر ہم ایک نظر میں دیکھ سکیں تو ہم حیران رہ جائیں کہ وہاں کتنے مرد اور عورتیں بے غرضی سے، دلیری سے، بغیر کسی ستائش کی تمنا کے، بغیر کسی صلے کی پروا کے، بے شمار مشکلوں اور دقتوں اور نا امیدیوں کے ہوتے ہوئے کیونکر خود بخود نیکی کے ہزاروں کاموں میں مصروف و منہمک رہتے ہیں۔ یوں انسانی ہمدردی اور محبت کی ایک لہر کئی پیاسے اور دکھیا کے بدنصیب شہریوں کا کلیجہ ٹھنڈا کرتی ہے + کون انکار کرسکتا ہے کہ وہ تمدن جو ایسے ایسے مخیّر اور ایسے ایسے رضاکار پیدا کرے ہزاروں خوبیوں کا حامل اور لاکھوں امیدوں کا علمبردار ہے!

مگر جب یہ پوچھا جائے کہ وہ برائیاں اور کمیاں کہاں سے آئی ہیں جن کے دور کرنے اور پورا کرنے کے لئے اتنی شجاعت دنیا اضافی کی ضرورت در پیش ہے تو اس کا صرف ایک ہی جواب ہے کہ ان برائیوں اور کمیوں کے وجود کا سبب معاشری خدمت کے اس دوسرے شعبے کی ناکامی میں مضمر ہے جو ہر کارکن اور دستکار کے روزانہ کام سے متعلق ہے جو اس سے تقاضا کرتا

ہے کہ وہ اپنا کام تن دہی اور ایمانداری کے ساتھ سرانجام دے + یہ معاشرتی برائیاں صاف ظاہر کرتی ہیں کہ انسانی جماعت کو انسانی افراد نے اپنی خراب کارگذاری سے کس حد تک ذلیل کر دیا ہے۔ یہی معاشرتی خرابی کا سب سے بڑا سبب ہے +

آنے والے زمانے کے اخلاق دنیا کے روزانہ کام کو خوبی سے کرنے پر منحصر ہونگے۔ یہ ہوگی وہ مضبوط و پائدار بنیاد جس پر آئندہ کے آرٹ اور اخلاق اور مذہب اپنی اپنی تعمیرات بنائیں گے اور ان تعمیرات کی خوبی و بلندی کی کوئی حد نہ ہوگی + فن صنعت کے ساتھ متحد ہوگا محنت تعلیم کے ساتھ۔

اپنا کام بخوبی سرانجام دینے کا قانون اتنا ہی قیمتی ہے جتنی کہ خود کائنات + اسے اپنی زندگی کا جزو لاینفک بنا کر ہم کائنات کے باشندے بن سکتے ہیں، خدا کے ساتھ کام کرنے والے، جو زمانے کو ہماری دنیا میں اس طرح چکر دیتا رہتا ہے جیسے قوت کسی کل کو اور جو اجزا کی غیر محدود مخالفتوں کے اندر سے کل کا شاندار تعاون و تفاعل پیدا کرتا رہتا ہے، ایک ایسی کائنات کی روح جس کے لئے وہی کشاکش فی الحقیقت ہر لمحہ حیات بخش ہے جو ہر وقت تباہی اور موت کی دھمکی دیتی ہے +

ایڈمنڈ برک کہتا ہے کہ ہم متمدن انسانوں کا یہ کام ہے کہ ہم اپنے نفوس میں فیاضی اور دیانت داری کے جذبات کو ابھاریں، بڑھائیں۔ ہمارے گھر بار کی زندگی میں جو دلکش خوبیاں ہیں ہم ان کو عوام کی خدمت میں عمل میں لائیں۔ ہم محب وطن بنیں لیکن اس طرح کہ ہم اپنی انسانیت کو نہ بھول جائیں۔ ہم دوستیاں بڑھائیں اور دشمنیوں سے نہ ڈریں۔ ہماری دوستیاں اور دشمنیاں دونوں مضبوط ہوں لیکن منتخب۔ ان میں ہم نرم دل ہوں اُن میں اٹل۔ ہم اپنے اصولوں کو اپنے فرائض اور اپنے حالات کے سانچے میں ڈھالیں۔ ہم یہ جی سے مان لیں کہ تمام وہ نیکی جو نا قابل عمل ہے محض ناکارہ ہے اور شوق سے ایک ایسی راہ میں جہاں ہم اثر اندازی اور توانائی کے ساتھ مصروف عمل ہو سکیں غلطیاں کرنے کے خطرے میں پڑ جائیں بجائے اس کے کہ اپنے روز و شب یوں پڑے پڑے گذار دیں کہ نہ ہم پر کوئی الزام عاید ہو اور نہ ہم دنیا میں کسی کے کام آسکیں۔

اجتماعی زندگی تن دہی اور جاں فشانی اور جاں فروشی کی زندگی ہے جو اپنا کام کرتے ہوئے سوچتا ہے وہ اپنے فرائض کو کماحقہٗ انجام نہیں دیتا +"

بشیر احمد

راحت کدہ[۱]

(۱)

شورشِ آبادِ جہاں سے سخت گھبرایا ہوا ہوں میں
بہرِ تسکیں تیری تربت پہ کھنچ آیا ہوں میں
رہ گیا ہے آہ! باقی کیا دلِ برباد میں
چند آنسو چند آہیں نذر کو لایا ہوں میں

(۲)

تیرے جلووں سے دلِ زار بھرا رہتا ہے
تیرے جلووں سے ہے آباد بسا رہتا ہے
تیری ہی یاد ہیں لب بند ہیں لیکن دل میں
گرچہ چشمک ہے آنکھیں ہیں بپا رہتا ہے
ایک ہنگامۂ خاموش بپا رہتا ہے

(۳)

میں جب شبستانِ تنہائی میں تجھ کو یاد کرتا ہوں
ترے جلووں سے اپنی خلوتیں آباد کرتا ہوں
عجب لذت سی پاتی ہے مجھے فریاد و شیون میں
سراپا درد ہو جاتا ہوں اور فریاد کرتا ہوں

(۴)

فصلِ گل ہے یا خزاں کا دور ہے کس کو ہوش ہے
میرے سینے میں بپا طوفانِ غم کا جوش ہے
ایک جوئے نغمہ تھمی ہے شب کی چاندنی
شاعری افسردگی ہے نالہ خاموش ہے

اثر صہبائی

[۱] حضرت اثر صہبائی نے "راحت کدہ" کے عنوان سے درد انگیز قطعات کا ایک سلسلہ لکھا ہے۔ یہ تمام اشعار انہوں نے اپنی جواں مرگ رفیقۂ حیات کی یاد میں لکھے ہیں جنہیں وہ راحت کے لقب سے مخاطب کیا کرتے تھے۔ اس لحاظ سے قطعات کا یہ سلسلہ "راحت کدہ" کہلاتا ہے۔ "ہمایوں"

انگریزی شاعری میں محبّت کا تصور

(۲) محبت کے التباس کا ایک دلپذیر پہلو قدیم شناسائی کا احساس ہے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ محبوب سے کسی قدیم زمانے میں جسے گزرے مدتیں ہوگئیں اور کسی ایسی جگہ جو ہمیشہ کے لئے فراموش ہوگئی پہلے بھی جان پہچان اور محبت رہ چکی ہے میں سمجھتا ہوں تم میں سے اکثر کے مشاہدے میں یہ بات آئی ہوگی کہ جب کسی نئی اور حد سے زیادہ مسرت بخش چیز کا احساس باصرہ یا سامعہ میں شدید ہیجان پیدا کردیتا ہے تو اس کی جدت یا انوکھے پن کی حس تقریبًا بالکل مٹ جاتی ہے تمہیں یہ معلوم نہیں ہوتا کہ تم کسی نئی چیز کو دیکھتے یا سنتے ہو بلکہ یوں معلوم ہوتا ہے گویا مدتوں سے پہلے تم اس چیز سے بہت اچھی طرح واقف تھے۔ مجھے یاد ہے کہ ایک مرتبہ میں ٹوکیو کے ایک چھوٹے سے دل کشا مضافاتی شہر میں ایک جاپانی لڑکے کے ساتھ سفر کررہا تھا اور ابھی ہم بڑے بازار میں داخل ہوتے ہی تھے کہ لڑکا بے اختیار بول اُٹھا: "اوہو، میں نے تو یہ جگہ پہلے بھی دیکھی ہے!" دراصل اُس نے یہ جگہ پہلے کبھی نہ دیکھی تھی کیونکہ وہ تو اوساکا کا رہنے والا تھا۔ اور اس سے قبل اُس نے اُس بڑے شہر سے باہر کبھی قدم نہیں رکھا تھا۔ لیکن ایک نئے تجربے کے سرور نے ایک ایسی چیز کے متعلق اُس کے دل میں آشنائی کا احساس پیدا کردیا جس سے فی الحقیقت وہ ناآشنا تھا۔ مجھے آشنائی و ناآشنائی کے اِس عقدے کے حل کرسکنے کا دعوےٰ نہیں ہے۔ یہ اب بھی اسی طرح ایک گہرا راز ہے جس طرح روم اکبری کے فاضل خطیب سسرو کے لئے یہ ایک گہرا راز تھا۔ لیکن ہر اس شخص پر جو محبت کرچکا ہے غالبًا ایک آدھ لمحہ کے لئے یہ کیفیت طاری ہوئی ہے کہ "میں اس عورت سے پہلے بھی واقف رہ چکا ہوں" لیکن کب؟ اور کس جگہ؟ یہ بھید ہیں۔ زمانۂ حال کے شعرا میں سے بعض نے اس احساس کو حسن وخوبی کے ساتھ نظم کیا ہے۔ اس کی بہترین مثال جو مجھے یاد ہے روزیٹی کے دل نشیں اشعار موسوم بہ "تنویر ناگہاں" ہیں ؎

میں پہلے بھی ضرور یہاں آچکا ہوں۔

لیکن کب اور کس طرح، یہ میں کیونکر بتاؤں؟

دروازے کے سامنے جو گھاس اگی ہے میں اُسے پہچانتا ہوں

یہ تیز میٹھی خوشبو،

یہ سسکیاں لیتی ہوئی آواز، یہ ساحل کے گرد کی روشنیاں، سب مجھے

یاد ہیں۔

تم کبھی پہلے بھی یقیناً میری ہو چکی ہو ———
اگرچہ میں یہ نہیں کہہ سکتا کہ اسے کتنا عرصہ گزر گیا۔
لیکن اس ابابیل کی پرواز پر
جوں ہی تمہاری گردن یوں مڑی
ایک پردہ گر پڑا ——— میں نے یہ سب کچھ پہلے بھی دیکھا تھا۔

کیا یہ سب کچھ پہلے بھی یوں ہی ہو چکا ہے؟
اور کیا وقت کا تیز رو گرداب اسی طرح
ہماری زندگیوں کے ساتھ ہم دونوں کی محبت کو نہیں لوٹائے گا۔
خواہ موت اور فنا کتنا ہی زور لگائیں؟
اور کیا دن اور رات مل کر ایک بار پھر سرور کا ایک ایسا ہی نقش نہیں
چھوڑ جائیں گے؟

غالباً تمہیں اعتراف ہوگا کہ یہ شعر نہایت لطیف ہیں۔ اسی شاعر نے یہ مضمون بعض اور نظموں میں جو زیادہ پیچیدہ قسم کی ہیں یکساں خوبی کے ساتھ باندھا ہے لیکن اس دور کے ایک اور شاعر آرتھر اوشافینیسی کے دماغ میں یہ خیال روزیٹی سے بھی زیادہ چکر لگاتا رہتا تھا۔ روزیٹی کی طرح اُس نے بھی والہانہ محبت کی تھی اور محبت میں ناشاد و نامراد رہا تھا۔ اُس کی نظمیں جو اب مشہور ہیں اس درد و حسرت کا نتیجہ تھیں جس سے اُس کا دل معمور تھا۔ اسی طرح گانے والی چڑیوں کے متعلق جو پنجرے میں پیدا ہوئی ہوں کہا جاتا ہے کہ اگر اُن کی آنکھیں نکال دی جائیں تو وہ پہلے سے زیادہ خوش الحانی کے ساتھ گاتی ہیں۔ یہاں میں ایک مثال دیتا ہوں ع

ابھی ابھی باغ کی روشوں کے ساتھ ساتھ
میں نے پھولوں کو بولتے ہوئے سنا
سفید گلاب نے مجھ سے تمہاری پیشانی کا ذکر کیا
اور سرخ گلاب نے تمہارے رخساروں کا
کنول نے تمہارے جھکے ہوئے سر کی داستان سنائی۔
اور سنبل نے تمہارے پر پیچ و خم بالوں کی
ہر پھول کتنا حسین کتنا پیارا معلوم ہوتا تھا مگر پھر بھی اُس کی زبان سے یہ

صدا آتی تھی۔
کہ تمہارا حسن بہت زیادہ دلکش تھا۔

یہاں سے پلٹ کر میں جنگلوں میں پہنچا
اور میں نے طائرانِ صحرا کو یہ راگ گاتے ہوئے سنا
کہ تمہاری ادائیں کتنی شیریں تھیں، وہ اسی طرح گاتے رہے
اور بار بار یہی ایک گیت، یہی ایک ترانہ اُن کے سروں سے نکلتا تھا —
طوطی اور کوئل اور بلبل لگاتار اُنہیں سروں کو دہراتے تھے
اور رہ رہ کر پھر اسی نغمے کو شروع کرتے تھے
کیونکہ تمہاری ادائیں بہت زیادہ شیریں تھیں

اور یہاں سے گزر کر میں سمندر کے کنارے پہنچا
جہاں اس کو بھی میں نے ہلکی ہلکی سرگوشیوں میں
اسی قدیم راز کا ایک حصہ دہراتے سنا
جو سب کا سب مجھ سے اور تم سے بنا ہے،
کہ کس طرح کئی ہزار برس گزرے ہیں۔
میں نے تمہیں اپنا دل دیا تھا اور تم میں دلبری کی سب ادائیں موجود تھیں۔
اس سے زیادہ مجھے تم سے دور رہنے کی تاب نہ رہ سکی، اس لئے
میں پلٹ کر پہنچا اور تمہارے قدموں میں گر پڑا۔

آخری بند میں علی الخصوص اسی خیال کا اظہار کیا گیا ہے جس کا ذکر میں تم سے کر رہا تھا لیکن ایک نظم بعنوان "یادِ اکبر" میں یہ خیال زیادہ وضاحت سے ظاہر کیا گیا ہے۔ یادِ اکبر سے مراد اس زندگی سے ماورا گزرے ہوئے منازلِ زیست کی یاد ہے یہ قطعہ انیسویں صدی کی اس شاعری میں شامل ہو گیا ہے جو باقی رہے گی اور مناسب ہے اس میں سے بعض بہترین بند یہاں پڑھے جائیں ؎

حرماں نصیب دل میں مدّتوں تک
محبت کے آنسوؤں اور آہوں سے بھری ہوئی داستان دبی رہی

ـــــ اُس بہشت کی جس کی تعمیر دو انسانوں نے مل کر شروع کی
اور اُس دہشت کی جس نے ان دونوں کو گھسیٹ کر الگ کر دیا۔
جب ایک کے ہاتھوں محبت کا خون ہو گیا لیکن دوسرے نے
اپنے دل میں محبت کے لئے ایک مزار بنایا۔

طویل مدتیں اپنے بھاری سست رو قدموں کے ساتھ خاموشی سے گزرتی رہیں
اور وہ محبت اسی طرح اپنے مزار میں پڑی رہی اور وہیں
چپکے چپکے بدلتی رہی۔
یہاں تک کہ ایک دن اپنے نہاں خانے کے کنج سے
ننگ اور خجالت اور رسوائی کے داغ کی بجائے
محبت ایک نورانی چہرہ لئے ہوئے اُٹھی،
جیسے کوئی فرشتہ شہر خموشاں سے چلا آتا ہے۔

اُس نے وہ پتھر ہٹایا جو لحد پر لگا ہوا تھا
ـــــ اُس لحد پر جسے دل نے اپنے اندر اب تک محفوظ رکھا تھا
لیکن رنج والم اندر ہی اندر گل گل کر فنا ہو چکا تھا۔
اور اُس دروازے سے جو مدتوں بند رہا تھا
ایک پیاری صورت نکلی جو نہ تو وہ گناہ تھی
اور نہ وہ رنج جو پہلے وہاں دبا ہوا تھا۔

× × × × × × × ×

اُس چہرے پر جو جان سے زیادہ محبوب تھا
اب کسی ایک آنسو کا نشان بھی نہ تھا۔
یہ پہلے سے زیادہ حسین تھا مگر پھر بھی وہی تھا
یہ پرانی محبت کا پاکیزہ ترجز و تھا
اور صبح اولین کا وہ خواب تھا

جس کا دیکھنا اجڑے ہوئے دل کو پھر نصیب ہوا۔
یہ اُن تمام باتوں کا علم تھا جو کبھی صرف عالم خیال میں گزری تھیں
یہ وہ چیز تھا جو محبت کرنے والی روح میں چھپی رہی تھی۔
یہ وہ حرف تھا جو لب، پر نہ آسکا تھا
کہ ماضی کو زنجیر عذاب سے مخلصی دیتا یا دوبارہ حاصل کرتا
یہ اُس سے بہت زیادہ تھا جو لے لیا گیا تھا۔
اور آخرکار دل کو پھر واپس مل گیا تھا

وہ درد جس کا سحر کام نہ آسکا وہ گلاب کا پھول جو وہیں مرجھا گیا جہاں گرا تھا۔
وہ نگاہ جو بے سود آوارۂ جستجو رہی
وہ آہ جو ہمیشہ بے تاثیر رہی
ان سب کو دل نے دوبارہ پالیا۔
اور ساتھ وہ سب کچھ تھا جسے دل ایک محفوظ امانت کی طرح
پھر صحیح وسلامت دیکھنا چاہتا تھا

نسبتہً سادہ الفاظ میں اس حکایت کو یوں سمجھو کہ ایک نوجوان مرد اور نوجوان عورت آپس میں کچھ عرصے تک محبت کرتے رہے۔ پھر کسی بہت بڑے جرم کی وجہ سے دونوں کو الگ ہونا پڑا، غالباً عورت نے بے وفائی کی۔ مگر اس جرم کے باوجود جو اُس سے سرزد ہوا تھا، مرد نے ہمیشہ اُسے محبت سے یاد رکھا۔ دونوں مر گئے اور آغوش لحد میں جا سوئے اور ان کی مٹی زمین کی مٹی میں مل گئی۔ لیکن کائنات کے جاودانی نظام میں ایک پاک محبت کبھی مر نہیں سکتی خواہ جسم مرکر گزر جائے آخر نسل ہا نسل کی مدت منقضی ہوگئی اور وہ پاک محبت جو اس شخص کو ایک بری عورت سے تھی ایک اور مرد کے دل میں پیدا ہوئی۔ یہ وہی محبت تھی مگر پھر بھی وہی نہ تھی۔ اُدھر اُس عورت کی روح نے بھی جس نے مدتیں ہوئیں وہ جرم کیا تھا دوبارہ جنم لیا۔ جب یہ دونوں ملے تو اس جذبے کے ماتحت ایک دوسرے کی طرف کھنچ آئے جسے عوام عشق کہتے ہیں۔ لیکن جو دراصل "یادِ اکبر" یعنی گزشتہ زندگیوں کی یاد ہے۔ اب اُن کے لئے ہر طرف مسرت ہی مسرت ہے کیونکہ دونوں کی فطرت کا کمزور اور بدتر پہلو واقعی فنا ہو چکا ہے۔ اسے وہ صدہا برس پیچھے چھوڑ آئے ہیں اور اب اُن کی روح کے صرف بلند اور ارفع حصہ کو دوبارہ پیدائش ملی ہے۔ "وہ سب کچھ جسے نہ ہونا چاہئے تھا اب نہیں ہے اور وہ سب کچھ جسے ہونا چاہئے تھا اب ہے"۔ یہ دراصل مسئلہ ارتقا کی تعلیم ہے لیکن ساتھ ہی اُس میں شاعرانہ مبالغے کو بھی دخل ہے کیونکہ بنی نوعِ انسان کی فطرت کا وہ جزو جو اخلاقی اعتبار

سے زشت و زبون ہے اتنا جلد فنا نہیں ہوتا جتنا شاعر نے فرض کر لیا ہے۔ شاید ہزاروں لاکھوں برس گزر گئے تب کہیں جا کر ہم اپنی چھوٹی چھوٹی خطاؤں سے نجات پا سکیں گے۔ بہرحال شاعر کا خیال دلچسپ ضرور ہے اور بے اختیار یہ امید کرنے کو جی چاہتا ہے کہ یہ سب باتیں حقیقت میں صحیح ثابت ہوں۔

ہمارے وقت کے شعرا جب محبت کی حکایتوں کا سراغ اس زندگی سے ماورا پیچھے تک پہنچاتے ہیں تو یہ سمجھنا بالکل قرینِ قیاس ہے کہ بعینہٖ یہی عمل انھوں نے دوسری سمت کے متعلق بھی کیا ہوگا۔ میری مراد بہشت کے دائمی وصال یا اس قسم کی دوسری باتوں سے نہیں بلکہ محض اس الفت سے ہے جو موت کے بعد بھی برقرار رہے۔ اس سلسلہ میں بعض بہت دلآویز مضمون پیدا کئے گئے ہیں لیکن ان سے تمہیں ویسی دلچسپی نہ ہوگی جیسی ان نظموں کے ساتھ جو گزرے ہوئے متازل ہستی کی یاد کے متعلق ہیں۔ جب ہم ماضی کو تخیل کی آنکھ سے دیکھتے ہیں تو ہمارے لئے کوئی ایسی چیز ضرور ہوتی ہے جس کی بنیاد پر ہم اپنے تصورات قائم کر سکیں۔ گزرے ہوئے دن گزرے ضرور ہیں، اس میں چون و چرا کی کوئی گنجائش نہیں۔ یہ حقیقت کہ ہم اس وقت زندہ ہیں بطورِ احسن اس دوسری حقیقت کی تصدیق کرتی ہے کہ ہم لاکھوں یا کروڑوں برس پہلے بھی زندہ تھے۔ لیکن جب شاعر مستقبل پر نظر ڈالتا ہے کہ وہاں سے اسے کوئی مضمون سوجھے تو معاملہ بالکل دگرگوں ہوتا ہے۔ وہاں اسے قیاس دوڑانا پڑتا ہے مگر اس میں تجربہ یا اس قسم کی کوئی اور چیز جو اس کے تخیل کے لئے بنیاد کا کام دے سکے موجود نہیں ہوتی۔ یہ تو ظاہر ہے کہ اگر دوسرے جنم کے بعد ہم پھر پیدا ہوں تو ہم بہت سی باتوں کے متعلق قیاس دوڑا سکتے ہیں لیکن موت اور نئی زندگی کے درمیان کا وقفہ اس قدر پراسرار ہے کہ اس کا علم ہمیں ہو ہی نہیں سکتا۔ چنانچہ اس سلسلہ میں شاعر خواب کے واردات پر حصر کرتا ہے۔ کرسٹینا روزیٹی نے اپنی بلندپایہ نظم "ایک وقفہ" میں ایسی ہی ایک حالت کا نقشہ کھینچا ہے :-

گھر کے لوگوں نے کمرے کو پھول پتوں سے بہشت بنا دیا۔\
اور اُس بستر کو جس پر میں لیٹی تھی گل ہائے بہار سے معطر کر دیا،\
اس وقت میری روح جسے محبت نے گرفتار کر رکھا تھا رک رک کر قدم\
اٹھاتی تھی۔\
منڈیر پر بیٹھی ہوئی چڑیوں کا چہچہا مجھے سنائی نہ دیتا تھا۔\
اور نہ میں اناج کے گٹھوں کے پاس فصل کاٹنے والوں کی بات\
چیت ہی سنتی تھی۔\
البتہ میری روح روز و شب چشم براہ رہتی تھی\
میری پیاسی روح کسی کی راہ دیکھتی تھی جو وہاں موجود نہ تھا ـــــــــ

اور میں سوچتی تھی کہ شاید اُسے محبت ہے، شاید وہ بھول نہیں گیا،
شاید وہ میرے لئے کڑھتا ہے۔

آخر زینے پر وہی قدم سنائی دیا۔
قفل پر ہاتھ کی وہی جنبش تھی جس سے میں خوب آشنا تھی۔
اُس گھڑی پہلے پہل یہ معلوم ہوا کہ نسیم فردوس کے جھونکوں کی خوشبو
میری روح تک آرہی ہے،
اُس گھڑی پہلے پہل وقت کی سست رفتار ریگ کی روانی سنہری
ہوگئی۔
اور مجھے معلوم ہوا کہ میرے بالوں پر ایک نور برسنے لگا ہے۔
اور میری روح میں ایک نئی وسعت پیدا ہوگئی ہے۔

عورت مر چکی ہے اس کمرے میں جہاں اُس نے جان دی مرنے والی کے لئے چڑھاوے کے طور پر پھول رکھ دیئے گئے ہیں۔ بستر پر بھی پھول بچھا دیئے گئے ہیں۔ عورت کی روح کو یہ سب کچھ نظر آتا ہے مگر ان چیزوں کی وجہ سے اس کو نہ کوئی مسرت ہوتی ہے نہ رنج۔ اس کے دل میں صرف اپنے زندہ عاشق کی یاد ہے جو اس کی موت کے موقع پر وہاں نہ تھا بلکہ کہیں بہت دور تھا۔ وہ یہ جاننا چاہتی ہے کہ واقعی اُس کو مجھ سے محبت تھی اور کیا واقعی وہ یہ سُن کر ملول ہوگا کہ میں دنیا سے رخصت ہوگئی۔ مرنے والی کے کمرے کے باہر پرندے گیت گا رہے ہیں اور کھڑکیوں کے سامنے کے کھیتوں میں کسان کام کر رہے ہیں اور ساتھ ساتھ باتیں کرتے جاتے ہیں لیکن روح اِن آوازوں کو بالکل نہیں سنتی۔ وہ کمرے میں صرف محبت کی خاطر رکی ہوئی ہے اور اس وقت تک نہیں جاسکتی جب تک عاشق وہاں پہنچ نہ جائے۔ آخر اُسے اُس کے آنے کی آہٹ سنائی دیتی ہے۔ وہ اس کے قدموں کی چاپ پہچانتی ہے اور صرف یہی نہیں بلکہ جب دروازے کے قفل پر اُس کا ہاتھ پڑتا ہے تو وہ اس آواز کو بھی پہچانتی ہے۔ اور پھر آکیا گی، اس سے قبل کہ عاشق پر اس کی ایک نگاہ بھی پڑی، اُسے مسرت محسوس ہوتی ہے ابھی سے اس کو یہ معلوم ہوتا ہے کہ وہ بہشت کے پھولوں کی خوشبو سونگھ سکتی ہے اُسے یوں معلوم ہوتا ہے کہ اس کے سر کے گرد ایک ہالہ نور کھنچ رہا ہے جیسا فرشتوں کے سروں کے گرد ہوتا ہے اور اصلی بہشت جو بہشتِ عشق ہے قریب آپہنچی ہے۔

یہ شعر کس قدر دلآویز ہیں! ابھی ایک مصرع اور ہے جس کو الگ طور پر تشریح کے ساتھ سمجھنا چاہئے میرا اشارہ اس فقرے کی طرف ہے جس میں "ریگ وقت کی روانی کے سنہرا ہو جانے" کا ذکر ہے۔ شاید تم کو یاد ہوگا کہ یہی تشبیہ

ٹینی سن کی نظم "لاکسلے ہال" میں بھی استعمال ہوئی ہے۔

محبت نے وقت کا شیشہ اٹھا لیا اور اسے اپنے دمکتے ہوئے ہاتھوں میں گھمایا

اور ایک ایک لمحہ ہلکی سی جنبش پا کر، اپنی روانی میں سنہری ریت بنتا ہوا بہتا گیا

یہاں وقت کو شیشۂ ساعت کی ریت سے تعبیر کیا گیا ہے اور "روانی" سے مراد ریت کا شیشے کے بالائی حصے سے نچلے حصے میں ٹپکنا ہے بہ الفاظ دیگر باریک ریت بالکل اسی طرح "رواں" ہوتی ہے جس طرح پانی۔ یہ کہنا کہ "ریگِ وقت کی روانی سنہری ہو گئی" یا ریت تبدیل ہو کر سونا بن گئی، صرف اس حقیقت کے بیان کا ایک شاعرانہ طریقہ ہے کہ وقت محض خوشی ہی سے نہیں گزرا بلکہ ایک ایسی کیفیت اس پر طاری ہو گئی کہ وہ بہشتی یا آسمانی معلوم ہوتا تھا۔ اب تمہیں اندازہ ہو گا کہ اس چھوٹی سی نظم میں جہاں عورت کی روح اپنے عاشق کے آتے ہوئے قدموں کی آہٹ کا انتظار کر رہی ہے، ریگِ وقت کی یہ تلمیح کس قدر دل نشین بن گئی ہے۔

اب محبت کے جذبے کے بعض اور پہلوؤں پر جدا جدا بحث کی جا سکتی ہے۔ ان میں سے ایک پہلو جو خصوصیت سے دلآویز ہے گزری ہوئی باتوں کی یاد ہے۔ یہ تو خیر ظاہر ہی ہے کہ محبت کی یاد آنے والی باتوں کے کئی پہلو ہوتے ہیں جن میں سے بعض سراپا مسرت اور بعض انتہا درجے کے غمناک ہوتے ہیں مثلاً کسی پہلی ملاقات یا وداع کے لمحے کی یاد۔ اس قسم کی باتوں کی یاد سے انگریزی کی عشقیہ شاعری کا خزانہ بھرا ہوا ہے میں صرف تین مثالیں دوں گا لیکن ہر مثال کی نوعیت جداگانہ ہو گی۔ پہلا شاعر جس کا میں ذکر کرنا چاہتا ہوں کونٹری پیٹمور ہے۔ اُس نے نظم کی دو عجیب کتابیں لکھی تھیں جن میں سے ایک کا نام "گھر میں فرشتہ" اور دوسری کا "نامعلوم عشق" ہے۔ ان میں سے پہلی کتاب میں اُس نے اپنے معاشقے اور شادی کی تمام داستان لکھی ہے۔ کسی شاعر کے لئے اس قسم کے کسی کام کا بیڑا اٹھانا خطرے سے خالی نہیں لیکن پیٹمور کی نظم کامیاب رہی۔ دوسری کتاب متفرقات کا مجموعہ ہے اور اس میں بعض نہایت نفیس چیزیں ہیں۔ میں ایک نظم بعنوان "امیلیا" سے صرف چند شعر نقل کرتا ہوں۔ اس نظم میں ایک شام کا قصہ بیان کیا گیا ہے جو کسی محبوبہ کے ساتھ بسر ہوئی جو شعر میں نقل کر رہا ہوں اُن میں اس وقت کا ذکر ہے جب عاشق لڑکی کو گھر تک پہنچانے کے لئے جا رہا ہے۔ یہ شعر اب خاصے مشہور ہو چکے ہیں۔

. . . . . دھندلے بازار تک

میں نے اُس کے مقدس قدموں کی رہنمائی کی۔

اور اس طرح بیٹی کو

نرم و نازک پتنگے کی سی، شیریں ادا والی

گلِ دمشق کی طرح بھر آئی ہوئی اور مشک کے مانند شرمگیں

بیٹی کو ماں کے حوالے کر دیا جو دھندلکے میں تشویش کے ساتھ راہ دیکھ رہی تھی

لہ شوخ رنگ؟

اور اب "شب بخیر!"

شاعر لڑکی کا ذکر آخر اس انداز میں کیوں کرتا ہے؟ وہ اس کے قدموں کو مقدس کیوں کہتا ہے؟ لڑکی نے ابھی ابھی اس سے شادی کا وعدہ کیا ہے اور اب وہ اسے بالکل ایک آسمانی ہستی معلوم ہوتی ہے لیکن اپنی لطیف ترین حسیات کو ادا کرنے کے لئے اُس نے چند نہایت سادہ الفاظ ڈھونڈ لئے ہیں۔ "بازار" دھندلا ہے، اس لئے کہ رات کا وقت ہے۔ اور اس وقت وہ دوشیزہ جو خوبصورت پوشاک میں ملبوس ہے ایک نظر فریب پتنگے کی طرح معلوم ہوتی ہے۔ رات کی تتلیوں کو انگلستان میں "پتنگے" کا نام دیا جاتا ہے۔ انگلستان میں پتنگے اصلی تتلیوں سے بہت زیادہ خوبصورت ہوتے ہیں۔ ان کے پر قرمزی اور ارغوانی اور بھورے اور سنہرے رنگ کے ہوتے ہیں۔ پس یہ تشبیہ اگرچہ انگلستان کے مقامی حالات سے مخصوص ہے مگر بہت عمدہ ہے۔ ساتھ ہی پتنگے کی اڑان کے بے صدا ہونے کی طرف بھی کنایہ ہے۔ "گل دمشق کی طرح بھڑکیلی" پر زور تشبیہ ہے اور یہ صرف اس لئے کہ گل دمشق ایک عجیب شاندار پھول ہے جو انگلستان کے باغات میں گلاب کی تمام قسموں میں سب سے زیادہ شوخ رنگ کا پھول ہے۔ "مشک کے مانند شرمگیں" ایک اچھوتی اور ذرا انوکھی سی تشبیہ ہے۔ "مشک" ایک خوشبو ہے جسے انگریز اور جاپانی خواتین سبھی استعمال کرتی ہیں لیکن یہ ایک ایسی خوشبو ہے جسے صد درجہ سلیقے اور احتیاط سے برتنا پڑتا ہے۔ مشک کے لگانے میں خفیف سا شائبہ بھی اگر اندازے سے زیادہ لگ جائے تو نتیجہ اچھا نہیں رہتا لیکن اگر مناسب مقدار ٹھیک ٹھیک استعمال کی جائے اور ذرا سی زیادتی بھی نہ ہو تو کوئی خوشبو اس سے زیادہ پیاری نہیں ہوتی۔ گویا "مشک کی طرح شرمگیں" کا اشارہ دوشیزگی کے اُس حجاب کی طرف ہے جس سے ذرے کے برابر بھی کوئی لغزش نہیں ہو سکتی۔ یہ وہ لطیف حیا ہے جو بجز لطیف ہونے کے کچھ اور ہو ہی نہیں سکتی۔ با ایں ہمہ یہ اعتراف کرنا پڑتا ہے کہ یہ تشبیہ محسوس کرنے کی ہے، سمجھانے اور تشریح کرنے کی نہیں۔

جن تین مثالوں کے پیش کرنے کا وعدہ میں نے کیا تھا اُن میں سے دوسری مثال رابرٹ براؤننگ کے اشعار سے ہوگی۔ اس مثال میں ایک ایسا احساس نظم کیا گیا ہے جس پر شعراء نے اگرچہ کم توجہ دی ہے لیکن یہ احساس عشاق کے لئے مخصوص ہے۔ میری مراد اس خواہش سے ہے کہ جب ہم بہت خوش ہوتے ہیں یا کسی دلچسپ چیز کی طرف دیکھ رہے ہوتے ہیں تو اس وقت ہم اپنی مسرت میں محبوب کو بھی شریک کرنا چاہتے ہیں، لیکن اس کا اتفاق بہت ہی کم ہوتا ہے۔ کہ حقیقت میں بھی یہ خواہش اور یہ شرائط یکجا پورے ہوں۔ اس آرزو کا خیال کرکے براؤننگ نے ایک چھوٹی سی نظم لکھی جس نے اب مستند اور بلند پایہ اشعار کا مرتبہ حاصل کر لیا ہے۔ یہ انیسویں صدی کے بہترین جواہر ریزوں میں سے ہے۔

کبھی یہ نہ ہوا کہ وقت اور جگہ
اور محبوب سب باہم میسّر ہو سکتے!
یہ رہگزار ——— چلنے میں کتنا نرم و لطیف ہے!

یہ بہار —— ہائے کیسا جادو بھرا موسم ہے!

۲

میرے محبوب کا چہرہ کہاں ہے؟
ایک خواب میں اُس محبوب کا چہرہ میرے چہرے سے ملتا ہے
لیکن مکان تنگ ہے اور جگہ وحشت خیز اور ہوا کے جھکڑ کی زد میں،
باہر مینہ اور آندھی نے ایکا کر رکھا ہے ——
اگر میں بولنا چاہوں تو کان لگا کر چوری چوری سننے کا
میرے سرخ ہوتے ہوئے رخسار کو اپنی عناد پرور آنکھ سے دیکھنے کا
اور میرے خلاف ایک ایسے کینے سے کام لینے کا جو میری ایک ایک
جنبش میرے ایک ایک لفظ کی خبر رکھتا ہے!

اس دنیا میں کبھی سب چیزیں حسب مراد نہیں ملتیں۔ ایک خوشگوار دن، ایک دل پسند جگہ اور محبوب کا قرب سب کے سب ایک ہی وقت میں کبھی نصیب نہیں ہوتے۔ کسی نہ کسی چیز کی کمی ضرور رہ جاتی ہے۔ اگر جگہ اچھی ہو تو شاید موسم خراب ہوتا ہے یا اگر جگہ اور موسم خوش آئند اور نفیس ہوں تو وہ عورت جس سے محبت ہو موجود نہیں ہوتی۔ شاعر جب اپنے آپ کو ایک خوبصورت جگہ میں پاتا ہے تو اسے یہی خیال آتا ہے اور معاً اس کے دل میں محبوبہ کے ساتھ اپنی گزشتہ ملاقات کی یاد تازہ ہو جاتی ہے۔ یہ ملاقات ایک چھوٹے سے تاریک اور سرد مکان میں ہوئی تھی۔ مکان سے باہر بارش ہو رہی تھی اور جھکڑ چل رہا تھا۔ آندھی اور مینہ کی آوازیں چھپ کر باتیں سننے والوں کی آوازوں کے مانند تھیں یا اُن لوگوں کی آوازوں کے مانند جو چوری چوری کھڑکیوں میں سے جھانکنے کی کوشش کر رہے ہوں۔ یہ تو ظاہر ہے کہ کسی مجبوری کی وجہ سے یہ ملنا چوری چھپے کا ملنا تھا اور بحیثیت مجموعی یہ ملاقات بہت زیادہ مسرت افزا نہیں تھی۔

تیسری مثال ایک نہایت دلکش نظم ہے لیکن ہمیں صرف اس میں سے ایک اقتباس لے کر ہی اکتفا کرنا پڑے گا۔ یہ ایک منگنی کے دن کی یاد ہے اور لکھنے والا فریڈرک ٹینی سن ہے۔ غالباً تم جانتے ہو کہ ٹینی سن کے نام کے تین بھائی تھے۔ اور اگرچہ الفریڈ شاعرانہ کمال میں سب پر سبقت لے گیا لیکن سبھی اچھے شاعر تھے:

موسم بہار کی ایک سنہری صبح ہے
میرا چہرہ زرد ہے لیکن اس کے رخساروں پر شگفتگی کی حرارت دوڑ رہی ہے
اور ہم اس پرانے کمرے میں اکیلے رہ جاتے ہیں
اور وہ ایک راگ گانے لگتی ہے۔

کھلا ہوا دریچہ نسیم کے جھونکوں میں لرز رہا ہے
اور ایک بڑا سا گلاب کا پھول اپنا شبنمی حسن
کمرے کے اندر ایک ہنستے ہوئے چہرے کی طرح جھکائے ہوئے ہے۔
اور اس کے گرد شہد کی مکھیاں تیرتی پھرتی ہیں

× × × × × × ×

مجھے کچھ معلوم نہیں کہ میں نے کیا کہا صرف وہ جواب جو اس کے لبوں سے نکلا۔
ایک ہمیشہ رہنے والی دھوپ کی طرح اب بھی میرے دل میں چمکتا ہے
اور پھر میں نے محبت سے بھری ہوئی آواز میں آہستہ سے کہا، آہ ہم کبھی جدا نہ ہوں
میری پیاری، میری جان، میری دلہن!

اس عظیم الشان شادمانی کے بعد ہم پر خاموشی
اسی طرح چھا گئی جیسے کوئی خوشگوار سایہ ۔ اور میں نے سنا
کہ بہت دور جنگل آہیں بھر رہا ہے اور ایک طائر بہار
درختوں میں گا رہا ہے

اس خوش نوا طائر کا نغمہ مسرت جو چاروں طرف لہرا رہا تھا
درختانِ صحرا کی ہلکی صدائیں اور لاجوردی آسمان
سب میرے دل پر نقش ہو گئے، اگرچہ نہ کانوں اور نہ آنکھوں کو
کسی منظر یا آواز کی خبر تھی۔

وہ آرام سے اپنے سنگِ تربت کے نیچے سو رہی ہے
لیکن ہائے یہ تمام نظارہ اسی قدر صاف نظر آتا ہے
کہ مجھے یہ یقین ہونے لگتا ہے کہ مرنے والی پھر قبر سے اٹھائی گئی یا موت

آئی ہی نہ تھی

اگر میں اپنے آپ کو یہاں یکہ و تنہا نہ پاؤں۔

کسی لمحۂ محبت کی اس قدر روشن اور زوردار تصویر کھینچنا کمالِ فن کی دلیل ہے۔ آؤ اس کی چند خوبیوں پر غور کریں۔ عاشق کا چہرہ اس لئے فق ہو رہا ہے کہ وہ تشویش اور اضطراب میں مبتلا ہے۔ وہ اپنی محبوبہ سے ایک سوال کرنے والا ہے گر ڈرتا ہے کہ معلوم نہیں وہ کیا جواب دے۔ اس واقعے کو پیش آئے مدت گزر چکی ہے، سالہا سال ہو چکے ہیں مگر اس صبح کے گہرے اور پُر روز جذبات اپنی ہر تفصیل کا ایک حیرت انگیز طور پر واضح نقش حافظے پر چھوڑ جاتے ہیں۔ اتنے برس گزر جانے کے بعد بھی اُس شخص کو کمرے کی صورت، دھوپ کا کمرے میں پڑنا، گلاب کے قرمزی پھول کا باغ میں سے اندر کی طرف رخ کئے ہوئے ہونا اور مکھیوں کا اس کے گرد بھنبھنانا سب کچھ یاد ہے اور پھر جب سوال پوچھا جا چکا اور اس کا جواب باصواب مل گیا تو خوشی کے مارے دونوں کے منہ سے کوئی بات نہ نکل سکتی تھی۔ اس خاموشی کی وجہ سے قدرت کی باہر سے آنے والی تمام صدائیں اس قدر واضح ہو گئیں کہ اُن کے احساس میں ایک درد کی سی کیفیت پیدا ہو گئی۔ اب وہ یاد کرتا ہے کہ کس طرح اس کمرے میں بیٹھے ہوئے اُس نے بہت دور کے درختوں میں ہوا کی سنسناہٹ اور ایک پرندے کا گیت سنا تھا۔ ساتھ ہی اُسے اُس دن کے تمام رنگ اور روشنیاں بھی یاد آجاتی ہیں۔ لیکن اس بات کو بہت لمبا، بہت ہی لمبا عرصہ گذر چکا ہے اور وہ مر چکی ہے۔ تاہم اس کے دل میں اس واقعے کی یاد اتنی صاف اور روشن ہے کہ اسے یوں معلوم ہوتا ہے جیسے وقت کی رفتار رک گئی ہے یا وہ قبر سے پھر واپس آگئی ہے۔ صرف ایک چیز اسے بتاتی ہے کہ یہ جو کچھ بھی ہے اس کی حقیقت پرانی باتوں کی یاد سے زیادہ نہیں ـــــ وہ اکیلا ہے۔

اب التباسِ محبت کے موضوع کی طرف رجوع کرتے ہوئے میں اس حقیقت کی طرف اشارہ کرنا چاہتا ہوں کہ یہ فریب ہر صورت میں جاتا نہیں رہتا۔ ان صورتوں میں جب محبت کامیاب ہو اور مسرت آمیز طور پر ملاپ ہو جائے یہ فریب ہمیشہ جاتا رہتا ہے۔ اس وقت قدرت کو اپنے عظیم مقاصد کی تکمیل کے لئے اس کی ضرورت نہیں رہتی۔ لیکن ناکامی، موت (......) یا محبوب لڑکی کے ہاتھ نہ آنے کی صورت میں اکثر ایسا ہوتا ہے کہ عالمِ تصوّر کی تمثال کبھی غائب نہیں ہوتی بلکہ دل پر عمر بھر اس طرح چھائی رہتی ہے کہ مٹائے نہیں مٹتی اور اس طور پر اس میں اتنی قدرت ہوتی ہے کہ نہایت ہی کامیاب زندگی کو بھی ناشاد و نامراد بنا دے۔ بعض اوقات اس قسم کی ناکامی کا نتیجہ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ کسی شخص کے خیالات دنیا اور زندگی اور مذہب کے متعلق بالکل پلٹ جائیں۔ اور پھر اس کے لئے ہر چیز پر ہمیشہ تاریکی اور یاس کا سایہ محیط رہتا ہے۔ بہت سے نوجوان محبت میں مایوس ہوتے ہیں تو اسی وقت سے ان کی مذہبی حس بھی فنا ہونے لگتی ہے محض اس لئے کہ تقدیر اُن کے ساتھ نامہربانی سے پیش آتی ہے اُن کو یوں معلوم ہوتا ہے جیسے کائنات کی

بنیاد ہی ٹیڑھی ہے۔ بخلاف اس کے کامیاب عاشق یہ سمجھتا ہے کہ دنیا کے انتظامات ٹھیک چل رہے ہیں۔ وہ اپنے معبود کا شکر بجالاتا ہے اور مذہب اور انسانی فطرت پر اس کا ایمان پہلے سے زیادہ مضبوط ہو جاتا ہے۔ مجھے اس وقت کوئی ایسی قابلِ ذکر انگریزی نظم یاد نہیں جس سے اس حقیقت پر روشنی پڑتی ہو۔ لیکن فرانسیسی زبان میں وکٹر ہیوگو کی ایک چھوٹی سی نفیس نظم ہے جس سے سیدھی سادھی طبیعتوں میں کامیاب عشق اور مذہبی وجدان کا باہمی رشتہ بخوبی واضح ہو جاتا ہے۔

نظم کا موضوع محض ایک رات کی چہل قدمی ہے۔ نوخیز دلہن اپنے شوہر کے بازو کا سہارا لئے چل رہی ہے شوہر کے دل میں اس رات کی جو یاد ہے یوں ظاہر کی گئی ہے۔

میں نے اُس ساعدِ سیمیں کو، جس میں ہلکی سی لرزش تھی،
محبت سے دبایا۔ اور ہمارے خیالات نے
عشق کی دل نواز فتح مندی کا اقرار کیا۔
خدا کی روح عظیم الشان، پیاری پیاری رات پر چھائی ہوئی تھی۔
محبت ہمارے دلوں پر چھا رہی تھی۔
ستاروں کا نور جگمگ جگمگ کر رہا تھا۔

یوں ہی پھرتے پھرتے اور خواب دیکھتے دیکھتے،
وہ خواب جن میں زمین سے لے کر آسمان تک کے تمام جلوے جھلکتے ہیں،
ایسا معلوم ہوا کہ ہماری روحیں بولنے لگیں۔
ستاروں نے تیرے عارض پر نظر ڈالی ——
تیری آنکھوں کو فضائے لاجوردیں سے
ستاروں کی آنکھیں ڈھونڈتی تھیں

اور اژدحامِ کواکب کے نور میں
تو نے محسوس کیا کہ نرم و شیریں رات
رشتہ چیر کر تیری روح سے ہم کنار ہو گئی۔
تو نے کہا: اے سرور و شادمانی کے خدا!

گنبدِ نیلوفری کے مالک!
جزو و کل کو تو نے ہی بنایا ہے!"

اور ستاروں نے دھیمی دھیمی سرگوشیوں میں
فضائے عمیق کے خدا سے کہا: ہم جانتے ہیں،
اے ازل و ابد کے خداوند،
اے ہمارے پیارے مالک، سب عشق و محبت تجھ سے ہے،
ہم نورِ محبت ہی سے تو فروزاں ہیں!
حسن کو تو نے ہی بنایا ہے!"

یہ تو ظاہر ہے کہ اس نظم میں خود احساسِ مذہبی بھی التباسِ محبت ہی کا ایک جزو ہے لیکن اس نے احساسِ عشق میں بہت زیادہ گہرائی اور زیبائی پیدا کر دی ہے۔ اس کے علاوہ یہ نظم ایک صداقت کی نہایت پر زور طور پر توضیح کرتی ہے یعنی جب ہم کو کامل مسرت حاصل ہو تو کائنات خدا کی محبت اور خدا کے جمال کا عکس معلوم ہوتی ہے، بہ الفاظِ دیگر ہم بہشت میں ہوتے ہیں۔ لیکن جس وقت ہم کسی عظیم رنج میں مبتلا ہوں تو دنیا ایک جہنم معلوم ہوتی ہے جہاں نہ کوئی امید ہو نہ خوشی اور نہ کوئی معبود جس سے دعا مانگی جائے۔

لیکن سب سے بڑھ کر جس وجہ سے میں نے وکٹر ہیوگو کی نظم تمہیں سنائی وہ یہ ہے کہ اس میں وہ خاص کیفیت موجود ہے جسے فلسفی نقادانِ ادب کی اصطلاح میں "کونی جذبہ" کہتے ہیں۔ کونی جذبہ انسانی جذبے کی بلند ترین کیفیت ہے۔ لفظ "کون" سے مراد کائنات ہے، صرف یہی دنیا نہیں بلکہ افلاکِ معلومہ کے لاکھوں کروڑوں سورج اور دنیائیں بھی اس مفہوم میں شامل ہیں اس لئے بداہتہً "کونی" کے اسم صفت کے معنی ہوئے "تمام کائنات کے متعلق"۔ یہ ضروری نہیں کہ معمولی جذبہ اپنے علائق یا نسبت کے لحاظ سے محض انفرادی ہی ہو یعنی یہ بالکل ممکن ہے کہ تمہارے احساسات میں کسی ایسی چیز کے خیال یا ادراک سے تحریک پیدا ہو جائے جو صرف تمہاری ہی زندگی سے نہیں بلکہ اور بھی بہت سے لوگوں کی زندگی سے علاقہ رکھتی ہو۔ اس معمولی جذبے کی عظیم ترین شکل وہ ہے جسے احساسِ قومی کا نام دیا جاتا ہے۔ یہ اس تعلق کا احساس ہے جو تمہیں پوری قوم یا پوری نسل کے ساتھ حاصل ہے لیکن جذبے کی اس سے بلند تر شکل بھی ہے۔ جس وقت تم اپنے آپ کو جذباتی طور پر صرف اپنے ملک یا اپنی قوم سے نہیں بلکہ تمام بنی نوع انسان سے متعلق سمجھو اس وقت تم پر تیسرے یا دوسرے درجے کا کوئی جذبہ طاری ہوتا ہے۔ میں نے قصداً "تیسرے یا دوسرے" کہا ہے اس لئے تمہارے جذبے کا دوم یا سوم درجے کا ہونا بڑی حد تک اس پر منحصر ہے کہ تمہارے دل میں بنی نوع انسان

کی وحدت کا کیا تصور ہے۔ لیکن اگر تم اپنے آپ کو محض اس دنیا کے متعلق نہیں بلکہ کروڑوں ستاروں اور سیاروں کی تمام کائنات سے، عالم شہود کے پورے بھید سے متعلق سمجھو تو تمہیں اعلیٰ ترین صنف کا کوئی جذبہ میسر ہو گا یہ ظاہر ہے کہ خود اس میں بھی تدریجات موجود ہیں فلسفی یا مابعد الطبیعیات کے حکیم کا کوئی جذبہ اس جذبہ سے کہیں زیادہ لطیف ہو گا جو شاعر یا سامع کو نصیب ہو سکتا ہے لیکن عشاق پر بہت کثرت سے اپنی اپنی دماغی ترقی و استعداد کے متناسب ایک قسم کا کوئی جذبہ طاری ہوتا ہے اور ورڈز ورتھ کی چھوٹی سی نظم سے اس حقیقت کی توضیح ہوتی ہے۔ رات اور ستارے اور آسمان کا گنبد سب عاشق کی آنکھ کو حسن اور محبت کے جوش سے لرزتے ہوئے معلوم ہوتے ہیں کیونکہ وہ خود ایک محبت آمیز سرور کی حالت میں ہے اور پھر اس کا سلسلۂ خیال ہستی مطلق سے، اس سرِ عظیم سے جو ہر قسم کی صورت اور ہر قسم کے نام سے ماوراء ہے، اپنا تعلق قائم کرنے لگتا ہے۔

اس قسم کے جذبے کی ایک تیسرے یا چوتھے درجے کی مثال کیٹس کی ایک نفیس و جمیل نظم سے لی جا سکتی ہے جو اس نے اپنی موت سے کچھ ہی عرصہ پہلے لکھی تھی۔ کوئی بہت ہی نوجوان شخص یہ شعر لکھ سکتا تھا۔ اس لئے کہ کوئی بہت ہی نوجوان شخص اس انداز میں محبت کرتا ہے لیکن یہ کس قدر دلآویز ہے! اس کا کوئی عنوان نہیں۔

روشن ستارے! کاش تیری طرح میری ہستی کو بھی ثبات حاصل ہوتا ——
اس لئے نہیں کہ میں قدرت کے اس بے خواب گردش کرنے والے شب زندہ دار زاہد کی طرح سکوتِ شب کی پرعظمت تنہائی میں آسمان کی بلندیوں پر معلق رہ کر سدا کھلی آنکھوں کے ساتھ ان جنبش کرتے ہوئے پانیوں کا مشاہدہ کرتا رہوں جو اس خاکی دنیا کے کناروں کے اردگرد سرِ وقت طہارت کے پاکیزہ شغل میں مصروف رہتے ہیں
اس لئے بھی نہیں کہ میں پہاڑوں اور میدانوں پر ملائمت اور آہستگی کے ساتھ گرتی ہوئی تازہ تازہ برف کی سفید چادر کا نظارہ کیا کروں،
نہیں، بلکہ میں اس لئے ایک ثبات پذیر، ایک غیر تغیر آشنا وجود چاہتا ہوں کہ اپنی محبوب سینہ کے نوخیز گداز لئے ہوئے سینے کو تکیہ گاہ بنا کر اس کے ہلکے ہلکے مدوجزر کو محسوس کرنے کے لئے ہمیشہ ایک شیریں بے آرامی کی حالت میں بیدار رہوں اور اس کے دھیمے دھیمے تنفس کی آواز سنا کروں۔
اے کاش! یا تو ہمیشہ میں اسی حالت میں رہوں یا پھر موت مجھے اپنے آغوش میں اٹھالے۔

ٹینی سن نے نہایت دل نشیں انداز میں ایک عاشق کو یہ آرزو کرتے ہوئے ظاہر کیا ہے کہ وہ اپنی محبوبہ کا ہار یا پیٹی یا

کان کا آویزہ ہوتا لیکن یہ کسی صورت میں کوئی جذبہ نہیں کہلا سکتا۔ بلکہ حقیقت یہ ہے کہ ٹینی سن کے گیت کا اصل خیال بعض قدیم فرانسیسی اور انگریزی عشقیہ گیتوں سے لیا گیا تھا جو معمولی کسانوں کے بنائے ہوتے ہیں لیکن کیٹس اس دلکش نظم میں جہاں عاشق یہ آرزو کرتا ہے کہ اسے ایک ستارے کی جاودانی زندگی اور مماثلت نصیب ہو جاتی صرف اس لئے کہ اس کو معشوق کا دائمی وصال حاصل ہو، اس پرانے یونانی خیال کی کچھ جھلک نظر آتی ہے جس نے دو تین ہزار سال قبل یہ نفس مصرعے کہلوائے تھے!

تُو ستاروں کو دیکھ رہا ہے، میرے ستارے! کاش میں ہی آسمان ہوتا،
ہزار آنکھوں سے ستارہ پوش، ہمیشہ تیری ہی طرف دیکھنے کو!

لیکن کیٹس کی نظم میں خیال کے یونانی حسن کے علاوہ کچھ اور بھی ہے۔ کیونکہ یہ شاعر خارجی کائنات کا ذکر وسیع ترین علائق میں کرتا ہے۔ ستارے اُس کے نزدیک ہمیشہ سمندر کے پانیوں کے مدوجزر پر نگاہ جمائے رکھتے ہیں۔ خود یہ مدوجزر ہر وقت دنیا کی طہارت اسی طرح کرتا ہے جس طرح کوئی پجاری کسی مندر کی۔ اس لڑکے کا تخیل پھیلتے پھیلتے فلسفے کا تخیل ہو گیا ہے۔ یہ شاعری فلسفے اور مخلصانہ جذبے کی بہم آمیزی ہے۔

جن نظموں کا مطالعہ ہم نے مل کر کیا ہے اُن سے تم سمجھ گئے ہو گے کہ انگریزی کی عشقیہ شاعری جاپان کی عشقیہ شاعری کی طرح شاخوں میں تقسیم کی جا سکتی ہے یا بہ لحاظِ وسعتِ موضوع اس کی جماعت بندی کی جا سکتی ہے جس کی حد نہایت سادہ احساس کے بیان سے لے کر اُس بلند ترین مرتبے تک پہنچتی ہے جو کوئی جذبے کا اظہار کرتا ہے۔ یہ مضمون بہت سیر حاصل ہے۔ طالب علم کو یہی الجھن ہوتی ہے کہ کس چیز کا انتخاب کرے۔ میں تم سے پھر یہی کہوں گا کہ التباس کے مضمون کی اہمیت کو صحیح طور پر پیشِ نظر رکھو علی الخصوص ان مثالوں کی روشنی میں جو ہم نے مل کر پڑھی ہیں۔ اس میں شک نہیں کہ مغربی دنیا کی عشقیہ نظموں کی ایک تعداد خصوصاً تمہیں کچھ عجیب بلکہ شاید مہمل اور بے وقوفانہ معلوم ہو گی۔ لیکن تم یقیناً اس حقیقت کو تسلیم کرو گے کہ انگریزی زبان کی عشقیہ شاعری کی بعض انواع ایسی ہیں جو نہ عجیب ہیں اور نہ احمقانہ اور جو نہ صرف اپنی جگہ پر بلکہ تمام ادبیات میں اظہارِ جذبات کی بلند ترین صورتوں سے متعلق ہونے کے باعث بدرجۂ اولیٰ مطالعے کے مستحق ہیں۔ نہایت اعلیٰ درجے کی عشقیہ شاعری میں سے بہت کچھ اخذ کیا جا سکتا ہے جو خود تمہاری ادبیات میں جذبات کو ایک نیا آب و رنگ دے کر مالا مال کر دے۔

حمید احمد خاں

انقلاب

تیری نگاہیں کیا پھریں، مجھ سے زمانہ پھر گیا
تیری نظر سے کیا گرا، میں ہر نظر سے گر گیا

ہاروتِ بابل بھی مری مشکل سے عاجز آ گیا
ہر سحر بے تاثیر ہے جس دن سے وہ ساحر گیا

محرومِ اُلفت اب نہ رو، تیرا خزانہ لُٹ چکا
دنیا سے تو خائب اُٹھا عقبیٰ کو تُو خاسر گیا

جس دل سے مہر و ماہ نے پائی مسرت کی ضیا
گھنگھور غم میں پھنس گیا، کالی گھٹائیں گھر گیا

اب جوئبارِ زندگی چپ چاپ سی ہے، ہاں کبھی
اُٹھی صدائے درد جب کوئی کنارہ کر گیا

یاد

یاد اُس کی مجھے اک دن دیوانہ بنا دے گی
آئینِ دو عالم سے بیگانہ بنا دے گی

اُس چشمِ فسوں گر کی جاں سوز فسوں سازی
جینے کی تمنا کو افسانہ بنا دے گی

پھر پاس گھٹا بن کر اُمڈی دلِ مسکیں پر
وحشت مری بستی کو ویرانہ بنا دے گی

اے پیرِ مغاں خوش ہو اب میری سیہ مستی
آفاق کی وسعت کو میخانہ بنا دے گی

ہر فتنۂ گردوں کو صہبا میں ڈبو دے گی
ہر گردشِ دوراں کو پیمانہ بنا دے گی

تھی کس کو خبر یارب! یہ بے بصری مجھ کو
اک شمعِ خیالی کا پروانہ بنا دے گی

نادر علی خاں

جنگ و جدال

ایکٹ دوم

چنار کے درختوں میں ایک کوٹھی، اوپر کی منزل میں ایک چوڑی بیلکونی، جہاں سے چناروں کے درمیان سے سمندر دکھائی دیتا ہے۔ دائیں اور بائیں ایک ایک دروازہ، داہنی طرف کا دروازہ ڈرائنگ روم میں، اور بائیں طرف کا سونے کے کمرے میں کھلتا ہے، جس کا سامان اور فرنیچر نہایت قیمتی اور اعلیٰ قسم کا ہے

پردہ اٹھتے وقت، ولی بائیں دروازے کے سوراخ میں سے جھک کر اندر جھانکنے کی کوشش کرتا نظر آتا ہے۔

ولی (سر اٹھا کر اور ہٹ کر) الٰہی، یہ بھی کیا عمر، اور کیا زمانہ ہے، ساری رات صبح تین چار بجے تک باہر گھومنا، اور پھر دوپہر تک بستر پر پڑے رہنا۔ (ذرا آگے بڑھ کر) سب نوجوان امیر عیش کے سوا اور کوئی کام کرتے ہی کب ہیں۔ (باہر کے دروازے کی گھنٹی بجتی ہے، دوڑ کر بیلکونی میں جاتا ہے۔ اور وہاں سے نیچے دیکھتا ہے) کوئی آیا۔ اوہو، یہ تو آنیفقہ آئی ہیں۔ کاہے کو آئی ہیں (داہنے دروازے سے جاتا ہے تھوڑی دیر میں آنیفقہ کے ساتھ واپس آتا ہے)

آنیفقہ:۔ بک کہاں ہیں؟

ولی:۔ تمہیں اُن سے کیا کام ہے؟

آنیفقہ:۔ تمہیں کیا، کچھ ہوگا، میں اُنہیں دیکھنے آئی ہوں۔ کچھ باتیں کہنی ہیں، جلدی کرو، جلدی۔ میرے مُنہ کو کیوں تاک رہے ہو۔ ٹکٹکی لگا رکھی ہے۔ میں کہتی ہوں بک کہاں ہیں۔ میں اُن سے ملوں گی۔

ولی:۔ اوہو، ایسی بھی کیا جلدی۔ حالانکہ تم ان سے نہیں مل سکتیں۔

آنیفقہ:۔ کیوں کیا وہ یہاں نہیں۔

ولی:۔ ہاں کل رات بھی یہاں نہ تھے، کہہ گئے تھے میں نہیں آؤں گا۔

آنیفقہ:۔ خیر تو جاؤں (جانے کو ہوتی ہے)

ولی:۔ ذرا تو ٹھیرو، ایسی بھی کیا جلدی۔ تم بھی عجیب عورت ہو۔ کیوں اُچھلی پڑتی ہو، ڈر مت، کوئی تمہیں کھا نہیں جائیگا۔ تمہارا بال بھی بیکا نہیں ہوگا۔

آنیفقہ:۔ کیا تم سے ڈر کر بھاگ رہی ہوں۔ مجھے کام ہے اس لئے جا رہی ہوں۔ نہیں تو، تم آدم خور تو نہیں ہو۔

ولی۔ (کمرے کے اندر سے گھنٹی بجتی ہے! اس سے چونک کر) حضور!

مجدی۔ (اندر سے) تم کس سے باتیں کر رہے ہو۔

آنیقہ۔ (خوش ہو کر جلدی سے) مجھ سے حضور۔ آپ کو سلام کرنے آئی تھی۔

ولی۔ (آنیقہ کو ہاتھ سے پکڑ کر، اشارے سے اُسے چپ کرنے کی کوشش کرتا ہے، پھر آہستہ سے کہتا ہے) چپ رہو، اری طاعون کی وبا۔ (آنیقہ کواڑ کو ہٹاتی ہے) نہیں، نہیں، تم اندر داخل نہیں ہو سکتیں۔

آنیقہ۔ کیوں؟ مجھے ان سے کچھ باتیں کہنی ہیں۔

ولی۔ اچھا باتیں کہنا میں منع کب کرتا ہوں۔ لیکن وہ ابھی پلنگ پر ہیں۔ اسی بھی کیا بے صبری۔ رُکا ہی نہیں جاتا۔ ذرا ٹھیرو۔ وہ بستر سے اٹھیں، کپڑے پہن لیں۔

آنیقہ۔ کچھ پروا نہیں، اگر وہ آرام کر رہے ہیں، تو بھی میں اُن سے باتیں کروں گی۔

ولی۔ میری بات کیوں ماننے لگیں۔ اگر بک ہوتے تو فوراً تمہارا وطیرہ بدل جاتا۔

مجدی۔ (اندر سے) ذرا ٹھیرو، آنیقہ، ابھی آیا۔

ولی۔ اب اپنی حد پہچانی؟ بدتمیز کہیں کی۔

(آنیقہ ناک بھوں چڑھاتے ہوئے، بیلکونی (برآمدے) میں جاتی ہے اور وہاں سے جھک کر چناروں کے اندر نظر ڈالتی ہے؛ اتنے میں مجدی پاؤں میں سلیپر ڈالے، اور ڈریسنگ گون پہنے دکھائی دیتا ہے۔ آنیقہ آنکھ کے اشارے سے، ولی کو باہر جانے کے لئے کہتی ہے۔ مجدی بھی اُسے باہر جانے کا اشارہ کرتا ہے۔ ولی بھی پُر معنی نظروں سے آنیقہ کو دیکھتا ہوا داہنی طرف سے باہر جاتا ہے۔)

مجدی۔ کہو کیا خبریں ہیں۔

آنیقہ۔ (مسکرا کر) ہم پہونچ گئے، بک افندی۔

مجدی۔ (خوش ہو کر) تم؟ اور وہ کہاں ہیں؟

آنیقہ۔ چناروں میں مجھے بھیجا ہے کہ آپ کو خبر کروں تاکہ آپ نوکر کو دفع کر دیں۔

مجدی۔ ابھی لو۔ ذرا ٹھیرو (میز کے قریب جا کر گھنٹی بجاتا ہے، ولی داخل ہوتا ہے) (اُس سے) دیکھو فوراً ساحل پر جاؤ کیا بجا ہے۔ (گھڑی دیکھ کر) او ہو نو بج رہے ہیں۔ جو جہاز ملے، اُسی پر استنبول جاؤ۔ بک اوغلے میں میرے درزی سے کہو کہ میں نے جن سوٹوں کا آرڈر دیا ہے، اُن کا پیکٹ بنا کر نہیں دے۔ شام کے جہاز سے واپس آؤ سمجھے، ہاں ٹھیرو، روپے تو لیتے جاؤ (روپیہ لانے کے لئے پھر کمرے میں جاتا ہے)

ولی۔ (آنیقہ سے) معلوم ہوتا ہے یہ حکم تمہارے اشارے سے ملا ہے۔ سچ ہے تمہارے کاٹے کا منتر نہیں۔

(مجدی کمرے سے باہر آتا ہے، ولی کو نوٹ دیتا ہے، وہ سلام کر کے باہر جاتا ہے۔)

مجدی۔ (آنیفہ سے) دیکھو ہوشیاری سے، کہیں راستے میں تمہیں ولی نہ مل جائے۔

آنیفہ۔ نہیں بک افندی، پوری احتیاط کی جائے گی۔

مجدی۔ تو پھر جلدی کرو، جاؤ اُن سے عرض کرو تشریف لائیں۔ میں بھی ذرا جا کے کپڑے پہن لوں۔ اور ہاں آنیفہ، تم جب لوٹ آؤ، تو دروازے میں کنجی لگا دینا اور باہر بیٹھ جانا۔ اور کوئی بھی آئے اُسے اندر آنے مت دینا۔ اور دیکھو خبردار کسی سے یہ نہ کہنا کہ میں آج کسی سے ملاقات نہ کروں گا۔ خواہ مخواہ شبہ پیدا ہوگا۔

آنیفہ۔ بہت اچھا حضور۔ میں سمجھتی ہوں، آپ کے فرمانے کی ضرورت نہیں۔ حضور اطمینان رکھیں میں پوری احتیاط کروں گی۔

مجدی۔ شاباش۔ تم کو میں خوش کردوں گا۔ ہاں، اب جاؤ (آنیفہ دہنے سے، مجدی بائیں دروازے سے جاتے ہیں، آدھے منٹ کے بعد داہنی طرف سے، بہیجہ نقاب ڈالے داخل ہوتی ہے۔ لباس نہایت تکلّف کا، ہاتھ میں لیڈیز کی چھتری ہے)

آنیفہ۔ کمرے میں ہیں۔ کپڑے پہن رہے ہیں۔ آپ کو ذرا انتظار کرنا ہوگا۔ (بہیجہ سر کے اشارے سے موافقت کرتی ہے اور آگے بڑھ کر میز پر کی تصویروں کو دیکھتی ہے، پھر برآمدے کے دروازے سے ٹیک لگا کر باہر کی سیر کرتی ہے۔ مجدی بائیں دروازے سے داخل ہوتا ہے، اور بہیجہ کی طرف جو مڑ کر اسے دیکھتی ہے، لپک کر اُس کے ہاتھ کو اپنے ہونٹوں تک بوسے کے لئے جاتا ہے اور کہتا ہے۔ کیسی بڑی عنایت، کتنا بڑا احسان!

بہیجہ۔ بیشک آپ مہمان کے آنے سے خوش ہی ہوئے ہونگے۔

مجدی۔ اُف کیسا مہربان اور کتنا عزیز مہمان! کاش وہ مہمان اپنی عنایات سے، ہمیشہ ہمیشہ یہیں رہے، کبھی نہ جائے۔

بہیجہ۔ مہمان کی بھی خواہش تو یہی ہے کہ جتنا ہو سکے یہاں رہے۔ ابھی کچھ زیادہ دن تو نہیں ہوئے کہ میں یہاں آئی تھی کل یہاں پھر آنے کے لئے چاہ رہی تھی۔ مگر شام تک دل پر جبر کرتی رہی، آخر آج میں نے سوچا کہ اگر نہ آئی تو صبر نہ کر سکوں گی میں نے سب سے کل شام یہ کہہ دیا کہ آج میں اپنی خالہ سے ملنے جاؤں گی۔ لوگوں نے کہا کہ ابھی تو گئیں تھیں میں نے کہا بیمار چھوڑ آئی تھی۔ اس لئے جانا ضروری ہے۔ غرضکہ سینکڑوں حیلوں اور ہزاروں بہانوں سے پھر آتی ہوں۔ اور تمہیں کیا معلوم کہ کتنے اور کن خطروں میں سے گذر کر آئی ہوں۔ تاکہ اُنہیں شبہ نہ ہو ساحل تک ان کے ساتھ آئی اور وہاں سے دوسرا راستہ لے کے بڑی مشکلوں سے چاپ راست بازار تک گئی اور وہاں کی گلیوں اور کوچوں سے گذر کے پھر جہاز لیکر یہاں تک پہونچی

مجدی۔ اس قدر زحمت اٹھانے کا مجھے جس قدر افسوس ہے اسی قدر آپ کی تشریف آوری کا احسان مند ہوں۔

بہیجہ۔ مگر آپ نے کس قدر اچھا کیا کہ اس تنہا مقام میں یہ کوشک (بنگلہ) لیا۔ اگر وہیں رہتے تو ہر وقت ایک دوسرے سے مل تو سکتے لیکن جیسا چاہتے ہیں ویسا نہ مل سکتے۔ اب اس مکان کی بدولت آرام سے اور اطمینان سے ملاقاتیں ہوا کرینگی۔

مجدی۔ اس میں کیا شبہ ہے۔ وہاں مجھ پر بہت کچھ اعتراضات ہوئے۔ اور واقعہ یہ ہے کہ معاملہ اس قدر بڑھ جانے کے بعد

میرا وہاں رہنا خطرہ سے خالی نہ تھا۔ آہ! میں جب اُن دنوں کا خیال کرتا ہوں جو ایسے ہیجان و آتشِ شوق میں گذرے ہیں۔

بھیجہ۔ کیا اچھا زمانہ گذرا تھا۔

مجدی۔ وہ پہلی شام جب میں وہاں آیا تھا اُس وقت سے لیکر اس وقت تک کا زمانہ جبکہ میں نے پیانو کے پاس اعترافِ عشق کیا، اُس زمانے کا ذوق و ہیجان میں بھول نہیں سکتا۔ وہ شام جبکہ آپ میری نظر کے نیچے پیانو بجا رہی تھیں.....

بھیجہ۔ اُسے صرف نظر کہنا، اس کی اہانت کرنا ہے۔ وہ نظر نہ تھی، ایک آتش، ایک التہاب تھی۔ اُف یا ربّی! وہ اک آگ تھی، جس نے میرے تمام جسم کو مشتعل کر کے، میری روح، میرے قلب کو زیر و زبر کر دیا۔ اُسے صرف نظر کہتے ہو؟ مدّت سے میرے صنم خانۂ خیال میں مرد کا، اور مرد کے حُسن و کمالات کا جو تصوّر تھا، وہ میں نے تم میں اتنا مکمل پایا کہ تمہیں دیکھتے ہی میں نے اپنے دل سے کہا۔ مرد یہی ہے! جب سے میں دنیا میں آئی ہوں مجموعۂ محاسن مرد یہی دیکھا ہے، پھر یہ مرد، جبکہ میں اس آتش سوزاں سے مضطرب تھی، اس نافذ نظر سے میری روح میں گھس رہا تھا۔ بھلا اس نظر کا میں کیا مقابلہ کر سکتی تھی، سوچو، تم وہ مرد تھے جس کا میں بچپن سے پوری مفتونیت سے انتظار کر رہی تھی۔ مجھے خود حیرت ہے کہ دامنِ ضبط و استقلال چھوڑ کر میں کیوں تمہارے پاؤں پر نہ گر پڑی۔

مجدی۔ لوگ تمہیں گھیرے ہوئے تھے۔ اور میں پورے طور پر آپ کے رجحان کو سمجھ نہیں سکا تھا۔ لیکن واقعہ یہ ہے کہ باغ میں جس وقت آپ نے ایک گلدستہ مجھے پیش کیا تھا، اُس وقت مجھے کچھ کچھ شبہ ہونے لگا تھا کہ آپ کے احساساتِ قلب میری طرف کیا ہیں۔ شبہ کا پیدا ہونا تھا، کہ پہلی علامت نے اس شبہ کو پوری شدت سے تقویت دی۔ اُف! آپ کا حال کیا تھا۔ ہونٹوں میں لرزش تھی، رخساروں پر رنگ، آنکھوں سے کیا کچھ نہ برس رہا تھا۔

بھیجہ۔ مجھ سے قسم لو، کہ اس دن جس آتشِ محبت سے میں مشتعل تھی کسی عورت نے پہلے نہیں، اپنے محبوب کو سپرد کرنے کے لئے اپنے دل میں ایسا شعلہ بھڑکا ہوا نہ پایا ہوگا۔

مجدی۔ میں نے اپنی زندگی کو آپ کی محبت سے اس قدر مستغرقِ لطف و لطافت پایا کہ میرا دل ایک ناقابلِ بیان انشراح و مُسرّت سے کھل گیا۔ دو دن کے اندر محقق ہو گیا کہ ایک دوسرے کے متعلق ہمارے دلوں کی کیفیّات کیا ہیں، آپ جیسے ایک خزینۂ یگانہ کو پا کر، سوسائٹی کی پابندیوں اور بیہودہ قیود سے ڈر کر، ہاتھ سے دے بیٹھنا، بے شک ایک ناموسکارانہ اور مردانہ حرکت ہوتی۔ لیکن میں ایک عاجز و مریض و بیچارہ عاشق ہو کر رہ گیا۔ شرف و ناموس کہاں؟ نہ معلوم میں نے بُرا کیا یا اچھا کیا۔

بھیجہ۔ (اُس کے اور قریب آکر) یہ بھی کوئی پوچھنے کی بات ہے۔ تمہیں کیا خبر تم نے کتنا اچھا کیا۔ اگر میں تمہاری طرف سے رد کی جاتی، تو یقین مانو میں خودکشی کر لیتی۔ کیونکہ میں تمہیں اس طرح نہیں چاہتی جس طرح عورتیں مردوں کو چاہتی ہیں۔ تمہیں اس کا اندازہ کرنا مشکل ہے۔ میں نے تمہیں اُس بے پناہ، بے امان، چارہ ناپذیر عشق سے چاہا ہے جو ایک انسان اُس انسان کیلئے محسوس کرتا ہے جسے قدرت نے محض اس کے لیے پیدا کیا ہو۔

مجدی۔ کیا اچھا ہوا کہ میں عاشق ہوا اور اعلان عشق کیا۔ میں تو خوش بخت ہوا ہی، آپ کو بھی باعثِ زحمت نہیں ہوا۔

ہیجہ۔ بے شک بے شک لیکن اگر آپ یہ سمجھ رہے ہیں کہ مجھے آپ نے اپنے عشق سے وہ مسرت بخشی ہے جو وارستۂ اندیشہ ہے، یا جس پر کسی کدورت کا سایہ نہیں، تو آپ غلطی پر ہیں۔

مجدی۔ وہ کیوں؟

ہیجہ۔ میں حال سے اس قدر ہوں کہ استقبال سے ڈر رہی ہوں، نہیں چاہ کر، اور تم سے چاہی جا کر، میرے دل کو وہ راحت پہونچ رہی ہے کہ میں اس کے انجام سے خوف کھانے لگتی ہوں، میں جانتی ہوں کہ مجھے اس خوف و اضطراب کا شکار نہ بنتا چاہیئے، لیکن کیا کروں، یہ میرے اختیار کی بات نہیں۔

مجدی۔ نعیم سے؟

ہیجہ۔ نہیں، اُس سے ڈرنے کی مجھے کوئی حاجت نہیں، کیونکہ اگر وہ خبر پا جائیگا، تو یقیناً مجھے مار ڈالیگا اور اُس وقت میں اپنے عذاب و اضطراب سے چھوٹ جاؤنگی، میں جس چیز سے ڈر رہی ہوں، وہ ہمارے عشق کا مستقبل ہے۔

مجدی۔ خدا کے لئے بتلایئے ہمارے عشق کے مستقبل کے متعلق آپ کو کیا خوف ہے۔

ہیجہ۔ فرض کیجئے کہ ہم تا ابد اسی طرح ایک دوسرے کو چاہیں گے۔ مگر ہوگا کیا؟ اول تو یہی عذاب کیا کم ہے کہ ایک دوسرے سے جُدا رہنا اور محرومیت۔ کے بعد، چھپا چوری ملنا۔ اس کے بعد غمگین طریقے سے اپنے سر کو اس کے کندھے پر رکھ کر، اس کے بعد واقعہ یہ ہے کہ مجھے ایک شخص کی طرف سے اس کا بھی اطمینان نہیں کہ وہ مجھے برابر اتنا ہی چاہتا رہیگا جتنا میں چاہتی ہوں۔

مجدی۔ تمہاری زبان سے اور میں یہ سنوں، یقین مانو، کس قدر بیکار اور غلط اندیشے کو دل میں جگہ دے رہی ہو۔ اول ذرا سوچو، تم جیسا ایک لطیف نادرۂ عشق مجھے ملیگا کہاں۔ تم نہیں سمجھ سکتیں کہ آج کل کی سوسائٹی کی شرائط ہیجہ کے اندر میں کسی دوسری عورت سے نہ عشق کر سکتا ہوں نہ شادی کر سکتا ہوں۔

ہیجہ۔ میں نہیں سمجھتی، نہیں سمجھتی، کیا میں اپنے عشق کو خطرے اور تہلکے سے گھرا ہوا خیال کروں تو حق بجانب نہیں ہوں۔ تمہیں کیا معلوم کہ تمہاری نسبت، میں تمام عورتوں کو کس شبہ اور کس قدر شدید رقابت کی نظر سے دیکھتی ہوں۔ ابھی میں زندہ نہ رہوں گی، یہ تمام اندیشے مجھے برباد کئے دے رہے ہیں۔ ہماری خوشی کا یہ پہلا ہی ہفتہ ہے۔ مگر رقابت اور خوف کی آگ کے تحمل سوز شعلے مجھے جلا رہے ہیں۔

مجدی۔ کس قدر فضول اندیشے اور خوف میں مبتلا ہو۔ میں یقین دلاتا ہوں کہ . . .

ہیجہ۔ (بات کاٹ کر) ہاں اگر ایک دفعہ مجھے یقین آجائے کہ میرے اندیشے بے بنیاد ہیں تو اس وقت میں پوری مسرت کی زندگی بسر کر سکتی ہوں، صرف اس وقت، مگر اس سے قبل ممکن نہیں، ورنہ میں تو چار طرف خطرہ ہی دیکھتی ہوں، اپنے عشق کو خطرے سے گھرا ہوا پاتی ہوں

مجدی۔ میری جان تم بھی کس قدر وہم میں مبتلا ہو خطرہ کیسا، خطرہ کہاں ہے؟ میں تو سوائے اپنے عشق کی اور اپنی مسرت کی تابانی کے سوا اور کچھ نہیں دیکھ رہا۔

بہیجہ۔ لیکن، ہر نوجوان اور خوبصورت عورت، خاص کر نوجوان کنواری لڑکیوں سے مجھے خطرہ ہے جانتے ہو؟ سب سے زیادہ حسد مجھے کس سے ہے؟ ان کنواری لڑکیوں سے جن کا تمہاری بننا ممکن ہے مثلاً نسیمہ۔ ہنستے ہو؟ تمہیں کیا معلوم کہ میں اُس سے کس قدر جلتی ہوں، خاص کر اُس کے آزاد ہونے سے۔ حالانکہ میرے پاؤں میں ایک بھاری اور خوفناک زنجیر پڑی ہوئی ہے جو مجھے ایسے شخص کے ساتھ زندگی بسر کرنے کے لئے مجبور کر رہی ہے جسے میں ذرا نہیں چاہتی! میں اپنے دل سے کہتی ہوں آج کے دن کاش میں بھی آزاد ہوتی تو جس سے محبت کرتی ہیں اُس کے پاس جاتی اور اُس سے کہہ سکتی "مجھے لے، میں تیری ہوں، جو چاہے کر" آہ ہمارے عشق میں خفیہ مسرتیں ہیں، تو اُس میں تلخیاں بھی ہیں۔ سب سے اول اُس کا پوشیدہ ہونا ہی اک مصیبت ہے، خیانت کی طرح ہر شخص سے چھپانا۔ اگر یہ راز فاش ہو جائے، تو ہم پر لعنت بھیجی جائے گی۔ چونکہ یہ عشق جو اس قدر مسرت دے رہا ہے، کہا جائیگا کہ یہ تمہارا حق نہیں، چونکہ اگر لوگوں کو خبر ہو جائے، تو میں نفرتِ عامہ کا نشانہ بن جاؤں گی۔ چوروں کی طرح چوری کرنا، یہ احساس مجھے پیسے ڈالتا ہے۔

مجدی۔ بہیجہ پیاری سمجھ لو کہ عشق و سعادت دُنیا میں ہر چیز سے بالا تر ہے۔ اور جس عشق سے تمہیں دُنیا میں مسرت پہونچی ہے، اس کا چند بوسیدہ اور بے حس آدمیوں کے خود تراشیدہ قواعد کے مخالف ہونا، تمہیں کیوں مضطرب کرتا ہے؟ کیوں میری جان؟ میرے ہاتھ اگر تم جیسی نایاب و معزز ہستی آجائے، تو میں سوائے اس کے، اور کچھ نہ سوچوں کہ تمام قواعد و رسوم کو خیر باد کہہ کر، ایک ایسا آشیانۂ مسرت بنانے میں مشغول ہو جاؤں جہاں نہیں اور اپنے عشق کو اوروں سے چھپا کر رکھوں، اور میری تم سے بھی یہی التجا ہے کہ تم بھی اس کے سوا اور کچھ نہ سوچو۔ کیا یہ افسوس کی بات نہیں کہ تمہاری خوبصورت آنکھیں، ان واہی اور بے بنیاد وہموں اور فکروں کی وجہ سے نمناک ہوں؟ بجائے اس کے کہ ہم اپنے عشق کے خیالی خطروں کو سوچ سوچ کر مکدر رہوں، آؤ، اپنی موجود اور محض مسرتوں سے بہرہ اندوز ہوں، دیکھو ان چناروں کے نیچے، اس بے مثال منظر کے درمیان، عشق و محبت کرنے سے بڑھ کر اور بھی کوئی خوشی ہو سکتی ہے، آہ کس قدر افسوس ہے کہ یہ تمام محاسن طبیعیہ رائیگاں جا رہے ہیں۔ یہ بے نظیر جزیرہ جو ایک آشیانۂ عشق ہونے کے لئے پیدا کیا گیا ہے، یہ خوبصورت جزیرہ، حیف ہے اگر چند بد ذوق، اور تنگ نظر آدمیوں کے ایجاد کردہ قواعد کی بدولت، ایک غیر دلکش تصویر کا چوکھٹا بن کر رہ جائے، واقعہ یہ ہے کہ اگر دل میں محبت و عشق جاگزیں نہ ہو، تو اس حسین منظر پر نظر ڈالنا بھی گناہ ہے۔ کیونکہ خدا نے یہ خوبصورت مناظر صرف عشق و محبت کے لئے، صرف اُن لوگوں کے لئے پیدا کئے ہیں جو شرابِ عشق سے مدہوش ہو کر ایک دوسرے کو چاہتے ہوئے ان کی سیر کے لئے نکلیں ... یہ مناظر، یہ مملکت، یہ سماء، یہ چناروں کی قطار، یہ خوشبوئیں کس قدر دل آویز اور وجد انگیز ہیں۔ یہاں کا ہر ذرہ کہہ رہا ہے کہ میں اس قدر خوبصورت

اس لئے پیدا کیا گیا ہوں کہ حسن و عشق یہاں مصروفِ گلگشت ہوں۔ کون انکار کرسکتا ہے کہ اس جزیرے کی پیدائش کا مقصدِ وحید یہ ہے کہ جو نہ جانتے ہوں انہیں بتائے کہ عشق و محبت کیا چیز ہے۔ یہاں، صرف اس ہوائے نسیمِ عشق و سودا میں سانس لینے سے عورتیں پُرغلیان و پُرشفقت ہو جاتی ہیں، اور صرف یہی نہیں کہ اپنے تئیں تسلیم کردیں بلکہ اپنی تمام روح و قلب کے ساتھ تسلیم ہونے کے مہیا پائی جاتی ہیں۔ یہاں مرد، بے اختیاری طور پر شاعر یعنی روحاً و قلباً عاشق بن جاتا ہے۔ یہاں ایک معمولی بات بھی، اس روح پرور منظر کے درمیان، ان چناروں کے سایہ دار ایسے کے نیچے اک لطیف شعر، ایک رنگین غزل، ایک ولولہ انگیز قصیدہ بن جاتی ہے بلاشبہ، اگر دنیا میں وطنِ عشق تلاش کیا جائے، تو یہی آطہ لر ہیں۔ آہ ان چناروں کے گھنے اور سرسبز سائے، ان کی خوشبوئیں اور ان کی ترنم آمیز سرسراہٹ!

بہیجہ۔ آپ کس قدر صحیح کہہ رہے ہیں۔ ہے، وہ دن یاد ہے جب پہلے پہل یہاں آئی ہوں۔ ہم خرستوس کو گئے تھے چناروں کے نیچے ان کی سرسراہٹ سے مست و مدہوش ہوکر میں جارہی تھی اور چاہنے اور چاہے جانے کی ایک عمیق احتیاج میری روح کو مضطرب کر رہی تھی، آخر وہاں جہاں پاپائے اعظم کی اقامت گاہ تھی وہاں پہنچ کر میرے سامنے نامتناہی عظمت کے ساتھ میرے پاؤں تلے بحرِ مرمر شعاعِ آفتاب سے چمک رہا تھا۔ تھوڑی دیر کے لئے اس کی چمک سے میری آنکھیں چکا چوند ہوگئیں۔ انسان قطعاً چناروں کے رنگ، ان کی خوشبو، ان کی سنسناہٹ سے مست و مدہوش ہوجاتا ہے۔ اور ایسا معلوم ہوتا ہے کہ نیچر کی ہر ایک چیز اس سے صرف عشق کا ہی ذکر کرتی ہے۔ اور اُسے شوق آرزو اور غلیان کی طرف کھینچے لئے جاتی ہے۔ اس دن میں نے اپنی عمر میں پہلی دفعہ اپنے دل سے صدائے شکایت سنی "یہاں چاہا نہ جانا کس قدر قابلِ افسوس ہے"۔ یہ فریاد میرے دل سے اس دن نکلی تھی۔ آہ اُس دن تمام خوبصورتیوں کو میں نے زہرناک تلخی سے محسوس کیا تھا۔ مگر آج تمہاری بدولت میرا قلب شوق و آرزو سے انہیں دیکھ رہا ہے۔ اور میں قسم کھاتی ہوں کہ میں نے اب انہیں سمجھا ہے۔ نیچر کی خوبصورتی میں نے پہلے بھی دیکھی مگر اس سے جو لطف حاصل ہوتا ہے وہ تم نے مجھے سکھایا۔ اب میں تمہاری نظروں سے اُسے دیکھتی ہوں۔ اب تک نیچر کے جو رنگ نہ دیکھے تھے اب دیکھ رہی ہوں۔ اور اب وہ خوشبوئیں سونگھ رہی ہوں جو اب تک میرے مشامِ جان تک نہ پہونچی تھیں۔

مجدی۔ آہ پیاری بہیجہ۔

بہیجہ۔ میں اپنا تمام انشراحِ قلب تمہیں بتانا چاہتی ہوں، اور یہ آرزو رکھتی ہوں کہ جو الفاظ کسی کو نہ ملے ہوں اُن کے ذریعے سے نہیں سناؤں کہ میں تمہاری کس قدر مفتون، کس قدر مملوک ہوں۔

مجدی۔ یقین مانو کہ وہ الفاظ جو تمہاری نظریں کہہ رہی ہیں، زبان کا کوئی لفظ ان سے زیادہ بلیغ اُن سے زیادہ محبت پاش نہیں ہوسکتا۔

بہیجہ۔ اگر یہ بات ہے، تو للہ میری نظروں سے نظر ملاؤ۔ محبت کی نظر سے محبت کی نظر ملاؤ۔ وہ نظر ڈالو جو مجھے بتائے کہ تم مجھے کتنا

لے استنبول کے چند نہایت خوش سواد جزیرے ہیں، جہاں امرا اپنے قصروں میں رہتے۔ اس ڈرامے کا سین وہیں ہے۔

چاہتے ہو؟ وہ نظر جو میری روح میں نفوذ کر جائے، اور میری روح کو اطمینان، اصل ہو۔

مجدی۔ ہیجہ کے سر کو اپنے دونوں ہاتھوں میں پکڑ کے، دیر تک مفتونانہ نظر سے دیکھتا ہو، آہ میری حیات اور میری روح سب تیری ہے۔

ہیجہ۔ (مست و مدہوش) میرے محبوب، دیکھ مجھے دیکھ اور گہری نظر، اور محبت بھری نظر سے دیکھ۔

مجدی۔ (اسی کی طرح مست و مدہوش) تجھے چاہتا ہوں، تجھ پر فدا ہوں (سر جھکا کر ایک لمبے بوسے سے اُسکے ہونٹوں کو بند کر دیتا ہے)

ہیجہ۔ آہ اور، اور، اور محبت کی نظر ڈال۔

مجدی۔ میں تیری پرستش کرتا ہوں۔ مگر تم تو اپنی آنکھیں بند کئے لیٹی ہو، یہ نہ ہوگا۔

ہیجہ۔ اچھا تو تم میری آنکھوں میں کیا دیکھتے ہو؟ ان کی گہرائیوں میں تمہیں کیا نظر آتا ہے؟

مجدی۔ آہ تمہیں کیا معلوم میں وہاں کیا دیکھ رہا ہوں؟ وہ کہہ رہی ہیں۔ "ہم دنیا کی سب سے زیادہ حسین و دلکش آنکھیں ہیں جو ہم پر فدا ہوتا ہے وہ خوش قسمت اور جس سے ہم محبت کریں وُہ خوش قسمت ہے۔

ہیجہ۔ پھر کہتی ہوں۔ "یہ نہ کہنا کہ میں نامتناہی محبت سے چاہا نہ گیا، کسی عورت کی طرف سے لازوال و بے مثال مہر و وفا نہ دیکھی جتنا میں چاہتا ہوں اتنا چاہا نہ گیا! اس لئے کہ تم اپنے تصور سے زیادہ چاہے جا رہے ہو۔ اور عورتوں پر طعن و تشنیع نہ کرو اس لئے کہ اگر وہ تمام وفا و صداقت جو عورتیں تمام مردوں کے مقابلہ میں کرتی ہیں، ایک جگہ جمع کر دی جائے تو بھی وہ اس محبت کے برابر نہ ہوگی جس شدت سے کہ میں تمہیں چاہ رہی ہوں۔ (ایک ناقابل رد جذبۂ محبت سے مغلوب ہو کر اس کے اور قریب آکر) ہاں یہ بالکل صحیح ہے جس عشق میں میں مبتلا ہوں، وہ مجھے ایسی بڑھ چڑھ کر باتیں کہلوا رہا ہے ٹھیرو، دیکھو، سنو، ہوا کیا کہہ رہی ہے، چناروں کی سنسناہٹ کیا کہہ رہی ہے۔

مجدی۔ محبت کرو، محبت کرو۔ دنیا میں صرف عشق ہے، اور دنیا میں شایان تبریک و تجلیل صرف وہی اک قوت ہے، وہی اک قوت ہے جو انسان کو شوق و سعادت بخش سکتی ہے۔" یہ کہہ رہی ہیں۔

ہیجہ۔ بس اس قدر؟

مجدی۔ نہیں، اور یہ کہہ رہی ہیں کہ اگر زندگی تمہیں اس قدر خوش نصیب کر دے یعنی تمہیں چاہنے کے قابل اور چاہے جانے کے قابل اک حسین دستشنا عورت مل جائے، تو خبردار اس موقع کو ہاتھ سے جانے نہ دینا، اور فضول تصورات میں مبتلا ہو کر یہ دیوانگی مت کر بیٹھنا کہ اس فرصت کو ضائع ہو جانے دو۔

ہیجہ۔ (اُس سے چمٹ کر) اور، اور میری جان، اور

مجدی۔ اور بہت سی باتیں کہہ رہے ہیں۔

ہیجہ۔ (اُس سے اور چمٹ کر) اگر وہ عورت جسے تم چاہتے ہو، تم بغیر زندہ نہ رہ سکے، اور تمہیں خوش کر کے خود خوش ہونے کے لئے ہر قسم کے خطرے کا مقابلہ کر کے تم تک پہنچے، اور پہونچکر تم سے، بوسوں، نوازشوں کی منتظر و مشتاق ہو، تو.....

مجدی۔(عارفانہ) یہ کہتے ہیں کہ فوراً اس خزینۂ سعادت کو اپنی آغوش میں لے لو، اسے اپنی آغوش میں بھینچو، اُس کی زلفوں کو سونگھو، اور اس پر سیکڑوں، ہزاروں، لاکھوں بوسوں کی بھرمار کردو۔

بھیجہ۔اگر یہ بات ہے تو تم کیوں اس حکم کی اطاعت نہیں کرتے (دونوں جوش سے ایک دوسرے کے بوسے لیتے ہیں)

نسیمہ (کی آواز نیچے سے) مجدی بک، مجدی بک، (دونوں گھبرا کر علیحدہ ہوتے ہیں) (مجدی تھوڑے سے تردد کے بعد بیلکونی میں آتا ہے اور نیچے دیکھتا ہے۔

مجدی۔آہا نسیمہ خانم ہیں۔آیئے آیئے اندر کیوں نہیں آتیں۔

نسیمہ۔مجھ سے دروازہ کھلتا ہی نہیں، دیر سے کوشش کر رہی ہوں۔معلوم ہوتا ہے کہ اندر قفل لگا ہوا ہے، مہربانی کر کے کھولئے ہم آئیں۔باجی اور دولھا بھائی بھی ساتھ ہیں۔

مجدی۔ضرور، ضرور۔ابھی آیا۔(اندر جاکر، ہاتھ سے بھیجہ کو اشارہ کر کے بائیں طرف کا دروازہ دکھاتا ہے) ادھر۔(اس کی گھبراہٹ دیکھ کے) پریشان نہ ہوجئے میں اُس میں کنجی لگا دونگا اور کنجی اپنی جیب میں رکھ لونگا، آپ بالکل نہ ڈریئے۔

بھیجہ۔میں ڈرتی نہیں، میرا تردد اس لئے ہے کہ میں تمہیں اُس کے ساتھ تنہا چھوڑنا نہیں چاہتی

مجدی۔اُف رے بدگمانی بچپن چھوڑیئے، اور جلدی سے جایئے۔(بھیجہ بادل ناخواستہ کمرے میں جاتی ہے، مجدی اس کی چھتری وغیرہ کو پیچھے سے کمرے میں ڈال دیتا ہے، کمرہ بند کر کے کنجی لگا دیتا ہے، اور کنجی اپنی جیب میں ڈال لیتا ہے پھر دوڑ کے داہنے دروازے سے جاتا ہے۔ایک دو منٹ کے بعد نسیمہ کے ساتھ آتا ہے۔نسیمہ ایک اعلیٰ لباس میں ہے اور ہاتھ میں سُرخ چھتری ہے۔)

نسیمہ۔ہاں، ہم یہاں آنے کے لئے ساتھ ہی نکلے تھے۔راستے میں چار دن میں میاں بیوی کو دیوانگی نے گھیرا۔کہنے لگے ہم تو پہلے پہاڑی کی چوٹی پر جائیں گے۔بس اُنہیں چھوڑ کر یہاں آگئی۔آپ کو تکلیف تو نہیں ہوئی۔

مجدی۔آپ نے یہ کیا بات کہی۔آپ نے مجھے مرہونِ منت کیا۔

نسیمہ۔آپ سے سچ کہوں، جس دن آپ ہمیں اُس کوٹھی سے چھوڑ آئے ہیں۔اُس دن سے مجھے آپ پر بھروسا نہ رہا، میرا خیال آپ کی طرف سے بدل گیا۔

مجدی۔وہ کس طرح؟

نسیمہ۔ہر وقت آپ یہی کہتے تھے کہ آپ کو اپنے خاندان سے یعنی ہم سب سے کتنی محبت ہے، مگر اس حرکت سے آپ نے اپنے ادعا کو خود غلط ثابت کر دیا۔

مجدی۔چھوٹی خانم، آپ کو اپنے دل میں ان خیالات کو جگہ نہیں دینی چاہیئے۔

نسیمہ۔(اُس کے چہرے پر تھوڑی سی سرخی آتی ہے) آپ کو معلوم نہیں میں یہ سوچ سوچ کر کس قدر خوش تھی کہ آپ یورپ سے

واپس آئیں گے تو آپ مجھے تصویر کشی سکھائیں گے۔ لیکن اب آپ کو آئے دو مہینے ہو گئے اور آپ نے مجھے اک سبق بھی نہیں دیا۔

مجدی۔ بس اس قدر۔ اس کی تلافی تو بہت آسان ہے۔

نسیمہ۔ کس طرح؟ بہت آسان ہے؟ آپ آسان خیال کرتے ہیں، حالانکہ میرے نزدیک بہت دشوار ہے۔

مجدی۔ وہ کیوں؟

نسیمہ۔ اس لئے آپ بھاگتے ہیں۔ آپ تلافی کرنا نہیں چاہتے۔ اس سے آپ انکار کر نہیں سکتے۔ ۔ ۔ آپ جب ہمارے گھر پہلے پہل آئے، تو ایک ہفتہ تک تو اچھے رہے۔ اس کے بعد نہ معلوم کیا ہوا کہ آپ میں اجتناب و فرار کے علامات ظاہر ہونے لگے اک دم آپ میں ایسا تغیر واقع ہوا کہ اسکا کوئی سبب ہم لوگ معین ہی نہ کر سکے لیکن یہ تغیر یقینی ہے۔ ہم سے اجتناب ہی کافی نہ تھا کہ آپ نے گھر چھوڑنے کا بھی خیال ظاہر کیا۔ میں نے اپنے دل میں کہا "لیجئے، اب پورے طور پر بھاگنا چاہتے ہیں۔" آپ ہی کہئے، میں غلط کہہ رہی ہوں؟ (اس کے تردد کو دیکھ کر) میں دیکھ رہی ہوں کہ آپ کو جواب ملتا ہی نہیں۔ میں تو سمجھتی ہوں کہ آپ جو تنہائی کی اس قدر شکایت کرتے تھے، خاندان کے چہل پہل میں تو آپ کو لطف آنا چاہیئے، اور اسے اس گھر کی تنہائی پر ترجیح دینی چاہیئے تھی۔

مجدی۔ میری نسبت جو آپ نے اپنی لطف و عنایت کا اظہار کیا، اس کا ہزار بار شکریہ۔ لیکن میں اس بات کو آپ سے چھپانا نہیں چاہتا کہ میری طرف سے آپ نے اپنے دل میں چند غلط خیالات جاگزیں کر لئے ہیں اور اس کا مجھے رنج ہے۔

نسیمہ۔ غلط خیالات؟ آہ میں نے کس قدر چاہا کہ میرے خیالات کاش غلط ہو جائیں کیونکہ ایسی حالت میں (فقرے کو پورا کرنے میں تردد کرتی ہے)

مجدی۔ ہاں ایسی حالت میں کیا؟

نسیمہ۔ میں جو آپ کو ہاتھ سے کھویا ہوا سمجھتی ہوں، دوبارہ حاصل کر لوں گی۔

مجدی۔ یقین رکھئے کہ وہ کبھی آپ کے ہاتھ سے کھویا نہ جائیگا۔

نسیمہ۔ اگر میں اس پر یقین کر سکتی ہوں تو میں آپ کا شکریہ ادا کرتی ہوں۔

مجدی۔ میں آپ سے التجا کرتا ہوں کہ آپ یقین کیجئے۔ آپ نے یقین کیا؟ کہئے (نسیمہ کے سر کے تصدیقی اشارے پر) یعنی اب ہم میں آپ میں صلح ہو گئی۔ اچھا چونکہ آپ نے اپنے تئیں اس قدر اچھا بات ماننے والا ثابت کیا ہے۔ اس لئے لازم ہے کہ میں آپ کو کوئی انعام دوں۔ اچھا آئیے میں آپ کو اپنی تصویریں دکھاؤں۔

نسیمہ۔ (خوش ہو کر) آپ نے مجھے اپنا کتنا احسان مند کیا۔ بتائیے کہاں ہیں؟

مجدی۔ فی الحال میں نے انہیں زینے کے مقابل کے کمرے میں جمع کر دیا ہے۔ (دروازے کی گھنٹی بجتی ہے)

نسیمہ۔ تو نا ابا آ گئے۔ (دوڑ کر بالکونی سے دیکھتی ہے) ہاں وہی ہیں آپ تکلیف نہ کیجئے میں دوڑ کر نیچے جاتی ہوں، دروازہ کھول دونگی۔

مجدی، اس کے جانے پر اس پر منت دارانہ نظریں ڈالتا ہے، اور تھوڑے سے تردد کے بعد لوٹ کر میز پر سے اک سگرٹ

لے کر چلا نا ہے۔ اتنے میں ممدوح و فرخندہ خیمہ داخل ہوتے ہیں۔

مجدی۔ آیئے، آیئے۔ اس عنایت کا شکریہ۔

فرخندہ۔ سچ تو یہی ہے کہ ہم فرطِ عنایت سے ہی تم سے ملنے آئے ہیں، ورنہ ہمیں تم سے شکایت کرنے کا حق حاصل ہے۔

ممدوح۔ بے شک۔ اول تو یہی ہماری توہین کہ ہمارا گھر چھوڑ کے، اس دور افتادہ پہاڑی کی چوٹی پر آ بسے، گویا ہمارے ہاں آپ کو ٹھیرانے اور مہمان رکھنے کی جگہ ہی نہ تھی۔ لیکن اصلی توہین یہاں آنے کے بعد شروع ہوئی۔ آخر آپ کو ہو کیا گیا ہے۔ آپکا منہ دیکھنا گویا عید کا چاند دیکھنا ہے، ہمارے گھر کا رُخ ہی نہیں کرتے۔

مجدی۔ اگر آپ کو علم ہو کہ میں آج کل کس قدر مشغول ہوں تو آپ مجھے ضرور معذور خیال فرمائیں گے۔ با ایں ہمہ میں یہ نہیں کہتا کہ میرا قصور نہیں ہے۔ اگر آپ چار یا پنچ منٹ کی اجازت دیں تو میں نسیمہ خانم کو وہ تصویریں دکھا آؤں جو آجکل میں تیار کر رہا ہوں، وہ ابھی بہت مصروف تھیں۔ میرا نوکر استنبول گیا ہوا ہے، اس لئے معاف فرمائیگا قہوہ وغیرہ میں اس وقت پیش نہیں کر سکتا۔ (اُن سے اجازت پاکر، داہنی طرف سے نسیمہ کے ساتھ جاتا ہے)

ممدوح۔ (مجدی کے چلے جانے کے بعد) یقیناً اس کی زندگی میں کسی عورت کا ضرور دخل ہے، مگر وہ عورت کون ہے؟ یہ تحقیق طلب ہے۔

فرخندہ۔ آپ بھی غضب کرتے ہیں، آپ کو ہمیشہ ہر چیز، ہر معاملے کے اندر عورت کا دخل نظر آتا ہے۔

ممدوح۔ تو غلط ہے؟ دنیا میں کونسا کام ہے جس میں عورت نہیں۔

فرخندہ۔ ہر چیز میں عورت، ہر چیز میں عورت، شاید عورت ایک دن آپ کی آنکھیں نکال لے گی۔

ممدوح۔ (ہنسکر) گویا اب وہ نہیں نکال رہی۔

فرخندہ۔ یہ مان کر کہ عورت کا دخل ہے، پھر ہمیں اس سے کیا؟

ممدوح۔ بے شک ہمیں اس سے کیا تعلق۔ لیکن محض ایک تجسس۔

فرخندہ۔ تجسس جس کے معنی ہیں کہ تھوڑا سا شک بھی، کیوں ہے نا؟ لیکن فرق اتنا ہے کہ مجدی بک متاہل نہیں یعنی آزاد و مختار ہے۔

ممدوح۔ مطلب یہ کہ ہم اسیر و پابند ہیں۔ لیکن کم سے کم اس اسارت کو اپنے اوپر اتنا گراں ہوتا تو ظاہر نہ کرو۔

فرخندہ۔ مذاق چھوڑئیے۔ اگر کسی آدمی کو، کسی عورت سے تعلق ہے، تو ہمیں کیا۔ ہمیں خاموش رہنا چاہیئے لیکن اگر ہم یہ دیکھیں کہ اس عورت سے، اس کو نقصان پہنچ رہا ہے، تو بحیثیت اُس کے دوست کے بیشک ہمیں اس کو متنبہ کر دینے کا حق حاصل ہے، لیکن فی الحال مجدی بک کی کوئی حرکت ہمیں ایسی نہیں نظر آتی کہ ہمیں اسے متنبہ کرنے کی ضرورت ہو۔ اس لئے ہمیں اُسے آزاد چھوڑنا چاہیئے۔

ممدوح۔ بیشک صحیح کہتی ہو۔

فرخندہ۔ تو مہربانی کر کے اس معاملے میں اپنی زبان بند ہی رکھئیے۔ اور ہر شخص کے سامنے اس عورت کے مسئلہ کو

نہ چھیڑیئے، خاص کر نسیمہ کے سامنے۔

ممدوح۔ کیوں؟

فرخندہ۔ کیوں کی اچھی رہی۔ تمہیں خبر نہیں کہ نسیمہ پھنک رہی ہے۔

ممدوح۔ یہ تو عجیب بات سنائی۔ کاہے میں پھنک رہی ہے۔

فرخندہ۔ اور کس میں، پھکے گی عشق کی آگ میں پھنک رہی ہے۔

ممدوح۔ عشق؟ کس سے۔

فرخندہ۔ توبہ الٰہی! آپ اتنی بھی موٹی سمجھ کے نہ تھے۔ مجدی کے لئے پھنک رہی ہے، اور کس کے لئے پھنکتی۔

ممدوح۔ سچ ہے، میں بھی کتنا بیوقوف ہوں۔ بالکل ہی احمق۔ لیکن اب سمجھ میں آگیا۔ تو یوں کہو کہ تم آج....

فرخندہ۔ ہاں آج میں جو یہ کوہ بیابان طے کرکے آگئی تو نسیمہ ہی کے لئے تو آئی۔ جس دن سے مجدی ہمارے گھر سے اُٹھ آیا ہے اس دن سے نسیمہ کا حال تم بدلا ہوا نہیں دیکھتے؟ تم نہ دیکھ سکتے ہو، لیکن میری پہچاننے والی نظر سے وہ نہیں بچ سکتا۔ اس لڑکی کا دل کیسا صاف، کیسا اصلی سونے کی طرح پاک و خالص ہے۔ مگر دس بارہ دن سے میں دیکھ رہی ہوں، کہ رنجیدہ رہتی ہے، ہر وقت سوچ میں ڈوبی رہتی ہے، بالآخر میں نے اُس سے دبا کر پوچھا۔ اس قدر بھری ہوئی تھی، کہ میرے چھیڑنے پر باوجود ضبط کے، پھوٹ پڑی اور رو رو کے اُس نے مجھ سے اعتراف کیا سالہا سال سے، مجدی کی محبت میں گرفتار تھی، اور یہ سوچ رہی تھی کہ مجدی اس سفر سے واپس آئیگا تو ضرور شادی کریگا۔ اور شادی کرے گا تو اس کے سوا اور کس سے شادی کریگا۔

ممدوح۔ بیچاری نسیمہ۔ حالت یہ ہے کہ مجدی صاحب بالکل بے خبر ہیں، اور اس لئے اپنی ہوا و ہوس میں مبتلا۔

فرخندہ۔ اسے اگر خبر نہیں، تو کیا یہ ہمارا فرض نہیں کہ ہم اس کو خبردار کریں۔ اور بلاشبہ مجدی کو نسیمہ جیسی اچھی لڑکی اور مل نہیں سکتی۔ پس ہمارے خاندان میں اک بیاہ رچے، اور مجدی بھی ہم ہی میں آشامل ہو۔

ممدوح۔ اور سناؤ۔ اُف تم بھی بھیدوں کی کتنی پوٹ ہو۔ کیا کیا بھید پیٹ میں لئے بیٹھی تھیں.... کیا کیا اہم فیصلے کر چکیں۔ اور مجھے خبر بھی نہ کی۔

فرخندہ۔ ہر بات کا اک وقت ہے، اور بات یہ ہے کہ کل رات ہی تو قطعی طور پر تحقیق ہوا۔ اور یہ فیصلہ میں نے رات ہی کیا۔ اور آج صبح نسیمہ کو لے کے یہاں آئی کہ اسے دیکھئے، اور تھوڑی سی تسکین حاصل کرے۔ آپ کو معلوم ہے کہ نسیمہ کی پچھلی بیماری سے ڈاکٹر ڈر گئے تھے۔ کہتے تھے کہ کہیں دق تو شروع نہیں ہو رہی۔ کہتے تھے نسیمہ میں دق ہو جانے کی بہت استعداد ہے۔

ممدوح۔ بیشک، بیشک، لیکن میں یہ کیا جان سکتا تھا کہ مجدی کو وہ دل دیئے بیٹھی ہے۔ اگر یہ بات ہے تو ابھی مجدی کو بلاتا ہوں اور اس سے معاملہ صاف کرکے اس سے قول لئے لیتا ہوں۔

فرخندہ۔ میری بات سنو۔ اتنی جلدی نہ کرو۔ فوراً گلا گھونٹنا ٹھیک نہیں۔ آہستہ آہستہ کام کرنا چاہیئے۔ ہر کام کا ایک وقت ہوتا ہے۔

ممدوح۔ ہائے چھوٹی نسیمہ۔ شریر لڑکی۔

فرخندہ۔ (بیلکونی میں سے دیکھتے ہوئے یکایک) ارے نعیم؟

ممدوح۔ (دوڑ کر اور نظر ڈال کر) کیا نعیم بک؟

فرخندہ۔ ہاں وہی ادھر کون؟ (کھڑکی میں سے) آغا بک! آغا بک۔ (بیلکونی میں آکر) ادھر آئیے، ادھر آئیے، ہم ادھر ہیں۔ (ممدوح سے) جائیے جلدی دروازہ کھولئے (ممدوح جلدی جلدی جاتا ہے تھوڑی دیر بعد ممدوح و نعیم داخل ہوتے ہیں فرخندہ ان کا استقبال کرتی ہے) بتائیے تو آپ کہاں سے نکل پڑے۔

نعیم۔ تو بھائی میں واپس نہ آنے کے لئے تو گیا نہ تھا۔ بس اس خیال سے کہ گھر واپس آنے کی ممانعت نہیں ہے۔ میں صبح کے جہاز سے مالتپہ سے آیا سب سے پہلے گھر گیا۔ مگر وہاں دیکھا کہ پنجرہ خالی ہے سب چڑیاں اڑی ہوئی ہیں۔

فرخندہ۔ ہاں۔ بھیجہ خانم صبح ہی سے اپنی خالہ کے پاس گئی ہوئی ہیں۔ ...

نعیم۔ رہیں آپ، سو اس نٹ کھٹ مجدی سے ملنے، مع اپنے حوالی موالی کے آگئیں۔ مجھے جو یہ معلوم ہوا تو میں بھی یہیں دوڑا آیا کہ مجدی سے بھی ملاقات ہو جائے گی۔ مگر وہ ہیں کہاں؟

ممدوح۔ کمرے میں، نسیمہ کو اپنی بنائی ہوئی تصویریں دکھا رہے ہیں

نعیم۔ نسیمہ بھی یہیں ہیں؟ آپ ہی کے ساتھ۔ اچھا یہ تو بتائیے آپ سب خیریت سے ہیں نا؟

فرخندہ۔ ہم سب الحمدللہ خیریت سے ہیں۔ آپ دیکھ ہی رہے ہیں نسیمہ تھوڑی دُبلی ہو گئی ہے۔ رنگ بھی کچھ زرد ہو گیا ہے۔ مگر اس کے اعادۂ صحت کے لئے بھی دوا مل گئی ہے (مسکراتی ہے)

نعیم۔ کیا مطلب؟

ممدوح۔ بھائی، دوا، اور کیا۔ لو دروازے سے میرا خیال ہے مجدی آ رہے ہیں۔ اچھا اب نسیمہ کے متعلق تم سے بعد میں باتیں ہونگی۔

مجدی۔ (داہنے دروازے سے داخل ہوتا ہے نعیم کو دیکھتے ہی ہاتھ بڑھا کر اس کی طرف دوڑتا ہے) او ہو یہ کیا نعمت غیر مترقبہ! کہاں سے آ گئے۔ (اُس کا زور سے ہاتھ دباتا ہے)

نعیم۔ نہیں دیکھتے ہیں ان لوگوں میں سے ہوں جن کے لئے فوراً کہیں سے کہیں پہنچ جانا مشکل نہیں ہے ایسا آدمی ڈھونڈو تو میں ہی ملونگا۔

مجدی۔ بیشک اور یہ بھی ایک حیرت انگیز وصف ہے۔

نعیم۔ میں نے اس لئے نہ کہا تھا کہ آپ سے اپنی تعریف سنوں میں تعریف و توصیف سے بالاتر ہوں، اور اس لئے ان سب تعریفوں کو اس کان سنتا ہوں اور اس کان سے اڑا دیتا ہوں۔

مجدی۔ مجھے پہلے سے معلوم ہے کہ آپ کسی کی سننے والے نہیں۔

فرخندہ۔ مجدی بک، انیسہ کو کیا ہوا، وہ آپ کے ساتھ کیوں نہیں آئیں۔

مجدی۔ (ہنسکر) وہ تصویر حیرت بن کر میری تصویروں کو دیکھ رہی تھیں۔ اور میں انہیں دیکھ رہا تھا۔ لیکن واقعہ یہ ہے کہ انہوں نے بیحد حساس، بیحد رقیق طبیعت پائی ہے، اور پھر یہی نہیں، ان کی نظر کیسی صنعت شناس اور ناقدانہ ہے۔ تعجب ہوتا ہے۔

فرخندہ۔ آپ جیسے نکتہ چین اور نقاد آدمی سے، اُس کی قابلیت کی تعریف سننا میرے لئے بہت باعثِ فخر و مسرت ہے۔

ممدوح۔ بیشک کوئی آسانی سے، مجدی بک کو اپنا معترف نہیں کرسکتا۔ نہ وہ جلدی اپنی رائے قائم کریں نہ جلد بدلیں۔ ایک دفعہ کسی چیز کو سُرخ کہہ دیا، بس وہ سرخ ہے، سیاہ کہہ دیا، سیاہ ہے والسلام

فرخندہ۔ آپ اُس کی ظاہری قابلیتیں دیکھ رہے ہیں۔ کاش آپکو معلوم ہو کہ ان ظواہر کے نیچے، اُسکی روح، اسکا قلب کس قدر نجیب منتخب و پاک ہے۔

نعیم۔ نسیمہ کے متعلق بحث ہو رہی ہے؟ میں بھی اُس لڑکی کی شرافتِ طبع اور نفاستِ مذاق کا قائل ہوں۔

مجدی۔ بیشک، اس میں شبہ کا امکان نہیں۔

ممدوح۔ وہ جس کے ہاتھ آئیگی، وہ خوش قسمت آدمی ہوگا، یہ میری قطعی رائے ہے۔ (فرخندہ کو دیکھ کر مُسکراتا ہے)

نعیم۔ مگر ہوگا کیا، کوئی محض نالائق، گدھا آئیگا اور اسے لیجائیگا اور ایک دو برس کے اندر ہی، وہ بھی تمام عورتوں کی طرح خراب و برباد ہو جائیگی۔

مجدی۔ اگر ایسا ہوا تو کتنے افسوس کی بات ہوگی، کیونکہ یہ نزاکت و نفاستِ طبع اس سے بہتر نصیبے کی مستحق ہے، میں تو ہر حالت میں خدا سے دُعا کرتا ہوں کہ اس کی قسمت میں خوش رہنا لکھا ہو۔

فرخندہ۔ ہم سب کی یہی دُعا ہے۔ مگر افسوس کہیں ایسا نہ ہو کہ اُسے بھی ہر باکمال ہستی کی طرح محرومیت کے سوا کچھ اور نہ ملے۔

ممدوح۔ خدا اُسے اپنے حفظ و امان میں رکھے، اور ایسی مصیبت سے بچائے۔ وہ اک وجودِ لطیف و نجیب ہے جو سزاوارِ خوش بختی ہے۔

مجدی۔ کوئی شبہ نہیں، میں نے جتنی عورتیں دیکھی ہیں اُن میں نسیمہ خانم سب سے زیادہ قابلِ عزت ہیں، بالخصوص اُس قابلیت و شوق کا خیال کرکے جو تصویر کشی کے بارے میں اُن کو ہے۔ اگر انسان کو نسیمہ خانم جیسی باکمال و پاکیزہ طبیعت ہستی ملے، تو اس کی قدر کرنی چاہیئے اس کے برعکس، وہ بڑی خطا کا مرتکب ہوگا، ہے نا؟

بتول۔ بیشک (از زمین تا آسماں)

مجدی۔ عورتوں کی تفریق اور ان کی قدر و قیمت کے متعلق میرا ایک معیار ہے۔ میں ان عورتوں کو شوپن کے والس chopin waltz سے تشبیہ دیتا ہوں۔ آپ کو معلوم ہے کہ بادی الامر میں شوپن کے والس، اور معمولی والسوں میں زیادہ فرق نہیں ہے۔ اور اگر ہے بھی تو یہی کہ نظر اول میں معمولی رقص، شوپن کے والس سے زیادہ جاذب نظر، زیادہ لطیف اور دلکش معلوم ہوتے ہیں۔ عورتیں بھی انہیں والسوں کی طرح ہیں۔ یعنی بظاہر ان میں فرق نہیں۔ بلکہ جیسے معمولی رقص، شوپن کے رقص سے بڑھے چڑھے معلوم ہوتے ہیں، بعض عورتیں بھی اپنی آرائشوں کے باوجود، دوسری عورتوں سے برتر معلوم ہوتی ہیں، مگر تھوڑی سی تدقیق نظر سے تھوڑی سی معرفت سے جس طرح، شوپن کے رقص کی متانت، شوق و اصالت ادا۔ بمقابلہ اور رقصوں کے، ظاہر ہونے لگتی ہے، اور

جس طرح، اس کی روح، اپنی نجابت و ملنعت سے انسان کو مسحور کردیتی ہے، اور اہل نظر کو اس کی رفتار و ادا کی بے مثالی اپنا گرویدہ کرلیتی ہے جو لوگ عورتوں پر تہ۔ ذانہ نظر ڈالتے ہیں اور اُن کی نفاست و محاسن پر غور کرتے ہیں، ان کے لئے عورتوں میں بھی ایسے ہی فرق نظر آتے ہیں۔ موسیقی شناس جس طرح شوپن کے والس کو معمولی رقصوں سے بڑھا ہوا سمجھتے ہیں۔ اتنا ہی ہم لوگ، ایسی عورتوں کی معمولی عورتوں سے زیادہ روحی وجد سے پرستش کرتے ہیں حتیٰ کہ میں اُن تجربہ کار و قیمت شناس لوگوں کو جانتا ہوں جو ایسی مستثنا عورتوں کو صرف اُن کی نگاہ، اُن کی رفتار سے پہچان لیتے ہیں اور اُن کی عزت کرتے ہیں۔ اور خود اپنے تئیں بھی، اُن لوگوں میں شمار کرتا ہوں۔ اور اس بنا پر میرا دعویٰ ہے کہ شوپن کے والس کی طرح، نسیمہ خانم بھی، اپنی اصالتِ روح، و رقتِ حسیات کی وجہ سے قابلِ قدر ہیں۔

(نسیمہ، اس اثنا میں، داہنے دروازے سے داخل ہوتی ہے اور نعیم کو دیکھتے ہی خوش ہو کر اُس کی طرف دوڑتی ہے)

نسیمہ۔ آہ! میرے آغا بک آپ کب آئے؟ (دوڑ کر اس کے ہاتھوں کو بوسہ دیتی ہے، وہ بھی جھک کر اُس کے سر کو بوسہ دیتا ہے) اللہ بتایئے آپ کہاں سے آگئے۔

نعیم۔ توپ کے گولے کی طرح جنگلوں سے، میدانوں سے، تم پر آگرا۔

نسیمہ۔ (شکایتاً) یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں کیوں ایسی بری باتیں کہتے ہیں۔ (فرخندہ اور ممدوح کی طرف پھر کر) آج میں نے مجدی بک کی تصویروں کو دیکھ کر معلوم کیا کہ شراب کا نشہ کیا ہوتا ہے۔ کیا رنگ آمیزیاں ہیں، کس بلا کے رنگ بھرتے ہیں! مجدی سے خدا کے واسطے بتلایئے آپ کو یہ رنگ کہاں سے ملے، اور ان رنگوں کو ملا کر آپ انہیں اس قدر روح پرور چمک کس طرح دے دیتے ہیں میں قسم کھاتی ہوں، اب میں ہاتھ میں تصویر کا برش نہ لوں گی۔

مجدی۔ اگر ایسا کیا تو بہت قابلِ افسوس حرکت ہوگی۔ کیونکہ میں بھی استادوں کے شاہکاروں کو دیکھ کر اگر اتنا ہی مایوس ہو جاتا، تو میں جو کچھ اب کرسکتا ہوں نہ کرسکتا۔ اور تمہیں اس قدر تعجب و حیرت میں نہ ڈال سکتا۔ بات تو جب ہے کہ ہم جن شاہکاروں کو دیکھ کر حیرت میں رہ جاتے ہیں، ان کی مانند تصاویر بنانے کی کوشش کریں بلکہ ہم میں یہ شوق پیدا ہو کہ ان سے آگے بڑھ جائیں ہم!

نسیمہ۔ (تھوڑا سوچ کر) آپ سچ کہتے ہیں۔ معاف کیجئے، میں غلطی پر تھی۔ مگر میرے خدا کیا کبھی یہ ممکن ہے کہ میں اُن تصویروں کی طرح، ایک تصویر بھی بنا سکوں جو آپ نے بنائی ہیں۔

ممدوح۔ کیوں نہیں، کوشش کرو، تو سب ممکن ہے۔ کیوں مجدی بک؟

نسیمہ۔ کوشش؟ آپ کیا کہتے ہیں۔ میں اپنی تمام زندگی کے شوق و شغف کو سوائے اس کے اور کس چیز میں صرف کررہی ہوں۔ مجھ سے قسم لیجئے کہ ان جیسا کمال حاصل کرنے کے لئے میں اپنی عمر کے کم سے کم دس برس تو فدا کرسکتی ہوں۔

مجدی۔ (مسکرا کر) اگر ایسا کرو تو بھی قابلِ افسوس حرکت ہوگی۔ کیونکہ جن برسوں کو آپ فدا کرنے کے لئے تیار ہیں، اُن کا ایک دن بھی اتنا قیمتی ہے کہ وہ کسی چیز پر فدا نہیں کیا جاسکتا۔

نسیمہ۔ لیکن انہیں فدا کرکے جو صنعت کہ میں حاصل کروں گی وہ کیا کچھ کم قیمت ہے۔

مجدی۔ وہ کم قیمت نہیں، لیکن میں یہ کہنا چاہتا ہوں کہ.....

فرخندہ۔ بس بہت ہو چکا، چلو اب راستہ پکڑیں۔ راستے میں باتیں ہو سکتی ہیں۔ بارہ بج چکے اگر آپ کا معدہ اس کی آپ کو خبر نہیں دیتا تو کیا آپ گھڑی بھی نہیں دیکھ سکتے۔

ممدوح۔ بالکل ٹھیک ہے۔ مجدی آؤ ہم سب ساتھ چلیں، وہیں ہمارے ساتھ کھانا کھانا، اور جتنا چاہنا باتیں کرنا۔

نسیمہ و فرخندہ۔ آفریں ممدوح بک۔ کیا اچھی تجویز کی۔

مجدی۔ مگر افسوس کہ میں اس پر عمل نہیں کر سکتا۔

فرخندہ۔ ناممکن ہے، آپ اس تجویز کو رد نہیں کر سکتے۔ ہم آپ کو ضرور لے چلیں گے (نعیم و ممدوح کی طرف مڑ کر) کیوں ہے نا؟

نعیم و ممدوح۔ بے شک، بے شک۔ یہاں تنہا رہنے کے بجائے، ہمارے ساتھ آکر، مزے مزے کی باتیں کرکے، ساتھ کھانا کھانا کیا زیادہ اچھا نہیں؟

نسیمہ۔ اس میں شبہ کی کیا گنجائش ہے۔ آپ خود ہی سوچئے۔ علاوہ ازیں یہاں تنہا رہنا کس قدر ملال انگیز ہے۔

مجدی۔ یہ ٹھیک ہے مگر میں آج اتنا مشغول ہوں کہ آج نہیں چل سکتا۔ کسی دوسرے دن جس دن آپ کہیں خوشی سے حاضر ہوں گا، ساتھ کھانا کھاؤنگا۔ دیر تک گپ شپ لڑاؤں گا۔ غرضکہ آپ کے ہر حکم کی تعمیل کروں گا۔ مگر آج ممکن نہیں۔

نعیم۔ صاف تو یوں ہے کہ ساتھ نہ چلنے کے لئے آپ کا اس قدر اصرار کچھ شبہ پیدا کرتا ہے؟

مجدی۔ وہ کیا؟

نعیم۔ آپ کا اپنے تئیں یہاں قید رکھنے سے شبہ ہوتا ہے۔ (چھیڑ کر) آپ اقبال کیجئے کہ اس ٹھیرنے کے معاملے میں کسی عورت کا پاؤں درمیان ہے۔ (فرخندہ اور ممدوح نسیمہ کی طرف دیکھ کر اک دوسرے کو دیکھتے ہیں، نسیمہ کا رنگ زرد ہے، مگر نعیم اس طرف متوجہ نہیں۔) ہاں قبولئے۔ شاید آج ملاقات کا وعدہ ہوگا۔ کیا خبر ہم یہاں باتیں کر رہے ہیں، گھر میں کہیں عورت چھپی بیٹھی ہوگی۔

مجدی۔ (اندیشے سے) بچپن کی باتیں مت کرو، تم سے سنجیدہ آدمی کے لئے ایسا مذاق مناسب نہیں۔

نعیم۔ مثلاً اسی کمرے میں (اکمرے کو کھولنا چاہتا ہے، کمرہ بند پاکر) ذرا بتائیے اس کمرے میں کیا ہے۔

ممدوح۔ یہ آپ کے سونے کا کمرہ ہی تو ہے، مجدی بک؟

مجدی۔ (پریشان حالت سے) ہاں میرے سونے کا کمرہ ہے۔ مگر اس کی کیا ضرورت ہے۔

نعیم۔ فرض کیجئے کہ اس کے اندر، آپ کے بستر پر کوئی عورت آپ کی منتظر بیٹھی ہے۔

مجدی۔ پھر وہی بچوں کی سی باتیں۔ میں آپ سے عرض کرتا ہوں، اصرار نہ کیجئے۔ (نسیمہ کو آنکھوں سے اشارہ کرتا ہے۔)

نعیم۔ (ممدوح و فرخندہ کے اشاروں کو نہ دیکھ کر، اور مجدی کے اشاروں کو دیکھا ان دیکھا کر کے) کوئی نہیں؟ عورت دوست کوئی نہیں؟ اچھا تو پھر ہمارے ساتھ چلئے۔ اور اگر آپ ہمارے ساتھ نہیں چلتے تو میرے لئے یہ کچھ مشکل نہیں کہ میں لات مار کر کواڑوں کو توڑ دوں، اور جو اسرار اس کمرے میں پوشیدہ ہے اُسے باہر نکال لاؤں۔

مجدی۔ نعیم بک، آپ کیوں اتنا بچپن کئے جا رہے ہیں۔ بخدا، مجھے کام ہے اس لئے نہیں چلتا۔ ورنہ میں ضرور ساتھ چلتا۔

نعیم۔ (تھوڑا سا نرم ہو کر) اچھا تو آپ کو ضمانت دینی ہوگی۔ اس کمرے کی کنجی کہاں ہے۔

مجدی۔ میں...... میں..... میرے پاس۔

نعیم۔ تو بتایئے کمرے میں قفل کیوں لگا دیا۔

مجدی۔ کیونکہ جس وقت نسیمہ خانم تشریف لائیں، میں کپڑے پہن کے باہر، ساحل تک جانے کو تھا۔ جب میں باہر جاتا ہوں تو اس کمرے کو مقفل کر جاتا ہوں۔

نعیم۔ اچھا، شریر۔ اس وقت تو میرے ہاتھ سے سستے چھوٹ گئے۔ مگر خبردار پھر میرے ہاتھ نہ پڑنا۔ سمجھے؟ اچھا خدا حافظ۔ شام کو آؤ گے نا؟

مجدی۔ (پسینے پسینے ہو کر) ضرور آنے کی کوشش کروں گا۔ لیکن اگر نہ آ سکا تو مجھے معذور سمجھئے۔ اگر نہ آ سکا تو سمجھ لیجئے گا کہ کوئی ایسا سبب تھا جس پر میں قابو نہ پا سکا۔

فرخندہ۔ بہر حال، خدا حافظ، مجدی بک۔ چلو، نسیمہ۔ تم آگے ہو۔

نسیمہ۔ (غمگین طریقے سے) خدا حافظ مجدی بک، آپ بھول نہ جائیگا کہ ہم لوگ ہر روز آپ کے منتظر رہیں گے۔

مجدی۔ بے شک، اور میں بیان نہیں کر سکتا کہ میں آپ سب کا کس قدر احسان مند ہوں (ممدوح اور نعیم، اس سے ہاتھ ملا کر باہر جاتے ہیں۔ اسٹیج کوئی دس سیکنڈ خالی رہتا ہے۔ اس کے بعد، مجدی داہنے دروازے سے داخل ہوتا ہے اور جا کر بیلکونی سے دیکھتا ہے، اور اپنے ہاتھ اس طرح ہلاتا ہے گویا باہر سے جو لوگ اسی ہاتھ سے خدا حافظ کہہ رہے ہیں انہیں جواب دے رہا ہے۔ پھر لوٹ کر، اطمینان کا لمبا سانس لیتا ہے، اور جیب میں سے کنجی نکال کے بائیں جانب کے دروازے کی طرف متوجہ ہوتا ہے)

(پردہ گرتا ہے)

سجاد حیدر یلدرم

محفل ادب

شاعر کی تربت

دامانِ بہشت زار میں ہے — اک شاعرِ نوجواں کی تربت!
یادادئ نوبہار میں ہے — اک نکہتِ رائیگاں کی تربت!

آتیں نہیں اس طرف ہوائیں — شاداب وحسین پھول لے کر!
زائر بھی نہیں کہ جو چڑھائیں — دو اشک، دلِ ملول لے کر!

ممنونِ بہار کی نہیں ہے — کھلتے نہیں پھول اس زمیں سے!
یہ تو وہ خاکِ سرزمیں ہے — بیگانہ، گلاب و یاسمیں سے!

پر چشمِ بصیرت آشنا کو — مل جائے جو رخصتِ تماشا!
اور غور سے گورِ باصفا کو — دیکھو تو ہے کثرتِ تماشا!

شاعر کے الم گسار ہیں جمع — تربت پہ ہجوم ہو رہا ہے!
شمع و دلِ داغدار ہیں جمع — اور جام بھی خون رو رہا ہے!

وہ شمع کہ جس کی روشنی میں — راتوں کو وہ فکرِ شعر کرتا!
وہ جام کہ جس کو زندگی میں — وہ بادۂ شعلہ گوں سے بھرتا!

وہ دل کہ جو تھا اسیرِ الفت — اور آج بھی خوگرِ وفا ہے!
پیوست ہے جس میں تیرِ الفت — جو پھول کی طرح جانفزا ہے!

اک سمت فضا پہ چھا رہا ہے — آئینۂ رونمائے سلمیٰ!
یا موت کو گدگدا رہا ہے — نظارۂ جانفزائے سلمیٰ!

شاعر کو خبر نہیں گر کچھ — وہ تیرہ نصیب سو رہا ہے!
اس پر نہیں حال کا اثر کچھ — جاگا تھا غریب سو رہا ہے!

نیرنگ خیال

ہمایوں
ماہ جنوری ۱۹۲۲ء
نصف قیمت صرف اس ماہ کیلئے
اس فہرست میں سب اصل قیمتیں درج ہیں۔
محصول ڈاک بذمہ خریدار۔
محصولڈاک بذمہ خریدار ہے
بکثرت
فہرست کارخانہ پیسہ اخبار لاہور
جملہ علوم وفنون کی بہترین کتابیں قرآن
حدیث۔ دینیات۔ صنعت وحرفت۔ طب۔ تجارت۔ تاریخ۔ علاج البہائم۔ ناول۔ ڈرامے۔ فسانے وغیرہ
کارخانہ پیسہ اخبار واقعہ لاہور میں ہر قسم کی کتاب کی فرمایش آنے پر فوراً تعمیل کی جاتی ہے یہ کارخانہ گذشتہ ۳۰ سال سے آپ صاحبان کی خدمت کر رہا ہے۔
اس فہرست میں سب اصل قیمتیں درج ہیں۔ دیانتداری اس کارخانہ کا سب سے بڑا اصول ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ہمیں اس تجارت میں لاثانی عروج حاصل ہوا ہے۔ آپ نے جب کبھی
کوئی کتاب منگانی ہو۔ تو سب سے پہلے ہمیں یاد کیا کریں۔
باورچی خانہ
ہدایت نامہ باورچیان ہر قسم کے انگریزی کھانے پکانے کی خانساموں کے لئے مفید کتاب ۸عہ
مربے حلوا اچار چٹنیاں لذیذ مربے خوشگوار اچار۔ خوشبودار حلوے چٹ پٹی چٹنیاں بنانے کے مفید نسخے جو ہر گھر میں معلوم ہونے ضروری ہیں لڑکیوں کیلئے یہ کتاب بہت اچھی و کارآمد ہے ۸ر
خوان یغما مسلمانوں کے انواع واقسام کے صدہا لذیذ کھانے۔ پلاؤ زردہ متنجن۔ کوفتے وغیرہ بنانے اور مصالحہ ڈالنے اور پکانے کی کئی تراکیب درج ہیں قیمت ۸ر
بھوجن پرکاش باورچی خانہ اور رسوئی سے لطف و محبت رکھنے والوں کیلئے ضروری ہے کہ اس کتاب کا مطالعہ کریں اسمیں پرمزہ لذیذ نمکین اور شیریں کھانوں انواع واقسام کی مٹھائیوں حلوے۔ پوریاں۔ کچوریاں۔ بھاجیاں۔ ترکاریاں وغیرہ تیار کرنے کی پوری کیفیت درج ہے قیمت ۸ر
پرورش وعلاج حیوانات کیمتعلق کتابیں
علاج المویشی ہاتھی شیر گھوڑا خچر گدھا بھینس گائے بکری وغیرہ کے امراض اور ان کا علاج ۸ر
محب المویشی ہر قسم کے چوپایہ جانوروں کا حال علاج اور پرورش وغیرہ کے طریقے ۸ر
بھیڑ بکری کی پرورش اس میں بھیڑ بکری کے ریوڑ پالنے اور ان کی تجارت سے نفع حاصل کرنے اور نگہداشت کے طریقے ۸ر
معالجات الکلب کتوں کی ہر قسم کی بیماریاں اور علاج پرورش اور نگہداشت کے طریقے قیمت
مکمل مرغیخانہ مرغیوں کی پرورش سے دولت کمانا اس وقت دنیا میں سب سے زیادہ فائدہ مند بیوپار ہے مرغی انڈے کیلئے اس کا مطالعہ کریں قیمت ۱عہ
تربیت الدجاج اس میں بطوں اور مرغیوں کی ہر قسم کی بیماریوں کا علاج اور انڈے کی تجارت کا حال درج ہے۔ عہ
حالات کنیری کنیری پرند کی پرورش و نگہداشت کے طریقے ۴ر
شہد کی مکھی ۸ر ریشم کا کیڑا ۸ر خواص الحیوانات ۸ر
سیاسی دنیا میں تہلکہ مچادینے والی کتب مدر انڈیا یعنی مادر ہند
امریکہ کی رہنے والی ایک اخبار نویس ادھیڑ عمر عورت مس کیتھرائن میو نے ۱۹۲۶ء میں ہندوستان کی سیاحت کرکے ایک کتاب مدر انڈیا کے نام سے لکھی جس کی شہرت آناً فاناً تمام دنیا میں پھیل گئی امریکہ یورپ اور ہندوستان میں اس کے
کئی ایڈیشن چھپ گئے ہیں اس کتاب میں مس میو نے ہندوستان کی معاشرتی رسوم پر ایسی جلادانہ نکتہ چینی کی ہے کہ تمام ممالک ہند و چیخ اٹھے اور تمام ہندو پریس نے اس پر سخت سے سخت اعتراض کئے ہیں و بعض ہندوؤں کا خیال ہے کہ گورنمنٹ آف انڈیا نے مس میو سے یہ کتاب اس لئے لکھوائی ہے کہ کمیشن اصلاحات جو ہندوستان میں حالات کی تحقیقات کیلئے آئی تھی اس کو ہندوستان کی معاشرتی کمزوریوں کا پتہ لگ جائے یا ننا پڑتا ہے کہ تمام دنیا کے لوگ اس کتاب سے متاثر ہوئے ہیں چنانچہ اس کا نہایت سلیس ترجمہ عام فہم اردو میں شائع کیا گیا ہے۔ آجتک جس قدر ترجمے اس کتاب کے چھپے ہیں وہ نامکمل ہیں اور ان میں اختصار سے کام لیا گیا ہے مگر ہم نے لفظ بلفظ ترجمہ کیا ہے جس کو ناظرین دیکھکر خوش ہونگے انگریزی کتاب کی قیمت آٹھ روپے فی جلد۔ اردو کتاب کی قیمت تین روپے لکھائی چھپائی عمدہ ۳ر
فادر انڈیا یعنی بھارت پتا یہ کتاب مادر ہند کے جواب میں لکھی گئی ہے مادر ہند جنہوں نے مطالعہ کیا ہے ان کو چاہئے کہ دواب بھی منگوا کر پڑھیں عہ
ذخیرہ صنعت وحرفت کے آٹھ حصے
یورپ امریکہ کی تمام صنعتوں کا مفصل حال ہر چیز کی تیاری کا نسخہ ترکیب وغیرہ مفصل درج ہے اس کتاب کے دس بارہ ایڈیشن آج تک فروخت ہو چکے ہیں کئی لوگوں نے صرف اس کتاب کی بدولت ہزاروں

چہار مقالہ
فارسی زبان میں نظامی عروضی سمرقندی جو ادب تاریخ کی بہترین کتاب ہے۔ عہ

تاریخ دربار امرتسر
دربار صاحب امرتسر کے مفصل تاریخی حالات قیمت عہ

سفرنامہ بغداد
مولوی محبوب عالم صاحب نے دوران جنگ عظیم میں خلفائے عباسیہ کے قدیم پایہ تخت اور عراق عرب کے جدید حالات لکھے ہیں قیمت ۱ر

رہنمائے مسافران ہند
سہولیت مسافران و سیاحان و جاتریان ہندوستان عہ

رہنمائے کشمیر
کشمیر جنت نظیر کیلئے بہترین رہنما قیمت ۱۲ر

کارونیشن دربار دہلی
اس میں کارونیشن دربار دہلی میں شامل ہونیوالے کل راجوں نوابوں رؤسا و جاگیرداروں و صوبجاتی حکومتوں کے تمام بڑے افسروں وائسرائے اور کنگ جارج کی عکسی تصویریں اور مفصل سوانح حالات وغیرہ درج ہیں کتاب اعلیٰ درجہ کے آرٹ پیپر پر مدراس کی چھپی ہوئی ہے قیمت ۲۵ر مجلد

تاریخ مراکش
سلطنت مراکش کی ابتدا سے لیکر آجتک کی مفصل تاریخ قیمت ۱۲ر

تاریخ سیالکوٹ
ضلع سیالکوٹ کے حالات علامہ عبدالحکیم سیالکوٹی کی زندگی اور ہمعصر علماء کے کارنامے وغیرہ اس کتاب کا دیباچہ سر محمد اقبال صاحب نے لکھا ہے قیمت عہ

شباب کشمیر
کشمیر کے مشہور بادشاہ بڈشاہ کی دور حکومت کے مفصل حالات قیمت ۱۲ر

سفرنامہ سیر مالٹا
مولانا محمود الحسن صاحب اسیر مالٹا کے خود نوشت حالات قیمت ۱۲ر

بدایت الحجاج ۱۲ر تاریخ جنگ سمالی لینڈ ۶ر
انگلستان و اسلام ۸ر جنگ یورپ کے مکمل حالات ۱۲ر
دنیا کی رنگین و گوری قومیں ۸ر لاہور عہد مغلیہ میں ۸ر
شاہی سیر کشمیر ۸ر شالامار باغ ۸ر

بچوں کیمتعلق مفید کتابیں

بچوں کے گیت
اس کتاب میں نہایت دلچسپ بچوں کے گیت جمع کئے گئے ہیں۔ ۱۲ر

اخلاقی کہانیاں
نہایت دلچسپ بچوں کیلئے مفید حکایات جس پر پنجاب گورنمنٹ نے مصنف کو تین سو روپیہ انعام دیا قیمت عہ

گلیور صاحب کی سیاحت
باؤنوں و بالشت بھر کے آدمیوں کے ملک میں گلیور صاحب کی سیاحت کے دلچسپ حالات معہ تصاویر

سندباد جہازی ۱۲ر قفس ۱۲ر پانچ بادشاہ ۱ر

لطائف و ظرائف
گذشتہ تیس سال سے انتخاب الجواب دہفتہ وار پیسہ اخبار میں جو لاکھوں لطیفے دلچسپ چھپتے رہے ہیں ناظرین کے اصرار پر کتابی صورت میں چھاپے گئے ہیں ان کی دلچسپی کا سب سے بڑا ثبوت یہ ہے کہ پہلا حصہ قریبًا بیس دفعہ چھپ چکا ہے پانچسو لطائف حصہ اول تا حصہ ہشتم ہر ایک حصہ میں پانچ پانچسو لطائف درج ہیں اور ہر ایک حصہ کی قیمت آٹھ آنہ آٹھوں حصوں کی قیمت للعہ

رہنمائے پولیس
جملہ ملازم محکمہ پولیس و عوام کے فائدہ کے لئے رہنما قیمت ۶ر

محبوب الاخلاق
یعنی مسلمانوں عیسائیوں اور ہندوؤں کے مشاہیر بزرگوں مصنفوں لیڈروں اور حکمائے یونان کے چیدہ اقوال کا دلچسپ مجموعہ بہ ترتیب حروف تہجی ۸ر

خط تقدیر
دبا تصویر) ہاتھ کی ہتھیلی سے انسان کی قسمت و حالات معلوم کرنیکا رہنما قیمت ۱۲ر

نوشتہ تقدیر
حکیم فیثاغورث کے چالیس سوالوں کا جواب علم نجوم میں یکتا کتاب۔ ۱۰ر

چالاکی پہلی و دوسری
اسمیں تمام جادو و شعبدے بازیاں۔ چالاکیاں درج ہیں ۸ر

علم ہپناٹزم
علم ہپناٹزم کی پہلی کتاب ۸ر

گنجینہ عملیات
ہر قسم کے تعویذات اور نقش لکھنے کے طریقے قیمت ۸ر

ہدایت تعلیم انگلستان
انگلستان میں جاکر مختلف کالجوں اور کارخانوں میں تعلیم حاصل کرنے کے حالات عہ

خواجہ ناصر الدین ۱۲ر چیستان و معمے ۶ر
ناصحان ۱۲ر آئینہ مسمریزم ۱۲ر علم کاسہ سر ۳ر
ڈاکٹروں اور مریضوں کے لطیفے ۱۲ر

دواوین وغیرہ

مسدس حالی
مولانا حالی مرحوم کا جادو اثر کلام جس کے شعر شعر میں اسلامی جذبات کی تصویر کھینچ دکھئی ہے قیمت ۱۲ر

دیوان حافظ
خواجہ حافظ شیرازی کا شیریں فلسفیانہ کلام ۱۲ر

باغ خیال اکبر
اکبر میرٹھی داناپوری کے کلام کا مجموعہ قیمت ۱۰ر

دیوان غالب
حضرت اسد اللہ غالب کا مکمل دیوان اردو عہ

دیوان ذوق
ملک الشعرا خاقانی ہند شیخ ابراہیم ذوق کا مکمل دیوان عہ

دیوان داغ
نواب میرزا خان صاحب داغ دہلوی استاد نظام دکن کا دیوان عہ

دیوان ظفر
شہنشاہ ہند ابوظفر بہادر ظفر کا مشہور اردو دیوان عہ

ترانہ موسیقار
اس میں غذائے روحانی یعنی نغمات اور سروں کو محفوظ رکھنے اور علم موسیقی کے علمی جزو پر بحث کی گئی ہے قیمت ۸ر

ہندو شعرا کا نعتیہ کلام
اسمیں ہندو شعرا کے اس کلام کو جمع کیا ہے جو انہوں نے رسول خدا محمد مصطفےٰ کے متعلق لکھا ہے۔ ۸ر

انوار احمدی
یا میلاد محمدی اسمیں آنحضرت کی پیدائش معجزات معراج شریف کے واقعات درج ہیں ۸ر

گلدستہ سہرا
تمام مشہور مشہور سہرے جو آجتک مختلف شادیوں کے موقعوں پر لکھے گئے ہیں اس گلدستہ میں جمع کر دیئے ہیں۔ ۸ر

معلومات بوسہ بازی
تمام دنیا کی قوموں میں بوسہ بازی کے رواج کے متعلق معلومات ۸ر

میلاد اکبر
اکبر وارثی میرٹھی نے اس میلاد شریف میں مختلف نعتیں۔ درود۔ سلام وغیرہ جمع کئے ہیں۔ ۱۲ر

تضمین نعتیہ بر کلام حافظ کا خلاصہ مصنفہ مولوی احمد علی صاحب منشی فاضل ۲ر

ناول ڈرامہ فسانے

ناول ۱۱۳ ۔ سراغرسانی کا حیرت انگیز اور دلچسپ ناول ۔ جو پڑھنے سے تعلق رکھتا ہے قیمت ۔۔۔ ے ر

فتح انطاکیہ یہ ایک اسلامی تاریخی ناول ہے اسمیں بتایا گیا ہے کہ مسلمانوں نے کیسی جانفروشانہ بہادریاں کر کے عیسائیوں پر غلبہ پاکر انطاکیہ فتح کیا ۔ قیمت للعہ ر

فتح یرموک یہ بھی ایک اسلامی تاریخی ناول ہے اسمیں بتایا گیا ہے حضرت خالد بن ولید کی حیرت انگیز بہادری اور مجاہدین اسلام کے کارنامے درج ہیں ۔ ۱۲ ر

سیتا یہ ایک انگریز ڈپٹی کمشنر کا قصہ ہے ۔ جو ہندوستانی لڑکی پر عاشق ہوا ۔ قیمت عہ

قعر دریا ہر دو حصہ منشی عبد الغفور صاحب مصنف حق بحقدار و تماشہ گاہ عالم وغیرہ نے اس سات سو صفحہ کے ناول میں حیرت انگیز مناظر کا پے در پے پیش آنا اور مجرموں کا نہایت چالاکی سے کامیاب ہونا اخیر میں طباع اور پرکار آتش سراغرسان کا بھانڈا پھوڑنا ۔ سعہ

سرگذشت رینلڈس کے مشہور ناول میری پرائس کا ترجمہ ایک خادمہ کی آپ بیتی کہانی ۔ نہایت سنسنی خیز ناول چار حصوں میں خوبی یہ ہے کہ جب تک اس کو ختم نہ کر لیا جائے چھوڑنے کو دل نہیں چاہتا چار حصوں کا حجم (۱۳۰۰) صفحہ سرگذشت حصہ اول ۴۴۴ صفحہ قیمت ۱۲ سرگذشت حصہ دوم ۲۳۲ صفحہ ۱۲ ر حصہ سوم ۲۳۶ صفحہ قیمت ۱۲ حصہ چہارم ۲۹۶ صفحہ قیمت ۱۲

تماشہ گاہ عالم منشی عبد الغفور صاحب مرحوم مصنف حق بحقدار و قعر دریا نے ہندوستانی زندگی کا ایک نقشہ پیش کیا ہے ۔ نہایت دلچسپ ۔ ۱۲

فریبی عورت اسمیں ایک عورت اپنے ادنے اغراض کیلئے ایک مالدار شخص کی لڑکی کو گم کر کے اپنی بیٹی کو اس کی لڑکی ظاہر کرتی ہے آخر حق بحقدار رسید ۔ سعہ

مفتاح التفتیش دوار برٹن نامہ ۔ جرائم پیشہ اقوام اور مجرموں کے سراغرسانی کے متعلق پولیس اور خفیہ پولیس کی دماغی کارروائیوں کو قابل قدر شکل میں پیش کیا گیا ہے ۔ ۶ ر

بد انجام جس میں ۱۸۵۷ء کے غدر کے واقعات کو اس مشہور تاریخی ناٹک کے ایکٹروں کی زبانی ۔ سعہ

دو حریف سراغرسان ۔ ملک افریقیہ کی سراغرسانی میں سے ایک چوٹی کا پر حیرت قصہ طبع پنجم ۔ سعہ

شمع شبستان لاہور کا ایک امیر زادہ ایک نہایت مفلس بڑھیا کی لڑکی پر شیدا ہوتا ہے جو بڑی مشکلات سے اس کے ہاتھ آتی ہے وغیرہ ۔ ۹ ر

حسن آرا بیگم ۔ ایک زنانہ اخلاقی ناول ۔ سعہ

قدرتی سیر بین ہندوستانی زندگی کا دلچسپ اور عبرت انگیز ناول ۔ ۱۲

دلفگار ۔ ایک حسین لڑکی کی درد بھری کہانی ۔ ۸ ر

اسرار اکلینڈ اس میں نیکیوں کے خوشگوار نتائج اور شریروں کو سزا وغیرہ قیمت ۔ ۱۲ ر

سیر بکاؤلی قلعہ بکاؤلی کے پر اسرار طلسمی حالات ۸ ر

داستان چل وزیر ترکی زبان سے الف لیلہ کی طرح نہایت دلچسپ کہانیوں کی کتاب ایک بادشاہ کو چالیس روز تک اسکی بیوی اپنے سوتیلے بیٹے کے خلاف ہر روز نئی کہانی سنا کر اس کو قتل کر دینے کی خواہاں ہوتی ہے اور دوسری صبح ایک وزیر ایک نئی کہانی عورتوں کے مکر کی سنا کر بادشاہ کے بیٹے کا قصور معاف کرا دیتا ہے ۔ عہ ۱۲ ر

حق بحقدار منشی عبد الغفور صاحب مرحوم منیجر دیوٹی شاپ مشہور ناولسٹ نے نہایت دلچسپ و حیرت انگیز طرز سے لکھا کہ بغیر ختم کئے چھوڑنے کو دل نہیں چاہتا ۔ قیمت ۱۲ ر

قدیم لندن کے اسرار دو حصہ رینلڈس مشہور فسانہ نگار کے ناول کا ترجمہ دو حصوں میں

چلتا پرزہ رینالڈس کے مشہور ناول کا ترجمہ ۔ ایک عیار کی مکاریاں ۔ قابل دید ہے ۔ عہ

بدر کمال ہر دو حصہ ۔ نہایت دلچسپ ناول ہے ۶ ر

موتیوں کا جزیرہ یا کونٹ آف مانٹی کرسٹو مشہور و معروف فرانسیسی ناولسٹ سر الیگزینڈر ڈوما کی تصنیف کو اسرار سے شائع کیا گیا ہے ۔ اس کے پایہ کا ناول آج تک اردو زبان میں کوئی نہیں لایا گیا ۔ قیمت مکمل ۸ عا

غبارہ میں پانچ ہفتے ہوائی جہازوں کی ایجاد سے قبل یہ ناول تصنیف ہوا تھا اس میں جیولس ورن نے ہوائی جہاز کی پرواز کے وہ امکانات دکھائے ہیں جو آجکل عملی طور پر ہو رہے ہیں اس وقت وہ صرف فسانہ تھے ۔ سعہ

پرستان بغداد بصرہ ۔ بغداد ۔ دمشق حلب وغیرہ مقامات کے عشقیہ فسانے قیمت ۔ سعہ

دس پونڈ کا نوٹ ایک معشوقہ کی ملاقات ۔ دس پونڈ کے نوٹ کی کشمکش ۔ قیمت سعہ

آستانہ کی حور جنگ یورپ میں ترکوں کی بہادری کے کارنامے انجمن اتحاد و ترقی اور ینگ ٹرکش پارٹی کا زور و شور وطن فروش ترکی وزیر داماد فرید پاشا و خلیفۃ المسلمین کی جلاوطنی وزراء سلطنت کی بد نظمیاں اور خود غرض ارباب حل و عقد نے کس طرح قسطنطنیہ کو برباد کیا کس طرح ترک برباد ہو کر اندرون ملک میں چلے گئے مجلس ملی کا انعقاد جنرل نور الدین پاشا کی فتوحات ۔ یونانیوں کے مظالم یونانی لشکر کی تباہی ۔ ترکوں کی شجاعت و بسالت جن کو پڑھکر حرارت اسلامی شخص جوش میں آتا ہے ۶ عا

سعید و فلپانہ اسلامی شجاعت ۔ تہور اور بہادری سے تاریخی فسانے عربوں کی دلیرانہ اور فاتحانہ زندگی کی سرگذشت غازیان اسلام کی فتح ۔ ایک پادری کی لڑکی فلپانہ اسلام کے سچے اصول و سعید کی بہادری دیکھکر مسلمان ہو جاتی ہے پھر مسلمان علم تبلیغ لیکر تمام علاقہ شام کو فتح کرتے ہیں عیسائیوں کے قلعوں پر اسلامی پرچم لہراتے ہیں ۔ یہ اسلامی تاریخ کا نہایت شاندار ناول ہے ۔ قیمت ۶ ر

اکبر و زہرہ ایک عشق و محبت کی داستان ۔ اکبر اپنے مہ جبین کے جنازہ تک سہرا جاتا ہے ۔ اور دنیا کی مصائب مردانگی سے جھیلتا ہے ۔ قیمت عہ

امریکہ کی نازنین امریکہ کی ایک عالمگیر نمائش میں ایک نازنین سے ملاقات ۱۲ ر

بخیل کی دولت ایک بخیل کی زندگی دولت جمع کرنے اور حرام موت مرنے کے حالات ۔ سعہ

پرکالہ آتش ایک پرکالہ آتش سراغرسان کی بہادری اور پر جوش تفتیش کے حالات ۱۲ ر

ملنے کا پتہ ۔ منیجر پیسہ اخبار لاہور

امریکہ کے کامیاب لوگ (تصویر) آجکل دنیا میں سب سے زیادہ کامیاب اور دولتمند ملک امریکہ ہی ہے۔ اس کتاب میں امریکہ کے تمام چوٹی کے کامیاب لوگوں کے حالات اور ان کی کامیابی کے وسائل درج کئے گئے ہیں کہ کس طرح یہ لوگ افلاس اور گمنامی سے اس عزت اور دولت کی انتہا تک پہنچ گئے عہ

اپنا فرض ادا کرو فرض ادا کرنے سے جو کامیابی ہو سکتی ہے اسکی نہایت شاندار مثالیں اس تین صد صفحہ کی کتاب میں درج ہیں۔ روم، یونان اور یورپ کی تاریخ سے ایسے واقعات دکھلائے گئے ہیں جن کی وجہ سے چھوٹے چھوٹے آدمیوں نے وہ کارہائے نمایاں سرانجام دیئے کہ جن سے قیصر و کسرے جیسے بادشاہ لرز اٹھے قیمت ۱۲ر سبل دلت ۸ر عمدہ حل نقطہ کا راز ۲ر

بے روزگاری کا علاج جو رگ گھر میٹھکر اپنی معیشی کا علاج کرنا چاہتے ہیں وہ اس کتاب کو منگاکر پڑھیں قیمت عہ ترجہ کی یکسوئی ۳ر مطالعہ نفس ۳ر مطالعہ باطن ۲ر

کم سرمایہ تجارتیں اگر آپکے پاس زیادہ سرمایہ نہیں ہے تو یہ کتاب منگاکر پڑھیں بہت کم سرمایہ سے آپ بڑی بڑی اچھی تجارتیں کرسکتے ہیں۔ عہ

تذکرات وسوانحعمری

حیات نعیم فی ذکر نبی کریم سید المرسلین کی زندگی کے حالات اقوال و اعتقادات قیمت ۸ر

پیغمبر اسلام ردی ند سفر مالسانی کے خیالات حضرت خیر البشر کی تعریف میں قیمت ۸ر

حضرت ابوبکر صدیقرض کی شاندار زندگی کے حالات رفیق بک کی کتاب شہر مشاہیر الاسلام کا ترجمہ سعہ

حضرت علیرض کرم اللہ وجہہ کی زندگی کے حالات ۱۲ر

خالد بن ولید حضرت خالد سیف اللہ سپہ سالار اسلام کی سوانحعمری قیمت ۸ر

حالات سعدی شیخ مصلح الدین شیرازی کی زندگی کے حالات

ذکر شہنشاہ جارج پنجم مفصل سوانحعمری با تصویر سعہ

جنرل گارفیلڈ ایک یتیم بچہ جو ریاستہائے متحدہ امریکہ کا پریزیڈنٹ بن گیا۔ ۶ر

مسٹر انڈریو کارنیگی امریکہ و انگلستان کا مشہور کروڑپتی قیمت عہ

سلطان علاؤالدین خلجی ہندوستان کے عظیم الشان دانشمند اور طاقتور بادشاہ کے عہد کی ترقیاں و ضمناً اکابر علماء و فضلاء کے حالات ۱۲ر

سوانح خواجہ غریب نواز نہایت اچھے انداز میں دہلی کی چھپی ہوئی۔ عہ

سلطان ٹیپو ۵ر سلطان الشہدائے سندھ ۴ر سوانح پنڈت موتی لال نہرو ۴ر مہادیو گووند رانا ڈے ۴ر حیات مشتاق ۶ر حیات زیب النساء ۶ر ابراہیم لنکن ۴ر مصنفان اسلام ۳ر اکابر اسلام ۴ر ابوریحان البیرونی ۴ر نپولین بوناپارٹ ۳ر سلطان صاحبقران ۴ر غازی محمد بن قاسم ۳ر جمال الدین افغانی ۴ر

اسلامی کتابیں

تجرید الاحادیث حدیث شریف کی اہم مختلف کتابوں کا خلاصہ دس ہزار احادیث عربی معہ اردو ترجمہ قیمت للعہ

شرح عقائد نسفی اس نام کی مشہور عربی درسی کتاب کا اردو ترجمہ قیمت ۴ر

آئینہ اسلام ابتدائے اسلام سے آجتک تاریخ و معاملات اسلام کا عالمانہ بیان جو تمام انگریزی و اردو خوان مسلمانوں کے پڑھنے کے لائق ہے

زیور ایمان تمام ضروری و معتبر اسلامی مسائل فقہ کی کتابوں سے اردو لباس میں قیمت ۱۲ر

دلیل الحیران قرآن شریف کی تمام آیات بحروف ابجدی ترتیب وار قیمت ۶ر

علم الکلام امام غزالی کی مشہور کتاب الاقتصاد فی الاعتقاد کا ترجمہ اردو قیمت ۴عہ

فیض الرحمن فی تسہیل القرآن قرآن مجید کے مطلب کو سمجھانے کیلئے مختلف معانی کی شرح قیمت ۴عہ

رام پیاری	۴ر
پاربتی	۸ر
اختر و بلقیس	۴ر
ذبیح فاطمہ	۸ر
یوسف نرینہ	۱۲ر
اختری بیگم	۸عہ
بیٹے کا قاتل	۴ر
فیروز محمودہ	عہ
حمیدہ بانو	۸ر
ماں کا قاتل	۱۲ر

تاریخی عربی ناولوں کے ترجمے

حسن پرست	۱۰ر
غدسیہ	۴ر
بوالہوس نواب	۴ر
نرالی بھوت	۸ر
بڈھے میاں	۴ر
رن ہیر کا نتا	۸ر
کمسن بی بی مس شوہر	۴ر
جوان بی بی کمسن شوہر	۴ر
نورجہان	۸ر

تاریخی ناول

باشوبک شہزادی	۵
انقلاب فرانس	۸عہ
معرکہ بیونس	۱۲ر
جنگ نقفار	۶ر
جنگ طرابلس	۶ر
جنگ سمرنا	۸ر
اورنگ زیب چنچل کماری	۱۲ر
نازنین بلخ	۸ر
سراب فنیش	۸ر
ماہ نو	۸ر
برق غضب	۱۲ر
زر پرست	۱۲ر

برا ہمارا گھوڑا	۶ر
مقدس دیوی	۸عہ
جانفروش	۸عہ
سفید پوش	۴ر
ترکی حرم سرا	۸ر
سائیکل بانہ حسینہ	۲ر
اسرار افریقہ	۱۲ر
بچھڑوں کا ملاپ	۴ر
خونی ملاح	۴ر
خونی چور	۶ر
خونی ساحر	۱۲ر
خونی آفت	۶ر
خونی بہن	عہ
خونی بھائی	عہ
خونی بھید	۸عہ
خونی منظر	۸ر
خونی تصویر	۴ر

عشق و محبت کا خزانہ

نرالا عاشق	عہ
پیارا عاشق	۶ر
دلبر عاشق	۴ر
ہوا باز عاشق	۸عہ
شیطان عاشق	۱۲ر
رومال کا عاشق	۸ر
درد عشق	۴ر
قانون عشق	۶ر
نظیر عشق	۴ر
ظالم عشاق	۶ر
معشوقہ فرانس	۸عہ

دنیا کے چند مشہور جاسوسی ناول

لنڈنی جاسوس	۸ر
بنگالی جاسوس	۸عہ
فطرتی جاسوس	عہ

زنانہ کتابیں

مرتبۂ نسواں مصنفہ مسٹر مشیر حسین صاحب قدوائی۔ اسلام میں عورتوں کا مرتبہ۔ مہر اور لا ولد بیاہی صفات۔ کثرت ازدواج۔ طلاق۔ پردہ وغیرہ پر مفصل بحث عہ

حیات زیب النساء زیب النساء بیگم کی نہایت دلچسپ سوانح حیات قیمت ۶ر

زنانہ نظمیں مختلف شعرا نے عورتوں کے متعلق آجتک جس قدر دلچسپ نظمیں لکھی ہیں۔ ان کو ایک جگہ جمع کر کے چھاپا ہے۔ قیمت ۱عہ

زنانہ خط و کتابت اس میں ہر قسم کے خطوط جو لڑکیوں کو لکھنے کی ضرورت پڑتی ہے بطور نمونہ لکھکر دکھائے گئے ہیں قیمت ۸ر

کشیدہ کاری ریشمی۔ سوتی وغیرہ کپڑوں پر مختلف رنگ کے دھاگوں سے کشیدہ کاڑھنے کے دو سو مختلف نقشے۔ قیمت ۱عہ

مولانا شبلی نعمانی کی مشہور کتابیں

حیات سعدی شیخ سعدی کے مفصل حالات۔ خانگی سیر سیاحت۔ شیراز میں ایسی شاعری طرز ادا۔ غزل گوئی۔ نکتہ سنجی وغیرہ پر کمال تبصرہ کیا ہے ۸ر

حیات حافظ خواجہ حافظ شیرازی کے نام دلنشیں بچپن شاعری فلسفہ اخلاق کلام کی بندش چستی و ظرافت پر نہایت عالمانہ تبصرہ ہے قیمت ۸ر

مولانا کا سفر نامہ روم و شام و مصر و شام۔ اس سفر نامہ میں ترکوں، عربوں کی تمدنی حالت اور ان معاشرت پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ ۱عہ

مجموعہ نظم شبلی و سوانح حیات مولانا کی وہ تمام اردو نظمیں اور مولانا مرحوم کی لائف نثر لکھنوی کے قلم سے ۸ر

مقالات شبلی مولانا شبلی کے وہ علمی و تاریخی مضامین جو ابتک کتابی صورت میں شائع نہیں ہوئے ۱عہ

آغاز اسلام ترجمہ بدر الاسلام مسلمان بچوں اور لڑکیوں کیلئے مولانا شبلی مرحوم کے قلم سے ۔ ۶ر

سوانح مولانا جلال الدین رومیؒ مولانا شبلی نے مثنوی شریف مولانا روم کی دیگر تصانیف پریشان وار تبصرہ لکھا ہے۔ مولانا کی شاعری۔ اخلاق۔ ریاضت اور زہد تقویٰ وغیرہ پر روشنی ڈالی گئی ہے قیمت ۱عہ

سوانح شیخ الاسلام ہند مولوی محمود الحسن صاحب اسیر مالٹا کے خود نوشت حالات پڑھکر سنسنی پیدا ہوتی ہے۔ ۱عہ

الغزالی اسلام کے سب سے بڑے مصنف کی سوانح حیات ان کے عقائد اور طرز استدلال۔ امام صاحب کی سوانحعمری میں آجتک کوئی کتاب محقق نہوئی تھی۔ برجہ اپنی خوبی کے یہ کتاب سلسلہ آصفیہ میں داخل ہے۔

النعمان امام اعظم ابو حنیفہ کی مکمل سوانحعمری۔ خاتمہ پر امام صاحب کے شاگردوں کے حالات درج ہیں۔ امام صاحب کا عام اخلاق اور مناظرات کی بہت سی مثالیں تاریخی حیثیت سے درج ہیں ۱۲ر

المامون فرمانروایان اسلام کے سلسلہ میں خلافت ہارون رشید کی فتوحات خانہ جنگیوں وغیرہ کے مفصل حالات پڑھنے کے قابل کتاب ہے قیمت ۱عہ

اورنگ زیب پر سرسری نظر۔ عالمگیر اورنگ زیب کو بدنام کرنے کی خاطر برادران وطن نے اسقدر جھوٹے قصے تراشے کہ جن کی تردید کرنے کے لئے مولانا شبلی نے یہ رسالہ لکھا قیمت ۸ر

جوزف میزینی اٹلی کے نامور محب الوطن کی سوانح عمری قیمت عہ

پیٹر اعظم روس کے نامور بادشاہ کی زندگی کے عبرت انگیز حالات قیمت ۸ر

سوانح علامہ عبد الحکیم سیالکوٹی کی علمی زندگی۔ ان کی نادر تصنیفات کے تذکرے۔ اکبر۔ جہانگیر۔ شاہجہان۔ عالمگیر کے عہد زریں کے علمی کارنامے قیمت عہ

سوانح راجہ بیربر مشہور و معروف راجہ بیربر کی زندگی کے حالات قیمت ۸ر

سلطان صلاح الدین ایوبی صلیبی جنگوں کے سپہ سالار کے حالات زندگی مصنفہ مولوی اشہری صاحب مرحوم قیمت عہ

سوانح نور جہاں ملکہ نور جہاں اور شہنشاہ جہانگیر کی پر لطف زندگی کی تصویر۔ ۸ر

ابراہیم ادھم۔ ۸ر

تاریخی عربی ناولوں کے ترجمے

امین و مامون خلافت بنی عباس کے جلیل القدر ارکان کی زندگی کا خلاصہ قیمت ۱عہ

شارل اور عبد الرحمن فرانسیسی بہادروں کا مسلمانوں سے مقابلہ اور شکست وغیرہ عہ

ابن طولون تیسری صدی کی مصری اسلامی حکومت کے سیاسی واقعات قیمت ۱۲ر

عروس فرغانہ خلیفہ معتصم باللہ کے عہد حکومت کے پراسرار واقعات عہ

محبوبۂ قریش حضرت عمرؓ اور حضرت ابوبکرؓ کے عہد کی فتوحات کا ذکر ۱عہ

اسمعیل صفیہ اسمعیل کا ڈاکوؤں کے خوف سے وطن کو خیرباد کہنا جنگل میں اس کی بیوی صفیہ کا گم ہونا اسمعیل کا واپس آکر ڈاکوؤں سے ملک کو صاف کرنا وغیرہ ۸ر

عصمت کا الہم اکبر کی وزیر خان اعظم کی دختر عفت کی شادی قیمت ۱۲ر

مالن کی بیٹی ایک مالن کی بیٹی تارا اور نیپال کے کنور کی شادی۔ ایک نہایت ہی دلچسپ عشقیہ فسانہ قیمت ۸ر

شوخ دلہن دیہاتی زندگی کا زندہ مرقع شوخی اور شرارت کی تصویر قیمت ۸ر

فتنہ ایک پیارے بچے کے کارنامے اس کے بھولے پن کی جیتی جاگتی تصویر۔ بلا ارادہ شرارتوں کا مرقع قیمت ۱۲ر